# خلجی خاندان

کے۔ ایس۔ لال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# خلجی خاندان

مصنّف

کے ۔ ایس ۔ لال

مترجم

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک ـ1، آر ـ کے ـ پورم، نئی دہلی ـ110066

**Khilji Khandan**

By : K.S. Lal

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1980

دوسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت: -/88

سلسلۂ مطبوعات: 803

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر- کے- پورم، نئی دہلی-110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی-110006

# فہرست ابواب


| نمبر شمار | باب | صفحہ |
|---|---|---|
| 1 | حکمراں خاندانوں کی تبدیلی (1290ء) | 7 |
| 2 | جلال الدین فیروز شاہ خلجی | 23 |
| 3 | علاء الدین کی دیوگیری پر فوج کشی | 44 |
| 4 | علاء الدین کی تخت نشینی | 60 |
| 5 | ملتان ــــ گجرات ــــ بنگال | 78 |
| 6 | جیسلمیر اور رنتھمبور | 96 |
| 7 | چتوڑ کی فتح | 114 |
| 8 | مالوہ ــــ سوانا ــــ جالور | 129 |
| 9 | منگول حملے | 140 |
| 10 | نظم و نسق | 170 |
| 11 | مالی اور فوجی اصلاحات | 195 |
| 12 | معاشی ضوابط | 217 |
| 13 | دکن | 245 |

| صفحہ | باب | نمبر شمار |
|---|---|---|
| 264 | انتہائی جنوب | 14 |
| 283 | علاءالدین کے آخری ایام | 15 |
| 292 | علاءالدین کی ترقی پر تبصرہ | 16 |
| 308 | قطب الدین مبارک شاہ | 17 |
| 333 | ناصرالدین اور خسرو شاہ | 18 |
| 349 | خلجیوں کے عہد میں تہذیبی سرگرمی | 19 |
| 374 | ضمیمے | |
| 402 | کتابیات | |

# پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتّب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

## باب ۱

# حکمران خاندانوں کی تبدیلی ۱۲۹۰ء

بیس سال بہ حیثیت وزیر اور بیس سال بہ حیثیت بادشاہ یعنی چالیس برس تک کامیابی سے حکومت کرنے کے بعد اسّی سالہ بوڑھے بلبن کی قسمت میں دل شکستگی کی موت لکھی تھی۔ جب شہنشاہ بستر مرگ پر دراز تھا تو اس نے سلطنت کے بڑے بڑے امرا مثلاً فخر الدین کوتوال اور وزیر خواجہ حسن بصری کو بلایا اور ان کو شہزادہ شہید محمد کے بیٹے کیخسرو کو تخت نشین کرنے کی وصیت کی۔ شہزادہ محمد منگولوں کے ایک معرکہ میں کام آیا تھا اور اس کی موت کا بلبن کی گرتی ہوئی صحت پر بڑا اثر پڑا تھا۔ لیکن سیاسی رسّہ کشی میں اصول و اقتدار کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ ۶۸۶ھ[1] مطابق ۱۲۸۷ء میں جیسے ہی غیاث الدین بلبن کی آنکھیں بند ہوئیں، اس کی وصیت بالائے طاق رکھ دی گئی۔ فخر الدین کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں کیخسرو کو ملتان بھیج دیا گیا اور بغرا خان کے بیٹے اور بلبن کے پوتے کیقباد کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا گیا اور سلطان معز الدین کیقباد لقبِ شاہی قرار پایا۔ تختِ شاہی پر اگرچہ بغرا خان کا حق زیادہ قوی تھا۔ مگر اس نے اپنے بیٹے کی تاجپوشی کی اس لیے مخالفت کی کہ وہ خود بنگال کے آزاد و خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے تخت لکھنوتی پر سلطان ناصر الدین محمود بغرا شاہ کے لقب سے رونق افروز ہو چکا تھا۔

---

1۔ قران السعدین، ص ۳۵؛ فتوح، ص ۱۶۰؛ تاریخ مبارک شاہی، ص ۵۲ اور بدایونی، مترجمہ رینکنگ جلد اول ص ۲۲۰ میں ۶۸۶ھ ہے۔ یہی تاریخ صحیح ہے کیونکہ معز الدین کی سہ سالہ اور چند ماہ حکومت ۶۸۹ھ میں ختم ہو گئی تھی۔ جیسا کہ ذیل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ برنی، ص ۱۲۱ میں دی گئی تاریخ ۶۸۵ھ غلط ہے۔

**معزّ الدین کیقباد:۔**

معزّ الدین بمشکل تمام سترہ[2] اٹھارہ سال کا جوان تھا اس کمسنی میں اُس نے اپنے کو ملک کا آقائے کل پایا۔ اس کا دل نرم، فطرت شائستہ اور شخصیت جاذب نظر تھی۔ مگر اس کا شباب اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔" ہوشمند اور جہاں دیدہ بلبن نے اس کی تربیت اور نشوونما میں اتنی سخت گیری سے کام لیا تھا کہ اپنی زندگی کے اس دور میں کیقباد کو کسی حسین چہرے پر نظر ڈالنے یا شراب کے ایک جام تک کا مزہ چکھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔[3] جب اچانک اس نے اپنے آپ کو اس طرح آزاد اور ایک وسیع سلطنت کا حکمراں پایا تو عیش پرستی، تن آسودگی کی خواہشیں اور نوجوانی کی جولانیاں اس کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ ملک کے کونے کونے سے مسخرے، بھانڈ اور شعبدے باز دربار میں جمع ہو گئے[4]۔ اور گوشہ گوشہ میں گویّے اور شاعر پیدا ہو گئے[5]۔ ہر دیوار کے سایے میں بیسواؤں نے ڈیرے ڈال دیے اور حسین صورتیں ہر بام کی زینت بننے لگیں[6]۔ صاحب حیثیت لوگ بادشاہ کی حسن پرستی کی نقل کرنے لگے اور شراب کی قیمت میں دس گنا اضافہ ہو گیا[7]۔ اپنی تخت نشینی کے چھ ماہ بعد معزّ الدین نے "لال محل" چھوڑ دیا اور جمنا کے کنارے اپنے تعمیر کردہ خوبصورت محل میں منتقل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر کہ بادشاہ کیلوگھری کو ایک خوبصورت اور ترقّی پذیر دارالخلافہ بنانا چاہتا ہے، دہلی کے امراء اور اعلیٰ طبقہ کے افراد اس طرف متوجہ ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے وہاں اپنے محلات تعمیر کر لیے۔ کیلوگھری زندگی سے دھڑکنے لگی اور مستیوں میں غرق ہو گئی۔ سلطان کا دربار حسن اور بذلہ سنجی کی آماجگاہ بن گیا۔ اور وہ نشہ جو چشم و گوش کی راہ سے اس کے اندر گھر کر گیا تھا زندگی کی آخری گھڑیوں تک نہ اتر سکا؟[8]

---

(۲) بدایونی، مترجمہ رینکنگ (ص [illegible]) اور فرشتہ (ص [illegible]) کے مطابق وہ اپنی تخت نشینی کے وقت عمر کے سولھویں سال میں تھا۔ طبقات اکبری کے مطابق اس نے اٹھارہ سال پورے کر لیے تھے۔ برنی کا بیان ہے کہ وہ سترہ اٹھارہ سال کا تھا۔

(۳) برنی، ۱۲۸

(۴) فرشتہ، ۸۳

(۵) برنی، ۱۲۹

(۶) برنی، ۱۳۰؛ فرشتہ، ۸۴

(۷) تاریخ مبارک شاہ، ۵۳

(۸) برنی، ۱۳۶؛ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال [illegible]، صفحہ ۱۰

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلبن کی کارگزار انتظامیہ مشین ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ شہنشاہی کا خوف، جاسوسی کا ڈر اور بادشاہ سے وفاداری کا جذبہ لوگوں کے دلوں سے نکل گیا۔ ملک الامرا فخر الدین کے بھتیجے اور داماد ملک نظام الدین نے جب یہ دیکھا کہ سلطان ہمیشہ عورتوں میں منہمک اور شراب میں غرق رہتا ہے اور اس وجہ سے ایک نہ ایک دن حکومت کا عصا اس کے ہاتھ سے گر کر رہے گا، اس نے اس عصائے شاہی کو اپنی پوری قوت سے پکڑ لینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وہ وکیل در[۹] کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سلطنت کا وفادار خادم ظاہر کر کے بادشاہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا حکمرانی کے کار منصبی ایک کے بعد ایک اسے ملتے گئے۔ ملک عمدۃ الملک قوام الدین علاد بیر کو اس نے اپنا ایک اچھا معاون پایا[۱۰]۔ قوام الدین علمی تبحر اور انشا پردازی میں بے مثال اور نائب وکیل در[۱۱] کے عہدے پر فائز تھا۔ نظام الدین خود بہت محنتی اور محتاط، ہوشیار اور معاملہ فہم اور باصلاحیت تھا۔ وہ سلطنت کا کاروبار بہت خوبی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ مگر اس کی ہوس اقتدار اور حُبِ جاہ بہت دن تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سے اعلیٰ امیر یا تو اس خدشہ سے کہ نظام الدین کے بہت طاقتور ہونے کی صورت میں وہ اس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں گے یا خود اس ہوس اقتدار کے سبب زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کوشاں رہنے لگے۔ نظام الدین اس صورت حال سے بے خبر نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حکمرانی کا سب سے زیادہ اہل شہزادہ محمد تھا جو پہلے ہی موت کی گود میں سو چکا تھا۔ رہا ناصر الدین بغرا خان، تو وہ اپنی صلاحیتوں کو دور دراز بنگال میں ضائع کر رہا تھا۔ اب صرف کیخسرو ایسا تنہا کانٹا اس کے پہلو میں رہ گیا تھا جو اگرچہ اس وقت ملتان میں جلا وطنی کے دن گزار رہا تھا مگر اس کے لیے کبھی نہ کبھی پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے معز الدین کو کیخسرو کے قتل پر یہ کہہ کر اکسایا کہ اگر صرف چند بلبنی امرا کی مدد اور تائید اس کو حاصل ہوگئی تو تخت سے بادشاہ کو ہٹانے اور اس کے مسند نشین ہونے میں ایک دن بھی نہیں

---

(۹) فرشتہ، ۸۴۔ عصامی کے بیان کے مطابق وہ "میرداد" کے منصب پر فائز کیا گیا (فتوح ص ۱۸۱ اور ص ۱۹۱) لیکن فرشتہ کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ قوام الدین جو کہ "نائب وکیل در" تھا اس کا ماتحت تھا۔ وکیل در کا اہم ترین فرض منصبی شاہی محلات کی چابیاں رکھنا تھا۔ اس سلسلے میں انتظام و انصرام کا بار دیکھو۔

(۱۰) برنی اس کو قوام الدین علاقہ دبیر کہتا ہے۔ لفظ علاقہ کا یہاں کوئی مفہوم نہیں بنتا۔ ہو سکتا ہے کہ "علار" نقل نویس کی غلطی سے علاقہ بن گیا ہو۔ علار کا یہ تو مفہوم ہو سکتا ہے کہ وہ ایک قابل سکریٹری تھا یا وہ کسی علار دبیر کا بیٹا تھا۔

(۱۱) برنی، ۱۳۱

گئے گا۔[11] کیخسرو بھی بادشاہ پر نظام الدین کے اثر و رسوخ سے واقف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خود بھی اس تخت کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے تھے جس کا وہ حقدار تھا۔ وہ اپنی مقصد براری کے لیے یہاں تک کوشاں تھا کہ منگولوں سے مدد حاصل کرنے کے لیے غزنی بھی گیا لیکن وہ خود اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے، دہلی پر حملہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ شہزادہ آزردہ و دل شکستہ ہو کر ملتان لوٹ آیا۔ تاہم اس کی نقل و حرکت کی اطلاع معز الدین کو ہوئی اور اس نے شہزادہ کے قتل کے احکامات صادر کر دیئے۔[12] نظام الدین کی ریشہ دوانیوں کا شکار ملتان سے دہلی طلب کیا گیا اور راستہ میں روہتک کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔[13]

ایک دشمن سے چھٹکارا پانے کے بعد نظام الدین نے دوسروں کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی۔ اس نے معز الدین کے وزیر خواجہ خطیر کو ایک معمولی لغزش کی پاداش میں بادشاہ کے حکم سے گدھے پر بٹھا کر شہر بھر میں رسوا کیا۔ اس نے منگول نو مذہبوں کا، جو زیادہ تر نو مسلموں کے نام سے مشہور تھے، اس الزام پر قتل عام کرایا کہ انھوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی تھی اور ان کے بچے کھچے خاندان والوں کو دور دراز قلعوں میں بھیج دیا۔[14] اس کے بعد ملتان کے مقطع (Feudatory) ملک شاہیک اور برن کے مقطع ملک توزکی، جو بلبن کے قابل اعتماد امراء میں سے تھے، کی باری آئی۔ ان کو دربار میں طلب کیا گیا اور کسی بہانے سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ نظام الدین نے یہاں تک جسارت کی کہ خود بادشاہ کا خاتمہ کر دینا چاہا۔ اس نے بادشاہ کی شراب میں زہر ملانا شروع کر دیا۔ اس کی یہ حرکت اگرچہ بادشاہ کی فوری موت کا سبب نہ بن سکی تاہم اس کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔[15] ان زیادتیوں اور حرکتوں کے باوجود نظام الدین کو بادشاہ کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔ دراصل معز الدین اس کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ اگر کوئی اشارے کنائے میں بھی اس سے نظام الدین کے برے ارادوں کے بارے میں کچھ کہتا تو وہ نظام الدین سے کہہ دیتا کہ "فلاں فلاں نے تمھارے بارے میں ایسی ایسی بات کہی؟" تب وہ بدقسمت شخص طلب کیا جاتا اور مکار وزیر کے سنگدلانہ انتقام کی

(۱۲) ایضاً، ۳۳-۱۳۲

(۱۳) فتوح، ۹۲-۱۹۰؛ فرشتہ، ۸۴ فتوح اور حاجی محمد قندھاری کے حوالے سے یہی کہانی دہراتا ہے۔

(۱۴) برنی، ۱۳۳؛ بدایونی، مترجمہ رینکنگ جلد اول ص۲۲۲ اور فرشتہ، ۸۴

(۱۵) برنی، ۱۳۴، ۱۴۳

(۱۶) فتوح، ۱۹۴، ۱۹۲

بھینٹ چڑھ جاتا۔ اس طرح نظام الدین نے بہت سے لائق وزیروں اور قابل افسروں کا خاتمہ کردیا۔ اس کے اقتدار کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کی بیوی کو سلطان کی اعزازی ماں اور شاہی محلات کی حکمراں منتظمہ کہا جاتا تھا۔ اس کی مسلمہ حیثیت اور ناقابل شکست طاقت کی بنا پر دوسرے تمام امراء اور افسر اس حد سے زیادہ خوشامدی اور ماتحت بن چکے تھے اور اس کا آستانہ اعلیٰ و ادنیٰ کا پناہ گاہ" (۱۷) بن گیا تھا۔

پیر نود سالہ فخر الدین اس کھیل کی خطرناکی سے اچھی طرح واقف تھا جو اس کا داماد کھیل رہا تھا۔ اس نے کئی بار اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ: بادشاہت کا خیال ترک کردو۔ جامۂ شاہی کچھ سپاہیوں پر خوب سجتا ہے۔ تم، جو ایک بنیے کو پیاز کے ڈنٹھل سے مارنے کی ہمت نہیں رکھتے اور نہ کسی گیدڑ کو کبھی ایک ڈھیلا تک مارنے کی جرأت کر سکے، اپنے کو مرد کار کیسے گردانتے ہو اور کیوں کر تاج شاہی کا خواب دیکھ سکتے ہو؟" (۱۸) یہ مشورہ ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتا تھا جنھوں نے اپنے تجربوں سے خود کچھ سیکھا ہو۔ مگر اس شخص کے لیے جسے یہ مشورہ دیا گیا تھا قطعی بیکار ثابت ہوا۔

نظام الدین نے تو اپنے خسر کے مشورہ پر کان نہیں دھرے مگر معزالدین نے اپنے باپ کی نصیحت کی طرف پوری توجہ دی۔ جب بنگال میں بغرا خان کو دہلی کے تباہ کن حالات کا علم ہوا تو اس نے بیٹے سے جلد سے جلد اجودھیا میں ملاقات کرنی چاہی جہاں معزالدین اس کے استقبال کو آیا۔ نظام الدین نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ باپ بیٹے کے درمیان اختلافات کی دیوار کھڑی کردے اور یہاں تک کوشش کی کہ ان میں ملاقات ہی نہ ہونے دے۔ لیکن ان کی ملاقات ہوئی اور دونوں کے آنسوؤں نے اس موقعہ کو ایک یادگار واقعہ بنا دیا۔ (۱۹) ناصر الدین نے معزالدین کو سینکڑوں نصیحتیں کیں اور جدا ہوتے وقت چپکے سے کان میں کہا: "نظام الدین کو اپنی راہ سے جلد ہٹا دو۔ اگر اس کے بعد اسے ایک بھی موقعہ مل گیا تو وہ تمھیں تخت پر ایک دن بھی نہ رہنے دے گا۔" (۲۰)

نصیحت کارگر ہوئی۔ کیلوگھڑی واپس آنے پر جو پہلا کام معزالدین نے کیا وہ یہ تھا کہ اس نے نظام الدین کو ملتان جانے کا حکم دیا۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ وہاں کے انتظام و انصرام کی نگہداشت

---

(۱۷) طبقات اکبری، مترجم ڈے، ص۱۲۲

(۱۸) برنی، ۱۲۰، ؛ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۱ء ۹۲، ۱۹۱

(۱۹) اس واقعہ کی واضح تصویرکشی کے لیے قران السعدین ۱۲۰-۱۴۰ ملاحظہ ہو ابن بطوطہ جلد سوم ۱۷۷ بھی دیکھیے

(۲۰) برنی، ۱۵۶۔

کرے مگر حقیقت میں اس کو دہلی سے ہٹانا مقصود تھا۔ نظام الدین اپنے تبادلے کا مقصد فوراً سمجھ گیا اس نے اپنی روانگی میں تاخیر شروع کر دی۔ درباریوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ بادشاہ نظام الدین سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے خفیہ طور سے نظام کی موت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ ایک دن اس کی شراب میں مہلک زہر ملا دیا گیا۔ اس طرح اس کی مکارانہ روش کا ایک نحت خاتمہ ہو گیا۔

## خلجیوں کا عروج

نظام الدین کی موت نے معزالدین کی حکومت کو مفلوج کر دیا۔ اپنی سازشی فطرت کے باوجود وہ ایک لائق اور دانشمند منتظم تھا۔ اس کے بعد کوئی اور اس جگہ کے لیے موزوں نہیں تھا۔ معزالدین کے دہی پہلے کے سے طوار ہو گئے۔ کچھ دنوں تک تو اس نے باپ کی نصیحتوں پر عمل کیا مگر پھر "اس کے دل کی باگ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی" اور ایک بار پھر اس کی خرمستیاں حد سے بڑھ گئیں لگاتار شراب نوشی نے اس کی صحت تباہ کر دی اور حکومت کا رہا سہا استحکام بھی جاتا رہا (۲۱)

اس نازک موقع پر بادشاہ نے سامانہ کے گورنر (نائب) اور دربار شاہی کے سر جاندار جلال الدین فیروز خلجی کو کاروبار سلطنت سنبھالنے کے لیے طلب کیا۔ راجدھانی پہنچنے پر اس کو شائستہ خان کا خطاب[۲۲] عطا کیا گیا اور برن کا اقطاع F معہ اور وزارت جنگ (عارض ممالک) کا قلمدان سونپا گیا۔ ملک ایتمر کچن اور ملک ایتمر سرخا، عہد بلبن کے دو امیر بالترتیب باربک (یعنی وزیر آداب دربار) اور وکیل مقرر ہوئے۔ اس عبوری انتظام کے ذریعہ ایک بار پھر سلطنت کے زوال پذیر نظم و نسق کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی۔

جلال الدین پیدائشی سپاہی تھا اور شمال مغربی سرحد پر ایک مدت تک منگولوں سے لڑ چکا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار شخص تھا۔ اس سے کوئی غلط قدم اٹھانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی [۲۳] جلد ہی ترک امرا اس مرتبے کی بنا پر اس سے حسد کرنے لگے۔ صورت حال اس وقت اور زیادہ خراب ہو گئی جب اسی اثنا میں سلطان پر کثرت شراب نوشی اور عیاشی کے سبب فالج کا حملہ ہوا۔ اس کی حالت

---

(۲۱) برنی، ۱۷۰

(۲۲) صرف برنی ۱۷۰ اس کا خطاب سیاست خان بتایا جاتا ہے۔ دوسرے تمام مورخین مذکورۂ بالا خطاب کا ذکر کرتے ہیں۔

(۲۳) تاریخ مبارک شاہ، ۵۶

بتدریج بگڑتی گئی۔ اتفاق کی کوئی امید نہ باقی رہی اور باہمی اختلافات بڑھتے گئے اور مخالفت ومتخاصم گروہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ دہلی کے امراء میں اس کے بعد دربار کے دو گروہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ترک امراء کا گروہ بلبن کے قدیم امیروں پر مشتمل تھا۔ اس کی قیادت ملک چھجو ایتمر کچھن اور ایتمر سرخا کے ہاتھوں میں تھی ۔ دوسرے گروہ کا سربراہ جلال الدین خلجی تھا۔ رائے عامہ اس گروہ کو کسی طرح ترک قبیلہ سے ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ کامل اقتدار وقوت کے حصول کے لیے اندر ہی اندر ترکوں اور نام نہاد غیر ترکوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ اس خراب صورت حال میں تھوڑی سی ابتری اس وقت پیدا ہوئی جب بعض با اثر بلبنی امراء نے بروقت اقدام کیا اور معز الدین کے کمسن بیٹے شمس الدین کا لقب دے کر تخت سلطنت پر بٹھا دیا (۲۴) جلال الدین شائستہ خان اس کا نائب مقرر کیا گیا مگر اہم عہدے اور قلمدان حکومت ترک امراء میں تقسیم کیے گئے۔ اس طرح بادشاہت "خاندان بلبن میں برقرار رہی اور کسی دوسری نسل کے لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں پہنچی۔ بہرکیف ترکوں کے ہاتھوں سے نہیں نکلی" (۲۵)

"ملک در خاندان سلطان بلبن بماند، در قومی واصل دیگر نیفتد و از اصل ترکان نرود"

(ترجمہ) ملک سلطان بلبن کے خاندان میں رہے اور کسی اور قوم اور خاندان میں نہ جائے۔ صرف ترکوں میں رہے"

ترکوں کے لیے تخت شاہی کا یہ نام نہاد تحفظ جلال الدین خلجی کے خلاف قدیم طبقہ امراء کی ایک چال کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جلال الدین صلاحیت اور کارکردگی میں ان سب سے کہیں آگے تھا۔ ایتمر کچھن اور ایتمر سرخا نے چند دوسرے ترک امیروں کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا کہ ایسے امیروں سے جو حقیقت میں اصل ترک نہیں ہیں تمام طاقت چھین لی جائے اور ان کو ان کے موجودہ عہدوں سے برطرف کر دیا جائے۔ انھوں نے ایسے تمام امیروں کی ایک فہرست بھی تیار کر لی تھی۔ جلال الدین کا نام سرفہرست تھا ۔ ۲۶ جلال الدین کو اس سازش کی خبر بادشاہ کے حاجب اعلا ملک احمد چپ سے ہوئی۔ ۲۷ جلال الدین

---

(۲۴) برنی ۱۷۰، صرف "خورد سال" لکھتا ہے۔ فرشتہ ۸۷، "طفل سہ سالہ" تحریر کرتا ہے برنی اور نظام الدین اس کا نام شمس الدین بتاتے ہیں اور تاریخ مبارک شاہی میں یحییٰ نے اس کا نام کیکاؤس لکھا ہے۔ عصامی اور فرشتہ کیومرث نام بتاتے ہیں۔

(۲۵) برنی، ۱۷۱

(۲۶) ایضاً ۱۷۲

(۲۷) فتوح، ۱۹۷، تاریخ مبارک شاہ، ۵۷، ہودی والا ۲۹۳ کی تحقیق کے مطابق "چپ" یا "جپ" حاجب کی تلخیص معلوم ہوتی ہے۔

نے محسوس کیا کہ دہلی میں اب مزید قیام خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لیے وہ اپنے حامیوں کے ساتھ بہار پور (۲۸) چلا گیا۔ اس نے اپنے اقطاع برن (موجودہ بلند شہر) سے کچھ آدمی بلا بھیجے اور اپنے گرد دوستوں اور رشتہ داروں کی ایک مضبوط جماعت جمع کر لی۔ جلال الدین کے راجدھانی سے فرار کی وجہ سے ترک حلقہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ان کی چال کھل گئی تھی اب وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے پہلی ضرب لگانے اور جلال الدین کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کسی بدگمانی کو دور کرنے کے خیال سے ایتمر کچن اور ایتمر سرخا نے اس کے پاس ایک عریضہ بھیجا۔ جس میں اسے "شہنشاہ جلال الدین" کے القاب سے مخاطب کیا گیا تھا۔ ایتمر کچن اس کو جال میں پھانسنے اور بہار پور سے کیلو گھری لاکر کمسن بادشاہ شمس الدین کے سامنے قتل کر دینے کے لیے ایک مختصر سے فوجی دستے کے ساتھ روانہ ہوا۔ جلال الدین کو اس سازش کا پتہ لگ چکا تھا۔ اس لیے جیسے ہی کچن اس کے محل میں پہنچا اس کو گھوڑے کی پشت سے کھینچ لیا گیا اور علاء الدین نے اسی وقت اس کی گردن اڑا دی۔ (۲۹) کچن کے قتل سے دونوں مخالف جماعتوں میں دشمنی کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ جلال الدین کے بہادر اور شجاع بیٹے پچاس سواروں (۳۰) کے ساتھ بڑی تیزی سے دہلی پہنچے۔ انھوں نے کمسن بادشاہ کو پکڑ لیا۔ ساتھ ہی دہلی کے کوتوال ملک فخر الدین کے بیٹوں کو بھی لیتے آئے۔ ایتمر سرخا نے ان کا تعاقب کیا اور بہار پور کے قریب انھیں جا لیا۔ دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ لڑائی میں جلال الدین کا بڑا بیٹا اختیار الدین گھوڑے سے گر پڑا۔ سرخا نے اس پر تلوار کے دو تین وار کیے۔ خوش قسمتی سے کوئی وار مہلک ثابت نہیں ہوا۔ اسی اثناء میں اختیار الدین نے اپنی تلوار سونت لی۔ اور ایک ہی وار میں ایتمر سرخا کی گردن اڑا دی۔ (۳۲)

کمسن بادشاہ کا اغوا اہلِ دہلی کے عوام کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ تمام شہری بغاوت پر آمادہ

---

(۲۸) برنی جگہ کا نام "بہارپور" لکھتا ہے۔ فرشتہ اسے "بہادرپور" اور بدایونی "بہاپور" کہتے ہیں جبکہ عصامی کے نزدیک وہ "جھاکل بہاری" ہے۔ بہرکیف یہ پرانی دہلی سے مشرق میں اور کیلو گھری سے جنوب مغرب میں چھ سات میل دور جمنا کے کنارے پر واقع ہے۔

(۲۹) فتوح، ۱۹۸

(۳۰) برنی ان کی تعداد پچاس لکھتا ہے۔ مگر نظام الدین اور فرشتہ ان کی تعداد پانچ سو بتاتے ہیں۔

(۳۱) فرشتہ، ۸۸، بدایونی کا بیان ذرا مختلف ہے دیکھو بدایونی ترجمہ رینکنگ جلد اول ۲۷. ۲۲۶

(۳۲) تاریخ مبارک شاہی، ۵۹، فرشتہ، ۸۸

ہو گئے ۔ وہ شہر کے تیرہ دروازوں (۳۳) سے نکل کھڑے ہوئے اور بدایوں دروازے پر آکر جمع ہو گئے ۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بہار پور جاکر شہنشاہ کے فرزند کو خلجیوں کے چنگل سے آزاد کرائیں گے ۔ البری ترکوں کے لیے ان کے سینوں میں ایک غیر شعوری وفاداری ابھر آئی تھی ۔ البریوں نے ان پر اسی سال تک حکومت کی تھی ۔ اب ان کو اس خیال سے بھی نفرت معلوم ہوتی تھی کہ وہ خلجیوں کے محکوم بنیں گے ۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ شہر کی دیواروں سے آگے بڑھیں ملک الامرا بدایوں دروازے پر جم کر کھڑا ہو گیا اس نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا ۔ اس کے اپنے بیٹے جلال الدین کے قبضے میں تھے لہٰذا اپنے عزیزوں کی خاطر وہ اس سے کوئی جھگڑا مول لینے پر تیار نہیں تھا ۔ اس نے ہنگامہ فرد کیا اور مجمع کو منتشر کر دیا ۔ عوام کی اکثریت تو واپس چلی گئی مگر ترک امیروں اور ملکوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے قائدین کی موت اور اپنے مقصد کی ناکامیابی سے دل شکستہ ہو کر آخرکار جلال الدین سے اپنی وفاداریاں وابستہ کرلیں وہ اس سے جا ملے ۔ ان کے دستوں نے خلجیوں کے سپاہیوں کی تعداد میں بہت اضافہ کر دیا ۔ (۳۴)

اب جلال الدین سب سے زیادہ طاقتور تھا کیونکہ ترک امرا کی طاقت ٹوٹ چکی تھی ۔ کم عمر بادشاہ اس کے قبضے میں تھا اور مفلوج معز الدین موت کی کشمکش میں مبتلا تھا ۔ شمس الدین کے اغوا کے دو چار دن کے بعد جلال الدین نے ترکیش (۳۵) نامی ایک شخص کو کیلوگھڑی بھیجا کہ وہ مرتے ہوئے سلطان کو قتل کر کے اپنے باپ کی موت کا انتقام لے جس کو کبھی معز الدین نے قتل کر دیا تھا ۔ وہ شخص محل میں داخل ہوا ۔ اس نے سلطان کے جسم کو ایک قالین میں لپیٹا ۔ کئی لاتیں ماریں اور اسے جمنا میں پھینک دیا ۔ اس طرح دریا آخری البری سلطان کے جسم کو بہا لے گیا ۔ یہ واقعہ یکم فروری ۱۲۹۰ء مطابق ۱۹ محرم ۶۸۹ھ بروز چہارشنبہ پیش آیا ۔ (۳۶)

---

(۳۳) برنی کے بیان کے مطابق بارہ دروازے تھے لیکن امیر خسرو نے (قرآن السعدین ، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ، ۵۲۴ ، میں) شہر کے دروازوں کی تعداد تیرہ بتاتی ہے ۔ ظفر نامہ کے مصنف شرف الدین یزدی کا بیان ہے کہ معز الدین کی قدیم دلی کے دس دروازے تھے لیکن تین اور دروازے (علاء الدین کے شہر) سیری کی جانب سے (تغلق کے شہر) جہاں پناہ کی طرف کھلتے تھے ۔ اس طرح دلی کے دروازے بارہ نہیں تیرہ تھے ابن بطوطہ نے ان میں سے کئی کے نام بتائے ہیں ۔

(۳۴) ظفر الوالہ ، ۵۳۰

(۳۵) فتوح ، ۲۰۰

(۳۶) معز الدین کی مدت حکومت صرف تین سال او چند ماہ تھی ۔ دیکھو تاریخ مبارک شاہ ۵۹

اگرچہ تاج شاہی جلال الدین کی گود میں آگرا تھا لیکن فوراً زیب سر کر لینے میں اسے تامل ہوا۔ اس نے شمس الدین کو بہار پور میں تخت نشین کیا۔ بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کے سامنے اس نے تجویز رکھی کہ وہ نئے نائب اور کم سن بادشاہ کی نگراں اور دلی کی ذمہ داریاں قبول کر لے۔ اور بادشاہ کی طرف سے اپنے لیے تبرہندہ، دیپال پور اور ملتان کے اضلاع کی[۳۷] درخواست کی۔ اس کے برعکس ملک چھجو نے اپنے لیے کڑہ جاگیر کی خواہش ظاہر کی اور اتالیقی اور وزارت شائستہ خان کے لیے چھوڑ دی۔ جلال الدین نے یہ تجویز پسند کر لی اور کڑہ چھجو کے حوالے کر دیا وہ فوراً اپنی جاگیر پر روانہ ہو گیا۔ کچھ دنوں تک تو جلال الدین شمس الدین کو دربار میں لاتا، اس کو تخت پر بٹھاتا اور خود وزارت اور اتالیق کے فرائض انجام دیتا رہا۔ مگر ہر شخص یہ جانتا تھا کہ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلنے والا نہیں ہے، دوست دشمن سب نے ہی ابھرتے ستارے کا خیر مقدم کیا۔ اور ایک دن جلال الدین کٹھ پتلی بادشاہ اور لوگوں کے ایک کثیر ہجوم کے ساتھ بہار پور سے روانہ ہوا۔ وہ کیلو گھڑی پہنچا اور وہاں اس نے کیقباد کے نامکمل تعمیر کردہ محل میں اپنی تاج پوشی کی رسم ادا کی شمس الدین جیل کی کوٹھری میں پھینک دیا گیا جہاں وہ کچھ دنوں کے بعد مر گیا۔(۳۸)

بہر کیف دلی کے عوام نے اس کی تخت نشینی کو شدید ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ وقائع نگار برنی لکھتا ہے کہ دلی میں بہت سے معزز و شریف، صاحبان عز و جاہ اور اہل سیف و قلم موجود تھے "مگر کسی نے بھی جلال الدین کے جشن مسند نشینی پر مبارک باد کا ایک لفظ بھی نہیں کہا" نیا بادشاہ بذات خود بھی ان کے معاندانہ رویہ سے خائف تھا، چنانچہ ایک عرصے تک اس نے دار الخلافہ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی۔ عوامی جذبات خلجیوں کے خلاف تھے، کیونکہ ان کے عروج نے ترکوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔

## خلجیوں کی اصل اور نسل

عوام کی ناراضگی اس خیال پر مبنی تھی کہ نسب کے لحاظ سے خلجی ترکوں سے مختلف ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جب معز الدین شدید بیمار ہوا اور اس کی صحتیابی کی کوئی

---

(۳۷) بدایونی، رینکنگ جلد اول ۲۲۹

(۳۸) شمس الدین کی حکومت محض تین ماہ اور چند دن رہی۔ دیکھو تاریخ مبارک شاہی، ۶۱، فرشتہ ۸۰، اور بدایونی رینکنگ، جلد اول ۲۲۹

امید نہ رہی تو بلبن کے امرا ایک جگہ جمع ہوئے اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ معزالدین کے ایک کم عمر بچے کو تخت نشین کر دیا جائے اور حکومت کا انتظام نائبوں کی ایک مجلس کے ذریعہ چلایا جائے تاکہ اقتدارِ اعلیٰ ترکوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ (۳۹) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ چونکہ جلال الدین کا تعلق ایک مختلف نسل سے تھا اس لیے وہ ترکوں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا اور نہ ترک خلجیوں پر اعتماد کرتے تھے۔ جب جلال الدین نے دہلی چھوڑی اور اپنا صدر مقام بہارپور کو قرار دیا اور اس کے بعد ایتمر کچھن اور ایتمر سرخا کی قیادت میں ترکوں کو شکست دی اور معزالدین کے کم سن بچے کو پکڑ لیا تو ترک امرا (از اصل ترکان) کی ایک کثیر تعداد اس سے جا ملی اور خلجیوں کو حدود اکثریت حاصل ہو گئی۔ معزالدین کے مرتے ہی ملک کی حکومت ترکوں کے خاندان (از خاندان ترکان) سے نکل کر خلجیوں کی نسل (در اصل خلجیان) میں چلی گئی۔ "امرا، عوام اور سپاہی سب ہی حیرت میں رہ گئے۔ ان کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی کہ ترکوں کی جگہ خلجی کیسے تخت نشین ہو گئے ہیں اور بادشاہت ترکوں کی نسل سے نکل کر کسی دوسری نسل (کے لوگوں) میں کیسے چلی گئی۔ (۴۰)

برنی کے مذکورہ بالا بیان سے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ دہلی میں دو گروہ تھے۔ ایک کی قیادت ایتمر کچھن اور ایتمر سرخا کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کی قیادت جلال الدین خلجی کے ہاتھوں میں تھی۔ ان میں سے ہر ایک دربار میں اپنا اقتدار چاہتا اور بسترِ مرگ پر دراز معزالدین کے کمسن بچے کے نام سے حکومت کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ چنانچہ یہ فطری بات تھی کہ ایک گروہ دوسرے پر بھروسہ نہ کرے بلکہ دوسروں کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کے درپے رہے۔ دوم یہ کہ خلجی ترکوں سے مختلف نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ خلجیوں کا تعلق آخر کس نسل سے تھا۔

بعد کے مؤرخین نے اس نکتہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں نظام الدین غالباً پہلا شخص ہے۔ اس کی وضاحت کے مطابق خلجی چنگیز خان کے ایک داماد قلیج خان کی اولاد تھے۔ قلیج خان کے تعلقات اپنی بیوی سے خوشگوار نہیں تھے۔ لیکن وہ اس کے باپ منگول شہنشاہ چنگیز خاں سے کھلم کھلا قطع تعلق کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ آخر کار اسے چنگیز خان کی اطاعت کے جوئے کو اتار پھینکنے کا ایک بہتری موقع مل گیا اور وہ اپنے خاندان اور پیروؤں سمیت، جن کی تعداد تقریباً

---

(۳۹) برنی ۱۷۱

(۴۰) ایضاً ۷۴ - ۱۷۵ ہ شریف و لشکری و بازاری ... حیران ماندندی و ایشان را عجب می نمود کہ خلجیاں چگونہ بجائے ترکاں بر تخت نشینند۔ و بادشاہی از اصل ترکان در اصل دیگر رود۔

تیس ہزار تھی، غور اور غرجستان کی وادیوں کی طرف ہجرت کر گیا۔ وہاں وہ امن و سکون سے رہا اور اس کے لوگ قلیج "یا" قلیج سے قلجی کہلائے لیکن بعد میں کثرت استعمال سے وہ لفظ خلجی ہو گیا۔ جب غور کے حکمرانوں نے ہندستان فتح کیا تو ان کے پیچھے پیچھے خلجیوں کی ایک بڑی تعداد نے ہندستان کا رخ کیا اور سلاطین ہند کی ملازمت اختیار کی۔ ان خلجیوں میں دہلی کے سلطان جلال الدین اور مالوہ کے سلطان محمود کے اسلاف بھی تھے۔ نظام الدین ایک جگہ یہ بھی کہتا ہے کہ سلجوق نامہ کے مصنف کی رائے کے مطابق خلجیوں کا سلسلہ نسب ترک بن یافث بن نوحؑ سے جا ملتا ہے۔ (۴۱)

تاہم نظام الدین کا اخذ کردہ نتیجہ ناقابل اعتبار ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ خلجیوں نے خوارزم شاہی سے کئی جنگیں لڑی تھیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ چنگیز خاں کے عہد سے پہلے بھی موجود تھے۔ اس مفروضہ کی تائید فرشتہ بھی کرتا ہے جس کا بیان ہے کہ خلجیوں کا تذکرہ غزنہ کی قدیم تاریخوں میں بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چنگیز خاں سے پہلے بھی وجود رکھتے تھے۔ لیکن غالباً وہ اپنے اور نظام الدین کے بیان میں مطابقت پیدا کرنے کی خاطر یہ اضافہ بھی کر سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ قلیج خاں بذات خود خلجیوں کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو اور دہلی کا جلال الدین اور مالوہ کا محمود براہ راست اسی کی اولاد میں ہوں۔ (۴۲) اس کے برخلاف بدایونی قلیج خانی نسب پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس نظریہ کا کوئی واقعی ثبوت نہیں ہے۔ ۔ ۔ اور حقیقت میں قلیج اور خلج میں کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔" (۴۳) فرشتہ اور بدایونی دونوں نظام الدین کے دوسرے بیان کو، جس میں ترک بن یافث کو خلجی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا گیا ہے، زیادہ قرین قیاس مانتے ہیں۔ حاجی دبیر مالوہ کے خلجیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ قلیج خاں افراسیاب کا بیٹا تھا اور افراسیاب چنگیز خان کا داماد تھا۔ (۴۴) لیکن وہ دہلی کے جلال الدین کے حسب نسب کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔

اس مسئلہ پر برنی کے بیان کا ابہام ناقابل تشریح ہے۔ اس کا باپ اور اس کا چچا خاصی مدت تک سلاطین دہلی کی ملازمت میں رہے۔ وہ خود بھی بہت سے با اثر کارکنان حکومت کا گہرا دوست رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی نظر سے وہ بہت سی معاصر اور اس سے قبل کی تصنیفات سے بھی

---

(۴۱) طبقات اکبری، ۱۱۶

(۴۲) فرشتہ، ۸۸

(۴۳) بدایونی، ریکنگ جلد اول ۳۴۰

(۴۴) ظفر الوالہ، ۱۹۷

رجوع کر چکا تھا۔ خلجیوں کی اصل کے بارے میں اس کی معلومات بالکل درست اور یقینی ہو سکتی تھیں لہذا یا تو اس نے اس نکتہ پر روشنی ڈالنے سے دانستہ گریز کیا یا اس کو ایک غیر اہم اور معمولی مسئلہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ امکان یہ بھی ہے کہ وہ خود حقیقت کا پتہ لگانے میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ بہر کیف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی نسلوں کی خصوصیات کے مطالعہ کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ اسی قسم کے ابہام کا مظاہرہ تغلقوں کے نسب کے سلسلہ میں بھی کرتا ہے۔ اس کے بیان سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم امراء کے ایک طبقہ نے خلجیوں کو پسند نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ان کا خاندان ترکوں سے کچھ مختلف تھا۔ بعد کے مورخین، مثلاً نظام الدین بدایونی، اور فرشتہ اس مسئلے پر مزید روشنی نہیں ڈالتے۔ ان کے بیانات پرانی روایتوں پر مبنی ہیں تاریخی تحقیقی نتائج پر ان کی بنیاد نہیں ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا مسئلے کا تنقیدی مطالعہ خلجیوں کے ترک اصل ہونے کی جانب قطعی اشارہ کرتا ہے۔ افغانستان میں دریائے ہلمند کے دونوں کناروں پر واقع علاقہ کو خلج کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی علاقہ کے بسنے والے خلجی کہلاتے ہیں عہد قدیم سے بہت سے خانہ بدوش قبیلے علاقہ خلج میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں قطعی طور پر یہ کہنا ناممکن ہے کہ خلجیوں کا تعلق کس قبیلہ یا سے تھا۔ تاہم دسویں صدی کا ایک عرب جغرافیہ نویس اور عالم ابن حوقل خلجیوں کو ترکی ترکی الاصل بتاتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق وہ ایک طویل مدت سے ہندوستان اور سجستان کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔" وہ مویشیوں کی دولت سے مالامال تھے اور ان کے عادات و اطوار، رسم و رواج اور لباس ترکوں جیسے تھے۔" (۴۵) بہت سے مصنف جیسے اصطخری اور حدود العالم اور دیوان لغات الترک کے لکھنے والوں کا بھی یہی خیال ہے کہ خلجی ترک تھے اور ماضی میں زمانہ دراز سے وہ افغانستان میں خلج کے مقام پر آباد چلے آرہے تھے۔ (۴۶) اس کے علاوہ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے مصنف فخر الدین کی شہادت ہے جس نے برنی کی تاریخ سے ڈیڑھ صدی قبل اپنی کتاب سنہ ۱۲۰۶ء میں مکمل کر لی تھی۔ فخر الدین چونسٹھ ۶۴ ترک قبیلوں کی فہرست دیتا ہے۔ اس میں وہ ترک، اغز، خلجی، تاتار، اغس، قنے وغیرہ کو شامل کرتا ہے۔ (۴۷) وہ ترک قبیلوں کے بارے میں بہت قیمتی

---

(۴۵) ابن حوقل، کتاب معجم البلدان، جلد ثانی صفحہ ۴۱۹، جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۸۵۲ء صفحہ ۳۶۸ اور شمارہ سنہ ۱۸۵۳ء کا صفحہ ۱۵۲ بھی

(۴۶) انڈین ہسٹری کانگریس سنہ ۱۹۳۸ء کی روداد صفحہ ۲۹۷

(۴۷) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ۴۷

معلومات فراہم کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو ان کے بارے میں گہری واقفیت تھی۔ طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج لکھتا ہے کہ خلجیوں نے ماوراءالنہر کے خوارزم شاہی شہنشاہو کی افواج میں عسکری خدمات انجام دی تھیں اور غور و غزنہ کی بہت سی جنگوں میں حصّہ لیا تھا۔(۴۸) ریورٹی کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خلجی کوئی مفروضہ قبیلہ نہ تھا، جیساکہ ایلیٹ کا خیال ہے۔(۴۹) بلکہ ان کا تعلق ایک ترک قبیلہ سے تھا۔ مدت دراز سے افغانستان میں سکونت کے باعث وہ مقامی باشندوں سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ وہ ترک سے زیادہ افغان سمجھے جاتے تھے۔(۵۰) وسطی ایشیا پر موجودہ عہد کے مسلم الثبوت اور مستند ترین محققین میں سے ایک محقق بارتھولڈ کا بھی یہی خیال ہے کہ خلجی ایک ترک قبیلہ تھا اور چوتھی صدی عیسوی کے قریب اس نے جنوبی افغانستان میں رہائش اختیار کر لی تھی۔(۵۱)

اولف کیرو بھی خلجیوں کو افغان سمجھتا ہے۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ بنیادی طور سے ان کا نسب ترک نسل سے جا ملتا تھا (۵۲)

اس طرح بلا خوف تردید یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلجی ترک تھے لیکن افغانستان میں اپنے طویل قیام کے سبب ان میں ملکی عادات و رسوم سرایت کر گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو غور و غزنہ کے حملہ آوروں کی افواج میں سپاہی بن کر ہندوستان میں آئے اور اکثر بیشتر افغانستان اور وسط ایشیا میں منگول طوفان کی تباہ کاریوں کے باعث یہ آکر پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں وہ حکمران نسل یعنی البری ترکوں سے مختلف نسل سے تعلق رکھنے والے سمجھے گئے۔ دہلی کا اقتدار اعلیٰ تقریباً ایک صدی سے البری ترکوں کا اجارہ سمجھا جاتا رہا تھا اور خاندان کی تبدیلی دہلی کے لوگوں کی نظر میں اس ماحول سے قطعی بیگانہ معلوم ہوتی تھی جس سے وہ اپنے کو اب پورے طور پر ہم آہنگ کر چکے تھے۔ خلجیوں کی تخت نشینی پر دہلی کے عوام کی حیرت کی اصل وجہ ان کی قدامت پسندی تھی نہ کہ خلجیوں اور البری ترکوں کے درمیان نسلی اختلاف۔ دونوں

---

(۴۸) طبقات ناصری، ریورٹی جلد اول ۱۰۴۳-۵۳ اور حاشیہ بھی دیکھیے۔

(۴۹) ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد ہشتم ۸۱

(۵۰) طبقات ناصری، ریورٹی جلد اول ملا اور ۲۱-۵۲۹ کا حاشیہ

(۵۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام صفحہ ۸

(۵۲) دی پٹھانس ۸۹-۸۸ اور ۳۲-۲۳۱

ایک ہی اصل اور ایک ہی نسب سے تعلق رکھتے تھے (۵۲)

## خلجی انقلاب کی اہمیت:

خلجی انقلاب دوررس نتائج کا حامل تھا۔ اس نے نہ صرف ایک نئے خاندان کی آمد کی منادی کی بلکہ مسلسل فتوحات، انتظامِ حکومت میں بے مثال تجربات اور لاثانی تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں کے ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ خلجیوں کی رگوں میں شاہی خون کی روانی نہیں تھی بلکہ ان کا تعلق عوامی جماعت سے تھا۔ ان کی تخت نشینی نے اس ظاہری عقیدہ پر کاری ضرب لگائی تھی کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف چیدہ لوگوں اور چنیدہ خاندانوں کی اجارہ داری ہے۔ خلجی بغاوت بنیادی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی ترک اقتدار کے خلاف بغاوت تھی۔ یہ دہلی کو مرکز ماننے والوں کی ان لوگوں کے خلاف بغاوت تھی جو غرور و نخوت سے کسب فیض کرنا چاہتے تھے۔ اس انقلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی حکومت کو شاہی خاندان کی حکومت پر برتری حاصل ہوئی۔ اس نے اعلیٰ حیثیت کا غرّہ رکھنے والے بہت سے ان ترکوں کی چولیں ہلا کر رکھ دیں جو اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو، چاہے وہ ہندوستانی نژاد ہوں یا غیر ہندوستانی۔ نیچی ذات کا اور اپنے سے کمتر مٹی کا بنا ہوا سمجھتے تھے۔

ہندوستانیوں کے لیے شاہی خاندان کی تبدیلی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ متواتر اور غیر متوقع شاہی خاندانی انقلاب نے کسی خاص گھرانے یا خاندان سے ان خیر سگالی جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ ان کی وفاداری کسی خاندان سے بڑھ جاتی تھی تو وہ حالات کے دباؤ کے تحت اسے دوسرے خاندان سے وابستہ کر لینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے عام طور پر عوام کے لیے ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں اقتدار کی منتقلی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

جلال الدین کو تخت شاہی نہ تو ورثہ میں ملا تھا، نہ انتخاب کی بنیاد پر اور نہ کسی سازش کے نتیجہ میں۔ ایک شخصی انقلاب (coup De Main) کے نتیجہ میں تخت سلطنت البری ترکوں

(۵۲) فرشتہ اس صورتِ حال کی بہتر وضاحت پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"بادشاہی از ترکان کہ غلامان سلاطین غور بودند بسلسلۂ خلجیان انتقال یافت"

(یعنی بادشاہت سلاطین غور کے غلام ترکوں سے نکل خلجیوں کے خاندان میں منتقل ہوگیا۔)

سے خلجیوں کی طرف منتقل ہوا تھا۔ اور انھوں نے محض طاقت وقوت کے بل پر اسے برقرار رکھا تھا۔ نہ تو عوام کی تائید کی ضرورت پیش آئی نہ امراء کی مدد اور تعاون کا مطالبہ کیا گیا، نہ ہی امراء اور علماء کی اعانت طلب کی گئی۔ خلجیوں نے ملک چاہے بنایا ہو یا بگاڑا ہو مگر انھوں نے مسلم دنیا کو یہ ضرور دکھا دیا کہ مملکت مذہبی تعاون و امداد کے بغیر نہ صرف وجود میں آسکتی ہے بلکہ موثر طور سے اس کا انتظام و انصرام چلایا بھی جا سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ صورت حال بے مثال تھی۔

ہندوستان کے مسلم دور کی تاریخ کے صفحات میں خلجی عہد کی (خصوصاً دورِ علائی کی) جو چیز غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے وہ بے نظیر فتوحات کا ایک متواتر سلسلہ ہے پہلی بار خلجیوں کی بدولت ملک کے دور دراز گوشوں میں مسلم فوجیں پہنچیں۔ انھوں نے بہت سے آزاد بادشاہوں اور حکمرانوں کو زیر کیا اور دوسری جانب غیر ملکی حملوں کے خلاف دفاع پر کڑی نظر رکھی۔ اگر علاء الدین نے بروقت اور سخت اقدامات نہ کیے ہوتے تو ہندوستان منگولوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوتا۔

علاء الدین کی بعض اصلاحات بھی عہد وسطیٰ میں انوکھے تجربات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ پوری طرح کامیاب رہیں۔ کیا ہوا اگر وہ دیر پا ثابت نہ ہوئیں۔ لیکن محض طاقت پر کامل بھروسا جس پر خلجی حکومت کا دار و مدار تھا۔ ان کی مملکت کے لیے گھن ثابت ہوا۔ اور ایک ہمعصر خدا رسیدہ بزرگ کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ "علاء الدین (عظیم ترین خلجی شہنشاہ) کی سلطنت کی بنا پائیدار بنیادوں پر نہیں تھی"۔

## باب 2

# جلال الدین فیروز شاہ خلجی

جلال الدین ۱۳ جون ۱۲۹۰ء (۲ جمادی الثانی ۶۸۹ھ)[1] کو تخت نشین ہوا۔ اور اس نے سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کا لقب اختیار کیا (۲) جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اس

(۱) امیر خسرو، مفتاح الفتوح، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۳۶ تاریخ مبارک شاہ انگریزی ترجمہ ص ۵۵ میں ربیع الآخر ۶۸۸ھ یا اپریل مئی ۱۲۸۹ء تاریخ ہے۔ برنی اور فرشتہ میں بالترتیب ۶۸۸ھ اور ۶۸۷ھ ہے۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۵۹ کے مطابق معز الدین کو ۶۸۹ھ میں قتل کیا گیا تھا یہی بدایونی رینکنگ جلد اول ص ۲۲۲ کا بھی بیان ہے۔ اس کے علاوہ شمس الدین کیکاؤس کے تمام معروف سکوں کی تاریخ ۶۸۹ھ ہے (نلسن سانت) جلال الدین کے قدیم ترین معروف سکے بھی ۶۸۹ھ کے ہیں (کیٹلاگ آف کوئنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد دوم نمبر ۱۷۵) اس طرح خسرو کی بیان کردہ تاریخ یقینی طور پر صحیح ہے جس کی تائید سکوں سے حاصل کردہ معلومات سے بھی ہوتی ہے۔ برنی اور فرشتہ سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔

دیکھئے تھامس کرونیکلس، ۱۴۱ حاشیہ، لکھنؤ میوزیم نیومیسمیٹک کیٹلاگ نمبر ۱۷۷۔

(۲) جلال الدین کے آباؤ اجداد کے بارے میں کوئی بھی ہمعصر مؤرخ روشنی نہیں ڈالتا ہے۔ حاجی الدبیر مانڈو کے خلجیوں کے بیان میں کہتا ہے کہ چنگیز خان کے ایک داماد افراسیاب کے تین بیٹے تھے۔ جن میں سے سب سے چھوٹا اولک خان تھا۔ تولک کے دو بیٹے تھے۔ ناصر الدین اور فیروز شاہ۔ موخر الذکر نے بلبن کی ملازمت اختیار کی اور کیقباد کے بیٹے سے تخت چھین لیا۔ ظفر الولہ ص ۱۹۷۔ لیکن یہ کہانی فرضی ہے۔

نے کیلوگھڑی کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ کیونکہ دہلی میں اس وجہ سے داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ اسے عام طور سے دہلی کے عوام کی اور خاص کر ترک امیروں کی دشمنی کا خوف تھا۔ معزالدین کے محل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا اور حسین نقاشی اور کتبات سے اس کی تزئین کی گئی۔ عمارت کی خوبصورتی میں چار چاند لگانے کے لیے جمنا کے کناروں پر ایک بے مثال باغ لگوایا گیا۔ سلطان نے شہر کے سربرآوردہ لوگوں کو وہاں کشادہ اور وسیع محلات تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ بازار بنائے گئے اور وہ مقام ایک "شہر نو" کی طرح نظر آنے لگا۔ (۳)

ایک شاندار دربار عام کا انعقاد ہوا۔ شاہی خاندان کے افراد اور زمانۂ انقلاب کے جاں نثاروں پر شاہی انعام و اکرام کی بارش کی گئی۔ سلطان کے فرزند اکبر اختیار الدین (۴) کو خان خاناں کا خطاب ملا اور دہلی کے اردگرد کے علاقے اُسے بطور اقطاع عطا ہوئے (۵) دوسرے بیٹے حسام الدین (۶) کو ارکلی خان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور فرزند اصغر کو قدر خان کے خطاب سے۔ سلطان کے عم ملک حسین کو تاج الملک کا خطاب ملا۔ اس کے دو بھتیجوں علاء الدین اور معزالدین کو (جو الماس بیگ کے نام سے زیادہ معروف ہے) بالترتیب امیر توزک اور آخور بیگ کے عہدے عطا ہوئے۔ ملک خاموش (۷) کو یغرش خان خطاب اور عارض ممالک (وزیر جنگ (۸)) کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ وزارت خواجہ خطیر کو تفویض کی

---

ہیل اور نیشنل بایوگرافکل ڈکشنری ۳۴۷ میں کہتا ہے کہ قائم خان جلال الدین کا باپ تھا۔ جلال الدین کے باپ کا صحیح نام معلوم کرنا مشکل ہے تاہم متعدد مورخوں کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے، کہ جلال کے باپ کا لقب یغرش خاں تھا۔ تاریخ مبارک شاہی صفحہ ۱۵ / بدایونی، رینکنگ جلد اوّل صفحہ ۲۲۶ اور صفحہ ۲۳۰، س صفحہ ۱۴۲ - ظفر الوالہ صفحہ ۵۵۔

(۳) برنی صفحہ ۱۷۵ کہتا ہے کہ کیلوگھڑی کو شہر نو کا نام دیا گیا لیکن اس کا بیان غلط ہے وہ پہلے ہی سے شہر نو کے نام سے معروف تھا اور منہاج سراج اس کو اسی نام سے پکارتا ہے۔ طبقات ناصری ۲۱۸ - ۲۱۷

(۴) تاریخ مبارک شاہی ۵۷ اور فرشتہ ۵۸ یہی نام ذکر کرتے ہیں۔

(۵) تاریخ مبارک شاہی صفحہ ۵۶۔

(۶) تاریخ مبارک شاہی ۵۶ میں یہی نام مذکور ہے۔

(۷) عصامی اور یحییٰ اس کا نام بالترتیب خامش اور خموش بتاتے ہیں۔ جلال الدین کے دو بھائی تھے شہاب اور خاموش۔ فتوح ۲۲۰

(۸) ظفر الوالہ ۵۵

گئی ۔ وہ بلبن اور کیقباد کے دورِ حکومت میں بھی اس عہدے پر فائز رہے ۔ مشہور و معروف امیر الامرا بھی کوتوال دہلی کی حیثیت سے اپنے عہدے پر بحال رہا۔ دوسرے امرا، جو اعزاز و اکرام سے نوازے گئے یہ تھے ملک احمد چپ کو نائب باربک بنایا گیا ۔ ملک خرم وکیل در مقرر ہوا اور ملک ناصر الدین کہرامی حاجب خاص کا عہدہ تفویض ہوا ۔ ملک فخر الدین کو داد بیگ یا منصف بنایا گیا ۔ ملک ہرن مار کو امیر شکار اور ملک ناصر الدین رانا کو شحنۂ پیل بنایا گیا ۔ جلال الدین کے ایک اور بھتیجے ملک اعز الدین کو آخور بیگ میمنہ کا عہدہ ملا ۔ بعض دوسرے اہم لوگ مثلاً تاج الدین کوچی ملک کمال الدین ابو المعالی اور ملک نصرت صباح کو بھی اعلیٰ مناصب عطا کیے گئے ۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا خلجی حکومت کی طاقت مستحکم ہوتی گئی ۔ جلال الدین کی شفقت اور مہربانی نے لوگوں کا اعتماد حاصل کیا ۔ دہلی سے آنے والے کیلوگھڑی کی شان و شوکت اور تزک و احتشام دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوئے ۔ رفتہ رفتہ دہلی کے باشندوں نے خوشی یا ناخوشی نئے بادشاہ کی اطاعت اختیار کر لی اور چھوٹے بڑے تمام لوگ کیلوگھڑی سے باہر آئے اور فیروز شاہ کی خدمت میں آداب بجا لائے ۔

## جلال الدین کی سیرت:

نئے بادشاہ کی سیرت ایک واقعہ میں صاف طور پر جھلکتی ہے جو اس کے دورِ حکومت کے آغاز ہی میں پیش آیا ۔ برنی لکھتا ہے کہ تخت شاہی پر پوری طرح متمکن ہونے کے بعد ایک دن جلال سوار ہو کر دہلی گیا اور بلبن کے کوشک لال کی زیارت کی پرانی گزری ہوئی یادوں نے کہ وہ کس طرح تخت کے سامنے کھڑا ہوا کرتا تھا اس کی آنکھیں اشکبار کر دیں ۔ وہ محل کے صدر دروازے پر اپنے گھوڑے سے اترا اور اظہارِ وفاداری میں سر خم کر دیا ۔ ملک احمد چپ نے اسے یاد دلایا کہ اب محل اس کی ملکیت ہے اور اسے ایسا رویّہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تو جلال الدین کے آنسو بہہ نکلے اور اس نے سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ "تم جانتے ہو کہ میرے آبا و اجداد میں کوئی کبھی بادشاہ نہیں ہوا کہ غرور اور رعب و داب مجھے وراثت میں ملتا ۔ سلطان بلبن یہاں تخت نشین ہوا کرتا تھا اور میں اس کی خدمت بجا لاتا تھا ۔ اس بادشاہ کا رعب و داب اور دبدبہ ابھی تک میرے دل سے نہیں گیا ہے ۔ بلبن نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں یہ محل تعمیر کرایا تھا اس لیے یہ اس کی اور اس کے بیٹوں اور عزیزوں کی جائیداد ہے

......."(۹) بوڑھے بادشاہ کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکی کہ وہ تخت شاہی پر متمکن ہو اور اس کے رفیق جو اسی کی طرح بلبن کے خدمت گزار رہ چکے ہیں اس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں۔ چنانچہ وہ اپنے امیروں کے درمیان ہی ایک نشست پر بیٹھ گیا اور اپنی پگڑی آنکھوں پر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ (۱۰)

اس جذباتی منظر نے احمد چپ کے ہونٹوں پر مہر لگا دی تاہم اس نے جلال الدین کی فیاضی اور نرم دلی پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی اور اس کے ایسے بہت سے مخالفوں کی تائید و حمایت حاصل کرنے میں مدد دی لیکن فیروز کے اس عجیب و غریب رویّے میں سلطنت کے ایک ایسے شہنشاہ کی شخصیت نہیں جھلکتی جس نے سخت مزاحمت کے بعد اس سلطنت کو حال ہی میں حاصل کیا ہو۔ دوسرے مواقع پر بھی جن کا ذکر ابھی کیا جائے گا سلطان نے انتہائی غیر دانشمندانہ طرز اختیار کیا۔ اس کی عمر اور مزاج دونوں ہی اس قابل افسوس نرمی کے ذمہ دار تھے۔ یہ تھی کہ ان کو کسی دور دراز علاقہ میں جلا وطن کر دے۔ باغی امیروں کو سرزنش کرنے کا اس کے پاس واحد طریقہ صرف یہ تھا کہ وہ ان کی موجودگی میں آنسو بہائے اور تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ شراب نوشی کرے۔ بادشاہ میں کسی کینہ توزی کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ جب وہ صرف ایک خان تھا تو دو شخصوں یعنی سراج الدین مسادی اور مندا ہر دو راجپوتوں کے سردار نے اُسے ایذا پہنچائی تھی۔ ان لوگوں نے جب سُنا کہ وہ بادشاہ ہو گیا ہے تو وہ اپنی جانوں سے مایوس ہونے لگے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر دیا اس حال میں ان کے سر خم تھے اور ان کے چہرے پشیمانی کے آئینہ دار تھے۔ تمام حاضرین کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب سلطان نے نہ صرف ان ناشائستہ حرکات کو معاف کر دیا بلکہ ان کو انعام و اکرام سے بھی نوازا۔

---

(۹) برنی ص۱۷۸ احمد چپ اور جلال کے درمیان گفتگو اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ جہاں یہ نکتہ اٹھتا ہے کہ سلطان کا تعمیر کردہ کوئی محل اس کی ذاتی جائداد ہوتی ہے یا ریاست کی ملکیت۔ قرون وسطیٰ میں دراصل سلطان کی نجی جائداد اور شاہی خزانے میں کوئی امتیاز نہیں روا رکھا جاتا تھا۔ پورا ملک اس کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ یہاں جلال اس نکتہ پر زور دیتا ہے کہ محل بلبن نے اس وقت تعمیر کرایا تھا جبکہ وہ (جلال) ایک امیر تھا بادشاہ نہیں، لہٰذا وہ اس کی نجی جائداد کے زمرے میں آتا ہے۔ بادشاہ کا اعتراض درست تھا۔

(۱۰) برنی ص۱۷۹

بعض اوقات سلطان بچوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ ایک بار اس کی خواہش ہوئی کہ وہ المجاہد فی سبیل اللہ (راہِ الٰہی کا مجاہد) کا خطاب اپنے نام کے ساتھ اضافہ کرے۔ دوسرا کوئی سلطان کسی ہنگامہ آرائی کیے بغیر ایسا کر گزرتا۔ لیکن جلال الدین نے اپنی محبوب ملکۂ جہاں سے کہا کہ وہ امراء کو ہدایت کرے کہ وہ دربارِ عام میں سلطان سے اس کی درخواست کریں۔ لیکن جب امیروں نے حقیقت میں اس کی درخواست کی تو فیروز نے فوراً اس کا اعتراف کر لیا کہ وہ خود ہی اس درخواست کا ذمہ دار ہے اور خطاب اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسا بے تدبیر حکمران سچ مچ دہلی کے تخت کے لیے ناموزوں تھا۔ جلال الدین جس طرح اپنے بھتیجے کی دغا کا شکار ہوا وہ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے المناک ترین واقعات میں سے ہے۔ تاہم خلجی خاندان کے بانی سے زیادہ کوئی اور شخص تاجِ شاہی پہننے کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس کے خیال میں بادشاہت فریب تھی۔ اور اس کا تزک و احتشام چند روزہ شان و شوکت۔ سچ یہ ہے کہ وہ اپنے ان دشمنوں کو اتنی لعنت ملامت نہیں کرتا تھا جو اس کے خلاف سازشیں کرتے تھے سوائے اس کے کہ وہ لوگ اسے تخت کی حفاظت کی خاطر اقدام کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ (۱۲) اسے شہرت اور ناموری کی کوئی تمنا نہ تھی وہ بادشاہ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے بجائے امیر کے منصب پر قناعت کرتا کیونکہ اس میں تمام پریشانیوں سے اس کا دامن بچا رہتا۔

اگرچہ فیروز ایک ناکام بادشاہ تھا تاہم وہ بہت شریف النفس تھا۔ اور اپنے وقت کے انتہائی پاکباز مسلمانوں میں سے ایک تھا۔ قسمت اور صلاحیت دونوں نے اسے جاہ و عزت کی بلند ترین چوٹی تک پہنچا دیا تھا لیکن اس میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ خدا ترس، شفیق، اپنے خاندان والوں سے محبت کرنے والا اور سب پر مہربان تھا اور اپنے امیروں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتا، بادشاہ جیسا نہیں۔ جلال الدین کی بادشاہت کی مدت مختصر تھی تاہم وہ اپنی رعایا پر اس طرح حکومت کرتا تھا جیسے ایک باپ اپنے خاندان میں اس نے واضح کر دیا کہ وہ ظلم نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کی ساری نرمی اور سادگی کا دنیادار لوگ مذاق اڑاتے تھے تاہم اس کی عمر اور اس کی فیاضی کا سبھی احترام کرتے تھے۔

سرکش عناصر نے اس کی نرمی سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں لگائی۔ پایۂ تخت کے

---

(۱۱) برنی ۱۷۹۔

(۱۲) ایضاً ۱۷۹

اندر اور باہر تاج شاہی کے خلاف سازشیں ہونے لگیں ۔ جلال الدین کی تخت نشینی کے صرف چند ہی ماہ بعد ملک چھجو نے کھلے عام علم بغاوت بلند کر دیا ۔

## ملک چھجو کی بغاوت :

اگست، ستمبر ۱۲۹۰ء (شعبان ۶۸۹ھ) (۱۳) کا زمانہ تھا جب گورنر کڑہ ملک چھجو کشلی خان نے بغاوت کا علم بلند کر دیا ۔ جلال الدین کے اقدام کے فقدان نیز اس تعاون کی بنا پر جس کا اس سے وعدہ کیا گیا تھا ملک چھجو کو اس بات کا حوصلہ بخشا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے تخت کو چھین لینے کی کوشش کرے ۔ کڑہ کے اطراف کے راوت اور پائک خاصی تعداد میں اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ۔ امیر علی سرجاندار کو گورنر اودھ (ایودھیا) نے اس کو بلا جھجک بھرپور تعاون دیا حتی کہ بعض جلالی امیروں مثلاً تاج الدین کوچی ، ملک محمد قتلغ خان اور ملک نصرت صباح کی ہمدردیاں بھی اس کے ساتھ تھیں ۔ دہلی کے امرا اور عوام کا بھی ایک طبقہ اس کو مرحوم غیاث الدین سے قرابت کی بنا پر خود مختاری کا اعلان کر دیا ، سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا ۔ اس نے ایک بڑا لشکر اکٹھا کیا اور دہلی کی طرف پیشقدمی کی ۔

جلال الدین کی رحمدلی اور اس کی لاپرواہی نے یہ صورت حال پیدا کی تھی ۔ لیکن ایسی خطرناک بغاوت نے اس کی قوت عمل کو مہمیز کیا ۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے خان خانان کو کیلوکھڑی میں نائب سلطان مقرر کیا اور خود بغاوت کا سر کچلنے کے لیے روانہ ہوا ۔ جمنا عبور کرنے کے بعد اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا ۔ فوج کا ایک حصہ ارکلی خان کی زیر قیادت بطور مقدمۃ لشکر بھیجا ۔ (۱۴) اور دوسرا حصہ خود اپنے زیر کمان اپنے لڑکے سے دس یا بارہ کوس کے فاصلے پر رہا ۔ (۱۵)

ارکلی خان کوچ پر کوچ کرتا ہوا دریائے کلانی بگر موجودہ کالی ندی تک جا

---

(۱۳) تاریخ مبارک شاہی ۔ ۶۳

(۱۴) حاجی الدبیر کے بیان کے مطابق ارکلی کو بارہ ہزار سپاہ کی کمان سونپی گئی تھی ۔ ظفر الوالہ ۵۵ ،

(۱۵) فرشتہ ۹۰

پہونچا (۱۶) دشمن نے دوسرے کنارے پر پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور دریا کی موجودہ کشتیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ چھجو کی اس احتیاطی تدبیر کے باوجود ارگلی خان نے کالی ندی کو عبور کرنے میں کامیابی حاصل کی جو اس وقت طغیانی پر تھی اور دشمن پر جا پڑا۔ "چاول کھانے والے" ہندستانی پیادہ سپاہی جو دشمن کے مقدمہ لشکر میں اچنبھے میں پڑ گئے۔ ان کو پوری طرح سے شکست فاش ہوئی۔ ملک چھجو نے "چھپالا" کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ شاہی افواج نے اس کے لشکر گاہ کو پورے دو دن تک لوٹا اور پھر اس کے تعاقب میں روانہ ہوئیں۔ جلد ہی اس کو جا لیا اور لڑنے پر مجبور کر دیا۔ جنگ کے دوران فوج کا قلب ارگلی خان کے زیر قیادت تھا اور اس کی مدد اس کے دو عم زاد بھائی علاء الدین اور قتلغ تگین (۱۸) کر رہے تھے۔ قتلغ تگین "تیر سے نیزہ پھاڑ سکتا تھا"۔ میمنہ اور میسرہ بالترتیب میر مبارک اور میر محمد کے زیر کمان تھے (۱۹) ملک چھجو نے بھی اپنی منتشر افواج اکٹھا کیں اور جان پر کھیل جانے والی جنگ لڑی۔ یہ جنگ دن بھر جاری رہی اور تلوار برابر چلتی رہی"۔

اسی رات کول (علی گڑھ) کے راجہ بیرام دیو کوٹلا نے ملک چھجو کو خبر دی کہ سلطان کی فوج جلد ہی شہزادہ کی فوج سے آملنے والی ہے۔ یہ سن کر چھجو کا دل ڈوب گیا۔ اس نے راہ فرار اختیار کی۔ اپنی روانگی کو نقاروں کی گونج میں چھپایا گویا کہ وہ دوسری صبح از سر نو جنگ کرنے

(۱۶) برنی اس کو آب کلاب نگر کہتا ہے۔ امیر خسرو یحییٰ اور بدایونی اس کو ذہاب کہتے ہیں۔ موجودہ کالی ندی یا نہر ہے جو قنوج کے قریب گنگا سے جا ملتی ہے۔ ملک چھجو کی یہ غیر دانشمندی ہوتی اگر وہ کڑہ سے گنگا کے شمال میں پیشقدمی کرتا اور دہلی پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے فاصلے سے گنگا جمنا دونوں کو پار کرتا۔ یقینی طور پر اس نے دونوں دریاؤں کے درمیان کسی راستہ پر پیشقدمی کی ہوگی چنانچہ وہ دریا جس کے کنارے جنگیں لڑی گئیں رام گنگا نہیں ہو سکتا جیسا کہ بعض مصنفوں کا خیال ہے۔ حاجی اس کو "کلانت کر" کہتا ہے۔ کلانکا کے معنی ہیں پہاڑ کی چوٹی پر واقع ایک قلعہ۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ص ۱۳۸ (حاشیہ) کلاب نگر کے معنی ایک قدرتی قلعہ کے ہیں۔

(۱۷) امیر خسرو جالب کہتے ہیں۔ مفتاح الفتوح ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۳۵۔ وہ دہلی صوبہ میں اور ڈاؤسن بدایوں سرکار کا ایک محال تھا۔ دیکھو آئین اکبری ترجمہ جلد سوم ص ۲۹۰ ایلیٹ اور ڈاؤسن ص ۵۰۔

(۱۸) وہ الماس بیگ سے چھوٹا تھا۔ فتوح ص ۲۱۲

(۱۹) مفتاح الفتوح ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۳۶

کی تیاری کر رہا ہے۔ اس کی افواج نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال کر امان چاہی۔

ارگلی خان کول کے راجہ کے طرزِ عمل پر سخت غضبناک ہوا۔ اسی کی بدولت دشمن دوسری بار صحیح سالم صاف بچ نکلا تھا۔ اس نے کالی ندی پار کی، کول پر حملہ کیا اور بیرم دیو کو قتل کر دیا اور ایک بار پھر چھجو کے تعاقب میں چل پڑا۔ (۲۰) آخرکار دشمن ایک ایسے قلعے سے گرفتار کیا گیا جہاں وہ پناہ گزیں تھا — ارگلی خاں فتح کی سرخروئی حاصل کر کے باپ سے ملنے کے لیے بدایوں واپس روانہ ہو گیا۔

ارگلی خان کی کمان میں مقدمۃ الشکر بھیجنے کے بعد سلطان جلال الدین کچھ عرصے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پھر وہ بھوج پور ضلع فرخ آباد کی جانب مڑ گیا اور رکٹھیا (موجودہ روہیل کھنڈ) کے کچھ ہندوؤں کو سخت سزا دی اس کے بعد وہ بدایوں کی طرف روانہ ہوا جہاں کچھ مدت بعد ارگلی خان باغی قیدی چھجو سمیت پہنچا۔ سلطان اپنے بیٹے کے شاندار کارنامہ سے بہت خوش ہوا۔ ان کو ملتان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس نے باغیوں کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک دربار منعقد کیا لیکن ملک چھجو اور دوسرے بڑے امیروں جیسے امیر علی سرجاندار، ملک الغی ولد ملک ترغی اور ملک تاجو رد کو اپنے سامنے پابہ زنجیر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ باغیوں کی بیڑیاں کھول دی جائیں، ان کو نہلایا جائے اور صاف ستھرے کپڑے پہنائے جائیں — احسان ناشناس باغیوں کے سر یہ سوچ کر شرم سے جھک گئے کہ انھوں نے ایک ایسے اچھے بادشاہ کے ساتھ کیوں غداری کی۔ تمام درباری اچنبھے میں پڑ گئے۔ جلال الدین نے باغیوں کو تسلی اور تشفی دی اور خوش کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ان کا طرزِ عمل بالکل مناسب تھا کیونکہ انھوں نے خاندان کے ایک شہزادہ کی حمایت کی تھی ماضی میں وہ جس کے ملازم رہے تھے۔ (۲۱) ان کے ساتھ ساتھ اس نے مہربانی و شفقت کا سلوک کیا اور شراب کے جام پیش کیے گویا کہ وہ اس کے مہمان ہوں۔ احمد چپ بادشاہ کو یہ یاد دلانے سے باز نہیں رہ سکا کہ باغیوں کے ساتھ اتنی فیاضی کا سلوک اچھی حکومت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس قسم کا برتاؤ دوسرے بہت سے لوگوں میں بھی تخت حاصل کرنے اور نئے

---

(۲۰) بدایونی تاریخ مبارک شاہی کے حوالے سے لکھتا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی ۶۳-۶۳

(۲۱) برنی ۱۸۴-۱۸۳

(۲۲) ایضاً ۱۸۴

فتنے پیدا کرنے کا رجحان پیدا کر دے گا (۲۱) اتنی سخت تنبیہ کے جواب میں سلطان کا جواب مختصر اور سادہ تھا۔ "احمد۔ میں بھی جانتا ہوں کہ (ماضی میں) بادشاہوں نے باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ لیکن میں ایک بوڑھا مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے خون بہانے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ میں اب ستر سے اوپر ہو چکا ہوں اور میں نے ایک بھی موحّد (خدا کی وحدانیت کا قائل) کو قتل نہیں کیا ہے۔ (۲۲)

مختصر یہ ہے کہ باغی بلا کسی سرزنش کے صاف بچ گیا۔ ملک چھجو کو ملتان بھیج دیا گیا۔ وہاں اس کو تمام سہولتیں مہیا کی گئیں۔ البتہ اس کو ہر وقت ارکلی خاں کی باخبر نگرانی میں رہنا تھا۔ کڑہ کا اس کا عہدہ علاء الدین کو سونپ دیا گیا۔ سلطان ۲ فروری ۱۲۹۱ء (محرم ۶۹۰ھ کے آخری دن) کو کیلو گھڑی واپس آ گیا۔ (۲۴)

پایۂ تخت میں جلال الدین مملکت کے انتظامی معاملات میں منہمک ہو گیا۔ اس کو تکلیف پہنچانے سے اتنی نفرت تھی کہ کئی بار چور اور ٹھگ پکڑے گئے اور اس کے سامنے لائے گئے لیکن اس نے ان سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ آئندہ چوری کا ارتکاب نہیں کریں گے آزاد کر دیا۔ ایک ایسے ہی موقع پر ایک ہزار سے زیادہ ٹھگ پکڑے گئے تھے (۲۵)۔ لیکن ان کو سخت سزا دینے کے لیے سلطان نے حکم دیا کہ ان کو کشتیوں میں لکھنوتی لے جا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ دہلی کے اطراف و جوانب میں خوف و ہراس نہ پھیلا سکیں۔ (۲۶)

چھجو کے ہمنواؤں اور ٹھگوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس سے حوصلہ پا کر کچھ زندہ دل امیروں نے شراب نوشی کی مجلسوں میں غیر ذمہ دارانہ گفتگو کرنی شروع کر دی۔ سلطان کو

---

(۲۲) برنی ۱۸۴

(۲۳) 〃 ۱۸۵

(۲۴) مفتاح الفتوح، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ۵۴۰

(۲۵) برنی لکھتا ہے ہزار وا ند ٹھگ (ہزار ٹھگ سے کچھ زیادہ (طبقات اکبری میں ایک ہزار ہے اور وہ قطاع الطریق (ڈاکو) لکھتا ہے۔ چنانچہ ہودی والا ۲۶۲ کا خیال ہے کہ "غالباً مسلم تاریخی ادب میں ٹھگوں کا یہ پہلا حوالہ ملتا ہے جو ایک متعین معنی رکھتا ہے اور جس میں اب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔" لیکن یہاں یہ لفظ فریبی یا دھوکہ دینے والے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ڈاکوؤں کے ایک مخصوص طبقہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

(۲۶) برنی ۹۰-۱۸۹

ان معاملات کی سن گن بھی مل چکی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ ان لوگوں کی بات پر دھیان نہیں دینا چاہیے جو نشہ میں ایسی گفتگو کرتے ہیں۔ انھیں چہلگانی (التمش کے چالیس امیر) میں سے ایک اور بااثر امیر ملک تاج الدین کوچی نے مے نوشی کی ایک محفل آراستہ کی۔ جب دور شراب چلا تو کسی نے خیال ظاہر کیا کہ صرف احمد چپ کے سوا تمام خلجی بالکل ناکارہ ہیں۔ کم از کم جلال الدین تو حکومت کرنے کے بالکل لائق نہیں ہے۔ تاج شاہی تو ملک تاج الدین کوچی کے سر پر زیب دیگا۔ ان سب نے اپنے میزبان کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ ایک نے وعدہ کیا کہ وہ شکاری چاقو سے سلطان کو قتل کر دے گا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ تلوار سے اس کا کام تمام کر دے گا۔ جب جاسوسوں نے اس محفل کی خبر سلطان کے کانوں تک پہنچائی تو اس نے ان کو بلایا اور سخت سرزنش کی۔ اس نے اپنی تلوار نیام سے باہر کھینچ کر ان کے سامنے پھینک دی اور کہا کہ "اگر تم میں سے کوئی مرد ہے تو وہ تلوار اٹھالے اور میرے مقابلے پر آئے۔" چرب زبان نصرت صباح سرود اتمار جس نے مجلس میں خود بھی ناعاقبت اندیشانہ گفتگو کی تھی، موقع کے تناؤ کو کم کیا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ وہ ایک ایسے بادشاہ کے خلاف سازش کرنے کو سوچ بھی نہیں سکتے جو اتنا باوقار، فیاض اور حلیم ہے اور جو ان کے ساتھ اپنی اولاد جیسا سلوک کرتا ہے۔ اور نہ سلطان ہی ان کی تباہی و بربادی کا خیال کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ان جیسے وفادار اور جان نثار ملک اور ملک زادے نہیں پا سکتا۔ بادشاہ خاموش ہوگیا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے بعض کو صرف معمولی سزائیں دے کر سب کو معاف کر دیا۔ (۲۷)

## سیدی مولا کی سازش :

نشہ کے عالم میں یہ بے سر و پا گفتگو صرف مرض کی علامت تھی۔ اصل مرض کا اظہار سیدی مولا کی سرپرستی میں ہونے والی بعض امیروں کی منظم سازش کی شکل میں ظاہر ہوا۔ (۲۸) سیدی کا اصل وطن ایران تھا۔ وہ اجودھن میں شیخ فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر

---

(۲۷) برنی ۱۹۰۔

(۲۸) ملک چھجو کی بغاوت کی سرکوبی کرنے کے بعد جلال الدین ۲ر فروری ۱۲۹۱ء کو واپس ہوا اور ۲۲ر مارچ کو رنتھنبور کے لیے روانہ ہوگیا۔ تقریباً تمام مؤرخین کے مطابق سیدی مولا والا واقعہ انھیں دونوں مہموں کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔

ہوئے[۲۹] فرشتہ کے مطابق سیدی ایک درویش تھے اور بلبن کے دورِ حکومت کے آغاز میں دہلی آئے تھے۔ وہ نماز تو پڑھتے تھے لیکن جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے اور جامع مسجد میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی خوراک بہت معمولی تھی وہ خواہشات نفسانی سے اجتناب کرتے تھے۔ (۳۰) وہ تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ انھوں نے کوئی خادم یا غلام نہیں رکھا۔ وہ لوگوں سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے تاہم اتنے افراط سے خرچ کرتے تھے کہ لوگ شبہ کرتے تھے کہ ان کو کیمیا اور سیمیا کا علم آتا ہے۔ انھوں نے اجودرروازے کے پاس ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرائی تھی۔ (۳۱) جہاں ہر طبقہ کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ جو کچھ خریدتے تھے اس کی قیمت بڑے عجیب و غریب طریقے سے ادا کرتے تھے۔ وہ اس شخص کو بتاتے تھے کہ وہ فلاں فلاں اینٹ یا موکھے سے اتنی رقم نکال لے۔ وہاں سے جو تنکے ملتے تھے وہ اتنے چمکدار ہوتے تھے گویا اسی وقت ٹکسال سے لائے گئے ہوں۔ (۳۲) ان کے دسترخوان پر روزانہ اتنے لوگ کھانا کھاتے تھے کہ اگر برنی کے بیان پر یقین کیا جائے تو دو ہزار من میدہ، پانچسو من گوشت اتنا ہی گھی اور دو یا تین سو من شکر اور سو یا دو سو من سبزیاں روزانہ ان کے باورچی خانے میں صرف ہو جاتی تھیں۔ خانقاہ میں اتنی رقم خرچ کی جاتی تھی اور اتنی اقسام کے کھانے پیش کیے جاتے تھے کہ بڑے بڑے امیر کو اتنا مقدور نہیں (۳۳) ایک دن بھیس بدل کر جلال الدین نے سیدی کی خانقاہ کی زیارت کی اور خود اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ خرچ کرتے تھے جتنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ (۳۴)

سیدی کی حرکات و سکنات سے بے شبہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں درویش نہیں ان کو ناموری، شہرت اور عزت کی تمنا تھی۔ وہ امرا اور دیگر مالک سے آزادانہ ربط و ضبط رکھتے تھے اور سیاسیات سے دلچسپی لیتے تھے۔ جب وہ دہلی کے لیے اجودھن سے روانہ ہو رہے

---

(۲۹) بدایونی رینکنگ جلد اول۔

(۳۰) فرشتہ صـ۹۳

(۳۱) ظفرالوالہ صـ۷۶۳، حاجی الدبیر صام خان کی تاریخ طبقات بہادر شاہی کی سند پر لکھا ہے۔

(۳۲) برنی، ۲۰۹

(۳۳) 〃 ۲۰۹

(۳۴) بدایونی ریکنگ جلد اول ۲۳۴، فرشتہ ۹۳

تھے تو شیخ فرید نے جن کو سیدی کی فطرت سے خوب واقفیت تھی ان کو تنبیہ کی کہ وہ ناموری اور شہرت کی جستجو میں نہ رہیں اور امرا کے ساتھ بہت زیادہ ربط وضبط نہ رکھیں۔ بلبن کے سخت عہد حکومت میں ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اتنی فیاضی اور افراط سے خرچ کرتے اور معتمد اشخاص کو پانچ ہزار یا دس ہزار تنکہ کھلم کھلا دے سکتے۔ مگر دراور عیاش معزالدین کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ سیدی مولا بے دھڑک خرچ کرنے اور اپنی خانقاہ کی جانب لوگوں کو متوجہ کرنے لگے۔ جلال الدین کے عہد حکومت میں ان رہنماؤں میں لوگوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھنے لگی اور بڑے اور چھوٹے، امراء اور عوام ان سے اظہار عقیدت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ سلطان کا فرزند اکبر خان خاناں ان کا پکا مرید ہو گیا۔

سیدی مولا کی خانقاہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے پیچھے یہ محرک کارفرما تھا کہ جلال الدین چونکہ ستر سے اوپر ہو چکا ہے اور کسی ہفتہ راہ قدم کا سفر کر سکتا ہے۔ اس لیے اس کے دو بڑے بیٹوں کی نظریں تخت پر مرکوز تھیں اور وہ سلطان کی زندگی ہی میں اپنی اپنی طاقت کو مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ بظاہر پایۂ تخت میں دو جماعتیں ہو گئی تھیں ایک خان خاناں کی زیر قیادت جس نے سیدی مولا کے ساتھ رسم و راہ بڑھائی تھی۔ دوسری ارکلی کے زیر قیادت جو فطری طور پر اس درویش کا دشمن ہو گیا تھا[35] ـــــ خان خاناں اس طرح کھلم کھلا سیدی مولا کے دامن سے وابستہ ہو گیا تھا کہ ارکلی خان اس پر اس کے بیٹے کی پھبتی کستا تھا[36] ـــــ یہ شبہ کرنے کی قوی گنجائش ہے کہ سیدی مولا کے نظام خانقاہی کے سرمایہ کی فراہمی خان خاناں ہی کی مرہون منت تھی۔ وہ ترک امرا بھی جو خلجیوں سے اپنی دشمنی بھولے ہوئے نہیں تھے۔ سیدی مولا کی خانقاہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جلال الدین کی نرم روی نے ان لوگوں کی خفیہ سرگرمیوں کی بالواسطہ طور پر حوصلہ افزائی کی۔ ایک بااثر عیار افسر قاضی جلال الدین کاشانی سیدی مولا کی درگاہ سے وابستہ ہو گئے اور سیدی مولا کے ساتھ دن رات بسر کرنے لگے۔ کوتوال برنجتن اور ہتھیا پایک جن میں ایک خاصا شہرت یافتہ پہلوان تھا اور اس وقت بڑے دن گزار رہا تھا یہ دونوں بھی سیدی کے رفیق بن گئے۔ بہت سے لوگ خصوصاً بلبنی امرا کی اولاد جو خلجیوں

---

(۳۵) فرشتہ، ۹۳

(۳۶) بدایونی ۱۰ - ۲۰۹

(۳۷) فرشتہ، ۹۳

کے عہد میں اپنے وثیقے اور جاگیر کھو چکی تھی، اکثر وبیشتر سیدی کی خانقاہ آنے لگی تھی اس طرح جلد ہی ان کے مرید ہزار تعداد کی تشویشناک حد تک جا پہنچے۔[۳۸]

جوں جوں وقت گزرتا گیا لوگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سیدی مولا کے محل میں قاضی جلال کاشانی، قاضی اردو (لشکر) اور دوسروں کی شبانہ محفلیں کسی نہ کسی دن یقینی طور سے فتنہ برپا کریں گی۔ کوتوال برنجتن اور ہتھیا پایک نے تو کھلم کھلا بغاوت کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ جلال الدین کا خاتمہ کر کے وہ سیدی کو خلیفہ بنائیں گے اور سلطان ناصر الدین کی بیٹی سے ان کی شادی کر دیں گے۔ قاضی جلال کاشانی کو قاضی خان کا خطاب اور ملتان کا اقطاع دیا جائے گا۔ جاگیریں اور عہدے بلبنی امرا کے بیٹوں کے درمیان تقسیم کیے جائینگے

جیسا کہ عام طور سے حاضرین میں سے ایک شخص سرکاری گواہ بن گیا اور سلطان کو صاف صاف وہ سب کچھ بتا دیا جو کہ سیدی کی قیامگاہ پر وقوع پذیر ہوا تھا۔ فوراً ہی تمام سازشیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو زدوکوب کیا گیا اور بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ وہ سلطان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔[۳۹] جلال الدین نے ان سے اعتراف کرنے پر جتنا زور دیا انھوں نے اتنی ہی اپنی معصومیت اور بے گناہی ظاہر کی۔ برنی کہتا ہے کہ ان دنوں یہ معمول نہیں تھا کہ تعذیب و تادیب سے اعتراف جرم کرایا جاتا تھا۔[۴۰] چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ ان کی صداقت کا امتحان آگ کی آزمائش سے لیا جائے۔ بہادر پور میں خوفناک آگ روشن کی گئی اور سلطان امرا اور ملزمین کے ساتھ وہاں پہنچا۔ شہر کے تمام علماء اور سربرآوردہ اشخاص جمع ہو گئے اور بہادر پور کے لوگوں نے بھیڑ میں مزید اضافہ کر دیا۔ سلطان نے حکم دیا کہ ملزموں کو آگ میں بٹھا دیا جائے اگر وہ سچے ہوئے تو بے داغ صاف بچ جائینگے لیکن علماء نے اختلاف کیا۔ فقہا و قانونی ماہرین نے دلیل دی کہ آگ کی آزمائش عقل کے منافی اور قانون کے خلاف ہے۔ آگ کی خاصیت جلانا ہے اور وہ مجرموں اور غیر مجرموں کے درمیان تمیز نہیں کرتی۔ مزید برآں سیدی اور ان کے ہمنواؤں کو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ ان کے خلاف ایک فرد واحد

---

(۳۸) فرشتہ ۹۳۔

(۳۹) بدایونی رینکنگ، جلد اول ۲۳۳۔

(۴۰) برنی ۲۱۱ غالباً یہاں مورخ علاء الدین کے زمانے سے موازنہ کرتا ہے جبکہ تعذیب و تادیب پر عام طور سے عمل کیا جاتا تھا۔

کے لگائے گئے الزامات کی تصدیق گواہوں کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی۔[41]

ملزموں کے اعتراف جرم سے مسلسل انکار نے سلطان کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ اب کوئی طریقہ نہیں تھا کہ ان کے جرم کو ثابت کیا جا سکتا لیکن تمام ظاہری علامات کے مطابق سازش کی گئی تھی اور جلال الدین نے خطا کاروں کو سزا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ان سازشیوں کو یکے بعد دیگرے سلطان کے حضور طلب کیا گیا۔ جن امرا کو اس سازش میں ملوث سمجھا گیا انہیں دور دراز کے علاقوں میں جلا وطن کر دیا گیا اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ قاضی جلال کاشانی کا تبادلہ بداؤں کر دیا گیا۔ برنجتن اور ہتھیا پایک کو جنھوں نے سلطان کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا سخت سزا دی گئی۔ اس کے بعد پابہ زنجیر اور بیڑیوں میں جکڑے سیدی مولی کو سلطان کے حضور پیش کیا گیا۔ ان کی محض موجودگی نے جلال الدین کو اتنا غضبناک کر دیا کہ اس نے سلسلۂ حیدری کے شیخ ابوبکر طوسی سے جو اس وقت اپنے مُریدوں کے ساتھ موجود تھے سیدی مولا سے اپنا انتقام لینے کے لیے کہا۔ شیخ کے ایک مرید بحری نے سیدی پر اُسترے سے حملہ کیا۔ (۴۲) اور ان کی کھوپڑی کاٹ دی۔ اسی دوران ارکلی خاں نے ایک مہاوت کو اشارہ کر دیا جس نے اس پر ہاتھی چڑھا کر اسے مار ڈالا یحییٰ کے بیان کے مطابق سیدی کی موت کے تین دن بعد دس گز لمبی اور تین گز چوڑی ایک خندق کھودی گئی جس میں آگ اس مقصد سے روشن کی گئی کہ مولی کے بقیہ پیروؤں کو اس میں پھینک دیا جائے۔ لیکن ارکلی خان نے ان کی سفارش کی اور وہ رہا کر دیے گئے۔[43] ارکلی کے جانی دشمن کو سزائے موت دی جا چکی تھی۔ اس کے بے ضرر پیروؤں کو مار کر کوئی خاص مقصد حل نہ ہوتا۔

سیدی مولی کی موت ضیاء الدین برنی جیسے قدامت پسند مولانا کی برداشت کے باہر تھی۔ اس نے شیخ کی کئی بار زیارت کی تھی اور ان کے محل میں کھانا کھانے کی سعادت بھی حاصل کی تھی[44] وہ اس کو ایک غیر منصفانہ قتل گردانتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ ناخوشگوار

---

(۴۱) برنی ص ۲۱۱

(۴۲) حیدری قلندروں کے سلسلے کی بنیاد شیخ نجم الدین طوسی نے ڈالی تھی۔ یہ قلندر اپنے مراد چہرے حتیٰ کہ بھنویں تک منڈوا دیتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ معمول تھا کہ وہ استرے ساتھ رکھتے تھے۔ نتیجتاً بحری ایک استرا نکال کر سیدی پر حملہ کر سکا۔

(۴۳) تاریخ مبارک شاہی ص ۶۷

واقعات وابستہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق شیخ کی موت کے دن کالی آندھی آسمان پر چھا گئی تھی اور اسی دن سے جلال حکومت کا استحکام جاتا رہا۔ اس کے فوراً بعد دہلی نے خشک سالی کی وجہ سے ایک خوفناک قحط دیکھا۔ غلّہ کی قیمت ایک سیر فی تنکہ تک چڑھ گئی اور لوگ روٹی کا مزہ تک بھول گئے (۴۵) شوالک کے کاشتکار (۴۶) جوق در جوق آنے لگے اور بیس بیس اور تیس تیس کے تعداد سے وہ جمنا میں پھاند پڑتے۔ سلطان اور اس کے امیروں نے صورت حال کو بہتر بنانے کی پوری کوشش کی لیکن کامیابی بہت کم ہوئی۔ (۴۷) دوسرے سال بارش اتنی شدید ہوئی کہ لوگوں کی یادداشت میں اس جیسی بارش کبھی نہیں دیکھی گئی۔ مسلسل دعاؤں کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ تقریباً دو سال کے بعد حالات معمول پر آسکے۔ (۴۸)

برنی کے بیان کے پیش نظر ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ سیدی کو غیر منصفانہ سزا دی گئی اور انھوں نے ایک شہید کی موت پائی۔ تاہم یہ امر کہ سلطان کے خلاف ایک سازش تیار کی گئی جس میں پوری طرح سیدی ملوث تھے۔ خود برنی کے بیان سے واضح طور پر ثابت ہے۔ ملک چھجو کی بغاوت، ملک تاج الدین کی دعوت مبارزت اور برسر عام گفتگو کہ جلال الدین تخت کے لیے ناموزوں ہے ان سب نے سلطان کے پیمانہ صبر کو چھلکا دیا تھا۔ غالباً ان سب کے فوراً بعد ہی وہ روح فرسا خون خشک کرنے والی سازش تیار کی گئی، جس میں جلال الدین کو قتل کرنا، سیدی کی ایک شاہی خاندان کی شہزادی سے شادی ہونی اور خلیفہ کا لقب اختیار کرنا طے ہوا تھا۔ دوسرا کوئی بادشاہ اس صورت حال کو ہرگز برداشت نہ کرتا جو سیدی کی قیامگاہ پر مہینوں پیش آتی رہی۔ سیاست دان درویش کو دوسرے بادشاہ کے ہاتھوں یہی سزا ملتی۔ سیدی کو قتل کر دینے میں جلال الدین قطعی حق بجانب تھا۔

## رنتھمبور کی مہم :

سیدی مولا والے واقعہ کے کچھ مدت بعد خان خاناں کی مشتبہ وقتی موت کا اعلان کیا گیا۔[۴۹]

---

(۴۵) فتوح السلاطین ۲۱۳

(۴۶) برنی سند دکھتا ہے ۔

(۴۷) فتوح، ۲۱۳

(۴۸) ایضاً، ۲۱۳

(۴۹) فرشتہ

ارگلی خان دلی عہد سلطنت بن گیا۔ وہ دہلی میں بحیثیت نائب الملک[50] مقیم رہا۔ جبکہ سلطان قلعۂ رنتھمبور پر حملہ کے لیے ایک لشکر جرار لے کر گیا۔ سلطان نے ۲۲ مارچ ۱۲۹۱ء (۱۰ ربیع الاول) (۵۱) بروز جمعرات سیری سے لوہراوٹ[51] کے لیے کوچ کی اور چنداول (۵۲) ریواڑی (۵۳) اور نرنول کے قصبہ جو کہ ریواڑی کے مغرب میں واقع ہے ہوتا ہوا راجپوتانہ کے ریگستانی خطہ میں داخل ہوا۔ وہاں شدید گرمی اور پانی کی کمیابی کی وجہ سے لوگوں کے منہ پیاس کی وجہ سے بند تھے اور فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سواونٹوں پر پانی لدا تھا۔

بوڑھے اور امن پسند بادشاہ نے آخر اتنی جان جوکھم والی مہم کا بیڑا ہی کیوں اٹھایا؟ محمد غوری کے ہاتھوں سے دہلی نکلنے کے بعد رنتھمبور چوہانوں کا سب سے مستحکم قلعہ بن گیا تھا۔ قطب الدین نے اس پر ۱۲۰۹ء میں حملہ کیا تھا۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ التمش اس پر ۱۲۲۶ء میں قبضہ کرنے میں کامیاب ضرور ہو گیا تھا لیکن غداری کی وجہ سے بہادری کے بل بوتے پر نہیں[55] رضیہ کے عہد حکومت میں راجپوت اس پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ ۱۲۴۹ء میں بلبن نے وہاں ایک بار پھر ترک حکومت قائم کرنے کی بے سود کوشش کی ۱۲۸۲ء میں رنتھمبور کی راج گدی پر رانا ہمیر بیٹھا جو ایک بڑا ممتاز اور عظیم جنگ جو تھا۔ اس نے گر یہہ منڈلا کے گوند راجہ کو شکست دی اور اس کو باج گزاری پر مجبور کر دیا۔ اس نے اجین کے راجہ بھوج دوم پر حملہ کیا اور اس کی راج دھانی پر قبضہ کر لیا۔ وطن واپس جاتے ہوئے اجمیر، پشکر، سانبھر اور

---

(۵۰) برنی، ۲۱۲

(۵۱) ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ۵۴۰ میں سوہرپٹ غلط درج ہے۔ اورینٹل کالج میگزین متن مفتاح الفتوح ص ۲۸ میں لوہراوٹ صحیح درج ہے۔ یہ گاؤں جو اس وقت سیری کے مغرب میں واقع تھا، اب مٹ چکا ہے۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں ناصر الدین خسرو نے غازی تغلق سے ۱۳۲۰ء میں تخت ہارا تھا۔

(۵۲) یہ امیر خسرو کی بیان کردہ تاریخ ہے۔ مفتاح الفتوح، اورینٹل کالج میگزین لاہور، متن نومبر ۱۹۳۶ء ص ۲۸۔ برنی میں ۶۸۹ھ غلط لکھا ہے۔

(۵۳) وہ دہلی کے جنوب مشرق میں دکن جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔

(۵۴) علائی عہد حکومت میں یہ ملک نائب کی جاگیر تھی۔

(۵۵) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ۵۳ اور ۵۱۵

کھنڈیلا سے اس کا گزر ہوا اور اس نے ان سب پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فوجی کارناموں سے جلال الدین خلجی کو اتنی تشویش ہوگئی تھی کہ اس نے فیصلہ کیا کہ رنتھمبور کے خلاف فوج کشی کرے اور ہمیر کی سرگرمیوں کو روک دے۔

پندرہ دن کے سفر کے بعد رنتھمبور کی حدود تک آپہونچا۔ اس نے رائے کے علاقہ کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کے لیے مخبروں کی پارٹی بھیجی اسی دوران اس کے سپاہی جھائن[۵۶]، کے نواح میں لوٹ مار میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے زہریلے تیر استعمال کیے اور بہت سوں کو مار ڈالا۔ یہ طے کیا گیا کہ پہلے جھائن کے شہر پر حملہ کیا جائے ایک ہزار سپاہ پر مشتمل ایک فوج بھیجی گئی جس کی قیادت ملک خرم، ملک قتلغ تعین (تگین) اعظم مبارک امیر تزول، احمد سر جاندار، محمود سر جاندار اور میر شکار احمد اور آباجی آخور بیگ جیسے امیروں کے ہاتھ میں تھی۔ جلد ہی جھائن میں سنسنی پھیل گئی۔ رائے نے ترکوں کی پیشقدمی روکنے کے لیے ایک ایک شخص گردان سینی کے ساتھ دس ہزار راوت فوج بھیجی۔ گردان سینی ایک عظیم جنرل تھا اور اس نے مالوہ اور گجرات کے علاقوں میں کئی مہموں کی قیادت کی تھی[۵۸]۔ لیکن ایک سخت معرکہ کے بعد وہ قتل کر دیا گیا۔ ہندو سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے[۵۹]۔ جھائن کے حکمراں نے رنتھمبور کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور جلال الدین جھائن میں داخل ہوا۔ اس نے راجہ کے محل کے حسین مجسموں اور پتھر اور لکڑی پر نقاشی اور خوبصورت مصوری کے شاہکاروں کو دل کھول کر سراہا۔ اس نے ان مندروں کو بھی دیکھا جن کو سونے اور چاندی کی کاریگری سے وسیع پیمانے پر آراستہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی جمالیاتی حس پر بت شکنی کا جوش غالب آگیا۔ اس نے ان کو ڈھا دینے کا حکم دیا اور اس طرح "جنت کو جہنم بنا دیا"۔ برہما کے کانسی کے دو بڑے مجسمے جن میں ہر ایک کا وزن "ایک ہزار من سے زیادہ تھا" چکنا چور

---

(۵۶) مفتاح الفتوح، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ۵۴۱، اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۳۶ء، ۲۹

(۵۷) "تیر زہر آلود" مفتاح الفتوح، اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۶ء، ۳۱

(۵۸) ایضاً ۳۲-۳۳

(۵۹) "لیکن شاہی افواج کا صرف ایک آدمی مارا گیا" ایضاً ۳۴ یہاں شاعر مؤرخ خسرو بظاہر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔

(۶۰) مفتاح الفتوح مذکورہ ۳۶-۳۵ نیز برنی ۲۱۳

کر دیئے گئے اور ان کے ٹکڑوں کو افسروں میں بانٹ دیا گیا، تاکہ دہلی کی جامع مسجد کے دروازوں پر ان کو پھینکا جا سکے (۶۱) محمود سرجاندار کے زیر کمان ایک فوجی دستہ مالوہ کو شکست دینے کے لیے بھیجا گیا۔ دریائے چمبل اور دریائے کواری (۶۲) پار کرکے شاہی فوج مالوہ میں داخل ہوئی۔ انھوں نے بہت سے مندر مسمار کر دیئے اور مال غنیمت کی بڑی مقدار لے کر واپس ہوئے (۶۳)

برنی بیان کرتا ہے کہ رنتھمبور کے راجہ نے اطراف و جوانب کے راجاؤں اور مقدموں کے ساتھ مل کر دفاع کو مستحکم کیا اور محاصرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔ جلال الدین نے مغربی، ثبات اور گرگچ (۶۴) جیسے فوجی آلات کی تیاری کا حکم دیا اور رنتھمبور کی طرف کوچ کیا تاکہ ذاتی طور پر قلعہ کا معائنہ کرے۔ لیکن وہ اسی دن جھائن لوٹ آیا اور افسروں کو واضح الفاظ میں بتایا کہ وہ اس پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔ (۶۵) اس نے صاف کہہ دیا، کہ پاشیب تیار کرنے اور گرگچ تعمیر کرنے ہی میں بڑی خاصی تعداد میں سپاہی مارے جا سکتے ہیں۔ وہ اتنی جانیں بلا وجہ ضائع کرنے پر تیار نہیں اور نہ اس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ فوت شدہ سپاہیوں کی بیواؤں اور یتیموں کا سامنا کر سکے۔ سلطان کی عجیب و غریب دلیل نے ملک احمد چپ کو جہانبانی کے اصولوں پر بے اثر تقریر کرنے کا موقع دیا۔ اس نے کہا کہ "جب بھی کسی فاتح نے کسی مہم کا بیڑا اٹھایا تو کوئی اندیشہ بھی اس کو اپنے مقصد کے حصول سے باز نہیں رکھ سکا۔ اگر جہاں پناہ قلعہ پر قبضہ کیے بغیر واپس ہو گئے تو اس جگہ کا راجہ مغرور ہو جائے گا اور جہاں پناہ کا شاہی وقار لوگوں کے دلوں میں گھٹ جائے گا۔ (۶۶) لیکن صلح جو سلطان واپس ہونے کا تہیہ کر چکا تھا اس بات پر فخر کرتے ہوئے کہ وہ ایک مسلمان کے

---

(۶۱) ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ۵۴۲، فتوح ۲۱۷ - ۲۱۶

(۶۲) مفتاح الفتوح: ۳۹ - ۳۸، برنی ۲۱۳

(۶۳) فرشتہ، ۹۴

(۶۴) ان جنگی آلات کے لیے دیکھو باب یازدہم (۱۱)

(۶۵) برنی ۲۱۳

(۶۶) برنی ۲۱۴ اور ۲۱۵

ایک بال سے زیادہ اس جیسے دس قلعے کی قیمت نہیں سمجھتا۔(۶۶) اس نے خیمے اکھڑوا دیے اور ۲ رجون ۱۲۹۱ء (۲ رجمادی الآخر ۶۹۰ھ) کو پایۂ تخت پہونچ گیا (۶۷) اس کی واپسی کے ساتھ ہی جھائن بھی ہاتھ سے نکل گیا غرض رنتھمبور کی مہم کا سخت ناکامی پر خاتمہ ہوا۔

**منگول حملہ:**

رنتھمبور سے شرمناک پسپائی کے بعد ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ ۱۲۹۱-۹۲ء ۶۹۱ھ (۶۹) ایران کے ہلاکو خان کا ایک پوتا (۷۰) عبداللہ ڈیڑھ لاکھ (۷۱) منگولوں پر مشتمل فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ حملہ کی خبر پاتے ہی سلطان نے منگولوں (۷۲) سے مقابلہ کرنے کے لیے پایۂ تخت سے کوچ کیا (۷۳) تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا وہ سنام (۷۴) کے حدود تک آپہونچا جہاں منگولوں کا مقدمۃ لشکر پہلے ہی سے آچکا تھا۔ دریائے سندھ نے دونوں فوجوں کو الگ کر رکھا تھا اور ایک فیصلہ کن جنگ(۷۵)

(۶۷) ایضاً ۲۱۳/عہد وسطی کے مؤرخ کے داستان طرازی کے باوجود یہم اتنی غیر اہم تھی کہ نیائے سوری نے اپنے "ہمیر مہاکاویہ" میں اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ ہمیرائن مقدمہ ۱۱۵

(۶۸) مفتاح الفتوح، اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۳ء ۳۹، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم ۵۴۲

(۶۹) برنی، ۲۱۸

(۷۰) برنی مطابق "نبسہ ہولیین" کہتا ہے۔ نبسہ کے معنی میں ایک عزیز اور پوتا۔ ہو غلطی سے بلاشبہ ہلاکو کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جو ایران کا فاتح اور چنگیز خان کا پوتا تھا۔

(۷۱) برنی، ۲۱۸ دس سے بارہ تومان کہتا ہے۔ فرشتہ، ۹۴ دس تومان بتاتا ہے ایک تومان میں دس ہزار سوار ہوتے تھے۔

(۷۲) اس حملے کے بارے میں عصامی کا بیان گمراہ کن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ حملہ جلال الدین کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں ہوا اور بادشاہ نے نہیں اس کی کمان ملک خاموش نے سنبھالی تھی۔ فتوح ۲۰۸-۲۰۲

(۷۳) عصامی کے بیان کے مطابق ہندوستانی فوج تیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی، فتوح، ۲۰۷

(۷۴) برنی اور حاجی الدبیر اس کو "برام" کہتے ہیں۔ فرشتہ میں "ہرام" ہے۔ مگر گمان غالب یہ ہے کہ وہ سنام یا سام ہے جو شمال مغرب سرحد پر واقع ہے۔ عصامی میں بھی "ام" ہے اور کہتا ہے کہ یہ جنگ دریائے سندھ کے قریب لڑی گئی تھی۔ فتوح ص ۲۰۶ بداؤنی میں سنام ہے۔ رینکنگ جلد اول ۲۳۶

(۷۵) ہندوستانی ہمیشہ مدافعانہ جنگ لڑتے رہے۔ خوف کی وجہ سے یا جنگی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستانی حکمراں منگولوں سے لڑنے میں کبھی جارحانہ لڑائی نہیں لڑتے تھے۔ یہاں تک کہ جنگی سردار علاء الدین نے کبھی منگولوں پر حملہ نہیں کیا۔

لڑنے کے لیے دونوں جانب زبردست تیاریاں کی جانے لگیں۔ اسی اثنا میں حریف افواج کے بے ترتیب دستوں کے درمیان اکا دکا چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ان میں دشمن کو زک اٹھانی پڑی تھی۔(۷۶) ایک دن منگول فوج کے ایک حصّے نے دریا عبور کر لیا اور شاہی مقدمۂ لشکر سے ایک خوفناک جنگ لڑی۔ برنی کے بیان کے مطابق دشمن کو مکمل شکست ہوئی اور اس کے کافی سپاہی مارے گئے۔ تقریباً ایک ہزار منگول افراد ایک سو سرداروں کے (کماندار امیران سادہ) ہندستانی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ اسی دوران صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور کچھ رسمی پابندیوں کے بعد جلال الدین اور عبداللہ کے درمیان ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ وہ برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے ملے اور تحائف کا آپس میں تبادلہ ہوا۔ عبداللہ اپنے وطن لوٹ گیا لیکن الغو یا الغ خان جو خود بھی چنگیز خان کے مراتب رکھتا تھا اسی ملک میں بس گئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جلال الدین نے اپنی بیٹی کی شادی الغو کے ساتھ کر دی۔ وہ اور اس کے چار ہزار ساتھی(۷۷) اپنے خاندان کے ساتھ بادشاہ کے ہمراہ پایۂ تخت آئے ان کو تمام سہولتیں فراہم کی گئیں، وظائف اور وثیقے دیے گئے اور انھوں نے غیاث پور، اندرپت، کیلوگھڑی اور تلوکا جو بعد میں مغلپورہ کے نام سے مشہور ہوا اور اپنی بستیاں بسا لیں۔(۷۸) وہ دیسی باشندوں سے گھل مل گئے اور نومسلم کے نام سے مشہور ہو گئے۔

برنی کے بیان سے قاری کے ذہن پر تاثر قائم ہوتا ہے کہ شاہی افواج کے مقابلے میں حملہ آوروں نے شکست کھائی اور ان کو سلطان کی طرف سے صلح کا عطیہ ملا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جلال الدین نے کسی بڑے معرکہ میں ڈیڑھ لاکھ منگولوں سے لوہا لینے کی ہمت نہیں کی۔ چنانچہ اس نے ان کے حق میں بڑی موافق شرائط پر صلح میں سرعت سے کام لیا۔ یہ صحیح ہے کہ گزشتہ بہت سے مواقع پر اس نے منگولوں کو شکست دی تھی لیکن بڑھاپے میں مردانگی اور شجاعت کا وہ پہلا سا

(۷۶) برنی نیز فرشتہ، ۹۴

(۷۷) فرشتہ، ۹۴

(۷۸) یہ سب دہلی کے نواح میں دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہیں، اندرپت شمال میں کیلوگھڑی وسط میں اور غیاث پور جنوب میں واقع ہے۔ غیاث پورہ میں شیخ نظام الدین اولیاء کا مزار واقع ہے۔ دہلی کے قریب اب بھی مغلپورہ نام کا ایک گاؤں ہے تھامس کرانیکلز میں شامل ایک نقشہ میں اس کی نشان دہی کی گئی ہے بدایونی کے بیان کے مطابق غیاث پورہ اور مغلپورہ دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ رینکنگ جلد اول ص ۲۳۶۔

دم خم نہیں رہا تھا۔ اور اپنی حکومت کے چھ برسوں میں وہ انتہائی صلح جو اور امن پسند رہا۔

منگول فتنہ کے ختم ہونے کے بعد جلال الدین نے ریاستی معاملات کی جانب توجہ مبذول کی۔ مستقبل میں جارحیت کی روک تھام کی غرض سے اس نے لاہور کی گورنری ارکلی خاں (۸۰) کو تفویض کی جو پہلے سے ملتان میں کامیاب رہا تھا۔ پہلے اُس نے منڈور پر (۸۱) پر پیش قدمی کی اور اور پہلے ہی حملہ میں کامیاب رہا۔ اس نے وہاں کے گرد و نواح میں خوب لوٹ مار مچائی اور کثیر مال غنیمت لے کر واپس ہوا۔ اس کے دوسرے حملہ کا رخ جھائن کی جانب ہوا جس کو اس نے ایک بار پہلے بھی رنتھمبور کی مہم کے دوران تاخت و تاراج کیا تھا۔ جلال الدین کی ان فتوحات کے بعد اس کے بھتیجے علاء الدین کی بھیلسہ اور اس کے بعد دیوگری کی کامیاب فوجی فتوحات واقع ہوئیں۔ جلال الدین کے آخری ایام بلاشبہ علاء الدین کے جنوبی ہند میں شاندار کارناموں سے دھندلا کر رہ گئے اس کے بعد سے ہندستان کی تاریخ کے میدان میں سب سے اہم کردار علاء الدین نے ادا کیا۔

---

۷۹۔ برنی صہ ۲۱۹

(۸۰) فرشتہ صہ ۹۴

(۸۱) طبقاتِ اکبری ماندو بتاتی ہے جو کہ غلط ہے

# باب 3

# علاء الدین کی دیوگیری پر فوج کشی

## ابتدائی زندگی:-

علاء الدین جو علی یا گرشاسپ کے نام سے بھی معروف تھا۔ جلال الدین کے ایک بھائی شہاب الدین مسعود خلجی[1] کا فرزند تھا۔ شہاب الدین کے چار بیٹے تھے۔ علی، الماس بیگ، قتلغ تغین اور محمد۔ ہم علی (علاء الدین) اور الماس بیگ کی آخری زندگی کے بارے میں تو کچھ واقفیت رکھتے ہیں لیکن دوسرے دو بھائیوں کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ قتلغ تغین کے بارے میں صرف ایک جگہ ذکر ملتا ہے کہ وہ ملک چھجو کے مقابلے میں لڑا تھا۔[2] محمد سلیمان کا باپ تھا جو اکت خان کے نام سے معروف ہے[3][4] ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شہاب الدین جلال الدین کی تخت نشینی سے بہت پہلے مر چکا تھا کیونکہ اس عہد حکومت کی تاریخ میں اس کا ذکر ایک بار بھی نہیں آیا اس لیے بھی کہ اس کے بڑے بیٹے کی پرورش اس کے چچا جلال الدین کی مشفقانہ نگرانی میں ہوئی تھی۔[5] علاء الدین کے بچپن اور نوجوانی کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ بلاشبہ

---

(۱) اس کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ ایک بہادر سپاہی تھا (دیول رانی صـ۵۱) اور یہ کہ وہ اپنے بھائی جلال کی طرح بلبن کی ملازمت میں تھا۔

(۲) فتوح، صـ۲۲

(۳) مفتاح الفتوح، الیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، صـ۵۳۵

(۴) عصامی اور فرشتہ نام اور لقب دونوں کا بیان کرتے ہیں۔ برنی اکت خان کا صرف لقب بیان کرتا ہے۔

(۵) برنی، صـ۲۲۴؛ فرشتہ ۸۹

حیرت انگیز بات ہے کہ مورخین نے ایک ایسے حکمراں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بھی لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جس کے عظیم الشان کردار نے اس کو قرونِ وسطیٰ کے ہندستان کے عظیم ترین شخصیات کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ کوئی ہمعصر مؤرخ علاء الدین کی تاریخ پیدائش نہیں دیتا۔ صرف حاجی الدبیر (ابتدائی سترھویں صدی کا ایک مؤرخ) کہتا ہے کہ علاء الدین چونتیس سال کا تھا جب وہ رنتھنبور کو فتح کرنے کے لیے نکلا تھا۔[6] (۱۳۰۱-۱۳۰۰ء) اگر یہ تاریخ صحیح تسلیم کرلی جائے تو علاء الدین ۱۲۶۶ء کے لگ بھگ پیدا ہوا ہوگا۔ بظاہر بچپن میں اس کو لکھنے پڑھنے کی باقاعدہ تعلیم نہیں ملی۔ لیکن جوانی میں اس کو اسلحہ کے استعمال، شہسواری اور دوسرے کھیلوں کی باقاعدہ تربیت دی گئی۔ اس کی ابتدائی فتوحات بصراحت یہ بتاتی ہیں کہ تیغ زنی اور دوسرے مردانہ مشقوں کی اس کو بہترین تربیت دی گئی تھی۔

علاء الدین نے خلجی انقلاب کے دوران اپنے جوہر دکھائے۔[7] جلال الدین کی تخت نشینی پر علاء الدین کو جو اس کا بھتیجا نیز داماد تھا افسر تقریبات (امیر توزک) مقرر کیا گیا۔[8] اس کے چھوٹے بھائی الماس کو جس سے سلطان کی دوسری بیٹی منسوب تھی گھوڑوں کا افسر (آخور بیگ) بنایا گیا۔[9] اپنی ترقی کے قلیل عرصے میں علاء الدین نے ملک چھجو کے خلاف مہم میں اپنی فوجی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ فتنہ جلد ہی فرو ہوگیا لیکن اس واقعے نے علاء الدین کے مستقبل کے امکانات روشن کردیے۔ اس کو کڑہ کا گورنر مقرر کردیا گیا۔ (۱۲۹۱ء)

شہزادے کی زندگی میں یہ تقرر ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوا۔ کڑہ میں حالات بالکل پُرامن نہیں تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک چھجو کی بغاوت کچل دی گئی تھی۔ لیکن کبیدہ خاطر امراء کا جذبہ سرد نہیں پڑا تھا۔ وہ جلال الدین کو ایک غاصب ایک کمزور اور ایک ایسا شخص تصور کرتے تھے جس کو ذرا سی منظم کوشش سے تخت سے اٹھایا جاسکتا تھا۔ وہ چھجو کی بغاوت

(۶) ظفر الوالہ، صہ ۷۸۵

(۷) ملاحظہ ہو پہلا باب

(۸) یہ برنی کا بیان ہے۔ تاریخ مبارک شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کو آخور بیگ میمنہ کے گھوڑوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ فرشتہ صرف یہ کہتا ہے کہ علاء الدین کو بڑے امراء کے حلقہ میں شامل کیا گیا تھا۔

(۹) برنی یہ نہیں بتاتا ہے کہ علاء الدین اور الماس بیگ سے شہزادیوں کی شادی کب ہوئی تھی۔ فرشتہ ۸۹ کہتا ہے کہ ان کی شادی جلال الدین کے کیلوکھڑی میں اقامت پذیر ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ عصامی (فتوح صہ ۲۲۱) علاء الدین کو بڑا داماد کہتا ہے۔

میں مددگار رہے تھے اور انھوں نے گورنر کو اس کے کڑہ میں آمد کے پہلے ہی سال ایک بڑی فوج کو اکٹھا کرنے اور تخت کے حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ اس مقصد کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ ملک چھجو کی بغاوت مناسب وسائل کی کمی کے سبب ناکام ہوگئی تھی۔

## علاءالدین کی گھریلو پریشانی

یہ ترغیب آمیز مشورہ بیکار نہیں گیا۔ خود علاءالدین ایک ناخوشگوار گھر کی راحت اور تفریح کا خواہاں تھا۔ جب سے اس کی شادی جلال الدین کی بیٹی سے ہوئی تھی، وہ کبھی خوش نہیں رہ سکا۔ بادشاہ کی بیٹی ہونے کے ناتے اس نے اپنے شوہر پر غالب رہنے کی کوشش کی۔ اس کے باپ کے اچانک اقبال نے انتہائی مغرور بنا دیا۔ اس کا گھمنڈ علاءالدین کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا لیکن وہ اپنی بیوی کی نافرمانی کو سلطان کے علم میں لانے کے خلاف تھا۔ ساتھ ہی وہ ذلت کے احساس تلے تلملاتا رہتا تھا۔ اور[10] اپنے مصاحبوں کو ختم کرنے کے بارے میں مشورہ کرتا رہتا تھا۔ حاجی الدبیر علاءالدین اور اس کی بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شہزادہ کی دو بیویاں تھیں، ایک سلطان کی بیٹی تھی اور دوسری ماہرو ملک سنجر کی بہن جو بعد میں الپ خان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس حقیقت نے کہ علاءالدین کی ایک بیوی اور ہے بادشاہ کی بیٹی کو چراغ پا کر دیا۔ وہ اپنے شوہر کے معاملات کی ٹوہ میں رہنے لگی[11] ایک دن جب کہ باغ میں محبت کرنے والا یہ جوڑا محو اختلاط تھا۔ جلال الدین کی بیٹی موقع پر پہنچ گئی اور اپنی چپل سے ماہرو کو مارنے لگی۔ علاءالدین یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے طیش کے عالم میں اپنے چچا کی لڑکی پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ لیکن

---

(۱۰) فتوح ص ۲۲۱

(۱۱) ظفرالوالہ میں "الزوجہ" ماہرو کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگر ماہرو ایک منکوحہ بیوی تھی تو یہ سچ مچ بڑی حیرت کی بات ہے کہ جلال الدین کی بیٹی کو اس حقیقت کا پہلے سے کوئی علم کیوں نہیں تھا ـــ بہرحال بعد کے واقعات یہ صاف بتاتے ہیں کہ ماہرو کی شرعی طور پر علاءالدین سے شادی ہوئی تھی۔ اس کی تخت نشینی پر دو خاص ملکہ یعنی ملکۂ جہاں اور اس کا بیٹا خضر خان ولی عہد سلطنت مقرر کیے گئے۔

خوش قسمتی سے اس کے چند معمولی زخم آئے اور وہ بچ گئی[11] اس واقعہ کی باقاعدہ خبر سلطان کو کی گئی لیکن اس نے اس پر کان نہیں دھرے ۔ یہی نہیں بلکہ ساس کے سلوک نے بھی علاالدین کا اور بھی ناک میں دم کر رکھا تھا ۔ ملکۂ جہاں کو اس کی خواہش کی بھنک مل گئی تھی اور وہ اس پر کڑی نظر رکھنے لگی ۔ اس نے اپنے بوڑھے اور کمزور شوہر کو علاء الدین کے اس ارادہ سے باخبر کر دیا کہ علاء الدین ملک کے کسی دور دراز گوشہ میں ایک آزاد مملکت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے[12] اس نے اپنی بیٹی کو ترغیب دی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تحکمانہ انداز اختیار کرے ۔

کڑہ میں علاء الدین نے اطمینان کا سانس لیا ۔ یہاں وہ سلطان کے عدم التفات ملکۂ جہاں کے تسلط اور اپنی تحکم پسند بیوی کی خود نمائی سے دور تھا ۔ اس نے اپنے ماضی پر غور کرنے اور مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی شروع کر دی ۔ اس کا واحد خیال یہ تھا کہ وہ دو بدمزاج عورتوں سے دور رہے بہر حال علاالدین کے گھریلو مشکلات کے لیے شہزادی اور اس کی ماں کو سراسر موردِ الزام ٹھہرانا مشکل ہے کیونکہ وہ خود بھی خامیوں سے مبرا نہیں تھا ۔ وہ سنگدل اور غیر مصالحت پسند تھا ۔

اسی اثنا میں سلطان جلال الدین کے وقار کو ایک صدمہ پہنچا ۔ ترک امراء برابر اس کے خلاف سازشیں کر رہے تھے ۔ وہ خود شہر دہلی میں سرکشی کی بیخ کنی نہیں کر سکا تھا ۔ وہ نہ تو باغیوں کو سزا دینے کی طاقت رکھتا تھا اور نہ اس میں اپنے حامیوں کو انعام و اکرام سے نوازنے کی دانائی تھی ۔ رنتھمبور سے اس کی پسپائی کافی ذلت آمیز تھی لیکن جس طریقہ سے اس نے منگول حملہ آور سے صلح کی وہ اور بھی بری تھی ۔ خاص طور سے الغو سے اپنی بیٹی کی شادی کر دینے سے دہلی کے امراء اور عوام پر بہت برا اثر پڑا ہوگا ۔ دور دراز کڑہ میں غیر مطمئن امراء کے اجتماع اور سلطان کی ذلت اور شکست کی کہانی کو بڑھا چڑھا کر علاء الدین سے بیان کیا گیا ہوگا جو خود بھی اپنے چچا اور خسر کی بزدلی پر ذلت محسوس کر رہا ہوگا ۔ لیکن اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا جس طرح ملک احمد حبیب اکثر کر دیا تھا ۔ اس نے اپنی نافرمانبرداری اور راگی

---

(۱۱) ظفر الوالہ ، ص۱۵۲

(۱۲) ابن بطوطہ کے مطابق علاء الدین کے گھریلو جھگڑوں کی طرف سلطان کی بے توجہی نے بادشاہ اور اس کے بھتیجے کے درمیان تعلقات کو بہت زیادہ کشیدہ بنا دیا تھا۔

(۱۳) فرشتہ ، (ص۹۳)

کا مظاہرہ جاری رکھا۔

## ودیشا پر حملہ:۔

تقریباً ۱۲۹۲ء (۶۹۱ھ) کے اواخر میں علاء الدین نے ودیشا (بھیلسہ) پر حملہ کرنے کے لیے سلطان سے اجازت مانگی۔[15] سلطان نے حال ہی میں مندور پر پہلے حملہ ہی میں قبضہ کر کے فتح حاصل کی تھی۔[16] اور جھائن کو دوسری بار تاراج کیا تھا۔ ایسے وقت میں علاء الدین کی درخواست اس کو بالکل قابل قبول تھی لہٰذا اس نے بلا تاخیر اجازت دے دی۔ علاء الدین کڑہ سے روانہ ہوا اور اجین کو جانے والی راہ پکڑ لی جس پر بھیلسہ کا شہر واقع تھا۔ اس کے اچانک وارد ہو جانے کی وجہ سے شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ خوفزدہ باشندوں نے اپنی مورتیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں ناپاک ہونے سے بچانے کے لیے دریائے بیتوا کی تہ میں چھپا دیا لیکن شہزادے نے ان کو دریا سے نکلوا لیا۔[17] متعدد مندروں کو توڑنے اور کثیر مال غنیمت حاصل کرنے کے بعد علاء الدین سلطان کی خدمت میں آداب بجا لانے کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اپنے ساتھ لوٹ کے مختلف اشیاء کے ساتھ ایک بہت بڑی مورتی بھی لایا۔[18] جلال الدین اپنے بھتیجے سے بہت زیادہ خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ مقبوضہ مورتی کو بداؤں دروازے پر ڈال دیا جائے تاکہ مسلمان اس کو پیروں تلے روندیں۔ علاء الدین کو وزیر جنگ (عارض ممالک) کے عہدہ پر سرفراز کیا اور اس کے کڑہ کے اقطاع میں اودھ کا اضافہ کر دیا۔

بھیلسہ میں علاء الدین نے دیوگیری کی عظیم دولت کے بارے میں سنا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے کڑہ میں مناسب فوج اکٹھا کر لی تو وہ اس سلطنت پر حملہ کرے گا۔

---

(۱۵) بھیلسہ (ودیشا) دریائے بیتوا پر واقع ہے وہ سنٹرل ریلوے بھوپال سے چونتیس میل دور ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔

(۱۶) مندور جودھپور کے شمال میں چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس وقت کی تعمیر شدہ ایک مسجد اب بھی موجود ہے اور اس میں ایک شکستہ کتبہ بھی ہے۔ اس حملہ کے وقت مندور سونگرہ چوہان سامنت سنگھ کے قبضہ میں تھا (مارواڑ کا اتہاس از بی، این، ریو ص ۱۸)

(۱۷) مفتاح الفتوح، الیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۵۴۲

(۱۸) نظام الدین اور فرشتہ کے یہاں دو پیتل کی مورتیوں کا ذکر ہے۔

لیکن وہ اپنے اس حوصلے کو دل ہی دل میں پروان چڑھاتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان اس پر بہت مہربان ہے اور کڑہ کے محاصل میں اودھ کے محاصل کا اضافہ کر دیا گیا ہے تو اس نے سلطان سے ایک اور عنایت کی درخواست کی۔ اس نے التماس کیا کہ "چندیری اور اس کے اطراف (محصول کی ادائیگی سے) آزاد ہیں اور دہلی کی فوج سے ناواقف (بے پروا) ہیں اگر آپ کی مرضی ہو تو میں اپنے اقطاع کے محاصل سے نئے سپاہی اور خدام بھرتی کروں اور بیشمار مال غنیمت لاؤں .... اور ہر شے شاہی خزانہ میں جمع کر دوں"[19] بادشاہ نے جس کو علاء الدین کے حوصلے کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی اپنی بیوی اور ساس سے دل برداشتگی کی گہرائی کا اندازہ تھا ایک نئی فوج بھرتی کرنے کے لیے ضروری اجازت دے دی اور کثیر مال غنیمت کے امکانات کے لالچ میں اس نے کڑہ اور اودھ کے محاصل بھی معاف کر دیے۔(۲۰) علاء الدین کڑہ واپس آیا اور چندیری پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا[21] یہی وہ موقع تھا جس کا اسے مدت سے انتظار تھا۔ اب اس کے پاس فوج اور دولت دونوں کی بہتات تھی۔ وہ دور دراز دیوگیری پر ایک حملہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

## دیوگیری کی سلطنت :-

دیوگیری کی عظیم مرہٹہ سلطنت (۲۲) شمالی ہند اور دکنی جزیرہ نما کے درمیان واقع تھی۔ دیوگیری کے شمال میں وندھیاچل کے زبردست پہاڑ تھے اس کے شمال اور شمال مغرب میں مالوہ اور گجرات کی سلطنتیں تھیں اور مغرب میں مغربی گھاٹ تھے۔ شمال میں وندھیاچل سے محفوظ ہونے کے سبب وہ ان غیر ملکی حملہ آوروں کی جولانگاہ سے محفوظ رہا تھا جو آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی تک شمالی ہند میں جوق در جوق آتے رہے۔ لیکن تیرھویں صدی

(۱۹) برنی صفحہ ۲۲۰

(۲۰) ایک صوبہ کا مکمل لگان محاصل کے نام سے معروف تھا اور نظم و نسق کے مصارف منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہ جاتا تھا وہ فواضل کہلاتا تھا۔ موخر الذکر شاہی خزانے کو بھیج دیا جاتا تھا لیکن علاء الدین کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اسے مزید سپاہی بھرتی کرنے کے لیے استعمال کرے۔ برنی صفحہ ۲۲۰

(۲۱) ضیاء برنی صفحہ ۲۲۱

(۲۲) مسلمان مورخین کا دیوگیری یا دیوگیر موجودہ دولت آباد ہے۔ ۵۷ ۱۹ شمال ، ۱۵ / ۷۵ مشرق

کے اختتام پر حوصلہ مند علاءالدین کی دوررس نگاہ نے اس کی فتح کی ایک راہ اور ایک حیلہ تلاش کرلیا۔

اس وقت دیوگیری پر رامچندر نامی ایک یادو حکمران کی فرمانروائی تھی۔ یادو بادشاہ اپنا شجرۂ نسب بہت قدیم بتاتے تھے۔ ان کے مغنی شعرا، انھیں بھگوان کرشن جیسی شخصیت کی اولاد بتاتے تھے۔ گزشتہ زمانے میں یادو حکمران چالوکیہ راجاؤں کے باجگزار تھے لیکن بارھویں صدی کے اختتام کے لگ بھگ بھیلما یادو ان کے جوئے کو اتارنے اور دریائے کرشنا میں واقع تمام علاقے پر تسلط جما لینے میں کامیاب ہوگیا(۲۳) لیکن ایک معمولی سی ریاست کو دکن کی عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک بنانے کا سہرا سنگھانا کے سر ہے جس نے تیرھویں صدی کے نصف اوّل میں حکمرانی کی۔ اس نے کامیابی کے ساتھ مالوہ اور گجرات پر حملے کیے، زیرین کونکن فتح کیا اور ہویسلا سردار سے جنوبی مرہٹہ علاقہ چھین لیا۔ (۲۴) ایک طویل اور شاندار دورحکومت کے بعد سنہ ۱۲۴۷ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا پوتا کرشنا اوّل اس کا جانشین ہوا۔ جب سنہ ۱۲۶۰ء میں کرشنا کا انتقال ہوگیا تو تاج اس کے بھائی مہادیو کے سر کی زینت بنا جس نے سنہ ۱۲۷۱ء تک حکومت کی۔ یہاں تک کہ کرشنا اوّل کا بیٹا رامچندر اس کا

(۲۳) بھیلما کے عہد حکومت کا آغاز سنہ ۱۱۸۵ء میں ہوا نہ کہ سنہ ۱۱۸۷ء میں جیسا کہ ڈاکٹر فلیٹ (DR. FLEET) نے فرض کیا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار دو معاصر کتبوں کی دریافت سے ہوتا ہے۔ سب سے قدیم دستاویز جو دیوگیری کا ذکر یادو حکمرانوں کے پایۂ تخت کے بطور کرتی ہے اس کا تعلق سنگھانا کے ایک پیشرو جیتپال کے عہد سے ہے اور اس کی تاریخ سنہ ۱۱۱۹ ساکا / سنہ ۱۱۹۶ء ہے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء صفحہ ۱۷۳ اور صفحہ ۱۷۵۔

(۲۴) ظاہر یہ ہوتا ہے کہ سنگھانا کے عہد میں یادو سلطنت اتنی وسیع تھی جتنی کہ گزشتہ خاندانوں کے عظیم ترین حکمرانوں کی فرمانروائی کے دوران تھی۔ سنگھانا کے کتبات میں اس کو ایک مقتدر اعلیٰ مہاراجا کے مکمل القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "جہاں پناہ"، "کرۂ ارض کی محبت" (پرتھوی ولبھ) اور شہنشاہ بھٹارکا، دکن کی ابتدائی تاریخ (Early History of The Deccan) صفحہ ۱۹۳

اس خاندان کی ابتدائی تاریخ کچھ تو کتبات کی دستاویزات میں پائی جاتی ہے اور کچھ ہیمادری کی "ورتا کھنڈ" کے مقدمہ میں۔ یہاں کا شجرۂ نسب غالباً سب سے زیادہ جامع صورت میں ہیمادری نے دیا ہے۔ سی، ای، فلیٹ، Dynasties of The Kanarese Districts بمبئی صفحہ ۵۱۱

طور سے ہندوں کے مختلف قسم کے سونے کے زیورات کے استعمال نے سونے کو ایک گھریلو شے بنا دیا تھا. اور سلطنت کے خزانے سونے چاندی اور بیش بہا جواہرات سے بھرپور تھے۔

دیوگیری کی یہی حالت تھی جس نے علاء الدین کے خیال کو مہمیز لگائی تھی اور اس کو ایک ایسی فتح حاصل کرنے کی ترغیب دی، جو ہندو مسلم تاریخ کے دفتر میں بے مثال ہو۔

## دیوگیری پر فوج کشی

کافی تیاریاں کرنے کے بعد علاء الدین کڑہ سے دیوگیری کے لیے آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ[29] ۲۶ فروری ۱۲۹۶ء (۱۹ ربیع الآخر ۶۹۵ھ)[30] بروز سنیچر روانہ ہوا۔ اس نے اپنے اصل ارادوں کو خفیہ رکھا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ وسطی ہند میں وندھیاچل پہاڑوں سے تقریباً ایک سو میل شمال میں راجپوت چندیری قلعہ کی فتح کے لیے جا رہا ہے۔ ضیا برنی کا چچا ملک علاء الملک شہزادہ کے منصوبہ میں اس کا معتمد تھا۔ اس کو اپنی عدم موجودگی میں کڑہ کے نظم و نسق کی نگہداشت نیز اس کی حرکات و سکنات کے بارے میں سلطان کو غلط سلط روئداد بھیجنے کے لیے مقرر کیا۔ علاء الدین چندیری تک علانیہ گیا اور وہاں سے اس کی نقل و حرکت گمنامی کے پردہ میں چھپ گئی۔ چندیری سے برق رفتاری سے ودیشا پہنچا۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس پیش قدمی پر ذرا بھی وقت ضائع نہ ہو اور ہنے ودیشا کی اپنی گزشتہ مہم میں تمام شاہراہوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے وندھیاچل کے پہاڑوں کے درمیان بڑی خوش اسلوبی سے گزرگاہ بنائی۔ بے ترتیب پہاڑوں اور تیز رفتار دریاؤں[32] سے ہو کر وہ

---

۲۹۔ اپنے اضافہ شدہ محاصل کی مدد سے وہ تین یا چار ہزار سوار اور دو ہزار پیادہ سپاہی بھرتی کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ برنی ص ۲۲۲؛ فرشتہ ص ۹۵

۳۰۔ خزائن، ص ۵

۳۱۔ آج کل چندیری صرف ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو جھانسی ڈویژن میں للت پور کے مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۹۵-۱۲۹۲ء میں شہر چندیری اس مقام کے بالکل متصل واقع تھا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ۱۳۰۳ء اور ۱۳۱۰ء کے درمیان خود علاء الدین کے عہد حکومت ہی میں چندیری اپنی موجودہ جگہ پر منتقل ہو گیا تھا۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ، ۲۵-۱۹۲۴ء، ص ۱۶۸۔

۳۲۔ مسلم مورخین کا اس پر زور دینا ہے کہ علاء الدین نے "جنگل کے راستہ" ایک مختصر راہ اختیار کی تھی یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی پیش قدمی کے مقامات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس نے دکن کا اس وقت کا معروف راستہ اختیار کیا تھا جو متعدد جنگلوں سے گزرتا تھا۔

جانشین بنا۔ اور یہی وہ راجا تھا جس کو بڑھاپے میں ایک طویل اور شاندار عہد حکومت کے بعد علاء الدین کے غیر متوقع حملے کا سامنا کرنا اور ایک غیر ملکی دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اس کے ابتدائی سال کافی خوشحال تھے۔ اس کی افواج نے مالوہ اور میسور دونوں پر حملہ کیا وہ بلاشک وشبہ جزیرہ نمائے ہند کا عظیم ترین بادشاہ تھا۔ ایک ہیجانی شان وشکوہ نے بھی اس کے عہد حکومت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اسی میں وزیر ہیمادری یا ہیمد پنت[25] نے نشوونما پائی اور اسی میں دیان دیو کا عروج ہوا جو پندھار پور مکتب فکر کے عظیم مرہٹہ شعراء کا سرخیل تھا (۲۶)۔

اس طرح تیرھویں صدی کے دوران سلطنت دیوگیری نے اپنے دو قابل یادو حکمرانوں سنگھانا اور رام چندر کے عہد حکومت میں ہمہ جہتی ترقی کی "پچیس سال تک رام چندر نے خوشحالی کے ساتھ حکمرانی کی۔ اس کی افواج کی شجاعت نے اس کی دور دراز سرحد کی حفاظت کی ہیمد پنت کی دوراندیشی نے اس کی رعایا کے لیے فارغ البالی بہم پہنچائی اور بادشاہ کے خزانے کو مالا مال کر دیا۔" (۲۷) علاقائی مقبوضات کے علاوہ دیوگیری اپنی روز افزوں تجارت اور کاروبار کی وجہ سے بھی دولت مند ہو گئی جو ایسے ملک میں فروغ پاتی ہیں جہاں داخلی طور پر امن وامان کا دور دورہ ہو۔ غیر ملکی حملہ آوروں نے ملک کے خزانوں کو نہیں لوٹا تھا۔ علاء الدین نے دودیشا میں معلومات بہم پہونچائی تھیں کہ رام چندر کو وراثت میں ایک عظیم خزانہ ملا ہے۔ جو اس کا پیشروں نے اکٹھا کیا ہے (۲۸) اس زمانے کی سماجی رسوم اور خاص

---

(۲۵) ہیمد پنت ایک عظیم معمار بھی تھا۔ جنوبی ہند کا ہیمد پنتی طرز تعمیر اسی ہیمد پنت کے نام سے موسوم ہے جو دیوگیری کے یادو حکمرانوں کا برہمن مشیر کار تھا۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۲۳-۱۹۲۲ء، صفحہ ۵۸
اس کی زندگی اور تصانیف کے لیے ملاحظہ ہو کھنڈارکر، دکن کی ابتدائی تاریخ، صفحہ ۹۵-۱۰۸

(۲۶) کنکید (Kincaid) اور پرسنس A History of Maratha People: Parasnis جلد اول صفحہ ۲۷: ۳۶

(۲۷) ایضاً، صفحہ ۳۷، یہ کتاب رام چندر کی حکومت کے صرف تیئیس سال بتاتی ہے لیکن اس نے ۱۲۷۱ء سے ۱۲۹۶ء تک پچیس سال تک حکومت کی تھی جب کہ (۱۲۹۶ء میں) علاء الدین نے دیوگیری پر حملہ کیا۔

(۲۸) فرشتہ، صفحہ ۹۵

ایلچ پور پہنچا[۴۳]۔ بالکل شروع سے اس کا منصوبہ تھا کہ وہ کم سے کم وقت میں اپنی مہم ختم کر کے واپس آجائے۔ بلاشبہ اس زمانے میں وقت کا عنصر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ علاءالدین دکن میں اس سے زیادہ ٹھہر سکتا تھا جتنا وقت چندیری کی مہم کے لیے اس کے اعلان کے مطابق درکار ہوتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دکن کے طاقتور ہندو حکمرانوں کی مخالفت مول لے اور دہلی میں امرا کے شبہ کو ہوا دینے کا موجب بنے اس نے اس مہم کا بیڑا بادشاہ کی اجازت کے بغیر اٹھایا تھا اور وقت پر کڑہ میں اس کے واپس نہ آسکنے پر اس کے دشمنوں کو اس کے بارے میں ریشہ دوانیاں کرنے کا بہانہ ہاتھ آجاتا۔ اس نے آرام کیے بغیر اور راستہ میں حکمرانوں کو چھیڑے بغیر سیدھے ایلچ پور پر پیش قدمی کی[۴۴]۔ ایلچ پور میں اس نے دو دن قیام کیا تاکہ سپاہیوں کو طویل اور تکلیف دہ سفر کی تھکن اتارنے کا موقع مل سکے اور فوج کو از سرِ نو تنظیم کیا جائے کیونکہ دیوگیری اب زیادہ دور نہیں تھی۔ اطراف و اکناف کے شہروں کے شبہات کو دور کرنے کی خاطر علاءالدین نے یہ افواہ اڑا دی کہ وہ جلال الدین کے دربار کا ایک باغی امیر ہے اور تلنگانہ میں، راج مندری کے راجہ کے پاس جو کہ یادو حکمراں کا ایک باجگذار تھا ملازمت حاصل کرنے آیا ہے۔

کوچ پر کوچ کرتے ہوئے علاءالدین نے اس درّہ کو عبور کیا جو گھاٹی لجورا یا لسورا[۴۵] کے نام سے معروف ہے اور جو دیوگیری کے مغرب میں تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس وادی پر ایک دلیر ہندو سردار کانہا کی حکومت تھی جو رام چندر کا اطاعت گزار تھا۔ کانہا نے اپنے دوستوں کو طلب کیا اور جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ فتوح السلاطین کے مصنف عصامی کے مطابق اس وادی میں ایک اونچے خاندان کی دو خواتین رہتی تھیں جو فن حرب سے بخوبی واقف تھیں۔ جب ان بہادر عورتوں نے حملہ آوروں کی آمد کے بارے میں سنا تو اپنے ملازموں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ کانہا سے آملیں۔ علاءالدین سے جنگ میں ان شیروں؟ نے دشمن پر ایسے غضب کا

---

۴۳۔ ایلچ پور برار میں واقع ہے۔ علاءالدین کے حملہ کے وقت وہ یادو سلطنت کی شمالی سرحدی چوکی تھی۔ پورے قرون وسطیٰ میں وہ تجارت اور کاروبار کا ایک ترقی یافتہ مرکز تھا۔ مغلوں کے عہد میں ایلچ پور برار کا خاص فوجی لشکر گاہ بن گیا۔ نیز ملاحظہ ہو چہار گلشن، بانکی پور مخطوطہ ورق ۸۵۔

۴۴۔ فرشتہ، ص ۹۵

۴۵۔ لجورا، لسورا یا لسوبر دیوگیری کے بالکل قریب اس کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ وہ جادوناتھ سرکار کی اورنگ زیب کی ایک مختصر تاریخ میں شامل نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔

حملہ کیا کہ وہ کچھ فاصلے تک پسپا ہونے کے لیے مجبور ہو گیا۔ بہر کیف دوسرے حملہ میں علاء الدین کی فوج نے زیادہ ثابت قدمی دکھائی اور رکانہا کو ہزیمت ہوئی۔ شکست خوردہ فوج افرا تفری کے عالم میں تتر بتر ہو گئی۔ اس کی شکست مکمل اور نقصانات زبردست ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ علاء الدین نے جنگ جیت لی مگر اس نے ساتھ ساتھ جنوب والوں کے جوہر بھی دیکھ لیے تھے۔ اس لیے دیوگیری اپنی منزل مقصود کی طرف پیش قدمی کرنے سے قبل اس نے اپنے افسروں اور جوانوں سے خطاب کیا اور ان کو اس مشکل کام کی اہمیت سمجھائی، جو پیش آنے والا تھا اس نے کہا کہ "ایک ایسے ملک میں جہاں عورتیں بھی ہمارے سامنے سے پسپا نہیں ہوتیں۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ میدان جنگ میں مرد ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے"۔(۳۷) اس نے اپنے سپاہیوں کو ممکنہ خطرات سے ڈرایا ہی نہیں بلکہ ان کے سامنے لوٹ مار اور مال غنیمت میں حاصل ہونے والی دولت کا تصور پیش کر کے ان کو ترغیب بھی دی۔ سپاہیوں نے پورے اتفاق سے دوسری بار لڑنے اور جنگ جیتنے کی قسم کھائی۔ جب یہ ہو چکا تو علاء الدین نے مزید پیش قدمی کی۔

اب تک کسی مسلم فوج نے دیوگیری پر فوج کشی نہیں کی تھی۔ راجا اور باشندوں کو سخت سراسیمگی لاحق ہو گئی۔ رام چندر کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ اس وجہ سے اور بھی ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا سنگھانا دیو دیشر

---

۳۶۔ فتوح ص۲۲۲-۲۲۳۔ عصامی نے برنی کی تاریخ مکمل ہونے سے تقریباً آٹھ سال پہلے لکھا تھا اور بعض مقامات پر اول الذکر موخر الذکر سے بہتر معلومات دیتا ہے۔ اس مہم کے لیے خاص طور سے عصامی پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے

(الف) اس نے بذات خود دیوگیری میں لکھا۔

(ب) اس نے بہت سے معتمد بیانات سننے کے بعد لکھا (ملاحظہ ہو ضمیمہ مستند مورخین)

(ج) برنی سے پہلے لکھا گیا اس کا بیان اول الذکر سے جا ملتا ہے: عصامی واقعات کا اچھا مبصر ہے۔

۳۷۔ فتوح، ص۲۲۳

۳۸۔ دیول رانی، ص۸۲، ۸۵ میں سنگھانا دیو ہے۔ اس کے علاوہ امیر خسرو اور عصامی دونوں رام چندر کے دوسرے بیٹے کا نام بھیلما بتاتے ہیں، (فتوح ص۲۲۶، ص۲۳۲)۔ لیکن سر ولزلی ہیگ (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم ص۹۶) اور بعض دوسرے مصنفین دونوں بیٹوں کا نام شنکر دیو اور بھیم دیو بتاتے ہیں۔ فرشتہ کے سنگھل یا سنگھن۔ غلط ہیں۔ صحیح نام سنگھ اور بھیلما ہیں جو یادوں کی شاہی شجرۂ نسب میں بہت عام ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو دی والا ص۶۲-۲۰۳

فوج کے چیدہ دستوں کے ساتھ ایک مہم پر جنوب میں گیا ہوا تھا یہ ماضی کی فوجی روایات کے عین مطابق تھا۔(۳۹) فرشتہ کا بیان کہ سنگھانا دیو ایک سفر پر گیا ہوا تھا قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں اس کو اپنے ساتھ سلطنت کے بہترین سپاہی لے جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ آئینگر کا بھی یہی خیال ہے کہ علاء الدین کو اپنے منصوبے بنانے سے پہلے ہی اس بات کا قطعی علم ہو چکا تھا کہ رام دیو کی اصل فوج اس کے بیٹے کی قیادت میں ہولیسلا سرحد کی جانب گئی ہوئی ہے۔[40] اب کہ دشمن شہر میں دندناتا چلا آیا تھا۔ بوڑھے راجا کو اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا کہ وہ بقیہ فوج کو قلعہ میں بھیج دے اور محاصرے کا مقابلہ کرے۔

دیوگیری کا قلعہ مخروطی شکل کی ایک الگ تھلگ پہاڑی پر جو کہ ۶۴۰ فیٹ بلندی پر واقع ہے۔ چٹان کی ڈھلان اور بلندی کی وجہ سے دفاع کی کم سے کم حاجت تھی اور فصیلوں، برجوں اور ٹھوس چٹان میں کھود دی گئی پچاس فٹ گہری خندق نے فطرت کی رہی سہی کمی کو پورا کر دیا تھا۔[41] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیوگیری بناوٹ اور تعمیر دونوں کے لحاظ سے ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں ایک تھا۔[42] لیکن گزشتہ کچھ زمانے سے یادو حکمران اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھنے لگے تھے کہ وہ اپنے دفاع کے بارے میں لاپرواہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ علاء الدین کے حملہ کے وقت خندق سوکھی اور غیر محفوظ پڑی تھی اور قلعہ کے محافظ فوج کے پاس سامان رسد کی قلت تھی۔[43] بہرحال یہ اتفاق تھا کہ چند باخبر حملہ آور فوج کے خوف سے کچھ بورے چھوڑ گئے تھے اور ان کو لے کر قلعہ میں پہونچا دیا گیا تھا۔

---

۳۹۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۱۹۳۰-۳۴ء، جلد اول: ص۲۳؛ فتوح ص۲۲۶-۲۲۷

۴۰۔ آئنگر، جنوبی ہند اور اس کے مسلمان حملہ آور، ص۷۷

۴۱۔ قلعہ اب بھی قائم ہے جو خوبصورتی اور مضبوطی میں بے مثال ہے لیکن یادو حکمرانوں کا پایہ تخت اب ایک محض گاؤں ہے جو اورنگ آباد سے دس میل پر واقع ہے۔ نیز ملاحظہ ہو گریبل (Grabble) ہسٹری آف دی دکن، جلد اول، ص۷

۴۲۔ سڈنی ٹوائے (Sidney Toy)، ہندوستان کے قلعے ص۳۳۔

۴۳۔ فرشتہ ص۹۵؛ بیگ۔ Landmarks of The Deccon ص۱۲

رام چندر قلعہ کے اندر محصور ہو گیا تھا لیکن دیر ہی شہر کا خاص طور سے وہ حصّہ جو بعد میں کٹکا[۴۴] نام سے معروف ہوا تھا حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ پوری طرح تاراج کیا گیا[۴۴] اور شہر کے تمام با اثر برہمن اور اہم تاجر قیدی بنا لیے گئے۔ علاءالدین نے مرہٹہ بادشاہ کے اصطبلوں سے ہاتھی تیس سے چالیس تک ہاتھی اور ایک ہزار گھوڑے بھی پکڑ لیے[۴۵] اسی اثنا میں چالاک ترک نے ایک اور افواہ اڑا دی۔ اس نے ظاہر کیا کہ اس کی فوج بیس ہزار شاہی فوج جو پیچھے پیچھے آ رہی ہے کا محض ایک مقدمۃ الجیش ہے۔ سپاہیوں، ہتھیاروں اور سامان رسد سے ٹھیک سے لیس نہ ہونے کے سبب رام چندر کسی حال میں ایک طویل محاصرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس نے کامیابی کی تمام امید چھوڑ دی۔ آخرکار اس نے صلح شرائط لے کر قاصد بھیجے۔ شرائط صلح کے ساتھ دھمکیاں بھی شامل تھیں۔ اس نے من چلے حملہ آور کو آگاہ کیا کہ سنگھانا کسی وقت بھی واپس آ سکتا ہے لہٰذا حملہ آور کی یہ دور اندیشی ہو گی کہ وہ اس کی واپسی سے قبل ہی لوٹ جائے۔ اس نے علاءالدین کو یہ بھی اشارہ کیا تھا۔ اس کی واپسی بہت سی ہندو سلطنتوں کے علاقہ سے ہو گی اور وہ یقیناً منقطع کی جا سکتی ہے۔ علاءالدین نے بھی دور اندیشی سے کام لیا کہ جو کچھ پیشکش ہو رہی ہے اسے قبول کر لے اور کسی قدر تیزی سے واپس ہو جائے۔ اس نے صلح کر لی، تاوان جنگ عائد کیا اور وعدہ کیا کہ وہ قیدیوں کو آزاد کرنے کے بعد پندرہ دن کے اندر راجدھانی سے چلا جائے گا۔ لیکن معاہدہ کی شرائط ابھی پوری ہونی باقی تھیں کہ حالات نے مختلف رُخ اختیار کر لیا۔

**دیوگیری کی جنگ** جب سنگھانا کو اس آفت کی خبر ملی جو راجدھانی پر نازل ہوئی تھی تو وہ مصیبت کے وقت اپنے باپ کی مدد کرنے کے لیے برق رفتاری سے واپس آیا۔ ابھی وہ پایۂ تخت سے تین کوس کے فاصلے پر تھا کہ اس کو رام چندر کا پیغام ملا۔ پیغام یہ تھا

۴۴۔ فتوح، ص ۲۲۶، نیز ص ۲۴۵۔ کٹکا کو اس وقت محصور اور قلعہ چندنا یا گیا جب محمد تغلق نے اپنا پایۂ تخت دولت آباد کو منتقل کیا تھا وہاں اس نے دفاع کے تین ٹھوس اور مستحکم خطوط تحریر کیے۔ دولت آباد جو کہ سلطان اور اس کی فوج کا صدر مقام تھا، کٹکا اور خود دیوگیری کا قلعہ مغلوں کے زمانے میں دولت آباد امبرکوٹ کٹکا جہاکوٹ اور دیوگیری بالاکوٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابن بطوطہ، جلد چہارم ص ۴۶
سٹوارٹ پگٹ (Stuart Piggott) ہند کے قدیم شہر Ancient cities of India ص ۸۲

۴۵۔ فتوح، ص ۲۸-۲۲۶

۴۶۔ برنی، ص ۲۲۳؛ فرشتہ ص ۹۵

کرحملہ آور کے ساتھ صلح ہوگئی ہے، یہ کہ دشمن بہت بڑا جنگجو ہے اور اس سے جنگ کرنے کی مزید کوشش سے بہتر نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ چونکہ وہ دلیر اور حوصلہ مند تھا لہٰذا نوجوان شہزادے نے اپنے باپ کی تنبیہ سنی ان سنی کر دی اور علاء الدین سے لڑنے کے لیے اپنی فوجوں کو صف آرا کر دیا۔[۴۷] اس نے علاء الدین کو ایک دھمکی آمیز پیغام بھیجا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اگر وہ اس خطرناک گرداب سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے جس میں اس نے اپنے آپ کو پھنسا لیا ہے تو اس کو وہ تمام دولت حوالے کر دینی چاہیے جو اس نے لوٹی ہے اور فوراً شمال کو لوٹ جانا چاہیے۔ علاء الدین جس نے ابھی حال میں معاہدہ کی شرائط رام چندر پر مسلط کی تھیں اس کے مغرور بیٹے کی ناعاقبت اندیشانہ اور گستاخانہ الٹی میٹم پر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ سنگھانا کے نام سفیروں کو ان کا منہ کالا کر کے فوج کی صفوں میں گشت کرایا جائے[۴۸] اور مقابلہ کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔

علاء الدین نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ قلعہ کے محاصرہ کی دیکھ بھال کرنے کے لیے نصرت خان کو چھوڑا اور اس طرح باپ اور بیٹے کی افواج کے اتحاد کو ناممکن بنا دیا اور بقیہ فوج کو سنگھانا سے لڑنے کے لیے صف آرا کر دیا۔ مرہٹہ افواج مسلمانوں کی فوج سے تعداد میں کہیں زیادہ تھیں۔ اس جنگ میں انھوں نے علاء الدین کے سپاہیوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر دی۔ اپنے آقا کو انتہائی خطرہ میں پا کر نصرت خان نے علاء الدین کے حکم کے بغیر قلعہ چھوڑا اور تیز رفتاری سے علاء الدین کی فوج سے آملا۔ نصرت کی اس جنگی تدبیر نے فتح کا پلڑا مسلمانوں کے حق میں جھکا دیا۔ اس ایک ہزار سواروں کے دستے کو مرہٹوں نے اس مبینہ بیس ہزار سواروں کا حصہ سمجھ لیا، جس کے بارے میں علاء الدین نے غلط افواہ پھیلا رکھی تھی۔ سنگھانا دیو کے سپاہیوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ میدان جنگ سے افراتفری کے عالم میں فرار ہو گئے۔ علاء الدین نے از سر نو اور بڑی شدت سے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے متعدد قیدی تاجروں اور برہمنوں کو قتل کر دیا اور رام دیو کے بعض قریبی اعزہ اور امرا کو قلعہ کے سامنے گشت کرایا۔ رام چندر نے جس کے لیے یہ آفت اتنی ہی خوفناک تھی جتنی کہ الوکھی اپنے درباریوں سے

---

۴۷۔ عصامی کا بیان کہ سنگھانا نے بغیر کوئی جنگ لڑے اطاعت کر لی تھی غلط ہے۔ فتوح صفحہ ۲۴۰

۴۸۔ فرشتہ، صفحہ ۹۷۔ سفیروں کی توہین کرنا روایت کے خلاف تھا۔ بعد کے زمانہ میں جب ایران کے ایل خان سلطان اولجائتو کا سفیر ہندوستان آیا تو علاء الدین کے ہاتھوں اس کو ایسا ہی توہین آمیز سلوک برداشت کرنا پڑا۔ وصاف بہت سخت الفاظ میں ہندوستان کے بادشاہ کے غیر دستوری طرز عمل کی مذمت کرتا ہے

پڑوسی ہندو راجاؤں کو اپنی مدد کے لیے بلانے کا مشورہ کیا، لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی فیصلے پر پہونچ سکتے۔ ان کو معلوم ہوا کہ وہ تین ہزار بورے جن کو وہ پہلے محاصرہ کے دوران قلعہ میں لے آئے تھے غلّہ کے نہیں بلکہ نمک کے تھے۔ اس دریافت نے قلعہ میں موجود ہر شخص کی ہمت توڑ دی۔

رام چندر نے پھر سے صلح کی درخواست کی۔ علاءالدین کو اس سبب کی بھنک مل گئی تھی کہ مرہٹہ بادشاہ کیوں اتنا بیتاب ہے کہ جس قدر ممکن ہو صلح ہو جائے۔ لہٰذا اس نے گفت و شنید میں تاخیر کی یہاں تک کہ رام چندر کے سفیروں نے اعتراف کیا کہ مدافعین بھوکوں مرنے لگے ہیں۔ علاءالدین کی شرائط پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ سخت تھیں۔ اس نے ایلچ پور کو حوالے کرنے اور کثیر تاوان جنگ کا مطالبہ کیا۔ فرشتہ کے مطابق یہ تاوان چھ سو من سونے، سات من جواہرات، دو من قیمتی پتھروں مثلاً زمرد، نیلم، ہیرے اور یاقوت، ایک ہزار من چاندی اور چار ہزار ریشم کے تھان اور دوسری بہت سی اشیاء پر مشتمل تھا۔ جس کا شمار دشوار تھا۔[49] ہمعصر مورخ ضیاء برنی کوئی فہرست تو نہیں دیتا۔ البتہ وہ یہ کہتا ہے کہ علاءالدین دکن سے اتنی دولت لایا تھا کہ اس کے جانشینوں کی فضول خرچی کے باوجود اس کا معتدبہ حصہ فیروز تغلق کے عہد تک باقی رہا۔[50] ایک دوسرے معاصر امیر خسرو اپنے مبالغہ آمیز شاعرانہ انداز میں بہت تفصیل سے ان خزانوں کو بیان کرتے ہیں، جو علاءالدین لایا تھا لیکن وہ بھی اعداد و شمار نہیں دیتے۔[51] لہٰذا مشکوک ہے کہ فرشتہ نے تاوان جنگ کے بارے میں معلومات کسی قابل اعتماد ماخذ سے حاصل کی ہوں گی۔ یہ محض اس کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہو سکتی ہے۔ اگرچہ دولت کی واقعی مقدار موجودہ حاصل شدہ معلومات سے متعین نہیں کی جا سکتی تاہم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معتدبہ ہوگی۔

رام چندر نے صوبۂ ایلچ پور کے سالانہ محاصل علاءالدین کے پاس بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی بھی علاءالدین سے کر دی۔ اگرچہ ہمعصر مورخین اس واقعہ کو نہیں بیان کرتے تاہم عصامی، وصّاف، محمد بہامد خان اور حاجی الدبیر اس کا حوالہ دیتے ہیں۔[52] عصامی شہزادی کا نام

---

۴۹۔ فرشتہ، ص۹۶

۵۰۔ برنی ص۲۲۳

۵۱۔ مفتاح الفتوح ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص۵۴۲

۵۲۔ وصّاف ص۳۱۲؛ تاریخ محمدی، الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ، ورق نمبر ۱۳۲؛ ظفر الوالہ، ص۸۳۶

جھیتا پلی یا جھیتا پالی بتاتا ہے۔ جبکہ ایک ہندو رزمیہ میں اس کا نام چھتائی بیان کیا گیا ہے[۵۴] ایک اور جگہ عصامی کہتا ہے کہ وہ شہاب الدین عمر خلجی کی ماں تھی۔ جس کو ملک کافور نے علاء الدین کے انتقال کے بعد تخت پر بٹھایا تھا۔

علاء الدین نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا اور دیوگیری سے اپنی آمد کے پچیس دن بعد روانہ ہوا۔ وہ وہاں امیدوں اور اندیشوں سے بھرا ہوا آیا تھا۔ اپنی کڑہ کو واپسی پر راستے میں اس نے اسیر گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا جو اس وقت چوہان راجپوتوں کے قبضہ میں تھا[۵۵] اور وہاں موجود تمام لوگوں کو قتل کر دیا بجز ایک بچہ کے جو کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا[۵۶] اس کا اصل مقصود دیوگیری ہی تھی اور دہلی سلطنت کو وہ ایک باجگذار ریاست بنانے میں کامیاب رہا۔ یہاں سے اس نے ایسے عظیم خزانے حاصل کیے جنھوں نے اس کے ہمعصروں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ اس کے عظیم الشان کارنامہ پر برگس کا تبصرہ نقل کرنے کے لائق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "تاریخ کی ضخیم جلدوں میں شاذ و نادر ہی کوئی مثال ملے گی جس کا اس کارنامہ سے موازنہ کیا جا سکے۔ ہم خواہ منصوبہ بندی کے عزم میں خوش تدبیری سے اس کو عملی جامہ پہنانے میں یا اس عظیم خوش نصیبی کو مدِ نظر رکھیں جو اس کامیابی کے شاملِ حال رہی"[۵۷]

---

۵۳۔ فتوح صفحہ ۲۳۱-۲۳۰ اور چھتائی وارتا

۵۴۔ فتوح صفحہ ۲۳۵، صفحہ ۲۳۶

۵۵۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۲۳-۱۹۲۲ء، صفحہ ۴۲
وہ قلعہ جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا ذکر مہابھارت میں آیا ہے قلعہ بندی کے تین الگ الگ خطوط رکھتا ہے جو خاص اسیر گڈھ، کمار گڈھ اور مالئے گڈھ کے نام سے معروف ہیں۔

۵۶۔ امپیریل گزٹ سنٹرل پراونسز، ۱۹۰۸ء، صفحہ ۲۷۵، صفحہ ۲۸۸

۵۷۔ برگس، جلد اول، صفحہ ۳۱۱

## باب 4

# علاءالدین کی تخت نشینی

**جلال الدین گوالیار میں**

سنہ ۱۲۹۶ء (سنہ ۶۹۵ھ) کی ابتدا میں جب علاءالدین جنوبی ہند میں مصروف کار تھا۔ جلال الدین نے اپنی فوج کے ساتھ گوالیار کی طرف پیش قدمی کی۔ گوالیار پر اس کی فوج کشی اور وہاں اس کے قیام کی قطعی تاریخیں نہیں ملتیں۔ فرشتہ بعض تفصیلات ضرور مہیا کرتا ہے مگر وہ متضاد ہیں۔[1] برنی صرف یہ کہتا ہے کہ ۶۹۵ھ میں جلال الدین گوالیار کی ایک مہم پر گیا اور وہاں کچھ دنوں قیام پذیر رہا۔ گوالیار میں اس کو افواہیں سننے کو ملیں کہ علاءالدین نے دیوگیری میں کامیابی حاصل کی ہے اور اب کڑہ واپس آرہا ہے۔[2] بظاہر جلال الدین نے گوالیار کا رخ اسی وقت کیا تھا جس وقت علاءالدین دیوگیری کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ کڑہ سے علاءالملک برابر من گھڑت خبریں سلطان کو بھیج رہا تھا کہ شہزادہ وسطی ہند میں کئی سلطنتوں کو فتح کرنے میں مصروف ہے اور جلد ہی بادشاہ کو ساری روئداد لکھ بھیجے گا۔ اس میں بھی شک ہے کہ خود علاءالملک علاءالدین کے غیر معمولی کارناموں سے واقف تھا۔

مختصر یہ کہ جلال الدین کو گوالیار ہی میں پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ علاءالدین نے دیوگیری پر فوج کشی کی، اس

---

(۱) فرشتہ، ص ۹۵-۹۶

(۲) برنی، ص ۲۲۳

(۳) برنی، ص ۲۲۲ پر صرف یہ کہتا ہے کہ یہ خبر علاءالملک نے دربار کو بھیجی تھی مگر وہ دہلی یا گوالیار کا نام نہیں لیتا لیکن یہ واضح ہے کہ یہ خبر گوالیار بھیجی گئی تھی جہاں سلطان اس وقت مقیم تھا

کو تاخت و تاراج کیا اور اب کثیر مال غنیمت لے کر کٹرہ کو واپس آیا ہے۔ سلطان اپنے بھتیجے کے کارناموں پر پھولا نہیں سمایا اور اپنے خاص مصاحبوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کے لیے شراب نوشی کی بزمیں سجائیں۔ اسی اثنا میں متواتر آنے والی خبروں نے علاء الدین کے دکن سے کثیر مال و دولت لانے کی افواہوں کی تصدیق کر دی۔ یہ خبر بھی آئی کہ اتنے خزانے تو ماضی میں دہلی کے کسی سلطان کی نظر سے بھی نہیں گذرے تھے۔ مقبوضہ مال و دولت کی کثرت مقدار کے محض خیال ہی سے جلال الدین کو تھوڑی سی تشویش لاحق ہو گئی۔ شہزادہ نے آزادانہ کارروائی کی تھی اور دیوگری پر حملہ کرنے کی اجازت سلطان سے نہیں مانگی تھی۔ جلال الدین نے اپنے بعض قریبی امرا مثلاً ملک احمد چپ، ملک فخرالدین کوچی، ملک کمال الدین ابوالمعالی اور ملک نصیرالدین کہرامی سے خفیہ مشورے کیے۔ اس نے ان کی رائے طلب کی کہ ایسے حالات میں اسے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے؟ جہاں وہ ہیں وہیں ٹھہر کر اپنے پاس علاء الدین کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے یا کٹرہ کے راستہ میں اس کو روکنا چاہیے یا اس کو دہلی واپس چلا جانا چاہیے۔؟

معقول مشورہ کا فقدان نہیں تھا۔ ملک شہاب الدین احمد چپ نے [۳۴] جو نائب باربک اور سلطان کی بہن کا بیٹا تھا اور جو انتہائی معقول مشورہ دینے کے لیے مشہور تھا کہا کہ "جب کثیر مقدار میں ہاتھی اور دولت کسی کے قبضہ میں آ جاتے ہیں تو وہ بہت زیادہ نزاع کا سبب بن جاتے ہیں۔ جو بھی ان کو حاصل کر لیتا ہے اس کے سر میں ایسا سودا سما جاتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں پیروں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ علاء الدین کو بہت سے باغی اور سرکش گھیرے ہوئے ہیں جنھوں نے ملک چھجو کی حمایت کی تھی۔ وہ بلا اجازت ایک دوسرے علاقہ میں گیا، وہاں اس نے جنگیں لڑیں اور خزانے بھر لایا۔ عاقلوں نے کہا ہے کہ: "دولت اور جنگ و جدل، جنگ و جدل اور دولت": بسنی یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ میری رائے میں ہم کو علاء الدین کا خیر مقدم کرنے کے لیے فوراً چندیری کی طرف کوچ کرنا چاہیے اور اس کی واپسی کی راہ بند کر دینا چاہیے۔ جب وہ سلطان کی فوج کو راہ میں حائل پائے گا تو وہ یقیناً اپنا تمام مال غنیمت سلطان کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ خواہ وہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔ اس وقت سلطان سونا چاندی، ہیرے جواہرات ہاتھی گھوڑے لے سکتا ہے اور دوسرا تمام مال غنیمت اس کے اور اس کے سپاہیوں کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔ ہاں اس کے اقطاع میں اضافہ کر دینا چاہیے اور پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے دہلی لے جانا چاہیے۔ ... لیکن اگر اس کو ان خزانوں کے ساتھ جو دس سلطنتوں کے برابر ہیں کٹرہ جانے دیا گیا تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ میں یہ بھی

---

(۳۴)۔ ظفرالوالہ ص۵۳

جانتا ہوں کہ برسوں سے ملک علاءالدین کے تعلقات اپنی بیوی اور ملکۂ جہاں سے ناخوشگوار ہیں ایسے کسی شخص سے وفاداری کی توقع نہیں رکھنی چاہیے جو پریشانی کا شکار رہا ہو۔" ۵

احمد چپ کی ولولہ انگیز تقریر سلطان کے دل کو کانٹے کی طرح چبھی۔ دراصل اس نے کسی کے کچھ کہنے سننے سے قبل اتنی کھری کھری باتیں کہیں کہ اس کے پرخلوص کلمات کا غلط مطلب نکالا گیا۔ سلطان نے احمد چپ کو یہ کہہ کر سرزنش کی کہ میں نے علاءالدین کے خلاف کوئی کام نہیں کیا ہے جو اسے مجھ سے برگشتہ کردے اور وہ (احمد چپ) اس کے داماد پر بے جا تہمتیں دھر رہا ہے۔ جلال الدین اس کے بعد دوسرے امراء سے مخاطب ہوا اور اس سے ان کی رائے طلب کی۔ ملک فخرالدین کوچی سلطان کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بھتیجے کے خلاف نکلا ہوا ایک لفظ بھی جلال الدین کو پسند نہیں آئے گا۔ چنانچہ اس نے وہ سب کچھ کہنا شروع کیا جو اس کے خیال میں سلطان کے من کو بھاتا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ احمد چپ نے کہا ہے وہ سب صحیح ہے۔ عیار فخرالدین نے کہا" علاءالدین کے لشکرگاہ سے کوئی ایسا ذمہ دار شخص دربار میں نہیں آیا جس کی باتوں پر مکمل اعتماد کیا جا سکے۔ خبر نہیں کہ افواہیں غلط ہیں یا صحیح۔ مشہور کہاوت ہے کہ "موزے اس وقت تک نہیں اتارنے چاہئیں جب تک کہ پانی نظر نہ آجائے۔" اگر ہم فوج کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہیں اور اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو اس کے سپاہی شاہی فوج کی آمد کی خبر سن کر خوفزدہ ہو جائینگے۔ وہ سب کے سب بھاگ کھڑے ہوں گے اور جنگل میں چھپ جائیں گے اور وہ سارا خزانہ جو وہ اپنے ساتھ لا رہا ہے ضائع ہو جائے گا۔ ہاں! ہمیں لشکر تیار رکھنا چاہیے جب تک ہم کسی کو سرکشی پر آمادہ نہ دیکھیں، اس وقت تک اس کے خلاف فوج کشی کرنا مناسب نہیں۔ رمضان کا مہینہ قریب آرہا ہے اور دہلی میں مصری جیسے میٹھے خربوزے آگئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جہاں پناہ لشکر کے ساتھ دہلی تشریف لے چلیں اور ماہ رمضان وہاں گذاریں۔" ۶

ملک احمد چپ جو وفادار اور ہر غلط کام کے سلسلہ میں بے لاگ تھا۔ فخرالدین کی منافقت برداشت نہ کر سکا اور اس کو کچھ کھری کھری باتیں سنائیں لیکن سلطان نے اس کو یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ میں نے اس کو (علاءالدین کو) اپنی گود میں کھلایا ہے اور وہ مجھ سے اتنا لگاؤ رکھتا ہے کہ میرے اپنے لڑکے تو میرے خلاف جا سکتے ہیں مگر وہ نہیں جا سکتا۔" اس پر احمد چپ انتہائی غصہ کے عالم میں مجلس شوریٰ سے اٹھ کر چلا گیا۔

(۵) برنی صفحہ ۲۲۵-۲۲۴۔

(۶) برنی صفحہ ۲۲۶-۲۲۵۔ اس عبارت کی زبان ناقص ہے اس لیے اس کا آزاد ترجمہ ہی دیا گیا ہے۔ فخرالدین کوچی کے آخری دو جملے خاص طور سے اس کی منافقت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

جلال الدین صرف وہ طرز عمل اختیار کرسکتا تھا جس کا تقاضا اس کے بھتیجے کے لیے اس کی محبت کرتی چنانچہ وہ گوالیار سے دہلی کے لیے روانہ ہوگیا اور جلد ہی کیلوگھڑی پہنچ گیا۔

## چچا اور بھتیجے کے درمیان خط و کتابت

اسی دوران علاء الدین ایک طویل مگر برق رفتار سفر کے بعد ۲ر جون ۱۲۹۶ء (۲۸ر رجب ۶۹۵ھ) کو واپس کڑہ پہنچ گیا۔[7] ہمعصر مورخین کے بیانات میں اس پر کچھ اختلاف ہے کہ علاء الدین نے دیوگری کی اس مہم میں کتنا وقت صرف کیا۔ ایک جگہ برنی (اس معافی نامہ کا حوالہ دیتے ہوئے جو علاء الدین نے اپنے چچا کو بھیجا تھا) کہتا ہے کہ شہزادہ نے لکھا تھا کہ اس مہم پر وہ سال بھر سے زیادہ عرصہ باہر رہا۔ برنی جو اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے کافی عرصہ بعد لکھ رہا تھا اس کی مراد غالباً ایک طویل عرصہ سے ہے اور کامل ایک سال سے زیادہ کا متعین عرصہ مراد نہیں۔ برنی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فرشتہ وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ علاء الدین نے ایک برس کا متعین عرصہ کس طرح صرف کیا۔[8] بہر حال دوسری معاصر شہادت یہ ظاہر کرتی ہے کہ مہم کی منصوبہ بندی کچھ ایسی کی گئی تھی کہ دو تین ماہ کی مختصر مدت میں مکمل کرلی جاتی

اول تو یہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ علاء الدین دکن میں زیادہ وقت صرف کرنے کی گنجائش نہیں نکال سکتا تھا۔ عصامی صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ علاء الدین نے چند ماہ کے اندر ہی واپس آنے کا منصوبہ بنایا تھا۔[9]

دوم برنی کہتا ہے[10] کہ علاء الدین نے دیوگیری کو جانے والی شاہراہیں بھیلسہ پر اپنی چڑھائی کے دوران صاف کردی تھیں۔ وہ اپنے سپاہیوں کو آرام کی مہلت دیئے بغیر یا راستے کے چھوٹے موٹے سرداروں کو چھیڑے بغیر تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا سیدھا دیوگیری گیا تھا۔

سوم یہ کہ وہ افواہیں جو گوالیار میں جلال الدین کو تابڑ توڑ پہنچ رہی تھیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ شہزادہ دیوگری پہنچ چکا تھا، اس کو تاخت و تاراج کرچکا تھا اور اب واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔ اس لیے بظاہر علاء الدین نے دیوگری میں زیادہ وقت نہیں گذارا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ وہ صرف پچیس دن مقیم رہا۔

---

(7) خزائن الفتوح، ترجمہ حبیب، ص ۳ ؛ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۶۹۔

(8) فرشتہ، ص ۹۶-۹۷

(9) فتوح، ص ۲۲۲

(10) برنی، ص ۲۲۲

چہارم یہ کہ اپنی واپسی کے سفر میں بھی علاء الدین نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ اول تو اس لیے کہ وہ راستے میں واقع ہندو سلطنتوں کے ساتھ کسی جھڑپ سے پہلو بچانا چاہتا تھا (بجز اس کے کہ اس نے ناسیگڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا تھا) جس سے رام دیو نے غالباً اپنی امداد کے لیے درخواست کی تھی۔ دوم یہ کہ وہ اپنے ان دشمنوں سے بھی خائف تھا جو دربار میں اس کے خلاف سازش کرتے رہتے تھے۔ سوم یہ کہ موسم برسات تیزی سے قریب آ رہا تھا۔

پنجم یہ کہ جب ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں قطب الدین مبارک شاہ نے دیوگیری پر حملہ کیا تو وہ دو ماہ کی قلیل مدت میں سلطنت کی سرحدوں پر پہنچ گیا تھا۔[11] لہٰذا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ علاء الدین کو دیوگری کے تیز رفتار سفر میں چند ماہ سے زیادہ صرف نہ ہوئے ہوں

اور سب سے آخری بات یہ کہ ہمارے پاس ہمعصر امیر خسرو کی سند موجود ہے۔ وہ کڑہ سے روانگی (۲۶ فروری ۱۲۹۶ء) اور کڑہ میں واپسی (۲ جون ۱۲۹۶ء) کی قطعی تاریخیں دیتے ہیں۔ خسرو کی تاریخوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرما کے تکلیف دہ موسم کے ختم ہوتے ہی علاء الدین روانہ ہوا اور برسات کے آغاز سے قبل ہی لوٹ آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہم کے وقت کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔

برنی کا سرسری بیان کہ علاء الدین نے اس مہم پر ایک سال کامل صرف کیا صحیح نہیں معلوم ہوتا دوسری معاصر تصنیفات سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ رنتھمبور کے محاصرہ کا ذکر کرتے ہوئے بھی برنی لکھتا ہے کہ قلعہ کا محاصرہ ایک سال تک جاری رہا۔[12] جبکہ خسرو قطعی تاریخیں متعین کرتے ہیں۔ برنی کے سنین عموماً غلط سلط ہوتے ہیں۔

لگ بھگ ساڑھے تین ماہ قبل سے جب علاء الدین نے کڑہ چھوڑا تھا۔ اس کے اور سلطان کے درمیان کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی تھی۔ فطری طور پر اس کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ جو لوگ اس کے منصوبوں سے آگاہ ہو جائیں      وہ اس کی عدم موجودگی میں یقیناً سلطان کے کان بھریں گے۔ دربار کے چند امرا کو بھی اس کے پر عزم منصوبوں کی سن گن نہیں ملی تھی البتہ صرف احمد چپ نے برملا اپنے شبہات کا اظہار کیا تھا اور اس کو صاف گوئی پر جھڑک دیا گیا تھا۔ بہر کیفیت یحییٰ کے بیان کے مطابق علاء الدین کی غداری کی خبر عام ہو گئی اور اس امر نے علاء الدین کو بوڑھے سلطان کے ساتھ تعلقات میں کافی محتاط بنا دیا۔[13] چنانچہ

(۱۱)۔ خسرو، نہ سپہر، ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص۵۵۵

(۱۲) برنی، ص۲۴۹

(۱۳) تاریخ مبارک شاہی، ص۶۸

جوں ہی وہ کنڑہ پہنچا اس نے اپنے چچا کو ایک خط بھیجا اس میں اس نے اپنی محبت اور وفاداری کا اظہار کیا تھا اور سلطان کی اجازت کے بغیر اس مہم کا بیڑا اٹھانے کی معافی مانگی تھی۔ اس خط میں اس نے دور دراز علاقہ میں اپنی غیر حاضری کے دوران اپنے خلاف اپنے دشمنوں کی سازش کے بارے میں اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا تھا۔ آخر میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ سارے خزانے اور ہاتھی سلطان کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ بشرطیکہ سلطان اپنے دستخط سے صرف ایک پروانۂ یقین دہانی بھیج دے کہ اس نے اپنے بھتیجے کی تمام غلطیاں معاف کر دی ہیں۔ اس لمحہ بھی جب کہ علاءالدین یہ پر فریب خط لکھ رہا تھا وہ اپنے تمام خزانوں کے ساتھ لکھنوتی[14] فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس اندیشے سے کہ کہیں جلال الدین پر لشکر کشی نہ کرے۔ ایسی ہی آفت ناگہانی کے اندیشہ سے اس نے ظفر خاں کو مشرق کی جانب بھیجا تھا تاکہ وہ اسرو (سرجو) عبور کرنے کے لیے بحری بیڑے کے انتظامات کر رکھے۔

کیلوگھڑی میں اپنی آمد کے صرف چند دنوں بعد جلال الدین کو علاءالدین کا خط ملا۔ دہلی کے زیادہ تر امرا اور سربرآوردہ اشخاص کو یہ علم ہو چکا تھا کہ علاءالدین ایک پر فریب کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ اس کے اس ارادے سے بھی واقف ہو چکے تھے کہ وہ بنگال میں ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن بیوقوف سلطان کو صحیح حالات سے آگاہ کرنے میں وہ اس خوف سے کتراتے تھے کہ کہیں ان کو اس کے غیر منصفانہ سلوک سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ جلال الدین نے اپنے بھتیجے کو ایک نہایت دلآویز اور تسلی بخش خط لکھا جس میں اس کی تمام کوتاہیوں کو معاف کر دیا اور اس کے لیے اپنی بے کراں محبت کا اعادہ کیا۔ اس خط کو پہنچانے کی ذمہ داری اس نے اپنے دو معتمد ترین امرار ملک عماد الملک اور ملک ضیاءالدین کو سونپی۔[15] جب وہ علاءالدین کے لشکر گاہ میں پہنچے تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کے بھولے بھالے آقا کو اس کا باغی اور احسان ناشناس بھتیجا کس طرح بیوقوف بنا رہا ہے۔ انھوں نے سلطان کو خبر بھیجنے کی کوشش ضرور کی لیکن بے فائدہ کیونکہ علاءالدین نے ان کی کڑی نگرانی کا انتظام کیا تھا۔

اسی اثنا میں برسات شروع ہو گئی۔ علاءالدین نے ایک اور پر فریب خط بھیجا لیکن اس بار اپنے بھائی الماس بیگ کو جو دربار میں آخور بیگ (گھوڑوں کے افسر اعلیٰ) کے عہدے پر فائز تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اب تک سلطان کا نافرمانبردار اور غیر وفادار رہا ہے اور اپنی کرتوت پر وہ اس قدر شرمندگی کا شکار ہے کہ کسی وقت بھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ

---

(۱۴)۔ برنی ص۲۲۲۔ علاءالدین صرف مشرق کا رخ کر سکتا تھا۔ مغرب میں سلطان تھا اور جنوب میں متعدد طاقتور ہندو راجہ تھے۔

(۱۵)۔ تاریخ مبارک شاہی۔ ص۶۵-۶۶۔

اس کے خدشات کا ازالہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ سلطان تنہا کڑہ آئے اور اس کو دربار میں اپنے ساتھ لے جائے۔ برنی کا بیان ہے کہ علاءالدین اور اس کے ہمنوا یہ سب کچھ سلطان کو دھوکے میں رکھنے کے لیے کر رہے تھے وہ جانتے تھے کہ سلطان کس قدر سادہ لوح اور لالچی ہے۔ الماس بیگ نے خط سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اپنے بھتیجے اور داماد کے غیر ضروری خدشات پر غم سے مغلوب ہو گیا۔ اس نے فوراً الماس بیگ کو کڑہ بھیجا تاکہ وہ علاءالدین کو تشفی دے اور خود اس کے پیچھے پیچھے جلد آنے کا وعدہ کیا۔ ایک ہفتہ کے عرصہ میں الماس بیگ کڑہ پہنچا اور اس کی آمد پر علاءالدین نے خوشی کے شادیانے بجانے کا حکم دیا۔

## جلال الدین کڑہ جاتا ہے

الماس بیگ کو کڑہ بھیجنے کے کچھ عرصہ بعد سلطان اپنے بھتیجے سے ملنے کے لیے اپنے بعض معتمد امراء کو اور ایک ہزار شہسواروں کے ساتھ کڑہ کے لیے عازم سفر ہوا۔ دبئی[۱۴] میں اس نے اپنے اور اپنے بعض ہمراہیوں کے لیے کشتیاں حاصل کیں اور احمد چپ کو فوج کے ساتھ خشکی کی راہ سے سفر کرنے کا حکم دیا۔ برنی لکھتا ہے کہ ایسے وقت جب کہ ہر جگہ دریا طغیانی پر تھے اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ موت جلال الدین کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور اس کو اس کے قاتل کے پاس کشاں کشاں لیے جا رہی تھی[۱۷]

۲۰ جولائی سنہ ۱۲۹۶ء (۱۷ رمضان سنہ ۶۹۵ھ) جمعہ کا دن تھا جب کڑہ میں شاہی جمعیت کو لانے والی کشتیاں نظر آئیں۔ علاءالدین نے اپنے خزانوں اور ہاتھیوں سمیت کڑہ چھوڑ کر گنگا پار دوسرے کنارے پر جا کر مانکپور کو اپنا صدر مقام بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ شاہی فوج کے اس حصہ کی زد سے وہ بچنا چاہتا تھا جو خشکی کے راستہ سفر کر رہی تھی اور جو کڑہ سے مانکپور کی طرف بغیر کشتی کے دریا عبور نہیں کر سکتی تھی۔ جوں ہی سلطان کا چتر دکھائی دیا علاءالدین نے الماس بیگ کو بھیجا کہ وہ سلطان کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے ساتھ آنے والی چھوٹی سی جماعت کو بھی اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔ سلطان سے ملاقات کی خاطر الماس بیگ ایک کشتی میں چلا گیا اور جب ان کی ملاقات ہوئی تو اس نے سلطان

(۱۴) - دبئی موجودہ ڈبائی ہے جو دہلی کے جنوب مشرق میں ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہ آج کل ایک شہر تحصیل ضلع بلند شہر میں ہے۔ امپیریل گزیٹیر جلد یازدہم ص ۳۲۱

(۱۷) برنی، ص ۲۳۲

(۱۸) ضیاءالدین برنی کہتا ہے کہ سلطان نے جب کڑہ کے لیے کوچ کیا تو اس کے ساتھ چند وفادار اور ایک ہزار سوار تھے۔ دہلی میں اس نے ایک ہزار سواروں پر مشتمل فوج کو احمد چپ کی سرکردگی میں خشکی کے راستہ سفر کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ سلطان نے صرف چند وفاداروں کے ساتھ کشتی میں سفر کیا لیکن عصامی کا بیان ہے کہ جب وہ کڑہ پہنچا تو اس کے بعض امیروں کے علاوہ ایک ہزار سپاہی بھی کشتی کے ذریعہ آ رہے تھے۔ برنی کی تاریخ میں سلطان جلال الدین کے ساتھ کڑہ جانے والے سپاہیوں کی تعداد میں کچھ گڑبڑ پائی جاتی ہے۔

کو غیر مسلح کرنے کے لیے ہزاروں پر فریب جتن کر ڈالے اس نے سلطان کو آمادہ کر لیا کہ وہ جماعت کو اپنے پیچھے رہ جانے کا حکم دے۔ جب خود اس کی کشتی دوسرے کنارے کی طرف لے جائی گئی۔ اس وقت صرف دو کشتیاں رہ گئی تھیں جو سلطان اور اس کے بعض چیدہ امیروں مثلاً ملک خرم وکیل در، ملک فخر الدین کوچی، ملک اباجی آخور بیگ، ملک جمال الدین (برنی کمال الدین کہتا ہے) ابوالمعالی، ملک نصیر الدین کہرامی، ملک اختیار الدین نائب وکیل در اور ترمتی طشت دار کو لے جا رہی تھیں[19]۔ غدار الماس بیگ نے ایک اور التماس کی "عالیجاہ، ان چند امیروں اور چیدہ وفاداروں کو جو کشتیوں میں بیٹھے ہیں حکم دیں کہ وہ اپنے ہتھیار اتار ڈالیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ کنارے پر پہنچیں تو میرے بھائی کی نظر ان پر پڑ جائے اور وہ خوفزدہ ہو جائے"۔ اس نامعقول درخواست سے بھی احمق سلطان کو شک و شبہ نہیں ہوا کیونکہ اس کے بھتیجے کی محبت نیز سونے کی طمع نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا[20]۔ اس نے امیروں کو ہتھیار اتار کر رکھ دینے کا حکم دیا۔ انھوں نے اس کی تعمیل کی۔ بہرحال جب کشتیاں کنارے کے قریب پہنچیں تو وہ اور اس کے ساتھی مشکل ہی سے اپنی آنکھوں پر یقین کر سکے۔ انھوں نے علاء الدین کی فوجوں کو جنگی ترتیب و تنظیم کے ساتھ صف آرا پایا۔ فوج ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے باقاعدہ تیار تھے اور سپاہیوں کے دستے مختلف مقامات پر متعین تھے۔ جلال الدین کے رفیقوں نے بخوبی دیکھ لیا کہ الماس بیگ نے اپنی چرب زبانی سے سلطان کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔ ملک خرم وکیل در نے چپ چاپ رہ کر باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور الماس بیگ سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ تم نے سب کے ہتھیار اتروا دیے لیکن علاء الدین کی فوجیں اسلحہ سے لیس ہیں گویا کہ جنگ کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ اس پر غدار نے جواب دیا کہ اس کا بھائی سلطان کا شاہانہ استقبال کرنا چاہتا ہے اسی استقبال کے دوران دیوگیری سے لائی گئی تمام دولت پورے تزک و احتشام کے ساتھ اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے گی۔ خوفزدہ اور سراسیمہ افراد اور حد سے زیادہ اعتماد رکھنے والے سلطان نے بہت سے سوالات پوچھے۔ الماس بیگ نے ان کا جواب گول مول دیا۔ سادہ لوح سلطان نے اپنا سر قرآن کریم پر جھکا دیا اور اپنا سفر اس طرح جاری رکھا جیسے کہ "ایک باپ اپنے بیٹے کے گھر اپنے دماغ میں کسی شک و شبہ یا خوف کے بغیر جاتا ہے"[21]۔

---

۱۹۔ یہ فہرست تاریخ مبارک شاہی ص ۶۹ میں دی گئی ہے۔ برنی کسی نام کا ذکر نہیں کرتا ہے

۲۰۔ برنی ص ۲۳۰

۲۱۔ برنی ص ۲۳۴

لیکن امرا نے آنے والے خطرے کو صاف دیکھ لیا تھا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ سورۂ یٰسین پڑھنے لگے تھے[۲۲]۔ اور اس طرح غمزدہ جماعت اپنی موت سے ملاقات کے لیے رواں دواں رہی۔

**سلطان کا قتل**

آخر کار کنارا آ پہنچا۔ بہ ظاہر علاء الدین اپنے چچا کا استقبال کر کے بہت مسرور ہوا۔ جیسے ہی کشتی کنارے سے لگی۔ علاء الدین آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں میں گر پڑا۔ جلال الدین نے اس کو اٹھایا اور نہایت شفقت آمیز لہجہ میں اس سے مخاطب ہوا۔ سلطان نے علاء الدین کو یاد دہانی کرائی کہ "میں نے تم کو بچپن سے پالا اور اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ کیا میں نے تم کو اس لیے پروان چڑھایا ہے اور ایک منصب کے بعد دوسرے منصب پر اس لیے ترقی دی ہے کہ تم کو قتل کر دوں؟ تم مجھے ہمیشہ اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز رہے ہو اور اب بھی اتنے ہی عزیز ہو۔ دنیا بدل سکتی ہے مگر تم سے میرا رشتہ نہیں بدل سکتا اور تمہارے لئے میری محبت کم نہیں ہو سکتی۔"[۲۳] اپنے بھتیجے سے یوں خطاب کر کے سلطان جلال الدین نے علاء الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اس کو اپنی کشتیوں کی طرف لے چلا۔ عین اس وقت نصرت خاں نے پہلے سے طے شدہ اشارہ کیا[۲۴]۔ اور سامانہ کا محمود سالم اپنی تلوار لے کر سلطان پر حملہ آور ہوا لیکن وار اوچھا پڑا اور اس کا اپنا ہاتھ کٹ گیا۔ درد سے تلملاتے ہوئے اس نے دوسرا وار کیا اور بوڑھے سلطان کو زخمی کر دیا۔ ناگہانی حملہ پر ششدر اور کرب سے تلملاتا ہوا سلطان اپنی کشتی کی طرف دوڑا اور کہتا جاتا تھا کہ "اوہ، علاء یہ تو نے کیا کیا!" دوسرا کرایہ کا قاتل اختیار الدین ہود سلطان کی جانب لپکا، اس کو زمین پر دے پٹخا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور اسے اس کے غدار اور احسان ناشناس بھتیجے کے سامنے پیش کیا۔[۲۵]

(۲۲) سورۂ یٰسین مشکل، مصیبت یا موت کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

(۲۳) برنی صـ۲۳۴

(۲۴) برنی، ایضاً

(۲۵) فرشتہ اور نظام الدین کہتے ہیں کہ سلطان جب کڑہ کی جانب رواں دواں تھا اس وقت علاء الدین کڑہ کے ایک مشہور بزرگ حضرت کرک کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں آداب بجا لایا۔ درویش نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کہا:

ہر کس کہ با تو کند جنگ — تن در کشتی سر در گنگ

(جو شخص تجھ سے لڑے گا اس کا تن کشتی میں اور سر گنگا میں ہوگا)

یہ پیش گوئی جلد ہی صحیح ثابت ہوئی۔ شیخ کرک کڑہ میں مدفون ہیں اور مسلمان ان کے مزار سے اب بھی بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔

نیز ملاحظہ ہو بیل، اورینٹیل بایوگرافکل ڈکشنری، صـ۲۶۴

یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ سوائے ملک فخر الدین کے اور تمام لوگ جو سلطان کے ساتھ تھے یا تو غرق کر دیئے گئے یا تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔[26]

اس وحشیانہ جرم کا ارتکاب ۲۰ رجولائی ۱۲۹۶ء (۱۷ ررمضان ۶۹۵ھ) بروز جمعہ ہوا۔[27]

---

(۲۶) علاءالدین کی تخت نشینی کے وقت فخر الدین کوچی کو داد بیگ حضرت کے عہدہ پر ترقی دی گئی،

برنی ص۲۴۸؛ فرشتہ ص۱۰۲

بدایونی کا یہ بیان کہ "ملک فخر الدین کوچی ان کے ہاتھ زندہ لگا اور مار ڈالا گیا" قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

رینکنگ، جلد اول ص۲۴۳

(۲۷) علاءالدین کے دماغ میں سلطان کو مار ڈالنے کا خیال کب آیا؟ یہ یقینی امر ہے کہ دیوگیری سے واپسی کے بعد اس نے بادشاہ کی زندگی پر وار کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا تاہم رام چندر کو دہلی کے بجائے کڑہ خراج بھیجنے کی اس کی ہدایت متوقع بغاوت کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن سلطان کے نام اس کے خطوط اس کے ان خدشات کا بھی اظہار کرتے ہیں جو وہ دربار میں موجود اپنے مخالف امرا کے بارے میں رکھتا تھا۔ چنانچہ اگر احمد حبیب جیسے لوگ سلطان کو سخت اقدام کرنے کی ضرورت سمجھانے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو اس صورت میں اس نے بنگال کی طرف راہ فرار اختیار کرنے کی پوری تیاریاں کر لی تھیں لیکن جب اس نے سلطان کو یکہ و تنہا کڑہ آتے دیکھا تو اس نے اس کو قتل کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا اس نے الماس بیگ سے کہا تھا کہ "ترک عزم لکھنوتی گیرم یعنی سلطان جلال الدین از طمع مال، پیل کور دکر گشتہ دخود ...... خواہد آمد"

(میں نے لکھنوتی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سلطان جلال الدین مال و دولت ہاتھی اور زر و جواہر کے لالچ میں اندھا ہو گیا ہے ...... وہ خود آئے گا۔)، برنی ص۲۳۰

مآثر رحیمی کا مصنف اس خیال کو بہت واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"یاز بخاطر او رساند کہ سلطان جلال الدین بطمع اسپ و فیل و مال جریدۂ پیش ما خواہد آمد۔ کار او بسازیم و بملک گیری پردازیم۔ چہ لازم کہ لکھنوتی باید رفت۔"

(بعد میں اس کی توجہ اس جانب مبذول کی گئی کہ سلطان جلال الدین گھوڑوں، ہاتھی اور دولت کے لالچ میں ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔ ہم اس کو ختم کر دیں گے اور اس کی بادشاہت پر قبضہ کر لیں گے۔ پھر لکھنوتی جانے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟)

چنانچہ قتل کا ارادہ عین وقت پر ہوا تھا۔ مگر ایک بار جب جرم کا ارتکاب ہو چکا تو علاءالدین اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ بہرکیف اس کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اپنے چچا کے خلاف اپنی کرتوت کو اس

### علاءالدین کی تخت نشینی

برنی لکھتا ہے کہ "مقتول سلطان کے کٹے ہوئے سر سے ابھی خون ٹپک رہا تھا کہ علاءالدین کے سر پر چتر شاہی سایہ فگن ہوا۔ اس کے سلطان ہونے کا اعلان ہوا۔" جس وقت فیل نشین افسر اس کی تخت نشینی کا اعلان کر رہے تھے۔ جلال الدین کا سر معمولی مجرم کی طرح نیزے پر بلند کر کے کڑہ اور مانکپور کی گلیوں میں گشت کرایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اسے اودھ (ایودھیا) بھیجا گیا تاکہ عوام کے مشاہدہ کے لیے پیش کیا جائے۔[38] کڑہ میں علاءالدین نے اپنے حامیوں کو خطابات اور اعزازات سے نوازنا شروع کیا۔ اس نے اپنے بھائی الماس بیگ کو الغ خان، ملک ہزبرالدین کو ظفر خاں، ملک سنجر کو الپ خاں اور ملک نصرت جلیسری کو نصرت خاں کے خطابات سے نوازا۔ اس نے کم اہم لوگوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا اور وفادار اور معتمد امرا اور ہر ملک کو زیادہ تر اعلیٰ مناصب پر ترقی دی۔

لیکن نوجوان بادشاہ کو ان رسمی تقریبات پر زیادہ وقت برباد کرنے کا موقع نہیں تھا۔ سلطنت کا دارالخلافہ ابھی تک مرحوم سلطان کے بیٹوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے اس نے تیزی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ با اثر امرا کو نئی فوجی بھرتی کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں پیشگی دی گئیں۔ کچھ دنوں تک بارشوں نے اور اس خوف نے کہ کہیں ارکلی خان ملتان سے پیش قدمی نہ کرے، علاءالدین کو فوراً دہلی کی جانب کوچ کرنے سے باز رکھا۔ وہ ارکلی خان سے خاص طور سے خائف تھا کیونکہ وہ "رستم زمانہ" کے نام سے معروف تھا اور اس کی فوجی صلاحیتوں کو وہ بذات خود ملک چھجو کی بغاوت کے دوران دیکھ چکا تھا۔ جب اس نے سنا کہ ارکلی خان دہلی نہیں آیا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ جلال الدین کے جانشین کی نااہلی، دہلی کے خزانے کے خالی ہونے کی وجہ سے تازہ افواج بھرتی کرنے میں اس کی ناکامی اور ملکہ جہاں کی عدم مقبولیت پر تکیہ کر کے علاءالدین نے بھری برسات میں راجد ھانی کی طرف پیش قدمی کرنے کا تہیہ کر لیا۔

### جلال الدین کے قتل کے بعد کی دہلی

جلال الدین کی شہادت کے فوراً بعد ملک احمد چپ راجدھانی کو واپس ہو گیا تھا اور اس نے اس بھیانک

(باقی گزشتہ کا) بے شرمی سے جائز قرار دینے کی کبھی کوشش نہیں کی جیسی اورنگ زیب نے اپنے باپ کے خلاف کی تھی۔ اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ لوگ اسے فراموش کر دیں۔ برنی صریحاً اس کرتوت کی مذمت کرتا ہے۔ امیر خسرو اس کی کوئی وضاحت نہیں کرتے۔

(۳۸)- برنی ص ۲۳۶-۲۳۵

ایسی کی خبر سنا کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اب بادشاہ کی موت پر آنسو بہانے کے لیے ملکہ جہاں کے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ ذرا سا بھی وقت ضائع ہونے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کے شوہر کا تخت اس کے قاتل کی طرف منتقل ہو جاتا۔ وہ ایک حوصلہ مند عورت تھی۔ وقت ضائع کیے بغیر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے قدر خان کے سلطان رکن الدین ابراہیم کے لقب سے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ "شاہ مادر" اور اس کے بیٹے نے کیلوکھری کو چھوڑ کر قصر سبز (سبز محل) میں قیام کیا۔ ملکہ نے اپنے (بیٹے کے) نام پر حکومت کرنی شروع کر دی، وہ عرضیاں قبول کرتی اور احکام جاری کرتی تھی۔[۲۹]

ملتان میں ارکلی خان کو اپنی ماں کی اس بے انصافی پر سخت برہمی تھی کہ اس نے اس کے حقوق نظر انداز کر دیئے۔[۳۰] جلال الدین کی زندگی ہی میں اس کو ماں سے کچھ اختلاف رہا تھا لیکن اب اس اقدام نے اس کو اتنا زیادہ برہم کر دیا کہ وہ ملتان ہی میں رہا اور تخت پر اپنا دعویٰ جتانے کے لیے دہلی نہیں آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارکلی خاں بہادر تھا لیکن ضدی اور چڑچڑا تھا اور وہ اپنے ماں باپ کا پیارا بھی نہیں تھا۔[۳۱]

یہ وہ حالات تھے جنھوں نے علاء الدین کو دہلی کی طرف فوراً روانہ ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ اس سال ایسی موسلا دھار بارشیں ہو رہی تھیں کہ "گنگا اور جمنا دریا سمندر بن گئے تھے اور ہر چھوٹا نالہ گنگا یا جمنا معلوم ہوتا تھا۔" کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے سڑکیں ناقابل عبور بن گئی تھیں۔ تاہم علاء الدین نے خیمے اکھاڑ دیئے اس نے اپنے افسروں اور امراء کو ایک بڑی فوج اکٹھا کرنے کے لیے بہترین

---

(۲۹) برنی نے ملکہ جہاں کے ساتھ بہت سخت رویہ اپنایا ہے۔ وہ اس کو "احمقوں میں احمق ترین" گردانتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اس کو حکومت کرنے کی خواہش تھی۔ بہر حال تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہ کے قتل کے بعد جانشینی کے مسائل یقیناً بہت پیچیدہ ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے بغیر حکومت کا کاروبار بہت دنوں تک نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ارکلی خان بہت دور تھا اور ملتان سے اس کے آنے میں کافی وقت درکار ہوتا۔ ملکہ جہاں اور اس کے چند امرا اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اگر فوراً کسی کے بادشاہ ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا تو علاء الدین دہلی پر فوج کشی کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گا۔ مزید برآں قدر خان پہلے سے ہی لاڈلا تھا اور ماں باپ کا بہت زیادہ لاڈلا تھا۔ برنی صفحہ ۱۷۶-۱۷۷، مفتاح الفتوح ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم صفحہ ۵۳۔

(۳۰) برنی صفحہ ۲۳۸-۳۹

(۳۱) بدایونی، رینکنگ، جلد اول صفحہ ۲۳۶

کوششیں صرف کرنے اور زیادہ سے زیادہ تنخواہیں مقرر کرنے کے لیے پرواہ نہ کرنے کی ہدایت کی۔ مزید براں ایک چھوٹی سی منجنیق تیار کی گئی اس سے ہر منزل پر پانچ من سونے کی مہریں پھینکی جاتیں۔[33] دولت کی اس بے تحاشا فضول خرچی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور "فوجی اور غیر فوجی" لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہونے لگے۔ جب علاء الدین بدایوں پہنچا تو اس کی فوج ۵۶ ہزار سوار اور ساٹھ ہزار پیادہ کی کثیر تعداد تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں اس نے اصل فوج کا ایک دستہ الگ کیا اور اس دستہ کو ظفر خاں کی سرکردگی میں دے کر کول (موجودہ علی گڈھ) کے راستہ دہلی کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا۔ وہ خود بدایوں کے راستہ اصل فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس نے ظفر خان کو اپنی فوج کی تیز رفتاری کی طرح پیش قدمی کی ہدایت کی تاکہ ایک ہی وقت میں پایۂ تخت پر افواج اکٹھی ہو سکیں۔

جلد ہی علاء الدین برن (موجودہ بلند شہر) پہنچا جہاں اس نے مزید سپاہی بھرتی کیے۔ نصرت خاں نے شہر کی مسجد کے صحن میں ایک اجتماع سے خطاب کیا اور ہر عام و خاص کو اپنے جھنڈے تلے جمع ہو جانے کے لیے اکسایا۔[34] اس نے کھلم کھلا کہا کہ جو کچھ وہ بے دریغ لٹا رہا ہے اگر دہلی کے اس ہاتھ آگئی تو وہ اس کا سو گنا حاصل کرے گا اور اگر اتفاقاً وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا تو یہ بہتر ہے کہ دیوگری سے حاصل شدہ دولت لوگوں میں تقسیم ہو جائے بجائے اس کے کہ وہ اس کے حریفوں کے ہاتھ لگے۔[35] بہر حال دہلی پر قبضہ کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کہ علاء الدین کا خیال تھا۔ جس وقت وہ برن میں خیمہ زن تھا۔ بعض سربرآوردہ جلالی امراء مثلاً تاج الدین کوچی، اماجی آخور بیگ، امیر علی دیوانہ، عثمان امیر آخور، امیر کلاں، عمر سرخہ اور ہرنمار جن کو پیش قدمی کرتے ہوئے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا دشمن سے مل گئے۔ اپنے غدارانہ اور شرمناک رویہ کے معاوضہ میں ان میں سے ہر ایک کو بیس تیس بلکہ پچاس من سونا علاء الدین کی جانب سے ملا۔ اس نے ایسے مواقع پر مصلحتاً انتہائی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ ان امیروں کے ساتھ جو سپاہی آئے تھے ان کو بھی فی کس سو تنکے دیئے گئے۔ یہ بدعہد امرا علانیہ کہتے پھرتے تھے کہ "شہر (دہلی) کے لوگ ہمیں یقیناً قصوروار ٹھہرائیں گے اور کہیں گے کہ ہم پہلے درجہ کی احسان فراموشی کے مجرم ہیں۔ ..... لیکن یہ ناعاقبت اندیش یہ نہیں سمجھتے کہ جلال الدین کی بادشاہت کا دراصل اسی دن خاتمہ ہو گیا تھا جس دن وہ کیلوگھڑی کے محل سے نکلا تھا اور اپنی مرضی سے کڑہ گیا تھا اور وہاں اس نے

(۳۳) برنی، صفحہ ۲۲۳ میں "ہر روز پنج من اختر زر" (ہر روز پانچ من سونے کے ستارے) ہے۔

(۳۴) برنی، صفحہ ۲۲۳

(۳۵) برنی، صفحہ ۲۲۴

ے "منجنیق" ، دن اٹھانے کا ایک جنگی حربہ یا مشین ہوتی ہے۔

اپنی اور اپنے قریبی وفاداروں کی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ ہم علاءالدین سے مل جانے کے سوا اور کیا کرسکتے تھے؟[34] سرکردہ جلالی امرا کی غداری دہلی لشکرگاہ میں ایسا ناقابل تلافی رخنہ تھا جس کی بنا پر سلطان رکن الدین ابراہیم کے دعوی کی ناکامی ناگزیر ہوگئی تھی۔ دہلی میں موجود امرا کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس کی ہمدردیاں شاہ مادر کے لیے اس بنا پر پہلے ہی ختم ہوگئی تھیں کہ اس نے ارکلی خاں کی حق تلفی کرکے بے انصافی کی تھی۔ ایک دوسرا طبقہ مرحوم بادشاہ کے بیٹوں اور اس کے بھتیجے کی وفاداری کے درمیان ڈانواڈول تھا۔

ایسے نازک لمحہ میں جب کہ جلالی گروہ پوری طرح پراگندگی کا شکار تھا اور ملکۂ جہاں کو کامیابی کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی اس نے ملتان سے ارکلی خاں کو بلایا۔ اس نے لکھا "تمھاری زندگی میں تمھارے چھوٹے بھائی کو تخت نشین کرکے میں نے غلطی کی ہے کیونکہ ملک اور امیر کے دل میں اس کا کوئی رعب نہیں ہے اور ان میں سے اکثر نے علاءالدین سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے اقتدار اعلی اب ہمارے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ لہذا اگر تم جلدی کرسکو تو فوراً آجاؤ ..... اور تخت پر متمکن ہوجاؤ۔"[24]

ارکلی خاں کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ صورت حال مایوس کن ہوچکی ہے اس کے علاوہ اس کے دل میں اپنی ماں کے خلاف جو غبار تھا اس نے بھی اس کو دہلی جانے اور ایک ہاری ہوئی بازی کھیلنے سے باز رکھا۔ اس نے ایک گول مول جواب بھیجا کہ "تمام امرا اور ان کے سپاہی چونکہ دشمن سے جاملے ہیں لہذا میرے آنے سے کیا فائدہ؟"

ارکلی خاں کے آخری جواب کی خبر جب علاءالدین کو پہنچی تو اس نے خوشی کے شادیانے بجانے کا حکم دیا۔ وہ سونے کی بارش کرتا اور اپنے حامی اکٹھا کرتا ہوا دریائے جمنا کے قریب پہنچا جہاں اس نے مرحوم بادشاہ کے دوسرے بہت سے امرا کو ان کے ہاتھ سونے سے گرم کرکے اپنا ہمنوا بنا لیا۔ دریا طغیانی پر ہونے کے سبب علاءالدین کی پیش قدمی کچھ دیر کے لیے رک گئی۔ لیکن جیسے ہی سیلاب اترا۔ اس نے باغپت[38] کے گھاٹ پر جمنا پار کی اور اس کے ایک کنارے پر خیمہ زن ہوا۔[39] رکن الدین کو کامیابی کی بہت کم امید تھی تاہم اس نے اپنے عم زاد سے جنگ کرنے کے لیے فوجوں کو صف آرا کیا۔

(۳۶) ایضاً، ص ۲۴۶-۲۴۵  (۳۷) برنی، ص ۲۴۵

(۳۸) برنی کے متن میں کتہ ہے لیکن غلطی سے یہ لفظ یقیناً موجودہ باغپت صحیح ہے۔ باغپت دہلی کے شمال میں جمنا پر واقع اور ضلع میرٹھ میں ہے۔

(۳۹) برنی ص ۲۴۶ میں "در صحرا جود" (جود کے صحرا میں) ہے۔ جود وہ جزاں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا جو بعد

لیکن معرکے سے قبل ہی شام کو اس کی شکستہ فوج کا میسرہ کھلم کھلا دشمن سے جا ملا۔ اس کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ اپنی جان خطرہ میں پاکر وہ شاہ مادر اور احمد چپ اور الغو جیسے بعض خیر خواہوں کے ساتھ چپکے سے راجدھانی کے غزنی دروازہ سے نکل کر فرار ہو گیا۔[41] شاہی خاندان کی افسوسناک حالت پر ہر خاص و عام کو قلق تھا اور دہلی کے لوگ چند روز تک بہت افسردہ رہے۔[42]

## علاء الدین کی تاج پوشی

۲۰ اکتوبر ۱۲۹۶ء (۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ) کو علاء الدین ایک فاتح کی حیثیت سے راجدھانی میں داخل ہوا۔[43] شہر کے بڑے بڑے امراء قضاۃ قلعہ کے کلید بردار اور دوسرے اہم اور سربرآوردہ لوگ اس کا استقبال کرنے کے لیے شہر سے باہر آئے جس کی بنا پر زمین کا گویا رنگ و روپ ہی بدل گیا۔ نئے تخت نشین ہونے والے بادشاہ نے ابو المظفر سلطان علاء الدنیا والدین محمد شاہ خلجی کا لقب اختیار کیا۔ وہ کوشک لعل یا سرخ محل میں فروکش ہوا۔[44] جہاں اس سے قبل سلطان غیاث الدین رہتا تھا۔ قدیم روایت کے مطابق علاء الدین کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس کے نام کے سکے ڈھالے گئے۔ اس مبارک موقع پر جشن منانے کے لیے عام طور سے لوگوں کو اکرام و انعام سے نوازا گیا اور کچھ عرصہ کے لیے شراب و حسن، موسیقی و عیش و طرب روزمرہ کا معمول بن گیا بازاروں میں شہ نشین تعمیر کیے گئے اور شراب، شربت اور پان مفت تقسیم کیے گئے۔ فوج کو چھ ماہ کی تنخواہ بطور انعام دی گئی۔ مشائخ و علما کو عطیات اور وظائف سے مالا مال کیا گیا اور شاہی بخشش سے ہر ادنیٰ

---

میں جون کا املا غلط لکھا گیا ہے۔ فارسی تاریخوں میں اس کا ذکر کثرت سے آیا ہے اور تاج المآثر میں اس کو یکساں طور پر جون لکھا گیا ہے۔ جون دریائے جمنا کا مرادف ہے۔ شہر کا وہ دروازہ جو دریا کی جانب کھلتا تھا جون دروازہ کہلاتا تھا اور صحرائے جون وہ قطعۂ اراضی تھا جو دریا اور جون دروازہ کے درمیان واقع تھا۔

(۴۱) رکن الدین ابراہیم نے صرف ایک ماہ کی مدت تک حکومت کی۔ بدایونی، ریکنگ، جلد اول صفحہ ۲۳۲

(۴۲) فتوح، صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶

(۴۳) یہ تاریخ امیر خسرو نے دی ہے (خزائن الفتوح، الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ، صفحہ ۷، ترجمہ حبیب صفحہ ۳)۔ برنی کوئی قطعی تاریخ نہیں بیان کرتا بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ علاء الدین کی تاج پوشی ۶۹۵ھ کے اواخر میں ہوئی۔ علاء الدین کی تاج پوشی دو بار ہوئی تھی۔ پہلی کڑہ میں جلال الدین کے قتل کے فوراً بعد ۱۶ رمضان ۶۹۵ھ (خسرو) یا ۱۹ رمضان ۶۹۵ھ (برنی) کو اور دوسری دہلی میں اس وقت جب علاء الدین تمام دشواریوں پر قابو پا چکا تھا۔

(۴۴) یہ محل بلبن نے تقریباً ۶۶۵ھ میں تعمیر کرایا تھا

اعلیٰ کو وافر حصہ ملا۔ دولت کی ایسی فیاضانہ تقسیم اور بے دریغ سخاوت نے لوگوں کو مرحوم بادشاہ کا قتل فراموش کرنے میں مدد دی۔[44]

علاء الدین نے ایک دور اندیش سیاستداں کی طرح جلالی امیروں کو ملک کے اعلیٰ مناصب دے کر ان کا تعاون حاصل کر لیا۔ پرانی حکومت کے بعض سرکردہ اشخاص اور بعض اس کے محبوب امرا کی مخلوط وزارت قائم کی گئی۔ جلال الدین کے مشہور خواجہ جہاں (وزیر اعظم) خواجہ خطیر کو ان کے سابقہ عہدے پر بحال رکھا گیا۔ قاضی صدر ملک (چیف جسٹس) ملک عمدۃ الملک کو دیوان انشا (وزیر خارجہ) مقرر کیا گیا اور اس کے دو بیٹوں حمید الدین اور اعزاز الدین میں سے پہلے کو دربار کے مصاحبوں میں شامل کیا گیا اور دوسرے کو محکمۂ انشا کا نگراں مقرر کیا گیا۔ سید اجل کو شیخ الاسلام اور خطیب کے عہدے پر برقرار رکھا گیا۔ نصرت خاں جلیسری کو کوتوالِ دہلی اور ملک فخر الدین کوچی کو داد بیگ حضرت (پایۂ تخت کا جج) مقرر کیا گیا۔ سلطان جلال الدین کے ایک امیر ملک [illegible] کو شاہی اصطبلوں کا محافظ (آخور بیگ) بنایا گیا اور ملک ہرنمار کو نائب محافظ (نائب باربک) کا عہدہ تفویض ہوا۔ ہزبر الدین ظفر خاں[45] کو جس نے بعد میں اپنے آپ کو اس اعلیٰ عہدہ کے لائق ثابت کر دکھایا، وزیر جنگ (عارض ممالک) مقرر کیا گیا۔ مورخ ضیاء الدین برنی کے چچا ملک علاء الملک کو کڑہ کا گورنر اور اس کے علاوہ مؤید الملک کو برن کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ملک جونا نائب وکیل در کے اپنے پرانے عہدہ پر برقرار رہا[46]

## علاء الدین کو درپیش مسائل

شہر اور دربار میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن ملک کی عام حالت نئے بادشاہ کے لیے باعث پریشانی تھی۔ اس وقت ہندوستان ایک بحران سے گزر رہا تھا۔ مغول تقریباً ہر سال شمال مغرب میں لوٹ مار کی مہمیں بھیجتے تھے۔ انتشار کا دوسرا عنصر پنجاب میں کھکھڑوں کی موجودگی تھی۔ ملتان اور سندھ کی جنوبی سمت میں گجرات جو فی الواقع ایک خود مختار بادشاہ کی طرح حکومت کر رہا تھا۔ سندھ کی جنوبی سمت میں گجرات کی خوش حال سلطنت واقع تھی جس پر بگھیلا راجپوت حکمراں تھے۔ گجرات سے ملحق راجپوتانے کی مختلف ریاستیں تھیں جو سب کی سب خود مختار اور سلطنت سے کٹی ہوئی تھیں۔ کوئی مسلمان حکمراں ان میں کسی ایک ریاست کو بھی مکمل شکست دینے یا زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف چتوڑ اور رنتھمبور جیسی سلطنتوں کی موجودگی سلطنت کے

---

(44) فرشتہ صفحہ [illegible]؛ بریگس جلد اول صفحہ ۳۲۲

(45) بدایونی ہزبر الدین نام بتاتا ہے۔ یحییٰ اس کا نام یوسف بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ علاء الدین کی بہن کا لڑکا تھا۔ تاریخ مبارک شاہی، صفحہ [illegible]

(46) برنی صفحہ [illegible]؛ فرشتہ صفحہ [illegible]۔

اقتدار کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج تھی۔ وسطی ہند میں مالوہ، دھار، اجین، اور بندیل کھنڈ کا وسیع علاقہ اس وقت تک مسلم اقتدار کے دائرہ سے خارج رہا تھا اور وہ پورے طور پر خود مختار تھا۔ وہ پورا خطہ جو اب بہار، بنگال اور اڑیسہ پر مشتمل ہے۔ ہندو رلجاؤں یا خود مختار مسلمان بادشاہوں کے قبضہ میں تھا۔ بنگال میں بلبن کے ایک بیٹے ناصر الدین محمود نے اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے آزادانہ حکومت قائم کر رکھی تھی۔ ملک کے زرخیز ترین علاقہ دوآب میں میرٹھ سے پیلی بھیت تک پورے خطہ کی پٹی اور اس کے ساتھ ساتھ شمال میں کمایوں کا نیم پہاڑی خطہ سرکش جاگیردار سرداروں کے قبضہ میں تھا جو ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اودھ، وارانسی (بنارس) اور گورکھپور کے علاقوں میں دہلی کا اقتدار ابھی تک مکمل طور سے مستحکم نہیں ہوا تھا۔ پھر وندھیاچل پہاڑیوں کے جنوب میں مسلمان فوجوں نے ابھی تک کوئی سلطنت فتح نہیں کی تھی۔ علاء الدین نے دیوگیری پر چڑھائی ضرور کی تھی لیکن جیسے ہی اس نے شمال کا رخ کیا۔ یادو حکمرانوں نے رفتہ رفتہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور وقار پھر سے حاصل کر لیا۔ وارنگل، دوار سمدر کی طاقتور سلطنتوں نے اور ان ریاستوں نے جن پر چولا، چیرا اور پانڈیہ فرمانرواؤں کی حکومت تھی کسی مسلم حملہ آور کا نام تک نہیں سنا تھا۔

ملک کی یہ حالت تھی اور اسی کے ساتھ اتحاد، نظم و نسق اور دفاع کے مسائل تھے جنھیں نئے بادشاہ کو حل کرنے کی ضرورت تھی۔ جلال الدین کے بیٹے ابھی تک زندہ تھے اور کسی لمحہ بھی خطرناک طاقت بن سکتے تھے۔ علاء الدین کو پیش نظر مسائل میں سب سے اہم مسئلہ مرحوم بادشاہ کے بچے کھچے اقربا اور اعزہ کی سرکوبی تھی۔ اس کے علاوہ امیروں کے ایک ایسے گروہ سے نمٹنے کا کام بھی باقی تھا جو بادشاہ کے خلاف سازشیں کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ منگول حملہ آوروں کے خلاف سرحدوں کا دفاع کرنے کا فرض بھی کچھ کم اہم نہیں تھا جنھوں نے ہندستان کی فتح کو مقصود و مطلوب بنا لیا تھا اور دو ایک مواقع پر تو وہ دہلی تک در آئے تھے۔ سو اگر سلطان اپنی طاقت مستحکم کرنا اور ملک میں مسلم حکومت کو دوام بخشنا چاہتا تھا تو اس کے لیے آزاد ریاستوں کی فتح بھی ضروری تھی۔ اس عہد کی سلطنت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ کسی نئے حکمراں خاندان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سلسلۂ فتوحات کا از سر نو اعادہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ گجرات، چتوڑ، رنتھمبور، دکن اور بنگال سب کو بار بار فتح کرنا پڑتا تھا۔ دراصل راجپوتانے کی تسخیر وہ کسوٹی ہے جس پر دہلی کے ہر سلطان کو پرکھنا چاہیے۔ علاء الدین کی تخت نشینی کے وقت شمالی ہند کا اکثر حصہ اور پورا دکن مسلم اقتدار کے دائرہ سے خارج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے ہندستان کی فتح بادشاہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اور اس کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ ان سب پر مستزاد مضبوط اور مستعد بنیادوں پر انتظامیہ کے قیام کا مسئلہ تھا۔ بڑے زمیندار روز افزوں خطرہ تھے۔ مقامی نظم و نسق اور مرکزی حکومت کے درمیان بہت

کم ربط ہونے کے سبب خوط اور مقدم جیسے مقامی افسروں کو آزادی سے کافی فائدہ اٹھانے کا موقع تھا۔ سلطان کو ایسے طریقے اور ذرائع تلاش کرنے تھے جن سے انھیں قابو میں لایا جا سکے اور ان کی خدمات کو ریاست کے بہترین مفادات میں استعمال کیا جا سکے۔

# باب 5

# ملتان ـــــ گجرات ـــــ بنگال

**ملتان سے ارکلی خان کا اخراج**

دہلی میں اپنے آپ کو پوری طرح سے مستحکم کر لینے کے بعد علاءالدین نے جلال الدین کے زندہ باقی رہ جانے والے بیٹوں کے خاتمہ کا بیڑا اٹھایا۔ رکن الدین ابراہیم دہلی چھوڑنے کے بعد اپنے بڑے بھائی ارکلی خان سے ملتان میں جا ملا تھا۔ اور ایک دور دراز صوبے میں خاصی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور تخت کا دعوی کر کے وہ کسی دن بے اندازہ خطرہ کا سرچشمہ بن سکتے تھے۔ علاءالدین نے اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر چونکہ ابھی حال ہی میں اس کی تاجپوشی ہوئی تھی لہٰذا اس نے ملتان پر بذات خود چڑھائی مناسب نہیں سمجھی اور اپنے دو معتمد جنرل الغ خاں اور ظفر خاں کو مہم کی قیادت کرنے کے لیے نامزد کیا۔ تیس سے چالیس ہزار تک کی طاقتور فوج کے ساتھ وہ نومبر ۱۲۹۶ء (محرم ۶۹۶ھ) میں ملتان کے لیے روانہ ہوئے[1] وہاں پہنچ کر انھوں نے فوراً شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ارکلی خاں کو اس آفت کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا اور اس نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی انتظامات کر لیے تھے۔ لیکن شہر کا کوتوال ایک طویل محاصرہ کی تکالیف برداشت نہ کر سکا اور محض دو ماہ کے محاصرہ کے بعد ہی دوسری جانب جا ملا۔ ارکلی خاں کامیابی کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھا اور ملتان کے شیخ رکن الدین سے اپنی جانب سے

---

۱۔ بدایونی، رینکنگ، جلد اول صفحہ ۲۴۴

سفارش کی درخواست کی۔ شیخ نے متصادم گروہوں کے درمیان ایک سمجھوتہ کی شرائط طے کیں۔ وہ شہزادوں کو الغ خاں کے لشکرگاہ میں لے گئے جہاں ان کا احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ فتح کی خوش خبری دہلی بھیجی گئی وہاں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔

فاتح جنرل دونوں قیدی شہزادوں، ان کے اہل خاندان اور ان کے امرا کے ہمراہ پایہ تخت کے لیے روانہ ہوئے۔ ابوہر[1] میں ان کی ملاقات نصرت خاں سے ہوئی جو مختلف قیدیوں کی سزاؤں کے سلسلہ میں بادشاہ کے فوری احکام لایا تھا۔ ارکلی اور ابراہیم، ملک احمد چپ اور جلال الدین کے داماد ملک الغو بے رحمی کے ساتھ اندھے کر دیئے گئے۔ ان کے خاندان والوں کو ان سے جدا کر دیا گیا اور ان کے مال و متاع اور غلاموں پر قبضہ کر لیا گیا۔ بعد میں ارکلی اور ابراہیم کو اول الذکر کے دو بیٹوں سمیت ہانسی کے کوتوال کے سپرد کر دیا گیا جس نے ان کو فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2] ملکۂ جہاں جس کو علاء الدین اپنا جانی دشمن سمجھتا تھا، ملک احمد چپ اور ملک الغو کو نصرت خاں نے دہلی میں اپنے محل میں قید رکھا۔ ان بدقسمت قیدیوں کا انجام تاریخ میں مذکور نہیں ہے لیکن آسانی سے قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ملتان کی فتح کے فوراً بعد (۱۲۹۶ء میں) نصرت خاں کو وزیر مقرر کیا گیا۔ اس نے جلال الدین کے امرا کی زمینیں اور جاگیریں ضبط کر لیں اور ان امرا اور ملکوں کی بھی جن کو علاء الدین نے اپنی تخت نشینی کے ابتدائی ایام میں بڑی فیاضی سے مالا مال کیا تھا۔ اس نے دولت وصول کر لینے اور جاگیریں ضبط کرنے کے ایسے اچھوتے طریقے ایجاد کیئے کہ حیرت انگیز طریقہ پر ایک مختصر مدت میں وہ ایک بڑی رقم شاہی خزانے میں جمع کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً اسی زمانہ میں علاء الدین نے اپنے وفادار خادم اور مشیر کار ملک علاء الملک کو بلا بھیجا یہ مورخ ضیاء برنی کا چچا تھا۔ علاء الملک امراء اور سربرآوردہ اشخاص کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ دربار پہنچا اور اس نے بادشاہ کی خدمت میں وہ تمام ہاتھی اور خزانے پیش کر دیئے جو بادشاہ اس کے پاس کڑہ میں چھوڑ آیا تھا۔ چونکہ وہ بے انتہا لحیم شحیم تھا اور کسی پھرتیلے کام کے لائق نہ تھا لہٰذا اس کو دہلی میں کوتوال بنا کر روک لیا گیا اور کڑہ کی حکومت نصرت خاں کو سونپی گئی جو

(1) ابوہر ہانسی کے قریب ہے۔ ہانسی اب ضلع حصار میں ایک تحصیل ہے۔ ابتدائی مسلم عہد میں یہ ایک اہم فوجی مرکز تھا۔ یہاں علاء الدین کے بہت سے کتبات پائے گئے ہیں جو اس وقت کے شہر کی اہمیت بتاتے ہیں۔
اپیگرافیا انڈو مسلیکا ۱۹۱۳-۱۴ء، ص ۲؛ تاریخ مبارک شاہی ص ۷۱۔

(2) بدایونی، رینکنگ، جلد اول ص ۲۳۵، فرشتہ ص ۱۰۲، برنی ص ۲۴۹، اس نکتہ پر پوری طرح واضح نہیں ہے۔

اسی زمانے میں اپنے استعمال زر کے طریقوں کی بنا پر دہلی میں بہت زیادہ غیر مقبول ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۲۹۷ء اور سنہ ۱۲۹۹ء کے درمیان منگولوں کے دو حملے پہلے کیدلر اور پھر دیوا اور سالدی کے زیر کمان ہوئے تھے، کامیابی کے ساتھ پسپا کر دیئے گئے۔ ان پر تفصیلی بحث کسی اگلے باب میں آئے گی۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ منگولوں کی شکست نے اقتدار کو استحکام بخشا اور نئے بادشاہ کے وقار کو مزید بلند کیا۔ اور وہ دن دونا رات چوگنا سنگدل ہوتا گیا۔ اس نے اپنے بھائی الماس بیگ کے مشورہ پر ان تمام جلالی امراء کو سزا دی جنھوں نے مٹھی بھر چاندی کے لیے اپنے آقا کے مفاد سے غداری کی تھی اور اس کے جانشیں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان میں بہت سے اندھے کر دیئے گئے بعض کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ ان میں سے صرف تین یعنی ملک قطب الدین علوی، ملک نصیر الدین اور ملک امیر جمال خلجی جنھوں نے نہ تو قاتل کا سونا قبول کیا تھا نہ جلال الدین کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اس تحقیقاتی بدسلوکی سے بچ سکے۔ بقیہ سب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اس طرح قدیم ترکی طبقۂ امراء کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سلطان نے اپنے طبقۂ امراء کا نظام قائم کیا جو مکمل طور پر بلا کسی پس و پیش کے اس کا وفادار تھا ساتھ ہی وہ اپنے دولت کے انبار میں ایک کروڑ ٹنکے کا اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

نام نہاد سرکش عنصر کی سرکوبی کرنے کے بعد علاء الدین نے ملک کے خود مختار علاقوں کو مسخر کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ملتان کی مہم کے بعد وہ کوئی بڑی مہم کہیں نہیں بھیج سکا تھا۔ سنہ ۱۲۹۹ء میں اس کی فوجیں فتوحات کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے آزاد تھیں۔ اس کی فوری توجہ گجرات کی حسین اور دولت مند سلطنت کی طرف مبذول ہوئی۔

**گجرات کی مہم** | گجرات کی سلطنت ازمنۂ وسطی کے ہندستان کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ایک تھی۔ زرعی دولت کی پیداوار میں غالباً اس کا مقام صرف دوآب کے بعد آتا تھا۔ پر اس حالت میں اس کے شہروں میں تجارت کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس کے اہم بندرگاہ کیمبے کے تجارتی تعلقات غیر ممالک مثلاً عرب دنیا اور ایران سے قائم تھے۔ شمالی ہند میں مسلم فاتحین کے داخلہ سے بہت قبل عرب تاجر اس خطہ میں بس گئے تھے۔ شہر کیمبے کے بارے میں وصاف لکھتا ہے کہ "اس کی ہوا صاف ہے، اس کا پانی خالص اور اس کے چاروں طرف کا علاقہ مناظر اور عمارات دونوں کے لحاظ سے خوبصورت ہے"[44] وینس کا قسمت آزما مارکو پولو بھی جس نے وصاف سے ایک صدی قبل اس جگہ کو دیکھا تھا۔ کیمبے کو ایک ایسی جگہ بتاتا ہے جو مال و دولت سے مالا مال تھی[45]۔ ان دونوں کی تصدیق

---

(۴۴) وصاف کتاب چہارم ص ۴۳۶

(۴۵) یول Ser Marco Polo جلد دوم ص ۳۹۱-۳۹۸

ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس نے اس کے مالدار تاجروں کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا ہے۔

گجرات کی ابتدائی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہے۔ موریہ حکمرانوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اس کے پہلے حکمراں رہے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی سے لے کر آٹھویں صدی عیسوی تک ولبھی حکمرانوں نے اس پر حکومت کی۔ پھر چانڈو خاندان آیا اور اس کے جانشین چالوکیہ یا سولنکی بنے۔ بھیم دیو اول (۱۰۲۲-۶۴ء) کے عہد حکومت میں محمود غزنوی نے سومناتھ کے مشہور مندر کو منہدم کیا تھا۔[6] گجرات کا دوسرا اہم حکمراں بھیم دیو ثانی (۱۱۷۸-۱۲۴۲ء) تھا۔ اس نے محمد غوری کو ۱۱۷۸ء میں شکست دی لیکن قطب الدین ایبک کا موثر طور سے مقابلہ نہیں کر سکا جس نے دو بار ۱۱۹۵ء اور ۱۱۹۸ء میں سلطنت پر حملہ کیا۔ دوسرے حملہ میں قطب الدین نے اس کے پایۂ تخت انہل واڑہ (موجودہ پٹن اور مسلم تاریخ نویسوں کے نہروالہ) کو تاخت و تاراج کیا اور کثیر مقدار میں مال غنیمت ساتھ لے گیا۔[7]

آخری سولنکی بادشاہ بغیر کسی نرینہ جانشین کے مر گیا اور سلطنت دگھیلا یا بگھیلا راجپوتوں کے ہاتھوں میں آگئی جو شادی بیاہ کے تعلقات کی بنا پر اس کے رشتہ دار تھے۔ بگھیلا حکمرانوں نے نصف صدی سے زیادہ (۱۱۹۹-۱۲۴۲ء) حکومت کی لیکن ان کو مسلم حملہ آوروں کی وجہ سے مسلسل مشکلات کا سامنا رہا۔ رائے کرن بگھیلا کا عہد حکومت تھا جب علاء الدین نے گجرات کی فتح کے لیے ایک لشکر جرار بھیجا۔

مہم کی قیادت دو معتمد جنرلوں الغ خاں اور نصرت خاں کے سپرد کی گئی۔ نصرت دہلی سے ۲۴ فروری ۱۲۹۹ء (۲۰ رجمادی الاولی ۶۹۸ھ) کو روانہ ہوا۔[8] الغ خاں کو سندھ سے کوچ کر کے نصرت کے

(۶) دیکھو ایم۔ ایس کمیسیریٹ تاریخ گجرات (A History of Gujarat) جلد اول ص ۸-۹۵ محمود غزنوی کے ہاتھوں سومناتھ کی مکمل تباہی اور بعد میں اسی نام سے دوسری عمارت کی تعمیر کے لیے دیکھو۔ ایم ناظم حیات و زمانہ محمود غزنوی (Life and Times of Mahmud of Ghazna)

(۷)۔ حسن نظامی، تاج المآثر، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد دوم ص ۲۲۹-۳۰

(۸)۔ اس مہم کی تاریخ کے سلسلہ میں مسلم مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ برنی اس کو علاء الدین کے عہد حکومت کے تیسرے سال کی ابتدا میں ہونا بتاتا ہے اس کا مطلب ہے ۱۲۹۹ء کے ابتدائی ماہ۔ امیر خسرو (خزائن، ترجمہ حبیب ص ۳۵) مذکورہ بالا تاریخ دیتے ہیں۔ چندر پربھا کا مصنف جین پربھا بھی جو کہ ایک عینی شاہد تھا الو (الغ) خاں کے حملہ کو ۱۲۵۶ سمبت ۱۲۹۹ء میں ہونا بتاتا ہے (انڈیا انٹیکوئٹی ۱۸۹۷ء ص ۱۹۴-۹۵) وصاف یہ ہی ذی الحجہ ۶۹۸ھ (اگست ۱۲۹۹ء) ہے چنانچہ یقینی ہے کہ مہم ۱۲۹۹ء میں بھیجی گئی تھی۔ فرشتہ اور حاجی الدبیر جو اس کی تاریخ ۶۹۷ھ/۱۲۹۷ء بتاتے ہیں غلطی پر ہیں۔

زیر قیادت لشکر سے آملنے کا اور گجرات پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا[9]۔ الغ خاں نے اپنے سفر کے راستے میں جیسلمیر پر حملہ کیا[10] اور چتوڑ کے قریب کسی جگہ نصرت خاں سے آکر مل گیا۔ دہلی سے گجرات کو جانے والی سیدھی شاہراہ جالور سے گذرتی تھی۔ سلطان نے جالور کے کنہردیو سے شاہی افواج کو اپنے علاقہ سے گذر جانے کی اجازت دینے کی درخواست کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں متحدہ فوج چتوڑ کے علاقہ سے گذری اور دریائے بناس کو عبور کر کے رودسا کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کا ذکر رزم نامہ کنہڑدے پربندھ میں ملتا ہے جو کسی پدمنابھ نے ۱۴۵۵ء میں جالور میں تصنیف کی تھی۔ نظم کا موضوع[11] علاء الدین کے ہاتھوں (۱۳۱۱ء) جالور کا محاصرہ ہے۔ یہ بیان مستند معلوم ہوتا ہے کیونکہ مصنّف نے ایک ایسے مقام پر لکھا ہے جس کو حملہ سے کافی زک پہنچی تھی اور یقیناً اس کو معلومات کے بہت سے ذریعے ہوں گے۔ ان میں وہ روایات بھی شامل ہیں جو (۱۲۹۹ء کے) حملہ کے سلسلہ میں اس علاقہ میں مشہور رہی ہوں گی۔ جین پربھاسوری بھی اپنی تصنیف چندر پربھا میں کہتا ہے کہ چتاکوٹا (چتوڑ) کے اس وقت کے حکمراں سمر سنگھ نے حملہ آوروں کو سزا دے کر علاقہ میواڑ کا تحفظ کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ علاء الدین کے جنرلوں نے گجرات کی طرف اپنی مہم کے دوران علاقہ میواڑ کے ایک حصہ پر ناکامیاب حملہ کیا تھا۔ اس حملہ سے متعلق عبارت کتاب میں واضح نہیں ہے چنانچہ بولر (Buhler) کہتے ہیں کہ چتوڑ کو تاوان دینا پڑا تھا (یا سزا برداشت کرنی پڑی تھی) جب کہ اوجھا اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ "چتاکوٹا کے حکمراں سمر سنگھ نے اس کو (حملہ آور کو) سزا دے کر میواڑ کا تحفظ کیا" اس میں کوئی شک نہیں کہ عبارت ناقص ہے اور اس کی دونوں تعبیریں کی جاسکتی ہیں لیکن اوجھا کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بظاہر حملہ آوروں کو شکست دے کر اور ان کو باہر نکال کر اس علاقہ کا تحفظ کیا گیا تھا۔ اور دشمن اس کو تاراج نہیں کر سکا تھا۔ پدمنابھ صرف یہ کہتا ہے کہ سمر سنگھ نے شاہی فوج کو چتوڑ سے گذرنے کی اجازت دے دی تھی[12]

(۹) تاریخ معصومی، صفحہ ۴۳؛ فرشتہ ص۱۰۲

(۱۰) تاریخ معصومی ص۴۳

(۱۱) کنہڑدے پربندھ کا مخطوطہ پہلی بار جی ہوزنے انیسویں صدی میں دریافت کیا تھا۔ میں نے اس کے ہندی خلاصہ پر تکیہ کیا ہے جو ڈاکٹر دشرتھ شرما نے شودھ پتریکا جلد سوم شمارہ دوم دسمبر ۱۹۵۱ء ص۴۲-۵۱ میں کیا ہے۔ گیسیریٹ مذکورہ بالا جلد اول ص۲۱۲ کے ایم منشی، گجرات اور اس کا ادب (Gujrat and its literature) ص۱۰۵-۱۰۲

(۱۲) قدیم ہند (Ind. Ant.) ۱۹۰۵ء-۱۹۱۶ء اوجھا، راجپوتانہ کا اتہاس جلد دوم ص۴۶۲؛ شودھ پتریکا ص۵۲۔

گجرات میں اپنی آمد پر الغ خاں نے حسب معمول لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ انہل واڑہ کا خوبصورت اور دولتمند شہر پوری طرح سے تہس نہس کر دیا گیا۔ راجہ کرن بگھیلا[13] جو محض چند سال قبل سارنگ دیو کا جانشین بنا تھا حیران رہ گیا اور افراتفری کے عالم میں دیوگیری کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی خواتین اور خزانے بشمول اس کی مہارانی کملا دیوی کے دشمن کے ہاتھ لگ گئے۔[14] فوج کا ایک حصہ بادشاہ کے تعاقب میں روانہ ہوا اور دوسرے نے سومناتھ کے مندر کا رخ کیا۔[15] اس مندر کو کاریال (۱۲۷۲-۷۳ء) نے

---

(۱۳) یمینی کے مطابق کرن کے پاس تیس ہزار سوار اور اسی ہزار پیادہ پر مشتمل مستقل فوج تھی۔ تاریخ مبارک شاہی ص۷۴

(۱۴)۔ گجرات کے حملہ کو روایت کرن کے وزیر اعظم مادھو کی بیوی کی بددعا سے منسوب کرتی ہے۔ کرن کو مادھو کی خوبصورت بیوی روپ سندری سے عشق ہو گیا اور اس نے پایۂ تخت سے مادھو کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے بس میں کر لیا۔ اس نے کرن کو بددعا دی کہ جیسے اس نے اس کو اس کے شوہر سے جدا کر دیا ہے اسی طرح اس کی ملکہ بھی اس سے جدا کر دی جائے گی۔ فوربس ( Forbes ) رس مالا ص۲۷۵۔
پدمنابھ اور نینسی دونوں بھی کہتے ہیں کہ مادھو نے "علاء الدین سے مدد کی درخواست کی اور اس نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ کنہدگا پربندھ، شودھ پتریکا، ص۵؛ نینسی کیاتس ( Khayats ) جلد اول ص۲۱۳

(۱۵) سومناتھ جو جینیوں کے نزدیک چندر پربھا کے نام سے معروف ہے اور شہر پٹن کے شمال مغربی گوشے میں گجرات کی سطح مرتفع کے مغربی ساحل پر ایک بلند مقام پر واقع ہے جہاں سے سمندر نظر آتا ہے۔ اور جو شہر پناہ کے قریب ہے۔ اپنی موجودہ شکستہ حالت میں سومناتھ کا کوئی امتیازی نشان یا صحیح انداز مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پوری پوری عمارتیں انتہائی شاندار نقاشی کا مظہر ہیں اور مختلف حجم کی اکیلی یا کئی کئی اکٹھی تصویروں سے مزین ہیں۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۴۳ء، ص۲۳۔
عرب جغرافیہ داں دمشقی سومناتھ میں پوجا کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کرتا ہے۔ لیکن محمود غزنوی کے زمانے میں مندر اور اس کی دولت کا بہترین بیان کامل التواریخ کا مصنف ابن اثیر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مندر ہندوؤں کے لیے ایک زیارت گاہ تھا جہاں وہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقعوں پر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ مقدس عبادت گاہ کے لیے دس ہزار گاؤں سے زیادہ وقف تھے۔ مورتی کو گنگا کے پانی سے دھویا جاتا تھا جو شمال کے دور دراز علاقے سے لایا جاتا تھا۔ مندر میں بہترین قسم کے اور بے بہا جواہرات جمع تھے۔ دمشقی عربی متن ص۱۷۰-۷۱؛ البیرونی، الہند جلد دوم ص۱۰۳؛ کامل التواریخ، ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد دوم، ص۴۶۸-۴۷۱۔

پہلے مندر کی طرح از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔ ۱۰۲۶ء میں محمود غزنوی کی بت شکنی کے جوش کی نذر ہوگیا تھا۔ اس مشہور مندر کی دولت لوٹ لی گئی، اس کے بت کو توڑ دیا گیا۔ اور اس کو بیل گاڑیوں پر لاد کر دہلی لے جایا گیا جہاں اس کو مسلمانوں کے قدموں تلے روندے جانے کے لیے ڈال دیا گیا۔[16]

تاہم ہم عصر فارسی تصنیفات نیز چندر پربھا اور کہندی پربندھ کے جین بیانات اس امر پر متفق ہیں کہ گجرات مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ جین بیان کرتا ہے کہ الغ خاں اور نصرت خاں نے سیکڑوں شہر برباد کر ڈالے جیسے اساولی (اساول، احمد آباد کے قریب ایک گاؤں) وکن تھلی (وتھالی) اور سورت۔ اور گجرات کی بہت سی خانقاہوں، محلات اور مندروں کو لوٹ لیا۔[17]

نصرت خاں کیمبے (مسلمان تذکرہ نگاروں کا کھمبایت) کے خوبصورت اور مالدار بندرگاہ کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے ایک دستے کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس نے شہر کے تاجر وں (خواجوں) اور دوسرے مالدار لوگوں سے سونے چاندی کی سلاخوں، جواہرات اور دوسری قیمتی اشیاء کی صورت میں بہت کثیر مقدار میں مال غنیمت وصول کیا۔ یہیں پر غلام کافور جس نے بعد میں دکن کی مہموں میں اہم کردار ادا کیا اس کے آقا سے زبردستی چھین لیا گیا جس نے اس کو ایک ہزار دینار میں خریدا تھا۔ برنی نہروالہ اور پورے گجرات کی تاراجی اور لوٹ مار کی تائید کرتا ہے۔[18] عصامی کا بیان ہے کہ سپاہیوں نے صرف اسی دولت پر اکتفا نہیں کی جو ان کے ہاتھ لگی بلکہ انھوں نے ان خزانوں کو بھی کھود کر نکال لیا جو گجراتی لوگوں نے زمین میں چھپا رکھے تھے۔[19]

گجرات کو پوری طرح لوٹ مار کر اور تہس نہس کر کے اور ایک قابض فوج چھوڑ کر فاتح جنرل

---

(۱۶) کہندی پربندھ، شودھ پتریکا، ص۵۲۔ ۱۲۹۹ء میں الغ خاں کے مندر تباہ کرنے کے بعد جونا گڑھ کے راجہ چوڑا سمین (۱۲۷۰ء-۱۳۳۳) نے اس کی عمارت پھر سے بحال کر دی جیسا کہ کنگنی Khagnan کے کرنا کتبہ سے ثابت ہوتا ہے۔ انڈیا انٹیکویٹی ۵۴، ۱۹۲۵ء ضمیمہ ص۲۲ نیز دیکھو "سومناتھ عرب جغرافیہ دانوں کی نظر میں (Somnath as noticed by Arab Geographers) روداد انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۴۳ء، ص۱۲-۲۰۹

(۱۷) انڈیا انٹیکویٹی، ۱۸۹۷ء، ص۹۵-۱۹۴ کہندی پربندھ محولہ بالا صفحہ کہتی ہے کہ اساول، ڈھولکا، کھمبایت، سورت، چمپانیر اور رانیر پر ترک فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

(۱۸) ۔ برنی ص۵۲-۲۵۱

(۱۹) ۔ فتوح ص۲۴۳

دہلی واپس آئے۔[۲۰] ان کے مالِ غنیمت میں، رائے کرن کی خوبصورت ملکہ کملا دیوی، بہت سے عورت مرد قیدی،[۲۱] کافور ہزار دیناری، اور سونے جواہرات اور دوسری قیمتی اشیاء کی خاصی مقدار شامل تھی۔ اس کے علاوہ ہر سپاہی نے لوٹ مار کی دولت سے اپنی اپنی جیب بھی خوب بھر لی تھی۔

**سپاہیوں کی بغاوت**

دہلی کی جانب واپسی کے سفر میں فوج نے براہ جالور سیدھا راستہ غالباً اس لیے اختیار کیا کہ کنہر دیو سے نمٹا جا سکے جس نے شاہی فوج کو اپنے علاقے سے گذرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے جالور سے نو کوس دور سکرنے[۲۲] میں پڑاؤ ڈالا جہاں فوجیوں کی شناخت ہوئی اور مالِ غنیمت میں ہر سپاہی کے سرکاری حصّہ (خمس) کا مطالبہ کیا گیا۔ بعض چیزوں کے حوالہ کرنے کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا اور سپاہیوں سے ان کی انفرادی یافت کے سلسلہ میں اعتراف کرانے کے لیے ان کی حیثیت اور عہدے کا خیال کئے بغیر ان کو بہت ہی وحشیانہ قسم کی سزائیں دی گئیں۔ اگر تاریخ مبارک شاہی کے مصنف پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو ان کو دھوپ کے نیچے رکھا گیا اور ان کو آبِ شور پینے پر مجبور کیا گیا۔ ڈنڈے اور مکّے کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔[۲۳] اس غیر انسانی سلوک نے فوج کے ایک بڑے حصہ کو جن میں نو مسلم زیادہ تر تھے علانیہ بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ عصامی کے مطابق باغیوں کے سردار محمد شاہ، کبھرو، یلچق اور براق تھے اور یحییٰ کے مطابق الغ، کسری، بیگی، طمغان، محمد شاہ، تیمور بوغا، شادی بوغا اور قتلغ بوغا۔[۲۴] ان کے

(۲۰)۔ الپ خاں کو گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا اور وہ وہاں ۱۳۰۰ء سے ۱۳۱۴ء کے لگ بھگ رہا۔ مرآتِ احمدی کا مصنف پٹن میں الپ خاں کی تعمیر کردہ جامع مسجد کی خوبصورتی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ مزید دیکھو بیلے (Belay)، مقامی مسلمان حکمران خاندان، گجرات (Local Muhammadan Dynasties, Gujrat) ۔ ص۳۸

(۲۱)۔ وصاف، کتاب چہارم ص۲۳۵

(۲۲)۔ کیاتس؛ جلد اول ص۱۵۱؛ کنبھر دی پربندھ، شودھ پتریکا، ص۲۵

(۲۳)۔ تاریخ مبارک شاہی ص۷۵

(۲۴)۔ غالباً ہمیر راسو کا گبرو جس میں اس کو محمد شاہ کا بھائی بتایا گیا۔ عصامی کے بیان کردہ چار نام سب کے سب بھائیوں کے ہو سکتے ہیں جیسا ہمیر مہا کاویہ (ہمیراین، مقدمہ ص۱۳) میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ حاجی الدبیر کہتا ہے کہ محمد شاہ اپنے زیر کمان تین ہزار سوار رکھتا تھا۔ ظفر الوالہ ص۹۰

(۲۵)۔ تاریخ مبارک شاہی ص۷۵؛ فتوح ص۲۴۳۔

نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب منگول مسلمان تھے۔ انھوں نے گجرات کی لوٹ مار میں بہت کافی حصہ حاصل کیا تھا اور اس اندیشہ سے کہ اس کا بڑا حصہ شاہی خزانے میں جمع کرنا پڑے گا۔ انھوں نے اپنی یافت کو چھپا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاہی جنرلوں کی شیطانی بربریت نے ان کو بغاوت کیلئے ضروری بہانہ فراہم کر دیا تھا جس میں ان کی امداد جالور کے حکمراں نے کی۔ اس نے اپنے خلاف پیش قدمی کے خوف سے شاہی فوج کو پریشان کرنے کے لیے فوجی دستے بھیج دیئے تھے[۲۶]۔ ایک صبح انھوں نے نصرت خاں کے ایک بھائی اور الغ خاں کے امیر حاجب (سکریٹری) ملک اعزازالدین کو قتل کر دیا۔ پھر انھوں نے الغ خاں کے خیمہ پر حملہ کیا لیکن وہ ہاتھ منھ دھونے باہر گیا ہوا تھا اس لیے وہ ایک یقینی موت سے بچ گیا۔ اس کی جگہ سپاہیوں نے سلطان کے ایک بھانجے (بہن کے لڑکے)[۲۷] کو غلطی سے اپنا شکار سمجھ کر مار ڈالا۔ الغ خاں بچ کر نصرت خاں کے خیمہ پہنچا اور دونوں جنرلوں نے اپنی غیر محدود حاضر دماغی کے سبب فوجی نقارہ بجانے کا حکم دیا۔ وفادار سپاہیوں نے جو بغاوت میں کسی طرح شریک نہیں تھے اس خیال کے تحت اپنے ہتھیار لگا لیئے کہ قرب وجوار کا راجہ ان پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ نصرت خاں کے خیمہ کے سامنے جمع ہو گئے۔ منگولوں میں افراتفری پھیل گئی اور وہ فرار ہو گئے۔ شاہی سپہ سالاروں کی سمجھ بوجھ نے صورت حال پر قابو پا لیا۔ یہ فتنہ چار ہی دن میں فرو ہو گیا۔ محمد شاہ اور کبھرو نے رنتھمبور کے رانا ہمیر کے پاس پناہ لی اور یلحق اور براق گجرات کے شکست خوردہ بادشاہ کرن[۲۸] کے پاس چلے گئے جو اس وقت دیوگیری کے رام دیو کے مہمان کی حیثیت سے نان بربار میں مقیم تھا۔

سپاہیوں کی بغاوت اگرچہ ناکام رہی تاہم اس نے شاہی جنرلوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ راستہ میں سرکاری حصہ کا مزید کوئی مطالبہ کیے بغیر خاموشی کے ساتھ دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔[۲۹]

بغاوت کے اہم سازشی بچ نکلے تھے لیکن دہلی میں ان کے خاندان کا برا انجام ہونا تھا۔ جس وقت علاءالدین نے بغاوت کی خبر سنی اس نے فوراً حکم دیا تھا کہ باغیوں کے بیوی بچوں کو پکڑ کر قید کر دیا جائے لیکن سنگدل وزیر نصرت اس سے مطمئن نہ ہوتا جو سلطان نے پہلے ہی ان معصوم مظلوموں کو دے

(۲۶) ۔ شودھ پتریکا۔ ص ۵۳

(۲۷) ۔ راجپوت تذکروں کے مطابق اس کا نام کالو ملک تھا۔ سوادھیہ، شاہ ودم، نومبر ۲۵-۱۹۶۳ء

(۲۸) فتوح ص ۲۴۵

(۲۹) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے متھرا کے راستہ سفر اختیار کیا تھا جہاں الغ خاں نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ ایچ گرانی انڈو مسلم کا ۱۹۳۵ء، ص ۶۱-۵۹

رکھی تھی۔ اس نے راجدھانی میں اپنی آمد پر اور بھی وحشیانہ ستم توڑے۔ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے اس نے اعزاز الدین کے قاتلوں کی بیویوں کو پکڑا اور ان کو دہلی کے بھنگیوں کی آغوش میں دیدیا اور ان کے بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالنے کا حکم دیا۔ ان وحشیانہ مظالم نے معاصر تذکرہ نگار کے جذبات کو صدمہ پہنچایا جو کہتا ہے کہ "مردوں کی خطاؤں کے لیے بیوی بچوں کو پکڑنے کی تاریخ اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ کہ ایسی سزاؤں کی کسی بھی مذہبی قانون میں کبھی اجازت نہیں رہی۔"[۳۰]

**علاء الدین کے مجنونانہ منصوبے**

جب الغ خاں اور نصرت خاں گجرات کو فتح کرنے میں مشغول تھے سلطان علاء الدین ایک اور غیر ملکی حملہ کا سامنا کر رہا تھا۔ ایک منگول سردار سالدی نے شمال مغرب پر حملہ کیا تھا اور سیوستان کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ظفر خاں کو اس کے خلاف ایک فوج کی قیادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ بہادر جنگجو نے منگولوں کو شکست دی۔ اور ان میں سے بہت سوں کو قیدی بنا کر دہلی بھیج دیا۔ اسی دوران گجرات میں بھی فتح ہو گیا۔ اس طرح ۱۲۹۹ء سلطان کے لئے بہت ہی خوش بختی کا سال ثابت ہوا۔ ملتان کچھ برس پہلے فتح کیا جا چکا تھا۔ ایک قسمت آزما منگول سالدی کو شکست دی جا چکی تھی اور گجرات کی دولت مند سلطنت کا الحاق کر لیا گیا تھا۔ "علاء الدین کی تمام مہمیں یکے بعد دیگرے کامیاب ثابت ہوئیں اور ہر گوشے سے فتح کی خوشخبری سے بھرپور فتح نامے مسلسل آ رہے تھے۔ ہر سال اس کے دو یا تین بیٹے پیدا ہو رہے تھے..... مختصر یہ کہ اس کی ریاست کے تمام کام اس کے دل کی مراد کے مطابق بڑے اطمینان بخش طریقے سے انجام پا رہے تھے۔ اس کے میگزین خزانوں سے بھرپور تھے..... کثیر تعداد ہاتھی اور ستر ہزار گھوڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے دو یا تین وسیع علاقوں کو بھی پوری طرح اپنے اقتدار کے جوئے میں بندھا پایا اور سلطنت میں کسی حریف یا مد مقابل کا خیال کبھی اس کے دماغ میں نہیں آیا۔"[۳۱]

گھمنڈ اور غرور کے ان محرکات کے نشہ میں پوری طرح سرشار علاء الدین نے انتہائی غیر معمولی اور عجیب و غریب منصوبے باندھے اور "ناممکنات اور نامعقول باتوں کو سوچنا" شروع کر دیا۔ اس کے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنا تھا تاکہ رسول کریم کی طرح اس کا نام بھی آنے والی نسلوں تک باقی رہے۔ سلطان اپنے قریبی مصاحبوں کو یہ دلیل دیتا تھا کہ پیغمبر حضرت محمد

(۳۰) برنی، ص۲۵۳

(۳۱) ایضاً، ص۲۶۲-۲۷۱

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار ساتھی تھے، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی۔ اور میرے بھی چار برابر کے بہادر اور وفادار ساتھی ہیں۔ الپ خاں، نصرت خاں، الغ خاں اور ظفر خاں۔ وہ اپنی افواج کی طاقت کے بل بوتے اور اپنے بہادر اور معتمد خدام کے سہارے ایک ایسا مذہب قائم کر سکتا تھا جو اس کے اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد مدتوں تک پھلتا پھولتا رہے۔ ۳۳

علاء الدین کا دوسرا منصوبہ سکندر کے کارنامے کو دہرانا اور اپنی فتوحات کے دائرے کو دور دور تک پھیلانا تھا۔ جیسا کہ ایڈورڈ گبن بجا طور پر تبصرہ کرتے ہیں کہ "جب تک بنی نوعِ انسان اپنے محسنوں کے مقابلے میں اپنے تباہ کرنے والوں پر فیاضی سے تعریف و توصیف کے ڈونگرے برساتی رہے گی اس وقت تک فوجی جلال و عظمت کی پیاس اکثر بڑے اشخاص کی کمزوری بنی رہے گی۔" ۳۴ شعراء اور مورخین کی نسلوں نے سکندر کی تعریف و توصیف میں جو زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے انھوں نے بہت سے قسمت آزما شہزادوں اور حکمرانوں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور علاء الدین ان میں سے محض ایک تھا۔ وہ اپنے قریبی مصاحبوں سے اپنے اس منصوبے کے سلسلہ میں مشورہ کیا کرتا تھا کہ نظم و نسق چلانے کے لیے وہ دہلی میں اپنا نائب چھوڑے اور خود فوج کشی کرے اور مشرق و مغرب دونوں کو اپنے قدموں کے تلے لے آئے جیسا کہ یونانی شہنشاہ نے کیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سکندر ثانی کہلانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کے سکوں اور نماز کے خطبوں میں اس کے لقب سکندرِ ثانی کا استعمال ہونے لگا۔

اگرچہ دربار کے اندر اور باہر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سلطان ان منصوبوں کے بارے میں

---

(۳۳) علاء الدین اپنے ذہن میں مذہب کا کیا تصور رکھتا تھا اس کا قیاس کرنا فضول ہے۔ ایک مذہب کو ایجاد کرنے کی خواہش کا اظہار کرنے کے سوا غالباً سلطان نے اس پر خود بھی بہت زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔ وہ کوئی ایسا عظیم کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا جو اس کا نام اسی طرح امر بنا دے جیسے کہ رسول کریم کا ہے۔ بہرکیف اس خواہش کے سوا علاء الدین نہ تو مذہب ایجاد کرنے کا ادراک رکھتا تھا اور نہ عزم مصمم۔ لیکن لوگ عام طور پر اس کی اس غیر معتدل خواہش سے سخت اندیشہ میں تھے اور یہ جان کر کہ اس نے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنے کی خواہش کا بار بار اظہار کیا ہے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ نیا مذہب یقیناً مذہب اسلام سے بالکل مختلف ہوگا اور اس کا نفاذ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے قتل عام کا موجب ہوگا۔ برنی ۲۶۴-۲۶۶

(۳۴) گبن، رومی سلطنت کا زوال و خاتمہ 'Decline and Fall of the Roman Empire'

محض انتہائی غرور و گھمنڈ اور حماقت کی بنا پر گفتگو کرتا ہے تاہم اس کی بدمزاجی کی وجہ سے وہ ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے ان کی منافقت سے سلطان نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے منصوبے آسان اور قابل عمل تھے۔ بہرحال شراب نوشی کی ایک مجلس میں جس میں سلطان اپنے الٹے سیدھے منصوبوں کی وضاحت کرتا رہتا تھا، ملک علاء الملک بھی اتفاق سے موجود تھا جو "اپنے بھاری بھرکم جسم کے سبب سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے کی زحمت مہینہ میں ایک بار سے زیادہ نہیں اٹھا سکتا تھا" گفتگو کے دوران اس نے سلطان کو بے خوفی سے بتایا کہ مذہب خدا کی جانب سے وحی کا معاملہ ہے اور وہ انسانی عقل یا سمجھ بوجھ کی بنیاد پر ایجاد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے دلیل دی کہ چنگیز خاں جیسے عالمگیر فاتحوں نے مسلمانوں کا خوب خوب خون بہا کر مذہب اسلام کو فنا کرنے کی اپنی بھرپور کوششیں کیں لیکن وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ کوتوال نے مزید کہا کہ اگر عوام نے یہ سن لیا کہ بادشاہ ان کے مذہبی عقائد پر ڈاکہ ڈالنے کی سوچ رہا ہے تو وہ سب کے سب اس کی اطاعت سے منحرف ہو جائیں گے اور ہر جانب انتشار اور بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ عالمگیر فتح کے سلسلہ میں علاء الملک نے اس کے تصور پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن یہ بھی کہا کہ حالات اتنے سازگار نہیں ہیں جتنے کہ سکندر کے زمانے میں تھے۔ سلطنت دہلی اتنی مستحکم بنیادوں پر استوار نہیں ہے جتنا کہ سکندر کا یونان تھا پھر سلطان ارسطو جیسے مشیر کار اور دانشمند نہیں رکھتا جو حکمراں کی عدم موجودگی میں ریاست کا کاروبار چلا سکیں۔[۴۴]

سلطان نے علاء الملک کی فصاحت و بلاغت سے بھرپور تقریر بڑی گہری توجہ سے سنی۔ اس نے وعدہ کیا کہ مستقبل میں وہ مذہب ایجاد کرنے کی بات زبان سے نہیں نکالے گا۔ لیکن اس نے پوچھا "کہ جب اتنی دولت، ہاتھی اور گھوڑے میرے ہاتھ آگئے ہیں تو میں اگر فتوحات نہ کروں، علاقے نہ حاصل کروں اور صرف سلطنت دہلی پر اپنے آپ کو قانع کر لوں تو اتنے سارے وسائل سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہوگا اور میں شاندار کارناموں کی شہرت کیونکر حاصل کر سکوں گا؟"

اس کے جواب میں علاء الملک نے دو متبادل تجویز کیے۔ اول یہ کہ خود ہندستان میں فتح کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔ رنتھمبور، چتوڑ، چندیری، مالوہ، دھار، اجین کی مضبوط اور آزاد سلطنتیں

---

(۴۴)۔ علاء الدین اور علاء الملک کے درمیان ہونے والی پوری گفتگو برنی کے مبہم اور عجیب و غریب خیالات کو ظاہر کرتی ہے جو وہ یونان کی تاریخ میں بارے میں رکھتا تھا۔ برنی ص ۲۶۴

اور بہار اور بنگال کی صوبے[۳۵] ابھی تک شمال میں آزاد ہیں اور مندھیاچل کے جنوب میں بیشمار مہموں کے لیے میدان کھلا پڑا تھا۔ دوسرے یہ کہ سلطان شمال مغرب میں قلعوں کو مستحکم کرکے اور قابل اعتماد سالاروں کو مقرر کرکے منگولوں کے حملوں کو موثر طور سے روک سکتا ہے۔ اور جب سارا ہندستان فتح کر لیا جائے اور منگول خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تو سلطان کی اگر خواہش ہو تو وہ غیر ملکی توسیع کی پالیسی اختیار کر سکتا اور غیر ممالک میں اپنی فوجیں بھیج سکتا ہے۔

مشیر کار نے حد سے زیادہ شراب نوشی اور مسلسل شکار کی تفریح سے اجتناب کی ضرورت بھی بادشاہ کے ذہن نشین کرائی۔ اس نے کہا کہ اعتدال سے زیادہ شراب نوشی نظم و نسق کی پرسکون کارگزاری میں خلل اور تاخیر کا سبب بن جاتی ہے اور اس کا عوام پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور اگر سلطان اپنے فرائض سے غفلت کے مرض میں مبتلا ہو تو ان کو بغاوت کرنے کی ترغیب مل جاتی ہے۔ علاء الملک نے یہ بھی مشورہ دیا کہ اگر وہ پوری طرح شراب نوشی ترک نہیں کر سکتا تو اس کو تنہائی میں شراب نوشی کی محفلیں سجائے بغیر تھوڑی مقدار میں شراب پینی چاہیئے۔

اس پرخلوص اور جرأت مندانہ مشورہ سے سلطان بہت متاثر ہوا۔ اس نے اب اپنے پرشکوہ منصوبوں کے ناقابل عمل ہونے کا ادراک کر لیا۔ اور علاء الملک کو ایک طلائی خلعت جو شہروں کی تصاویر سے مزین، ایک بنے ہوئے پٹکے، آدھا من سونے، دس ہزار تنکہ ساز و سامان سے آراستہ گھوڑوں اور دو گاؤں کے شاہانہ انعام و اکرام سے فیاضانہ طور پر نوازا۔ اور اس کو ریاست کے دوسرے تمام امرا پر فوقیت بخشی۔[۳۶]

حالات کی ستم ظریفی سے علاء الدین نے قتلغ خواجہ کے حملے سے ایک اور عملی سبق سیکھا جو ۱۲۹۹ء کے خاتمے کے قریب واقع ہوا۔ اس حملہ پر جو کہ علاء الدین کے زمانے میں ہونے والے عظیم ترین حملوں میں سے ایک تھا تفصیل سے گفتگو اس کی مناسب جگہ پر ہوگی یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سلطان کی اپنے دشمنوں پر فتح اتنی ہی معجزانہ تھی جتنی کہ شاندار اور اس نے اس کو اس کے ناقابل عمل خوابوں سے چونکا دیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آزاد سلطنتوں کو فتح کرکے ان کا خاتمہ کر دے اور ملک کو ایک یکساں نظم و نسق عطا کرکے اس کو متحد کر دے۔

---

(۳۵) برنی کے متن ص ۲۹۹ میں ہے " سرو (سرجو) کے مشرقی کنارے سے " جس سے تقریباً پورا بہار اور بنگال مراد ہے۔

(۳۶) برنی، ص ۲۷۱

اس کے بعد علاء الدین نے فتوحات کے ایک نہ ٹوٹنے والے سلسلہ کا آغاز کیا۔ طاقتور ترین تخت اس کی فوجوں کے سامنے گر پڑے اور انتہائی طاقتور راجاؤں نے اس کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ ۱۳۰۰ء سے ۱۳۱۰ء تک شمالی ہند میں اس نے مسلسل جنگوں کا بازار گرم رکھا۔ سب سے زیادہ خون آشام و خون ریز جنگیں جیسی کہ توقع کی جا سکتی ہے راجپوتانے کی تاریخی سرزمین پر لڑی گئیں۔ ۱۳۰۶ء اور ۱۳۱۲ء کے دوران اس نے دکن کے حکمرانوں کو مطیع بنایا۔ لیکن علاء الدین کی زندگی کا سب سے ذلت آمیز واقعہ بنگال میں پیش آیا جہاں غالب گمان یہی ہے کہ اس کی فوج کو ایک کمر توڑنے والی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

## بنگال کی ناکام مہم

ضیاء الدین برنی کے مطابق سنہ نے جس نے چتوڑ[۳۷] کی مہم کا مشاہدہ کیا تھا وارنگل کی طرف غازی ملک کے بیٹے ملک جونا اور گورنر کڑہ اور نصرت خاں کے بھتیجے ملک جھوجھو کی زیر قیادت ایک فوج کی روانگی کو بھی دیکھا۔ سالاروں کے اختیار میں چیدہ افواج دی گئی تھیں اور ان کو براہ بنگال واڑیسہ شمالی راستہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔[۳۸] سلطان نے شہزادہ کی حیثیت سے خود بھی جزیرہ نمائے دکن پر فوج کشی کی تھی۔ لیکن اس نے ایلچ پور کا راستہ اختیار کیا تھا جو بنگال واڑیسہ والے راستہ سے زیادہ مختصر تھا۔ سر ولزلے ہیگ کا بھی یہی خیال ہے کہ مہم وارنگل بھیجی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اس مہم نے کاکتیا راجاؤں کے پایۂ تخت وارنگل پر ایک ایسے مشرقی راستہ سے چڑھائی کی تھی جو اس وقت تک نامعلوم تھا اور بنگال و

---

(۳۷)۔ برنی ص۳۰۰ چتوڑ کا حملہ، وارنگل کی مہم اور ترغی کے زیر کمان منگولوں کے حملہ کو ایک ہی سال میں واقع ہونا بتاتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ علاء الدین کو ترغی کے حملے کی اطلاع چتوڑ سے واپسی کے راستہ میں ملی تھی۔ چنانچہ چتوڑ سے بادشاہ کی واپسی کے بعد پایۂ تخت کی حالت بہت نازک تھی وہ ایک ایسے وقت میں جب کہ منگول دہلی پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہوں ایسی مہم بھیجنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا جو "چیدہ سپاہیوں پر مشتمل ہو"۔ اس لیے قوی امکان ہے کہ وہ مہم علاء الدین کی چتوڑ کی فوج کشی سے پہلے بھیجی گئی ہو۔ فرشتہ بھی یہی کہتا ہے۔ امیر خسرو چتوڑ پر فوج کشی کی تاریخ دوشنبہ ۸ جمادی الاخری ۷۰۲ھ (۲۸ جنوری ۱۳۰۳ء) دیتے ہیں چنانچہ ملک جونا نے یقینی طور پر ۱۳۰۳ء کے آغاز میں یا ۱۳۰۲ء کے آخری مہینوں میں دہلی چھوڑا ہوگا۔

خزائن الفتوح، الٰہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ، ورق ۲۰ ب

(۳۸)۔ برنی ص۲۹۹-۳۰۰؛ فرشتہ ص۱۱۵

اڑیسہ سے ہوکر گذرتا تھا۔[39]

سنہ ۱۳۱۰ء میں جب وہ مہم بھیجی گئی تو چتوڑ، جالور، سوانا، مالوہ، بہار اور بنگال اور خود شمالی ہند میں بہت سی ریاستیں مسلم حکومت کے دائرۂ اثر سے باہر تھیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ علاءالدین نے تلنگانہ کی فتح کے بارے میں اچانک سوچا جب کہ ابھی تک زیادہ تر شمالی ہند فتح نہیں ہو سکا تھا مزید برآں علاءالدین نے دکنی سلطنتوں کو ۱۳۰۸ء اور اس کے بعد فتح کیا جبکہ اس نے تقریباً پورے شمالی ہند کی تسخیر مکمل کر لی تھی۔ اس طرح سنہ ۱۳۱۰ء کی وہ مہم جو برنی کے مطابق ورنگل کی فتح حاصل کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی دراصل بنگال بھیجی گئی تھی۔ جب ہم بنگال میں ہونے والے اس وقت کے حالات پر ایک نظر ڈالیں گے تو یہ سب کچھ صاف ظاہر ہو جائے گا۔

۱۳۰۲-۳ء (سنہ ۷۰۲ھ) میں صوبہ ایک شورش کے زمانے سے گذر رہا تھا۔ بلبن کے فرزند سلطان ناصرالدین نے تقریباً خود مختاری کے ساتھ بنگال میں حکومت کی تھی اس زمانے میں اس کا بیٹا کیقباد دہلی کا سلطان تھا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور اس کے نام کے سکے چلتے تھے۔ خلجی انقلاب سے صوبہ متاثر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی جلال الدین نے سنہ ۱۲۹۰ء میں اپنی تخت نشینی کے بعد اس دور دراز علاقہ کے معاملات میں دخل اندازی کی تھی۔ ناصرالدین محمود یا تو سنہ ۱۲۹۱ء سے پہلے ہی فوت ہو گیا تھا یا اس کے بیٹے رکن الدین کیکاؤس نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں بادشاہت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔[40] کرنل ہیگ کا بہرکیف یہی خیال ہے کہ ناصرالدین محمود سنہ ۱۲۹۱ء میں انتقال کر گیا تھا اور اس کا دوسرا باقی رہ جانے والا بیٹا رکن الدین کیکاؤس اس کا جانشین ہوا تھا اس نے اگرچہ شاہی خطاب اختیار کیا اور اپنے نام کے سکے جاری کیے تاہم وہ دہلی کے علاءالدین خلجی کی وفاداری کا دم بھرتا رہا۔[41]

سکوں کی شہادت بتاتی ہے کہ رکن الدین نے سنہ ۱۲۹۲ء سے ۱۲۹۶ء (سنہ ۶۹۱ھ تا ۶۹۵ھ) تک حکومت کی کیونکہ اس کے ایسے سکوں کا وجود نہیں پایا جاتا جن پر سنہ ۶۹۵ھ کے بعد کی تاریخ درج ہو۔ اس کی زندگی یا اس کی موت کے سنہ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں معلوم یہاں تک ہم شمس الدین فیروز کو لکھنوتی میں اپنے

---

(۳۹)۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم ص۱۰۲

(۴۰)۔ تھامس، بنگال کے ابتدائی سکے (Initial Coinage of Bengal) جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سنہ ۱۸۶۷ء، ص۱۴۶

(۴۱) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم ص۲۶۱۔ نیز تھامس، کرانیکلز Chronicles ص۱۴۹

آپ کو ۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں مستحکم کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ دراصل اس زمانہ کے بنگال کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور یہ جاننا مشکل ہے کہ آیا رکن الدین ۱۳۰۱ء میں مرگیا تھا یا اس کے بھائی شمس الدین فیروز نے اس کو تخت سے اتار دیا تھا۔ جس نے مغربی بنگال میں اپنی حکومت قائم کی تھی[۴۱] شمس الدین کے بارے میں بھی کچھ زیادہ نہیں معلوم سوائے اس کے کہ اس کے سکے جن کا زمانہ ۷۰۱ھ سے ۷۲۲ھ (۱۳۰۱ء تا ۱۳۲۲ء) ہے اس زمانہ میں لکھنوتی پر اس کے قبضہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کے سکے جو سنارگاؤں میں ڈھالے گئے تھے بنگال کے مشرقی صوبہ جات پر بھی اس کے قبضہ کو مسلم کرتے ہیں۔[۴۲] بہرحال یہ اہم ہے کہ شمس الدین نے اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھا تھا کہ اپنے لیے سلطان کا لقب اختیار کیا تھا جیسا کہ اس کے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا بھی کافی امکان ہے کہ اکت خان، حاجی مولا اور عمر اور منگو کی متعدد بغاوتوں نیز رنتھمبور میں سلطان علاء الدین کی مشغولیت نے فیروز کو خود مختار ہونے کی ترغیب دی ہو۔ اس خیال کی تائید ایک کتبہ سے ہوتی ہے جو ضلع ہگلی میں ظفر خاں کے مدرسہ پر کندہ ہے[۴۳] اس کی تاریخ ۷۱۳ھ (۱۳-۱۳۱۴ء) ہے اور وہ شمس الدین

---

(۴۱)۔ تھامس کرانیکلز ص۱۴۳

(۴۲)۔ بہت سے سکوں کے ماہرین جیسے تھامس (جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۶۷ء، ص۲۵) ایس پول
کیٹلاگ آف انڈین کوائنس ان دی برٹش میوزیم محمڈن پیریڈ Catalogue of Indian Coins
in the British Museum, Muhammadan States اور نلسن رائٹ
Nelson Wright فیروز کے عہد کا تعین ۷۰۱ھ تا ۷۲۲ھ کرتے ہیں لیکن بنگال کے بادشاہوں کے سکوں
کے ایک ذخیرہ میں جو ہگلی ضلع بردوان میں ابھی دریافت ہوا ہے شمس الدین فیروز کے چار چاندی کے سکے ہیں جو لکھنوتی میں ڈھالے
گئے تھے اور جن پر ۷۰۰ھ کی تاریخ کندہ ہے جو حاشیہ پر صاف تحریر ہے۔ نیز دیکھو جرنل آف نیومسمیٹک سوسائٹی آف
انڈیا جلد پنجم: حصہ اول ص۔۔۔۔

(۴۳)۔ بلاخمین (Blochman) نے اپنے مضمون "ضلع ہگلی میں عربی اور فارسی کتبات پر تبصرہ"
(Notes on the Arabic and Persian Inscriptions in Hughli Distt.)
جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۷۰ء ص ۲۸۰-۲۸۸۔ کتبہ پر موجود لقب اس کی تصدیق
کرتا ہے کہ فیروز شاہ نے مغربی بنگال میں اپنی حکومت پورے ا ۔۔ م کے ساتھ قائم
کر لی تھی۔

ابوالمظفر کا ذکر تاجدار جید کی حیثیت سے کرتا ہے۔ علاء الدین یہ کبھی نہیں برداشت کرسکتا تھا کہ بنگال دہلی سلطنت سے آزاد ہو جائے۔ دراصل اس کی نظر بنگال پر اس وقت سے تھی جب وہ بادشاہ بھی نہیں بنا تھا۔ دیوگیری سے اپنی واپسی پر اس نے ظفر خاں کو بنگال پر قبضہ کی تیاریاں کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ جلال الدین کے خلاف اپنے منصوبوں میں ناکام رہے۔[۴۵] اس کے علاوہ جب ظفر خاں کی مقبولیت نے سلطان کی حسد کی آگ بھڑکا دی تھی تو سلطان نے ظفر خاں کو ایک بڑی فوج دے کر بنگال پر قبضہ کرنے اور وہاں حکومت کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔[۴۶] دوسرے معاملات میں مشغولیت نے اس کو اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ لیکن جب فیروز کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا تو اس نے ۳-۱۳۰۲ء میں ایک فوج بھیجنے کا تہیہ کر لیا۔

اس مہم کا مفصل بیان نہ تو ضیاء الدین نے دیا ہے نہ فرشتہ نے۔ ان کے بیانات سے یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ آیا وہ فوج وارنگل پہنچی بھی تھی یا نہیں۔ فرشتہ ملک نائب کافور کے زیر قیادت وارنگل کی دوسری مہم کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک مہم پہلے بھی بنگال کے راستے وارنگل بھیجی گئی تھی لیکن چونکہ وہ کچھ بھی حاصل کئے بغیر منتشر و پراگندہ واپس آگئی تھی لہٰذا ملک کافور کے زیر کمان اس علاقہ کو ایک دوسری مہم بھیجی گئی۔[۴۷] وہ یہ نہیں کہتا کہ شاہی فوج پر کہاں آفت نازل ہوئی تھی بہرکیف برنی کہتا ہے کہ فوج ارنگل (وارنگل) پہنچ گئی تھی لیکن چونکہ بارشیں شروع ہو گئی تھیں اس لیے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکا۔[۴۸] اس مہم کے بارے میں برنی کی ناقص معلومات کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ علاء الدین نے بنگال کے ناخوشگوار حالات کو پوشیدہ رکھا ہو۔ ۱۳۰۲-۱۳۰۰ء کے ابتدائی ایام ہی میں سلطان کو کئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ رنتھمبور کے قیام کے دوران

---

(۴۵)۔ برنی ص ۲۹-۲۴۸

(۴۶)۔ ایضاً ص ۲۵۳ میں ہے:

"اورا چند ہزار سوار دہد و طرف لکھنوتی فرستد تا اقلیم لکھنوتی بگیرد و ہمانجا باشد و پیلان و خدمتی از ان جا بر سلطان علاء الدین روان سازد۔"

(اس کو چند ہزار سپاہی دے اور لکھنوتی کی جانب بھیجے تاکہ وہ لکھنوتی کی بادشاہت پر قبضہ کرے اور وہاں قیام کرے اور وہاں سے سلطان علاء الدین کو برابر ہاتھی اور خراج بھیجتا رہے)

(۴۷)۔ فرشتہ ص ۱۱۸

(۴۸)۔ برنی ص ۳۰۰

اس نے حاجی مولا کی بغاوت کو راز میں رکھا۔ ان حالات میں اور اپنی عادت کے مطابق اس نے بغاوتوں یا ہزیمتوں کو صیغۂ راز میں رکھا ہوگا اور برنی کی خاموشی کی یہی وجہ ہے۔ مزید برآں ضیاء الدین برنی بنگال کی مقامی تاریخ سے ناواقف تھا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ بلبن کے فرزند ناصر الدین محمود کے عہد میں، علاء الدین اور اس کے جانشینوں کی حکومت کے پورے زمانے میں بنگال پر امن رہا تھا یہاں تک غیاث الدین تغلق کا زمانہ آیا جب اس نے بنگال کی جانب اپنی فوج کشی کے دوران ناصر الدین کو زندہ میں پایا اور اس کو دوبارہ بحال کر دیا۔[۴۹] مورخ نے صاف طور سے شمس الدین فیروز کے فرزند ناصر الدین کو اس کے ہم نام اس کے دادا کے نام سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس طرح اس نے ہم کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس ناصر الدین نے ۴۴ سال تک حکومت کی۔ یہ حجت سکوں اور کتبوں کی غالب شہادت کے مقابلہ میں ناقابل یقین ہے۔ اگر برنی کو بنگال کے معاصر حالات سے زیادہ واقفیت ہوتی تو اس نے اس مہم کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات ہم پہنچائی ہوتیں جو حقیقت میں خاص طور سے بنگال کے خلاف اور غالباً محض اتفاقی طور پر دار شکل کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔

مختصر یہ کہ مہم بالکل ناکام رہی۔ ملک جونا اور ملک جھجو اپنی پراگندہ افواج کے ساتھ لوٹے تاکہ راجدھانی میں سلطان سے آملیں لیکن ان کو بدایوں کے قرب و جوار میں روک دیا گیا کیونکہ قتلغ خواجہ نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ بنگال میں شمس الدین فیروز حسب معمول پوری طرح محفوظ رہا اور ۷۲۲ھ/۱۳۲۲ء تک حکومت کرتا رہا در انحالیکہ دار شکل اس مہم سے قطعی متاثر نہیں ہوا تھا۔

---

(۴۹) ایضاً ص۱۵۱

# باب 6

# جیسلمیر اور رنتھمبور

بنگال میں ہزیمت کے سوا علاء الدین کے فتوحات کے شاندار منصوبے ملک کے دوسرے حصوں میں نہایت کامیاب رہے۔ گجرات میں فوری کامیابی نے مزید کارنامے انجام دینے کی اس کی خواہش کو اور تیز کر دیا۔ اس نے اپنی توجہ راجپوت ریاستوں کی طرف مبذول کی جو سب کی سب دہلی سلطنت سے آزاد تھیں۔ راجپوت ہندوستانی شجاعت کے پیکر تھے۔ اگر ان کو مطیع کر لیا جاتا تو شاہی افواج کا وقار غیر معمولی طور پر بلند ہو جاتا اور اسی تناسب سے مستقبل میں توسیع کے امکانات بھی بڑھ جاتے۔

## جیسلمیر پر حملہ

۱۲۹۹ء ہی میں راجپوتانہ کو علائی افواج کا تجربہ ہو چکا تھا۔ راجپوتانہ بھاٹوں کی روایات جیسلمیر پر خلجیوں کے دو حملوں کا ذکر کرتی ہیں۔ ۱۲۹۴ء میں پہلا حملہ جلال الدین کا اور دوسرا ۱۲۹۵ء میں سلطان علاء الدین کا۔ بے پڑھے لکھے بھاٹ ان کو ان حملوں کے بارے میں علم صرف ان کہانیوں سے ہوا تھا جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ بھاٹ غلطی سے پہلا حملہ علاء الدین سے اور دوسرا حملہ جلال الدین سے منسوب کرتے ہیں۔[2] یہ محض سہو زمانی ہے اور واقعات کو دیدہ و دانستہ مسخ کرنا نہیں ہے جیسا کہ کرنل ٹیگ کی رائے

---

۱۔ جیسلمیر ہر طرف سے ریگستان سے گھرا ہوا ہے۔ وہ ایک نخلستان ہے جہاں گیہوں، جو نیز چاول پیدا ہوتا ہے۔
ٹاڈ، جلد سوم، ص ۱۲۶۱-۶۲

۲۔ نینسی، کھیاتس، جلد دوم ص ۲۱۵-۲۹۸

کا رجحان ہے۔[۲] محض اس غلطی کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علاء الدین کے زمانے میں جیسلمیر پر حملہ کیا ہی نہیں گیا۔[۳] یہ صحیح ہے کہ مسلم مؤرخین جیسلمیر کے کسی حملہ کا ذکر نہیں کرتے تاہم بھاٹیوں کے ادب اور تاریخ معصومی میں جو کہ سندھ کی فارسی تاریخ ہے ایک حملہ کا یقینی ذکر موجود ہے۔ سب سے پہلا ترک حملہ ۱۲۸۶ء میں بلبن کے عہد میں ہوا تھا جس میں تین ہزار آٹھ سو راجپوت میدان جنگ میں کھیت رہے تھے اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد آگ میں جل کر ہلاک ہو گئی تھی۔ جیسلمیر پر ایک ترک محافظ رسالہ تعینات کیا گیا لیکن اس پر قبضہ دو برس سے زیادہ نہیں قائم رہ سکا۔ دوسرا ترک حملہ راجپوت بھاٹوں کے مطابق ۱۲۹۵ء میں "علاء الدین کے عہد" میں ہوا۔ اس وقت جیسلمیر کا حکمران بھٹی سرکار دودا تھا جس کو غالباً تخت نشینی کے لئے اس وجہ سے چنا گیا تھا کہ غالباً حکمران سرودھ ۱۲۸۶ء میں مسلمانوں سے یا تو لڑتا ہوا مارا گیا تھا یا شکست کھا کر کسی الگ تھلگ جگہ چلا گیا تھا۔[۵] دودا نے دس سال تک بڑے حوصلہ اور شان سے حکومت کی۔ وہ بڑا جنگجو تھا اور اس نے اپنے حملوں کا دائرہ اجمیر تک پھیلا دیا تھا اور ناساگر (جھیل) سے سلطان[۶] کے گھوڑے پکڑ کر لے گیا جہاں ان کو پانی پلایا جاتا تھا۔ اس دست درازی نے جیسلمیر پر دوسرے حملہ کا سبب فراہم کر دیا اور مصیبت و ابتلاء کی وہی کہانی پھر دہرائی گئی۔ سولہ ہزار عورتوں نے جوہر کی آگ میں جل کر اپنے آپ کو قربان کر دیا اور دودا نے تلک سنگھ اور اپنے قبیلہ کے سات سو آدمیوں کے ساتھ میدان جنگ میں لڑ کر جان دی۔

جیسلمیر پر علاء الدین کے حملہ کی جو تاریخ بھاٹوں نے دی ہے وہ غلط ہے کیونکہ ۱۲۹۵ء میں تو علاء الدین تخت نشین بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن تاریخ معصومی جو غالباً تنہا فارسی تاریخ ہے جو اس حملہ کا حوالہ دیتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ علاء الدین کی فوج نے گجرات جاتے ہوئے جیسلمیر پر حملہ کیا (۱۲۹۹ء) اور معصوم کی تاریخ اس حقیقت کے پیش نظر قطعی قابل قبول ہے کہ راجپوت بھاٹ تاریخیں ذکر کرنے میں محتاط نہیں تھے اور اگر ذکر کرتے بھی ہیں تو ان کے غلط ہونے کا قوی امکان رہتا ہے۔ میر معصوم کہتے ہیں:

---

۲۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم ص ۵۲۲۔

۳۔ ایضاً ص ۵۲۲

۵۔ نیز دیکھو Indian Historical Quarterly ۱۹۳۵ء، ص ۵۲-۱۵۰

۶۔ کھیات میں فیروز شاہ سے مراد جلال الدین ہے لیکن اس جگہ واضح طور سے علاء الدین مراد ہے۔

"از سلطان علاء الدین حکمی رسید کہ الغ خان بہ تسخیر گجرات نامزد شدہ بانصف لشکر سندھ از راہ جیسلمیر عازم گجرات شود۔ چوں الغ خان بالشکریاں بہ جیسلمیر رسید، آں قلعہ را فتح نمودہ، کفار بسیار بقتل رسانید، و دویست سوار در قلعہ جیسلمیر گذاشتہ بدیگر لشکر عنکر گجرات ملحق (ملحق) شد۔"(۹)

(سلطان علاء الدین کی طرف سے حکم پہنچا کہ الغ خان کو گجرات کی فتح کے لیے نامزد کیا گیا۔ سندھ کے نصف لشکر کے ساتھ وہ جیسلمیر کے راستہ گجرات کی مہم کے لیے روانہ ہو جائے۔ جب الغ خان سپاہیوں کے ساتھ جیسلمیر پہنچا تو اس نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا اور کافروں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ قلعہ جیسلمیر میں دو سو سواروں کو چھوڑ کر بقیہ فوج کے ساتھ وہ گجرات کی فوج کے ساتھ جا ملا۔)

**رنتھمبور کی مہم**

رنتھمبور کے حملہ کے مقابلہ میں جیسلمیر پر چڑھائی محض ایک فوج کشی تھی حقیقۃً میں رنتھمبور وہ پہلی ریاست تھی جس کو راجپوتوں کے ساتھ زور آزمائی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اوّل تو دہلی سے قریب ہونے کے سبب، دوسرے جلال الدین کے اس پر قبضہ نہ کرنے کی بنا پر اور تیسرے اس کی مشہور ناقابلِ تسخیر ہونے کی وجہ سے۔ ان میں ایک فوری بہانہ اور معقول وجہ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ منگول باغی محمد شاہ اور اس کے بھائی کہرو و یو جو جالور کے قریب ہونے والی بغاوت کے سرغنہ تھے، رنتھمبور کے رانا نے پناہ دے رکھی تھی۔ اگرچہ کوئی ہمعصر مورخ اس واقعہ کو حملہ کی وجہ نہیں بتاتا۔ تاہم واقعاتی شہادت جس کی تائید بعد کی تصانیف کرتی ہیں اس نظریہ کو حتمی طور پر تقویت دیتی ہیں۔(۹)

علاء الدین کے حملہ کے وقت رنتھمبور پر چوہان بادشاہ ہمیر دیو کی حکومت تھی

---

۷۔ تاریخ معصومی ص ۴۴

۸۔ رنتھمبور اب راجستھان کے جنوب مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔ وہ سمندر کی سطح سے ۱۵۷۸ فیٹ بلند ایک چٹانی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ امیر خسرو کے مطابق وہ دہلی سے دو ہفتہ کی مسافت پر واقع تھا۔ وہ چاروں طرف سے ایک ایسی ٹھوس فصیل سے محصور تھا جو گھیرے میں تین کوس کی تھی

دیکھو جرنل آف انڈین آرٹ، ۱۶، ۱۹۱۵-۱۶، حاشیہ ۳۶

دولرانی ص ۶۵

۹۔ ہمیر کا دیہ علاء الدین کے حملہ کا سبب ہمیر کا محمد شاہ کو پناہ دینا بتاتی ہے۔ اس کی تصدیق عصامی کرتی ہے۔

جو شہور پرتھوی راج کا اصالتاً جانشین (براہ راست اولاد) تھا۔[9] مسلم حملہ آوروں نے رنتھمبور میں اپنا اقتدار قائم کرنے کی بار بار کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ ۱۲۰۹ء میں اس پر قطب الدین ایبک نے حملہ کیا اور ۱۲۲۶ء میں التتمش نے اس پر قبضہ کر لیا لیکن جلد ہی اس نے اپنی آزادی پھر سے حاصل کر لی۔ ۱۲۹۱ء میں جلال الدین خلجی نے اس پر فوج کشی کی لیکن قلعہ نا قابلِ تسخیر پاکر اس پر قبضہ کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن علاءالدین ایک دوسری ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ۱۳۰۰ء میں اس نے اپنے دو جنرلوں الغ خان کو گورنر بنایا اور نصرت خان گورنر کڑہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے زیر کمان افواج کے ساتھ رنتھمبور پر حملہ کریں۔ دونوں متحدہ افواج راجپوت قلعہ کی طرف روانہ ہوئیں اور راستہ میں انھوں نے مزاحمت کا سامنا کئے بغیر جھائن[11] کو تاراج کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ رنتھمبور میں پہنچنے سے پہلے الغ خان نے چوہان حکمران کو پیغام بھیجا کہ ہمارے آقا کے دل میں رائے کے خلاف کسی قسم کا کینہ نہیں ہے اور اگر آپ بھگوڑوں کو یا تو تلوار کے گھاٹ اتار دیں یا ان کو ہمارے حوالے کر دیں تو شاہی افواج دہلی واپس چلی جائیں گی۔ اس نے مزید دلیل یہ دی کہ اس سے رحم طلب کرنے والے جب ان کے وفادار اور نمک حلال ثابت نہیں ہو سکے جنھوں نے ان کو زندگی اور عزت بخشی تھی تو ان سے بھلا کیسے امید کی جا سکتی

---

۱۰۔ ایک سنگین دستاویز جو کوٹہ میں پائی گئی ہے۔ رنتھمبور کے چوہانوں کا شجرۂ نسب بیان کرتی ہے پرتھوی راج، واگ بھٹ (بہادر)، جیترا سمہا اور ہمیر۔ ہمیر کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک جنگ میں کسی ارجن کو شکست دی تھی، مالوہ چھین لیا تھا اور وہاں ایک تین منزلہ سنہری محل بنوایا تھا جس کا نام پشپک تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رنتھمبور میں جے پور کے موجودہ شاہی محل سے بالکل مشابہ تھا۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۲۱-۱۹۲۰ء، ص ۳۴۔

۱۱۔ ہمیر کاویہ (بلوتھکا انڈکا، متن انگریزی دیباچہ ص ۲۹) کے مطابق شاہی افواج اسی ہزار سواروں اور پیادوں کی ایک کثیر تعداد پر مشتمل تھیں۔

۱۲۔ عصامی لکھتا ہے کہ جب الغ خان نے جھائن پر قبضہ کر لیا تو اس کا نیا نام "شہر نو" پڑا۔ بدایونی اس کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "وہ (جھائن) نو شہر کے نام سے معروف ہے۔" اب نہ تو جھائن اور نہ اس کا تبدیل شدہ نام نو شہر نقشوں میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ بہر حال ایک چھوٹی جگہ "نئے گاؤں" جس کے معنی شہر نو کے ہی ہیں، رنتھمبور سے تھوڑے فاصلے پر شرق میں واقع ہے۔ اس کو غالباً برنی کے جھائن سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ فتوح السلاطین ص ۲۷۱؛ بدایونی، جلد اول، ص ۱۹۰۔

ہے کہ وہ اپنے تئے آقا یعنی آپ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک روا رکھ سکیں گے؟ آخر میں ہمیر سے کہا گیا تھا کہ اگر اس نے خط میں مندرج ہدایات کے مطابق عمل نہ کیا تو اسے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے رہنا چاہیے۔[13]

لیکن ہمیر مرعوب ہونے والا نہ تھا۔ وہ اپنے مہمانوں کو ان لوگوں کے سپرد کر دینے پر قطعی تیار نہ تھا جو ان کو قتل کر لے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔ اس نے پیغام بھیجا کہ وہ سلطان کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا لیکن وہ اس سے خوفزدہ بھی نہیں ہے۔ امرت کلش کی ہمیر پربندھ کے مطابق متعدد مہاجنوں اور ساہوکاروں نے رانا کو مشورہ دیا کہ وہ پناہ گزینوں کو حوالے کر دے۔ کیونکہ ان کی دلیل تھی کہ ایسا کرنے سے انکار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رنتھمبور پر سلطان حملہ کر دے گا اور لوگوں کو مصائب برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن رانا نے ان کا مشورہ حقارت سے ٹھکرا دیا کیونکہ پناہ گیر امیروں کو دیئے گئے اپنے وعدہ کو وہ نباہنے کا عزم مصمم رکھتا تھا۔[14] ہمادر چوہان کے نزدیک منگولی امراء سے پناہ کا وعدہ اور اپنے گھرانے کی قدیم آن مسلمان جنرلوں کا چیلنج قبول کرنے کے لیے معقول ترین وجہ تھی۔

الغ خان نے رانا ہمیر کا جواب سنتے ہی اپنی فوج کو منزلِ مقصود کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ قلعہ کے اطراف میں وہ خیمہ زن ہوا اور اس نے خندقیں اور مورچے (اگرگچ) تعمیر کرنے کا حکم دیا۔[15]

---

13- فتوح ص ۲۴۳ - امرت کلش کے ہمیر پربندھ (مصنفہ در ۱۵۱۰ء) کے مطابق محمد شاہ نے کالو ملک کو قتل کر دیا تھا اور یہ قتل سلطان علاء الدین کی خفگی کا سبب بن گیا۔ (سوادھیائے جلد دوم شمارہ ۱، ۱۹۶۴ء ص ۵) یہ کالو ملک سلطان کا بھائی ہو سکتا ہے جو جالور کے قریب ہونے والی بغاوت میں قتل کر دیا گیا تھا لیکن اس کا نام فارسی مورخین نہیں دیتے ہیں۔

14- امرت کلش کا ہمیر پربندھ ابیات ۴۷-۱۲۹۔

ہمیرینٹ (ص ۱۱۷) مہاجنوں کو ان کے رویہ کے سبب موردِ الزام ٹھہراتی ہے لیکن نیاء سوری ہمیر کا دیہ میں لکھتا ہے کہ رانا کا زوال اس کی غلط معاشی پالیسی کے سبب ہوا (ہمیرینٹ مقدمہ ۳، ۲۸) بڑی جاگیروں کے علاوہ اس نے محمد شاہ اور کیبر د کو وہ الکو کا امرازی خدمت کا معاوضہ دیا تھا، اس فیاضی کا بار عوام کے کمزور کندھوں پر پڑا۔ ہمیر پربندھ بھی کہتی ہے کہ رانا نے محمد شاہ کو دولت اور جاگیر سے نوازا۔

15- قرونِ وسطیٰ کے فنِ حرب کے تذکرے میں عرادہ، اگرگچ، منجنیق اور پاشیب اکثر و بیشتر آتے ہیں پہلے تین تو پتھر پھینکنے والی کلیں تھیں۔ پاشیب ایک سطح چبوترہ سا ہوتا تھا جو ریت اور دوسرے سامان سے بنایا جاتا تھا کہ قلعہ کی دیواروں پر چڑھا جا سکے۔ نیز ملاحظہ ہو باب ۱۱ -

اس اثنا میں ہمیر دیو نے اپنی دفاعی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ یحییٰ کا اندازہ ہے کہ رانے کے زیر کمان بارہ ہزار سوار، چند مشہور ہاتھی اور بے شمار پیادے تھے۔ امیر خسرو کے بیان کے مطابق راجہ کے پاس تقریباً دس ہزار برق رفتار گھوڑے تھے۔[16] راجپوت قلعہ سے مسلسل تیر و تفنگ کی بارش کرتے رہتے۔[17] اتفاقاً نصرت خان کے ایک پتھر آ کر لگا اور وہ صدر دروازے پر جس کا نام نولکھی دروازہ تھا مر گیا۔ اتنے عظیم کمانڈر کی موت پر مسلمان فوج میں صف ماتم بچھ گئی۔ اس پر بہادر راجپوتوں نے شاہی لشکرگاہ میں خاموشی چھا جانے سے یہ نتیجہ نکالا کہ ان پر شکست خوردگی کے آثار طاری ہو گئے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے دفاعی مقامات کو چھوڑا اور سیلاب کی طرح قلعہ سے امنڈے اور محاصرہ کرنے والوں پر ٹوٹ پڑے۔[18] الغ خان اس تصادم کا مقابلہ نہ کر سکا اور فوراً جھائن کی جانب پسپا ہو گیا۔ یہ امر کہ علاءالدین نے راجپوتوں کی طاقت کا کم اندازہ لگایا سب پر روشن ہو گیا۔ الغ خان نے سلطان کو نصرت خان کی موت اور رنتھمبور سے فوج کی پسپائی کی صحیح خبر بھیجی۔ اس پر سلطان نے محاذ جنگ پر بنفس نفیس کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔[19]

---

۱۶- تاریخ مبارک شاہی، ۷۷؛ دیول رانی، ص ۹۵۔

۱۷- برنی، ۲۷۲ سنگ مغربی کہتا ہے۔ غالباً سنگ مغربی یا کوئی پتھر کسی قسم کے پھینکے جانے والے ہتھیار تھے جو علاءالدین کے زمانے میں جنگ میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اسلامک کلچر ۱۹۳۸ء ص ۴۰۵-۱۸، میں پیش کیے گئے۔ اس خیال سے کہ سنگ مغربی توپ کے گولے تھے اتفاق کرنا مشکل ہے۔

۱۸- فرشتہ کہتا ہے کہ رانے نے دو لاکھ سپاہ کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ یہ تعداد فرضی معلوم ہوتی ہے۔ راجپوت اسناد سے نصرت خان کی موت کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ ہمیر پد، مقدمہ ص ۱۵۔

متعدد ہمیر کاویہ (رزمیے) جو رستمبھور (رنتھمبور) کے رانا ہمیر کی سوانح حیات بیان کرتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر بی جے سندیسرا نے ہمیر کے بارے میں دستیاب مختلف کاویوں کی یہ فہرست تیار کی ہے (سوادھیائے، گجراتی میں، جلد دوم، شمارہ ۱، ۱۹۶۴ء ص ۱-۱۱)۔

سب سے پہلا کاویہ پاراساچین عالم نیا چندر سوری (تقریباً ۱۴۵۰ وکرم / ۱۳۸۳ء) کا ہے جو گوالیار میں تحریر کیا گیا۔ بھنڈ ودیاس کا ہمیرین ۱۴۸۱ء (۱۵۳۸ وکرم) میں مرتب ہوا اور امرت کلش کا ہمیر پربندھ ۱۵۱۸ء میں۔ ڈاکٹر دشرتھ شرما کے مطابق جنھوں نے ان راجستھانی ماخذ کا ایک تقابلی مطالعہ کیا ہے یہ کاویہ کافی قابل اعتماد ہے۔ اگرچہ وہ فارسی تذکروں کی طرح مبالغہ آرائی کرتے ہیں اور حقیقت و افسانہ میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ تاہم اکثر و بیشتر فارسی تذکروں سے ان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر

(باقی صفحہ [illegible])

## علاء الدین کو قتل کرنے کی کوشش

اس کے فوراً بعد سلطان ایک لشکر جرار کے ساتھ دہلی سے رنتھمبور کے لیے روانہ ہوا۔ وہ کچھ مدت تلپت[۲۰] میں قیام پذیر رہا جہاں وہ شکار کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ پڑوس کے بادہ نامی گاؤں

شردا کا خیال ہے کہ نیاسے چند سوری کی گہرا تاریخی شعور رکھتا تھا اور وہ صحیح تاریخیں دیتا ہے۔ (ہمیند و دیاس کا ہمیر بن، مقدمہ، ص ۴۷-۴۸)۔

تقریباً تمام راسا کہیں کہیں چند اختلافات کے علاوہ اپنے ہیرو کی زندگی کے بارے میں یکساں حقائق پیش کرتے ہیں۔ ان راسا کاویوں کے مطابق رانا ہمیر جیتر اسنگھ اور ان کی مہارانی ہیرا دیوی کا لڑکا تھا۔ شہزادے کو حکومت کے کاروبار کے سلسلہ میں بہترین پند و نصائح دینے کے بعد بوڑھے باپ نے ایک گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے لیے جنگل کی راہ لی اور ۱۲۸۳ء (۱۳۴۰ سمبت) میں ہمیر کو حکومت سونپ دی۔ رانا ہمیر نے ایک پناہ گزیں ماہم شاہ کو پناہ دی جس سے سلطان علاء الدین اس لیے ناراض ہو گیا تھا کہ سلطان کی چہیتی بیگم نامی ایک ملکہ نے منگول امیر کو اپنی عنایات کا مرکز بنا لیا تھا (مسلم مورخوں کے مطابق محمد شاہ جالور کی بغاوت کے بعد مسلم لشکرگاہ سے فرار ہوا تھا)۔ سلطان نے مفرور کو سپرد کر دینے کا مطالبہ کیا لیکن جب رانا نے انکار کر دیا تو سلطان نے رنتھمبور پر حملہ کر دیا۔ اس وقت رانا کی عمر ۲۸ سال تھی۔

جودھراج کی ہما کاوے (مرتبہ ۱۸۲۸ء) کے مطابق "قلعہ بہت مضبوط اور ناقابل تسخیر ہے۔۔۔ پانچ بڑے تالاب قلعہ کے دفاعی مورچوں کو مزید استحکام دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کی حفاظت پر چھ سو ناگاؤں کا دستہ جو سب کے سب تجربہ کار سپاہی ہیں تعینات ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی سامان رسد اور گولا بارود کی فراہمی کے وسیع انتظامات ہیں۔۔۔۔۔ علاء الدین کی افواج کے خلاف ہمیر کے دفاع میں اس کی مدد راؤ رندھیر نے بھی کی تھی جو رانا کا ایک چچا اور باج گذار تھا۔ چتوڑ کے دو شہزادے کھمبہ اور بلنسی بھی اپنے چچا کی اعانت کے لیے آئے تھے لیکن سرجن شاہ نے جو کہ بودھوں کے شراوجی (بنیا) فرقہ کا ایک تاجر تھا علاء الدین سے قلعہ پر قبضہ دلانے میں مدد کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ شراوجی راجپوت حکمرانوں کا دشمن تھا اور اس نے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کا تہیہ کر رکھا تھا جس کو رانا نے قتل کر دیا تھا۔

جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۹ء، ص ۲۵۲-۱۸۹۔

انڈین اینٹی کوئیری جلد ہشتم ۱۸۷۹ء، ص ۷۳-۵۵۔

۲۰- پرانی دہلی کے مشرق اور کیلوگھڑی کے جنوب میں تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر یہ ایک میدان تھا۔

گیا تو اس نے شیر کے شکار کے لئے (نرغہ)[21] کے انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ یہ انتظامات کیے جا رہے تھے سلطان ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک اس نے کچھ لوگوں کو "شیر شیر" پکارتے سنا اور اس پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ وہ بُری طرح گھبرا گیا تاہم وہ فوراً مونڈھے سے اتر آیا اور اس سے اپنے بچاؤ کی کوشش کی۔ بہرکیف دو تیر اس کے بازو میں آکر لگے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس غدارانہ اور بزدلانہ حملہ کا منصوبہ اس کے بھتیجے سلیمان شاہ نے جو اکت خان کے نام سے معروف تھا اور جو اس کے چھوٹے بھائی محمد کا ایک بیٹا تھا، بنایا تھا۔ اکت خان وکیل در کے عہدے پر فائز تھا۔ اکت خان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جیسے علاء الدین اپنے چچا کو قتل کر کے تخت کا مالک بن گیا اسی طرح وہ بھی اپنے چچا کو قتل کر کے تخت پر قابض ہو جائے۔ اسی ارادے سے وہ اپنے بعض ہمنواؤں کے ساتھ جن میں اکثر نو مسلم تھے شکارگاہ آیا تھا اور بادشاہ پر حملہ کیا تھا۔ خوش قسمتی سے علاء الدین ایک روئی قبا پہنے ہوئے تھا جس میں روئی بھری تھی (قبا و دگلہ)۔ تیر اس کے بدن کے کسی نازک حصے میں نہیں لگے تھے۔ البتہ وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ اکت خان موقعہ واردات پر پہنچا اور سلطان کا سر قلم کرنے کی کوشش لیکن بعض وفادار خدام نے صورت حال کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے علاء الدین کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا اور چلا چلا کر رونے لگے کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ بیوقوف اور ناتجربہ کار اکت نے کچھ تو اس بنا پر کہ وہ گھوڑے سے اتر کر سلطان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ تخت پر قبضہ کرنے کی اسے جلدی تھی آسانی سے خدام (پایک) کی دل خوش کن چیخ و پکار پر یقین کر لیا۔ وہ تیز رفتاری سے تلپٹ پہنچا، شاہی خیمہ میں داخل ہوا اور علاء الدین کے تخت پر رونق افروز ہو گیا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ میں نے سلطان کو قتل کر دیا ہے۔ لوگوں نے فوراً اس کا یقین کر لیا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو وہ مشکل ہی سے تخت نشین ہونے کی جسارت کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے شاہی لشکرگاہ میں زبردست افراتفری اور انتشار پھیل گیا اور ہر چیز الٹ پلٹ ہونے لگی۔ ہاتھیوں کو ہودوں سے آراستہ کیا گیا اور شاہی خیمہ کے سامنے لایا گیا۔ حرم شاہی کے خدام باہر آ گئے اور ہر شخص اپنے موزوں مقام پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔"[22] درباریوں اور عوام کو شرف دیدار بخشنے کے بعد اکت خان نے شاہی حرم میں

۲۱۔ برنی، ۲۷۳۔ نرغہ ایک شکار کی قسم کا نام ہے جس میں جانور کو سب طرف سے گھیر لیا جاتا ہے اور پھر اس پر نشانہ لگایا جاتا ہے۔

۲۲۔ برنی، ۲۷۴۔

داخل ہونا چاہا لیکن محافظ اعلیٰ ملک دینار نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کا راستہ روک دیا۔ اس نے الغ خان سے اصرار کیا کہ شاہی حرم میں داخل ہونے سے پہلے وہ سلطان کا سر لائے۔

سلیمان، ملک دینار کے عجیب و غریب مطالبے پر غور ہی کر رہا تھا کہ "اچانک علاء الدین کا سر نمودار ہوا جو ہمیشہ کی طرح اس کے شانوں کی زینت تھا یعنی زندہ سلطان ایک قریبی پہاڑی پر فوج کے سامنے نمودار ہوا۔"[۲۳] اس کا قصہ یوں ہے کہ جب علاء الدین تیروں سے زخمی ہوا تو اس کے ساتھ کے بیشتر لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف چند جان نثار محافظ (پایک) اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ جب سلیمان تلپٹ کی طرف برق رفتاری کے ساتھ روانہ ہو گیا تو سلطان کے خدام نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور اس کی تیمارداری کی۔ جلد ہی علاء الدین کو افاقہ ہو گیا تاہم زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ بہت کمزور اور خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ بعض بااثر امیروں نے نوجوان شہزادے کا ساتھ دیا ہوگا ورنہ وہ کسی ایسے گستاخانہ اقدام کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ غرض اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لشکرگاہ کو چھوڑ کر اپنے بھائی الغ خان کے پاس جھائن جائے اور آئندہ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے اس پر اس سے مشورہ کرے۔ لیکن ملک حمید الدین نے جو کہ امیر کوہ (زراعت کے نگران اعلیٰ) کے عہدہ پر فائز تھا سلطان کو فوراً ہی شاہی لشکرگاہ جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے دلیل یہ دی کہ جیسے ہی عوام اور درباریوں کو شاہی پرچم نظر آئیں گے اور جہاں پناہ کی عظیم المرتبت ذات کے محفوظ ہونے کی خبر ہوگی وہ آپ کے آستانہ پر لوٹ آئیں گے اور پلک جھپکتے ہی باغی الغ خان کا سر اڑا دیا اور نیزے پر بلند کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر ایک رات گزر گئی، اور لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ حضور محفوظ ہیں تو ممکن ہے کہ کچھ غدار اس سے جا ملیں اور بغاوت اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو جائے جتنی کہ اب ہے۔"[۲۴] یہ مشورہ سلطان کو موزوں معلوم ہوا اور وہ فوراً لشکرگاہ کو روانہ ہو گیا۔ راستہ میں اس کے آدمیوں میں جس کسی نے بھی سلطان کو زندہ دیکھا اس کے ساتھ ہو لیا۔ یہاں تک کہ جب وہ لشکرگاہ کے قریب پہنچا تو اس کے ساتھ پانچ چھ سو سوار تھے۔ علاء الدین ایک ٹیلے پر چڑھا اور لوگوں کے سامنے نمودار ہوا۔ تمام درباری فوراً شاہی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کہ سب کچھ ختم ہوا الغ خان افغان پور کی جانب بھاگ کھڑا

---

۲۳- لین پول، قرون وسطیٰ کا ہند (*Mediaval India*)، ۱۰۰۔

۲۴- برنی، ۲۷۵۔

ہوا۔ دوسرے امرا مع امیر ملک اعزالدین اور ملک ناصرالدین نورخان کو اس کے تعاقب میں بھیجا گیا۔ انھوں نے افغان پور کے قریب اسے جالیا اور اس کا سر قلم کر دیا۔ غدار کا سر ایک نیزے کی نوک پر رکھا گیا اور لشکر گاہ میں اس کی نمائش کی گئی۔ بعد میں اسے دہلی بھیجا گیا جہاں شہر بھر میں اسے گھمایا گیا اور پھر آخرکار اسے جھائن میں الغ خان کے پاس بھیج دیا گیا۔ باغی کے ایک چھوٹے بھائی قتلغ خان کا بھی سر اڑا دیا گیا۔ سلطان کے غصے کی انتہا نہ تھی۔ اس نے ان تمام لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن کا بغاوت سے ذرا بھی تعلق تھا یا جن کو ذرا بھی اس کی خبر تھی۔ اس نے ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنا کر مختلف قلعوں میں بھیج دیا۔

الغ خان کے حملے کے ختم ہونے کے بعد علاء الدین کوچ پر کوچ کرتا ہوا رنتھمبور پہنچا اور ران نامی ایک پہاڑی پر خیمہ زن ہوا جو اس پہاڑی کے مقابل تھی جس پر عظیم قلعہ واقع تھا۔ سلطان کی آمد کے ساتھ ہی محاصرہ میں پوری شدت پیدا ہو گئی۔ سپاہیوں میں چمڑے کے تھیلے تقسیم کئے گئے تاکہ وہ ریت اور کنکریٹ لائیں اور دونوں پہاڑیوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے والی کھائی کو پاٹ سکیں۔ لیکن رائے نے اپنے آپ کو شاہی افواج کے طریقۂ جنگ سے پوری طرح باخبر رکھا اور اپنے دشمن کی خندق کو بھرنے کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔[25] اس کے علاوہ قلعہ سے محاصرہ کرنے والوں کے آتشیں پتھروں کے جواب میں قلعے سے برابر آگ برسائی جاتی رہی اور دونوں جانب کافی تعداد میں لوگ مارے گئے۔[26]

## عمر اور منگو کی بغاوت

جب کہ محاصرہ اس طرح بلا کسی فیصلے کے طول کھینچتا جا رہا تھا۔ سلطان کو ایک دوسری بغاوت کی خبر پہنچی۔ راجدھانی سے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اس کے دو بھانجوں (بہن کے بیٹوں) عمر خان اور منگو خان نے جو بالترتیب بدایوں اور اودھ کے گورنر تھے اودھ میں بغاوت برپا کر دی۔ اس بغاوت کے اصل مقصد کا علم نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ سلطان کی ظالمانہ فطرت نے ملک کے غیر مطمئن عناصر کو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک دی ہو۔ اس زمانہ میں جانشینی کا غیر متعینہ طریقۂ کار بھی اس کا سبب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الغ خان کی بغاوت نے ان دونوں شہزادوں کو بھی قسمت آزمائی کی ترغیب دی ہو۔

---

۲۵۔ فتوح، ص ۲۶۵۔

۲۶۔ برنی، ص ۲۷۷۔

سلطان نے فوراً کچھ تجربہ کار امیروں کو روانہ کیا اور جلد ہی یہ فتنہ دبا دیا گیا۔ دونوں نوخیز جوانوں کو پکڑ کر رنتھمبور بھیج دیا گیا جہاں سلطان کے حکم سے اور اس کی موجودگی میں تخریب نے کی قاشوں کی طرح" ان کی آنکھیں نکال لی گئیں۔ ان کے خاندان اور پیروکاروں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔

## حاجی مولا کی بغاوت

عمر اور منگو کی ناکام بغاوت کے فوراً بعد دہلی میں ایک خطرناک بغاوت برپا ہونے کی خبر شاہی لشکر گاہ پہنچی۔ یہ بغاوت البری ترکوں کے اقتدار اعلیٰ پھر سے حاصل کرنے کی متعدد کوششوں میں سے ایک کوشش تھی۔ اس سازش کا سرغنہ ایک حاجی مولا تھا جو دہلی کے سابق کوتوال ملک فخر الدین کا ایک نامور غلام تھا۔ حاجی مولا انتہائی خون آشام، جری اور بد چلن فطرت شخص تھا۔ بغاوت کے وقت حاجی رتول[27] کی خالصہ زمینوں کا نگران اعلیٰ تھا اور ترمذی دہلی کا کوتوال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی بے انتہا سخت اور اکھڑ طبیعت کا آدمی تھا اور دہلی کے عوام اس سے سخت بیزار تھے۔ اس وقت وہ بدایوں دروازے کی مرمت میں مشغول تھا اور تعمیر کی نگرانی کرنے کے لیے اس نے اس کے قریب ہی ایک مکان کو اپنی رہائش گاہ بنا رکھا تھا۔ انھیں دنوں کچھ عارضی جھونپڑے سیری کے میدان میں کھڑے کر دیئے گئے تھے جہاں ایک نیا قلعہ تعمیر ہو رہا تھا اور سیری کا کوتوال علاء الدین ایاز وہاں مقیم تھا۔ اس طرح دونوں کوتوال مصروف تھے، ایک بدایوں دروازے پر اور دوسرا سیری میں اور سلطان رنتھمبور کے دور دراز علاقے میں تھا۔ اس وقت رنتھمبور سے سپاہیوں کی حالت زار کی خبریں مسلسل آ رہی تھیں اور یہ افواہ گرم تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ دینے پر بری طرح آمادہ ہیں لیکن سلطان کی سخت سزاؤں کے ڈر سے ایسا نہیں کر سکتے۔ اس موقع کو موضوع سمجھ کر اور یہ خیال خام کر کے کہ لشکر گاہ ا ۔ پایۂ تخت کے عوام اپنی پریشانی میں اس کی امداد پر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حاجی مولا نے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ مئی ۱۳۰۱ء مطابق رمضان ۷۰۰ھ کے مہینے میں ایک دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں جب کہ زیادہ تر لوگ قیلولہ کر رہے تھے اور بہت کم لوگ سڑک پر آ جا رہے تھے حاجی مولا چار مسلح آدمیوں کے ساتھ ترمذی کی رہائش گاہ پر گیا اور یہ کہہ کر کہ وہ سلطان کی طرف سے ایک پیغام لایا ہے اس کو باہر آنے کے لیے کہا۔ کسی خطرہ کا ذرا سا بھی شبہہ کیے بغیر کوتوال اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔ فوراً اس

---

۲۷۔ رتول یا رتول دہلی کے شمال مشرق میں پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور ضلع میرٹھ کی باغپت تحصیل میں شامل ہے۔ سلطان جلال الدین کے عہد میں حاجی مولا دہلی کا شحنہ رہ چکا تھا۔ فرشتہ، ص ۱۰۷۔

کا سر قلم کر دیا گیا۔ وہاں موجود ہر شخص حیرت زدہ رہ گیا اس وقت حاجی مولا نے اپنی بغل کے نیچے سے ایک مصنوعی حکم نکالا اور لوگوں کو بتایا کہ اس نے کوتوال کو سلطان کے حکم سے قتل کیا ہے۔ پھر اس نے ترمذی کی نگرانی میں رہنے والے تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔ کوتوال کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی شہر کے لوگ اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ "شہر بھر میں ہر گھر کا دروازہ بند کر دیا گیا" ترمذی کا خاتمہ کرنے کے بعد حاجی مولا نے شاہی حکم نامہ کے اس بہانے سے نئے قلعہ کے کوتوال علاء الدین ایاز کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ایاز حاجی کی غداری سے واقف ہو چکا تھا اور جب حاجی نے اس سے باہر آنے اور شاہی فرمان سن جانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے سیری کے نئے قلعہ کی جو اس وقت زیر تعمیر تھا حفاظت کے اقدامات کیے۔

لیکن دہلی پر حاجی مولا کا مکمل قبضہ تھا۔ اس نے تمام ریاستی قیدیوں کو آزاد کر دیا جن میں سے بعض اُس کے ساتھ ہو گئے۔ اپنے دعوی کو مستحکم بنانے اور نئے حامی حاصل کرنے کی غرض سے اس نے شاہی خزانہ لوٹ لیا اور یہ دولت عام طور سے لوگوں میں خوب خوب بانٹی۔ اس نے اپنے حامیوں کو ہتھیار اور گھوڑے دیئے اور "جو بھی اس کا حلیف بن گیا اس کی گود اس نے سونے سے بھر دی۔" پھر بھی حاجی مولا کی حالت محفوظ نہیں تھی۔ وہ ایک مکار اور غاصب تھا جس کا تخت پر کوئی حق نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ایک کٹھ پتلی تلاش کیا جو نام کا بادشاہ بنا رہے اور وہ خود اصل اقتدار سے لطف اندوز ہو سکے۔ نظر انتخاب علوی نامی ایک سید زادے پر پڑی جو برنی کے مطابق شاہ نجف کی اولاد میں سے سمجھا جاتا تھا۔ اور اپنی ماں کی جانب سے سلطان شمس الدین التمش کا رشتہ دار ہوتا تھا۔ حاجی نے اس معصوم کو زبردستی اس کے گھر سے اغوا کر لیا اور تخت پر بٹھا دیا۔ پایۂ تخت میں موجود تمام امراء اور سربرآوردہ اشخاص کو اس کی خدمت میں حاضر ہونے اور حلف وفاداری اٹھانے کے لیے مجبور کیا گیا۔ عوام عام طور سے بے انتہا خوفزدہ تھے۔ کیونکہ علاء الدین کے انتقام کو ٹھنڈا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ باغیوں کے خوف کی وجہ سے دہلی کے لوگوں کی بھوک اور نیند اڑ گئی اور ان کے دن بڑے اضطراب میں گذرنے لگے۔

علاء الدین کو بغاوت کی خبر اس کے برپا ہونے کے تین ہی دن کے بعد مل گئی تھی۔ اس نے اس حقیقت کی سن گن کسی کو نہ لگنے دی تاہم احتیاطی تدبیر کے بطور ملک حمید الدین کو دہلی بھیجا[۲۸]

۲۸۔ اکت خان کی بغاوت کے وقت حمید الدین شاہی لشکرگاہ میں موجود تھا۔ وہ سلطان کے ہمراہ یقیناً تھنبور گیا ہوگا۔ فرشتہ کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب حاجی کی بغاوت برپا ہوئی تو (باقی صفحہ آئندہ پر)

دیا لیکن جب دہلی میں بغاوت ہونے اور ایک کٹھ پتلی بادشاہ کے تخت نشین ہونے کی مسلسل خبریں آنے لگیں تو اس نے باغیوں کو سزا دینے کے لیے اپنے بھائی الغ خان کو روانہ کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ الغ خان دہلی پہنچے ملک حمید الدین نے فتنہ کا تقریباً سر کچل دیا۔ حمید الدین اپنے بیٹوں اور عزیزوں کے ہمراہ غزنی دروازے کی طرف سے زبردستی داخل ہو گیا اور شہر میں داخل ہونے کے بعد بھنڈر کل دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کے اور باغیوں کے درمیان معمولی سی جھڑپ ہوئی۔ حاجی مولا کو شکست ہوئی تاہم فتنہ انگیزی کی اس کی صلاحیت پوری طرح ختم نہیں کی جا سکی۔ اتفاق سے ظفر خان کے کچھ آدمی دربار میں اپنی درخواست پیش کرنے کی غرض سے امروہہ سے راجد حانی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے شاہی افسروں کا ساتھ دیا اور ان کی مدد سے حاجی کے گروہ کو پوری طرح سے تباہ کر دیا گیا۔ بہادر امیر کوہ نے حاجی کو اس کے گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ تیروں کی مسلسل بارش ہونے کے باوجود اس نے جنبش نہ کی، یہاں تک کہ حاجی کا کام تمام کر دیا۔ پھر وہ کوشک لال گیا اور بیچارہ علوی کا سر اڑا دیا۔ اس کو ایک نیزے پر رکھا گیا، دہلی کی سڑکوں پر گشت کرایا گیا اور پھر سلطان کے پاس رنتھمبور بھیج دیا گیا۔

ملک حمید الدین نے اس کے بعد حاجی مولا کے تمام ساتھیوں کو پکڑا اور ان سے وہ تمام رقمیں وصول کیں جو ان کو باغی سے ملی تھیں۔ ان کو پھر شاہی خزانے میں داخل کیا گیا۔ اس کی انتقامی کارروائی جاری تھی کہ رنتھمبور سے الغ خان آ پہنچا اور اس نے تمام مقید باغیوں کو قتل کر دیا جس سے خون کا ایک دریا بہہ نکلا۔ باغیوں کو جڑ سے کاٹ پھینکنے کے عزم کے ساتھ ساتھ اس نے لوگوں کی عبرت کے لیے دہلی کے سابق کوتوال ملک الامراء فخر الدین کی نسل ہی کا خاتمہ کر دیا۔ غالباً کوتوال کے خاندان والوں کا بغاوت میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ان کا بس یہی قصور تھا کہ گزشتہ کسی زمانے میں حاجی مولا ان کا آدمی رہ چکا تھا۔

## رنتھمبور کی مشروط اطاعت

رنتھمبور کا محاصرہ طول کھینچتا ہی گیا۔ اس اثنا میں نصرت خان جیسا جنرل ہلاک ہو گیا۔ سلطان کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ اور متعدد بغاوتوں نے سلطنت کی چولیں ہلا دیں۔ تاہم قلعہ پر قبضہ کرنے

---

(باقی صفحہ گزشتہ) امیر دہلی میں مقیم تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حمید الدین کو دہلی اس وقت بھیجا گیا تھا جب عمر اور منگو کی بغاوت پھوٹ پڑی تھی یا حاجی مولا کی بغاوت کے بالکل آغاز میں۔

کے علاءالدین کے عزم میں ذرا بھی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ فوج کو بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک بھی سپاہی نے لشکرگاہ سے فرار ہونے کی جرأت اس خوف سے نہیں کی کہ سلطان اس پر تین سال کی تنخواہ بطور جرمانہ عائد کر دے گا۔[19] قرب و جوار کے وسیع علاقے پوری طرح تاراج کر دیئے گئے۔ شاہی افواج پر مایوسی کے بادل چھانے لگے۔ پایۂ تخت سے دور پڑے ہوئے سپاہیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ رنتھمبور کی ناقابلِ تسخیر فصیلوں کے نیچے موت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ خفیہ طور سے علاءالدین اپنے معتمد امیروں سے ان مسلسل بغاوتوں اور حالات کی نزاکت کے بارے میں مشورے لیتا رہا لیکن علانیہ وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ جیسے کوئی خاص بات ہی نہیں اور محاصرہ میں اور شدت پیدا کر دیتا تھا۔ سپاہیوں نے خندق کو لکڑی کے لٹھوں سے پاٹنے کی کوشش کی لیکن قلعے سے پھینکے جانے والے جلتے ایندھن نے ان کو راکھ کر دیا۔ جب یہ تدبیر ناکام ہو گئی اور قلعہ کی فصیل تک پہنچنا مشکل نظر آیا تو سلطان کے سپاہیوں نے ریت اور پتھر سے خندق کے چھوٹے سے حصے کو پاٹنے پر اپنی ساری توجہ لگا دی۔ جب تھیلے کم پڑ گئے تو انھوں نے اپنے پاجاموں کو تھیلوں کی طرح استعمال کیا اور وہ ایک ایسا ٹیلہ بنانے میں کامیاب ہو گئے جو تقریباً قلعہ کے برجوں تک جا پہنچا۔[20] لیکن دفاع کرنے والے برابر آگ اور پتھروں کی بارش کرتے رہے اور دشمن کو مزید دو تین ہفتے تک قلعہ کی فصیل سے دور رکھنے میں کامیاب رہے۔ آخر کار قلعہ میں سامان رسد کی کمی ہو گئی اور جلد ہی اتنا زبردست قحط پڑا کہ چاول کا ایک دانہ "دو رتی" سونے کے عوض ہی خریدا جا سکتا تھا۔[21] امیر خسرو کہتے ہیں کہ "آدمی پیٹ کی مصیبت کے سوا اور ہر مصیبت برداشت کر سکتا ہے"۔ اور دلیر راجپوت بھوک کی مار برداشت

---

۱۹۔ برنی، ص ۲۷۹۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تنگ دستی کی وجہ رُوگردانی واقع ہوگی۔ دوسری جانب میر حسن چرت صراحت سے کہتی ہے کہ محاصرہ کے طول کھینچنے کی وجہ سے قلعے کے بہت سے لوگ دشمن سے جا ملے۔
ہمیرین، مقدمہ، ص ۱۲۹۔

۲۰۔ ہمیرین، مذکورہ بالا، ص ۱۷، ۵۔

۲۱۔ ہمیر کاویہ کے مطابق سرجن شاہ نے جو ہمیر سے دشمنی رکھتا تھا اور جس کو علاءالدین نے جیت لیا تھا خفیہ طریقے سے غلہ کے گوداموں میں کھالیں رکھوا دی تھیں جس سے اناج نجس ہو گیا تھا۔
جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۸۷۹ء، ص ۲۵۲-۱۹۶۔
انڈین انٹی کوئیٹی، ۱۸۷۹ء، ص ۴۳-۵۵۔

نہ کرسکے۔ دوسری طرف شاہی لشکرگاہ میں سپاہیوں میں سونا فیاضی سے تقسیم کیا جا رہا تھا تاکہ ان کو جنگ کرنے کی نئی تحریک دی جاسکے۔ جب قلعہ میں مصیبت، مایوسی اور بھکمری کے سوا اور کچھ نہ رہا تو جوہر کی دلیرانہ رسم ادا کی گئی۔ شعلے اگلتی آگ روشن کی گئی اور مہارانی رنگا دیوی کی سرکردگی میں رائے کی سب خواتین چتا میں جل مریں۔[۳۲] راجپوت سپاہ کے بچے کچھے سپاہیوں، ان کے امیروں اور راجہ نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے اور دشمن سے آخری جنگ لڑنے کے لیے امنڈ پڑے۔ ہمیر کی آخری جنگ کا مفصل بیان صرف راجپوت ماخذ میں ملتا ہے۔ ہمیر مہاکاویہ کے مطابق اس کے آخری لمحہ میں نو بہادر آدمی اس کے پہلو میں لڑتے رہے۔ اس کا بھائی ویرام، تک گنگادھر، چارمنگول (بھائی) کشیتراسنگھ پرمار اور ڈوڈا اور۔ ویرام کے مارے جانے اور محمد شاہ کے بیہوش ہو جانے کے بعد ہمیر لڑنے کے لئے آگے بڑھا۔ رنتھمبوری جان توڑ کر لڑے کیونکہ کسی کو بھی اپنی جان بچانے کی ذرا بھی تمنا نہ تھی۔ جنگ بھیانک ہوتی گئی اور ہر سمت خون بہتا رہا۔ محمد شاہ اور کبھرو جو آخری لمحہ تک راجپوت راجہ کے احسان مند رہے اپنے محسن کے پہلو بہ پہلو لڑتے رہے۔ آخر کار غنیم رانا ہمیر جو کہ ابھی عنفوان شباب ہی میں تھا بہادری سے لڑتا ہوا میدان جنگ میں کھیت رہا۔[۳۳] عصامی لکھتا ہے کہ راجہ کے خاندان میں کوئی زندہ نہ پکڑا جاسکا۔[۳۴] اس طرح ہندوستان میں چوہان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[۳۵]

بعض مصنفوں نے رانا ہمیر کی شاندار جنگ اور موت کو اس کی ضد (ہمیر ہٹ) سے تعبیر

---

۳۲- ہمیر بلاس سارگ ۱۳، ہمیر ص ۱۴۹ - ہمیر پربندھ کے مطابق قلعہ بنا شہر میں تمام طبقوں اور ذاتوں (ورن) کی عورتوں نے جوہر کی رسم ادا کی تھی۔

۳۳- گدھلا ضلع شیوپور کی ایک یادگار لوح سے بھی یہی کہتی ہے کہ ہمیر مہاکاویہ کا ہیرو ۱۳۰۱ء میں قتل کیا گیا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ہمیر کی آخری جان توڑ جنگ کی تفصیلات صرف راجپوت ماخذ فراہم کرتے ہیں۔ وہ بہرکیف یہ عجیب و غریب کہانی بیان کرتے ہیں کہ ہمیر نے اپنا سر خود اپنے ہاتھوں سے قلم کیا اور مہادیو کے چرنوں میں چڑھا دیا۔
آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۱۷-۱۹۱۶ء، ص ۲۰ - نیز ہمیر رین، مقدمہ، ص ۱۲۱۔

۳۴- فتوح، ص ۲۴۴۔

۳۵- کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، ص ۵۱۷۔

کیا ہے[۳۶] لیکن یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہمیر راجپوتانہ کے ان بہادر فرزندوں میں سے ایک تھا جس نے اپنے مادر وطن کی سدا کی محبوب آزادی کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے جان قربان کردی۔ ایک بار جب اس نے منگول امیروں کو پناہ دے دی تو ان کو دشمنوں کے ہاتھوں میں وہ انھیں کبھی نہیں سونپ سکتا تھا۔ اس نے انتہائی بہادری سے جنگ لڑی اور اس سورما نسل کی شاندار روایات کو برقرار رکھا جس سے تعلق رکھتا تھا۔

رنتھمبور نے ۱۱ر جولائی ۱۳۰۱ء (۳ر ذی قعدہ ۷۰۰ھ) بروز منگل صلح کرلی[۳۷]۔ اس کے زوال میں ہمیر کے دو وزیروں رَن مل اور رتی پال نے اور بھی سرعت پیدا کر دی تھی۔ وہ دشمن سے جا ملے تھے۔ رَن مل جو راجپوتوں کی طرف سے علاءالدین کے ساتھ شرائط صلح طے کرنے گیا تھا۔ اس نے سلطان سے اتحاد کرنے سے اتفاق کیا اور اس سے ایک تحریری ضمانت حاصل کر لی جس نے اس کو مکمل معافی بخش دی۔ رَن مل نے وہ دستاویز اپنے راجپوت دوستوں کو دکھائی اور رتی پال سمیت ان میں سے بعض نے محصور فوج کو چھوڑ کر شاہی لشکرگاہ کا رُخ کیا[۳۸]۔ لیکن جب علاءالدین نے قلعہ پر قبضہ کر لیا تو اس نے نمک حرام راجپوتوں رَن مل اور رتی پال کو یہ کہہ کر سزا دی کہ جب وہ اپنے پرانے محسن کے وفادار نہیں ہو سکے تو کیسے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کے وفادار رہیں گے[۳۹]۔ لیکن میر محمد شاہ کے ساتھ اس کا سلوک خلاف امید تھا جس کے زخموں کی

---

۳۶۔ انیسویں صدی کی دس خوبصورت تصاویر جو ہمیر کا دیہ کے بیان پر مبنی رنتھمبور پر قبضہ کو دکھاتی ہیں جرنل آف انڈین آرٹ ۱۶-۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی ہیں۔

۳۷۔ خزائن الفتوح، حبیب ترجمہ ص ۴۱۔ ہمیر مہا کاویہ میں تاریخ ۱۲ر جولائی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کیونکہ رانا کی موت کے دو تین دن بعد تک حامیانِ جنگ جاری رکھی تھی۔

ہمیرین، مقدمہ ص ۵۰ اور ص ۱۳۱۔

نیز انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی ۱۹۴۹ء، ص ۹۵-۱۹۲۔

۳۸۔ ظفر الوالہ، ص ۷۰۴۔

۳۹۔ ہمیرین، مذکورہ بالا، ص ص ۱۳۲، ۱۴۴-۱۴۶؛ فرشتہ، ص ۱۰۸؛ ہربلاس سارد، ص ۴۲-۴۸۔

چندر سین ساموری نے بھی اپنی ہمیر کا دیہ میں وزیروں کی غداری کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رن مل کی غداری رتی پال کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہوتی تھی۔ علاءالدین کے سونے کی حرص میں انھوں نے رانا کے گرد واموں سے ذلہ ہٹا دیا تھا۔ نیز ہمیرین، مذکورہ بالا، ص ۷۴۔

مرہم پٹی کرنے کا حکم صادر کیا[39] سکرات موت میں بھی بہادر سپاہی نے ہر توجہ پائے حقارت سے ٹھکرا دی۔ اس نے سلطان کی اعلانیہ توہین کی جس کی پاداش میں اس کو ہاتھی کے پیر کے نیچے کچل دیا گیا۔ لیکن سلطان منگول امیر کی بہادری اور دیانت داری کو کبھی بھلا نہیں سکا۔ اور اس کی تدفین پوری عزت کے ساتھ کی۔

رنتھمبور کے زوال نے بت شکنی اور لوٹ مار کے لیے حسب معمول جوش و خروش کا مشاہدہ کیا۔ متعدد مندر جن میں باہر دیو (ہر دیو) کا مندر خاص تھا خاک میں ملا دیے گئے۔ "شہر کے بہت سے مندر اور گھر تباہ کر دیے گئے" اور "کفر کا مرکز اسلام کا مسکن بن گیا"[40] قلعۂ رنتھمبور جھائن کے علاقے سمیت الغ خان کی ذمہ داری میں دے دیا گیا اور سلطان دہلی واپس گیا۔

## الغ خان کا انتقال

الماس بیگ نے رنتھمبور پر تقریباً چھ ماہ حکومت کی جس کے بعد وہ دہلی روانہ ہو گیا۔ راستہ میں وہ اچانک مر گیا۔ عصامی اس کی موت کا سبب زہر خورانی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ جب الغ خان نے اکت خان کی بغاوت کے دوران سلطان کو تقریباً مہلک زخموں کے لگنے کی خبر سنی تھی تو اس نے کہا تھا کہ اگر سلطان مر گیا ہے تو اس کا بھائی خالی تخت کو رونق بخشنے کے لیے زندہ ہے۔ علاء الدین کو اس کی خبر اپنے معتمد خدام میں سے کسی سے ملی۔ وہ اپنے بھائی کے بارے میں شک و شبہہ میں مبتلا ہو گیا۔ اور اس کو زہر دے دینے کا حکم دیا[41] حاجی الدبیر بھی حسام خان کی طبقات بہادر شاہی کی سند کی بنیاد پر کہتا ہے کہ الغ خان کو رنتھمبور سے دہلی آتے ہوئے زہر دے دیا گیا[42] ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ "الغ خان نے سلطان کی عدم موجودگی کے چار پانچ ماہ کے عرصہ میں ایک کثیر فوج بھرتی کر لی تھی تاکہ تلنگانہ اور معبر پر حملہ کرے لیکن وہ بے رحم قسمت کا شکار ہو گیا اور راجدھانی پہنچنے سے کچھ پہلے ہی موت نے اس کو آ دبوچا۔ لوگ اس کی مردہ لاش شہر لائے اور اس کو ایک محل ہی میں دفن کیا۔ اس المیہ نے سلطان کو بہت غمگین کیا۔ اس نے مرحوم کی روح کے لیے بہت ایصال ثواب کیا"[43] اس طرح برنی نہ صرف علاء الدین کو الزام سے بری قرار دیتا ہے بلکہ اس کی معصومیت بھی ثابت کرتا ہے۔ لیکن عصامی اور حاجی الدبیر کے

---

۴۰۔ خزائن، الٰہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ ورق ۲۷ الف اور ب

۴۱۔ فتوح، ص ۲۷۳-۲۷۲۔

۴۲۔ ظفر الوالہ، ص ۸۱۱۔

۴۳۔ برنی، ص ۲۹۹۔

بیانات اور علاء الدین کی منتقم مزاج بے رحم فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بعید از امکان بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی موت کے لیے ذمہ دار رہا ہو۔

رنتھبور سے واپسی کے بعد علاء الدین نے دہلی کے مضافات میں شکار میں اپنا وقت گذارا۔ وہ شہر میں غالباً اس لئے داخل نہیں ہوا کہ[44] راجدھانی میں ماضی قریب میں ہونے والی متعدد بغاوتوں سے وہ کافی خوفزدہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ ہمعصر مصنفین خوف کے اس احساس کا حوالہ نہیں دیتے اور راجدھانی میں داخل نہ ہونے سے سلطان کی جھجک کو اس کی ناراضگی اور ناخوشی پر محمول کرتے ہیں۔ اس لیے کہ باشندگان شہر نے غیر وفادارانہ رویہ کا اظہار کیا تھا، تاہم یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علاء الدین شہر میں جہاں اس کو تخت سے اتارنے کی مسلسل کوششیں ہو چکی تھیں داخل ہونے سے پہلے اپنے آپ کو اپنی زندگی کے تحفظ کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی حالات میں اس کے پیشرو جلال الدین بھی دہلی میں داخل ہونے سے باز رہا تھا۔

علاء الدین نے دہلی کے بہت سے سربرآوردہ اشخاص کو جلاوطنی کی سزا دی اور الغ خان اور ملک حمید الدین کے بے رحم انصاف سے بچ جانے والے ہر سازشی کو سزا دی۔ اس کے بعد سلطان نے بغاوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم مصمم کیا۔ اس نے بہت سی جاگیریں ضبط کر لیں، شراب کی فروخت اور استعمال کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ امیروں اور بااثر اشخاص کے عام میل جول پر پابندی عائد کر دی۔ یہ اقدامات اپنے تنوع اور شدت کے لحاظ سے اتنے وسیع تھے کہ ان کا مطالعہ ایک الگ باب میں کیا جائے گا۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ ان ضابطوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مستقبل میں دہلی میں کوئی اہم بغاوت رونما نہیں ہوئی۔ گھر محفوظ ہونے کے بعد سلطان نے آزاد سلطنتوں کو قبضۂ اقتدار میں لانے کے لئے ایک بار پھر سوچنا شروع کر دیا۔

---

۴۴۔ برنی، ص ۲۸۳، فتوح، ص ۲۶۹۔

# باب 7

# چتوڑ کی فتح

رنتھمبور میں کامیابی نے تحریک دی کہ راجپوتانہ میں مزید فتوحات کی جائیں۔ جیسا[1] پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ علاء الدین نے بنگال کی طرف ایک فوج بھیجی اور خود راجستھان کے مشہور ترین قلعہ چتوڑ کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔

چتوڑ کا قلعہ ایک پہاڑی پر واقع ہے جو قرب و جوار کے علاقے سے پانچ سو فٹ بلند ہے۔ چوٹی پر وہ ساڑھے تین میل لمبا اور وسط میں تقریباً بارہ سو گز چوڑا ہے۔ جڑ میں اس کا محیط آٹھ میل سے زیادہ ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک مستحکم فصیل ہے جس میں سوراخ بنے ہوئے ہیں[1]۔ جب کہ اس کی بلندی چار۔پانچ سو فٹ ہے۔ اس کو اصل میں راجہ چترنگ یا چترنگد نے بنوایا تھا۔ آٹھویں صدی کے بعد سے وہ میواڑ کے گہیلا حکمرانوں کی راجدھانی رہا۔ کچھ عرصے کے لئے اس پر پرماروں کا قبضہ ہوا پھر مالوہ کے منجھ نے اس کو گہیلا حکمرانوں سے چھین لیا۔ اس کے بعد اس کی تاریخ میں کافی نشیب و فراز آئے جس میں گجرات نے نمایاں کردار ادا کیا۔ آخر کار چتوڑ ایک بار پھر گہیلا راجپوتوں کے ہاتھوں میں واپس آ گیا اور تقریباً سوا صدی تک انھیں کے قبضہ میں ۱۳۰۳ء تک رہا یہاں تک کہ علاء الدین خلجی کے حملے نے اس کی سیاسی آزادی اور پرسکون زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

---

۱۔ دی اے۔ اسمتھ، اکبر دی گریٹ مغل ص ۸۳-۸۲؛ اسٹینلی لین پول، دی اسٹرانگ ہولڈز آف انڈیا، ص ۸۴۔ قلعہ کی خوبصورت تصویر کشی کے لئے ملاحظہ ہو، ٹاڈ، مذکورہ بالا جلد سوم صفحہ ۱۸۱۲۔ نیز ای۔ ٹیری، اے وائج ٹو ایسٹ انڈیا، ص ۷۷۔

**ابتدائی مسلم حملے** سندھ سے راجپوتانہ کے کافی قریب ہونے کی وجہ سے مسلمان حملہ آور بار بار اس پر چڑھائی کرتے رہے۔ راجستھان کے دوسرے قلعوں کی طرح چتوڑ نے بھی ۱۳۰۳ء سے قبل کئی حملہ آوروں کو پسپا کر دیا تھا۔ چاچ نامہ کے مطابق ۶۳۱ء میں چاچ کے سندھ میں تخت نشین ہونے کے فوراً بعد اس کا محاصرہ کیا گیا تھا۔ بعد میں جیترا سنگھ (۱۲۱۳-۱۲۲۳ء) کے عہد حکومت میں التمش نے ۱۲۲۲ء اور ۱۲۲۹ء کے درمیان کسی زمانے میں میواڑ پر حملہ کیا تھا۔ لیکن فارسی تذکرہ نگار اس کے بارے میں خاموش ہیں[۲]۔ حالانکہ وہ جالور، مندور اور رنتھمبور کے خلاف التمش کی مہمات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس فروگذاشت کی ایک وجہ تو سلطان کی شکست ہو سکتی ہے کیونکہ اس امر کا راجپوت کتبات اور مغنی شعراء کے ادب میں بار بار ذکر آیا ہے[۳]۔ التمش کے ہاتھوں ناگور کے تاراج ہونے کے بعد چتوڑ، میواڑ کا مستقل صدر مقام بن گیا۔ فرشتہ کے مطابق میواڑ پر دوسرا حملہ دہلی کے سلطان ناصرالدین محمود نے کیا جس کے باغی بھائی نے وہاں پناہ لے رکھی تھی۔ اس کے پہاڑی خطہ میں آٹھ ماہ تک باغی کا بڑی شد و مد کے ساتھ تعاقب کیا جاتا رہا۔ پھر جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے الغ خان نے ۱۲۹۹ء میں گجرات جاتے ہوئے میواڑ پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو پسپا کر دیا گیا۔ پایان کار ۱۳۰۳ء میں چتوڑ کو اپنی تاریخ میں عظیم ترین محاصرے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

**محاصرہ** ۲۸ جنوری ۱۳۰۳ء (۸ جمادی الثانی ۷۰۲ھ) بروز دوشنبہ علاءالدین ایک لشکر جرار کے ساتھ چتوڑ کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ مورخ اور ملک الشعراء امیر خسرو نے جو اس مہم میں سلطان کے ہم رکاب تھے قلعہ، اس کے محاصرہ اور آخری تسخیر کی بہت خوبی سے تصویر کشی کی ہے۔ چتوڑ میں اپنی آمد پر سلطان نے دو ندیوں گمبھیری اور بیرچ کے درمیان اپنے خیمے نصب کئے اور فوج نے پورے شہر کے گرد گھیرا ڈال دیا، فوج کے میمنہ اور میسرہ قلعہ کے دونوں کناروں پر خیمہ زن تھے۔ سلطان نے اپنا پرچم ایک پہاڑی پر نصب کیا جو چیترادری یا چتوڑی کے نام سے مشہور تھی۔ اسی پر سلطان نے اپنا دربار منعقد کیا اور بنفس نفیس محاصرہ کی رہنمائی کرتا رہا[۴]۔

علاءالدین کے حملے کے وقت رانا رتن سنگھ حکمران تھا یہ رانا سمر سنگھ کا بیٹا اور بہادر جیترا سنگھ

---

۲۔ اوجھا اس مہم کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، راجپوتانہ کا اتہاس جلد دوم ص ۴۶۸-۴۶۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۷۰-۴۷۱۔

۴۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۴۷۔

کا پوتا تھا۔ وہ تقریباً ۱۳۰۱ء میں تخت نشین ہوا تھا۔[۵] امیر خسرو کے مطابق چتوڑ کا رانا تمام ہندو حکمرانوں میں عظیم ترین تھا اور ہندوستان کے تمام بادشاہ اس کے تفوق کو تسلیم کرتے تھے۔[۶] قلعہ کے پرہیبت شکوہ کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ یہ قلعہ جو ایک بہت بڑی چٹان سے کاٹ کر بنایا گیا تھا نہایت شاندار تھا اور منجنیق کے حملوں کے باوجود اس پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑا تھا۔ اپنے بہادر سردار رتن سنگھ کی قیادت میں دلیر راجپوتوں نے مکمل آٹھ ماہ تک بڑی جانبازی سے مدافعت کی لیکن آخر گھٹنے ٹیک دیئے۔ محاصرہ کے مختلف تدابیر، سخت معرکوں اور حربی حکمت عملی کا ہمعصر یا بعد کا بیان جو ان آٹھ ماہ میں یقیناً وقوع پذیر ہوئی ہوں گی ہمیں دستیاب نہیں ہوتا۔[۷] یہ امر کہ محاصرہ خاصا طویل تھا اس بات کو پوری شدومد کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ محصور فوج اپنے آخری سپاہی تک دفاع کرنے کا عزم رکھتی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ پڑوسی حکمران رتن سنگھ کی امداد کو آئے تھے یا نہیں لیکن راجپوتانے کی ریاستوں کی مسلسل رقابت اور باہمی بے حسی و بے اعتنائی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چتوڑ کے نئے حکمران کو اکیلے ہی لڑنا پڑا ہوگا۔ بہرحال، ۱۵۱۷ سمبت (۱۴۶۰ء) کا ایک کتبہ جو اودے پور میوزیم میں محفوظ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سسودیا کے مہارانا لکشمی نے جو چتوڑ کے باجگذار حکمرانوں میں سے ایک تھا، اپنے سات بیٹوں کے ساتھ (علاءالدین کے زیر کمان) مسلمانوں سے لڑ کر جان دے دی تھی۔ محض یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ چتوڑ کے محاذ پر جنگ بڑی خوفناک ہوئی۔ اس کی تائید مسلمان مورخین بھی کرتے ہیں۔

---

۵۔ ۱۳۵۸ سمبت (۱۳۰۱ء) کے ایک کتبہ میں جو چتوڑ میں دستیاب ہوا ہے اور راجپوتانہ میوزیم رپورٹ ۲۱-۱۹۲۰ء میں چھپ چکا ہے، حکمران کا نام راول سمر سنگھ دیا گیا ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا رتن سنگھ ۱۳۰۱ء کے بعد کسی وقت یعنی ۱۳۰۳ء کے ابتدائی مہینوں میں علاءالدین کے حملہ سے کچھ مدت قبل تخت نشین ہوا تھا۔

۶۔ دیول رانی، ص ۶۷-۶۶۔

۷۔ اس عصر کا سب سے اہم مورخ برنی چتوڑ کی مہم کے بارے میں صرف ایک سطر لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے (ص ۲۹۹):
"سلطان علاءالدین از شہر باز لشکر کشید و در جیتور رفت جیتور را حصر کرد و زود تر آں حصار را بکشاد۔ و از آنجا باز در شہر آمد"۔ (سلطان علاءالدین پھر شہر سے چتوڑ کی جانب ایک مہم پر گیا۔ اس نے چتوڑ کا محاصرہ کیا اور تھوڑے عرصہ میں اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے پھر شہر لوٹ آیا۔)
زیادہ تر ہمعصر حتیٰ کہ بعد کے مورخین بھی اس کے بارے میں بہت کم کہتے ہیں۔ عصامی اور یحییٰ بھی برنی کی طرح کچھ بیان کرتے ہیں اور کوئی تفصیل نہیں دیتے ہیں۔

قلعہ کی تسخیر سے قبل راجپوت عورتوں نے ایک زمینی گپھا میں جو اب بھی موجود ہے جوہر کی آگ روشن کی اور اپنے آپ کو غلامی یا بے عزتی سے بچانے کے لئے لپکتے شعلوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ کرنل ٹاڈ اس منظر کی شاندار تصویر کشی کرتے ہیں جس میں بہادر راجپوت عورتوں نے رتن سنگھ کی ملکہ خوبصورت پدمنی کی سرکردگی میں اپنے آپ کو جوہر کی آگ کی نذر کر دیا۔ اینلز کا مصنف کہتا ہے کہ حسین پدمنی نے اس ہجوم کو انجام تک پہنچا دیا جو وہاں نسوانی حسن اور شباب کی وجہ سے اکٹھا ہو گیا تھا اور جس کو تاتاریوں کی ہوس وافر برباد دینا چاہتی تھی۔ ان کو گپھا میں لے جایا گیا پھر ان پر دہانہ بند کر دیا گیا۔ جہاں ان کو کھا جانے والی آگ میں بے عزتی سے تحفظ حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔"[9]

جوہر کی ہولناک رسم ادا کرنے کے بعد راجپوت سپاہی مسلم حملہ آوروں سے بڑی بے جگری سے لڑے۔ ایک پاشیب کی تعمیر کے ذریعہ قلعہ پر چڑھنے کی حملہ آوروں کی تمام کوششیں کافی عرصے تک ناکامی کا منہ دیکھتی رہیں۔ لیکن پھر ۲۶ راگست ۱۳۰۳ء (۱۱ محرم ۷۰۳ھ) بروز دوشنبہ ایک کھلے معرکے کے بعد چتوڑ نے گھٹنے ٹیک دیئے۔[10] راجپوتوں کی شاندار مدافعت نے سلطان کو مشتعل کر دیا جس نے ڈھائی صدی بعد اکبر کی طرح قتل عام کا حکم صادر کر دیا۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ ایک ہی دن میں تقریباً تیس ہزار ہندو سوکھی گھاس کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔[11] اس غیر انسانی قتل عام کے بعد منتقم مزاج سلطان کچھ دنوں تک چتوڑ میں رہا۔ اور اس نے وحشی پن اور توڑ پھوڑ کا ہر وہ کام کیا جس کا ایک متعصب جوش و خروش حکم دے سکتا تھا، اس نے مندروں اور دوسرے عالیشان محلوں کو مسمار کر دیا۔[12] چتوڑ کا نام سلطان کے فرزند اکبر خضر خان کے نام پر خضر آباد رکھا گیا۔ اور یہ قلعہ اسی کو تفویض کر دیا گیا۔ ایک سرخ چتر جو عموماً ولی عہد کو عطا کیا جاتا ہے، ایک سنہری کارچوبی خلعت اور دو پرچم ایک سیاہ اور دو سبز شہزادے کو عطا ہوئے۔ اس کے بعد علاء الدین بڑی تیزی سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اس وجہ سے کہ غالباً اس کو ایک منگول حملہ کی سن گن مل گئی تھی۔

رتن سنگھ کے انجام کے بارے میں مورخین کے بیانات میں قدرے اختلاف ہے نینسی کے مطابق رتن سنگھ علاء الدین سے لڑتا ہوا مارا گیا۔[13] ٹاڈ بھی بیان کرتا ہے کہ حکمراں راجہ

---

۸۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۲۶-۱۹۲۵ء

۹۔ اینلز جلد اوّل ص ۲۱۱ -

۱۰۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۴۸-

۱۱۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۴۹ -

۱۲۔ اینلز جلد اوّل، ص ۲۱۱-

۱۳۔ کھیات، جلد اول، ص ۲۱ ۔

(جس کا نام غلطی سے بھیسی بتاتا ہے) میدان جنگ ہی میں مارڈالا گیا۔[14] لیکن امیر خسرو خزائن الفتوح میں کہتے ہیں کہ چتوڑ کی تسخیر کے بعد رانا علاء الدین کے لشکرگاہ میں پناہ لی اور اس کی جان بخشی کر دی گئی۔[15] خسرو کی تائید عصامی کرتا ہے (جو رانا کو غلطی سے سنر سیہ یا سمر سنگھ کہتا ہے)[16] ان کے بیانات کی مزید توثیق جینی دستاویز نابھی نندنا جنو دھارا۔ پر بندھ سے ہوتی ہے جو ۱۳۳۶ء (۱۳۹۲ وکرمی) میں لکھی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاؤ دین (علاء الدین) نے چترکوٹ (چتوڑ) کے مالک کو گرفتار کر لیا۔ اس کا ساز و سامان چھین لیا اور اس کو ایک شہر سے دوسرے شہر بندر کی طرح نچاتا پھرا۔[17] امیر خسرو کا بیان جس کی تائید عصامی اور ایک آزاد اور تقریباً ہمعصر جین تصنیف کی سند سے ہوتی ہے، صحیح تسلیم کر لینا چاہئے۔ یقیناً رتن سنگھ کے لئے علاء الدین کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے اس ذلت و رسوائی کا موضوع بننے سے جس کا حال جین ماخذ سے ہوتا ہے میدان جنگ میں کھیت رہنا بہتر ہوتا۔ رانا کے آخری ایام اور انجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

**رانی پدمنی کا فرضی قصہ**

چتوڑ پر علاء الدین کے حملہ اور قبضہ کے بارے میں یہ واقعات ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ایک من گھڑت افسانہ بھی بنا گیا ہے۔ سولھویں صدی کے ایک شاعر ملک محمد جائسی جس نے ۱۵۴۰ء میں پدماوت کے نام سے ایک رزمیہ لکھا ہے، کا بیان ہے کہ علاء الدین نے چتوڑ پر اس لئے حملہ کیا تھا کہ وہ چتوڑ کے راجہ کی حسین بیوی رانی پدمنی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جائسی کے قول کے مطابق پدمنی یا پدماوتی لنکا کی ایک شہزادی تھی اور چتوڑ کے راجہ رتن سنگھ نے جب ایک طوطے سے اس کی خوبصورتی کا ذکر سنا تو اپنا عشق ظاہر کرنے کے لئے ایک فقیر کے لباس میں نکل گیا۔ چونکہ اس کو پدمنی سے بیحد عشق ہو گیا تھا لہٰذا وہ وہاں بارہ سال کے طویل عرصہ تک مقیم رہا۔

۱۴۔ ٹاڈ، اینلز جلد اول، ص ۱۲-۳۱۱۔

۱۵۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۴۹

۱۶۔ فتوح السلاطین، ص ۲۷۲۔

۱۷۔ اگرچہ کاکاسوری کی نابھی نندنا جنو دھارا پربندھ کا مرکزی موضوع جین تیرتھنکر آدی ناتھ کی مورتی نصب کرنا ہے جس کو سمر سنہا نامی ایک جین افسر نے نصب کیا تھا اور جو الپ خان، مبارک خان، غیاث الدین تغلق اور ولی عہد الغ خان کی ملازمت میں رہا تھا۔ اتفاقاً وہ علاء الدین خلجی کے کارنامے کا بھی بیان کرتی ہے۔

روئداد انڈین ہسٹری کانگریس، ۱۷، اجلاس، احمد آباد ۱۹۵۴ء، ص ۲۴۱۔

ہیم رتن کی گورا بادل چوپائی کے مطابق بھی (جو ۱۶۸۰ وکرمی سمبت/۱۶۱۳ء میں لکھی گئی) رتن سنگھ کو علاء الدین نے قید کر دیا تھا اور اس کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔

پدمنی چرتر چوپائی، ص ۱۴-۱۳ اور ۲۳۔

آخر کار رتن سنگھ اس کی محبت حاصل کرنے اور اپنے ساتھ اسے چتوڑ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ راگھو نامی ایک فقیر نے پدمنی کی ایک جھلک اس وقت دیکھ لی جب کہ وہ اسے خیرات دے رہی تھی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر بیہوش ہو گیا۔ راگھو نے میواڑ کی مہارانی کے غیر معمولی حسن کی کہانی سلطانِ دہلی تک پہنچا دی اور علاء الدین پدمنی کے حسن کا حال سن کر مسحور ہو گیا اور اس نے رتن سنگھ کو پیغام بھیجا کہ وہ پدمنی کو شاہی حرم کے لئے روانہ کر دے۔ رتن سنگھ دہلی کے سلطان کے مطالبہ پر مشتعل ہو گیا اور سلطان دہلی نے اس کے جواب میں قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن علاء الدین مکمل آٹھ سال کی جنگ وجدل کے باوجود قلعہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ قلعہ کو ناقابلِ تسخیر اور رتن سنگھ کو ناقابلِ شکست پا کر علاء الدین نے اپنا مطالبہ گھٹا دیا۔ اور وعدہ کیا کہ حسین پدمنی کی ایک جھلک آئینہ ہی میں دیکھ لے تو وہ دہلی لوٹ جائے گا۔[18] وہ قلعہ سے واپس ہوا اور رتن سنگھ بطور حسنِ اخلاق اس کے ساتھ قلعہ کے دروازوں تک گیا حالانکہ اس کے بہادر سالاروں گورا اور بادل نے اس کو ترک کے بُرے ارادوں سے باخبر کر دیا تھا۔ جب کہ رتن سنگھ سلطان کو دروازے پر رخصت کرنے ہی والا تھا اس کو فریب سے گرفتار کر لیا گیا اور زبردستی دہلی لے جایا گیا۔ سلطان کی اس شرمناک غداری پر چتوڑ کے لوگ ششدر رہ گئے۔ اس کے فوراً بعد شاہی فرمان پہنچا جس میں کہا گیا تھا کہ رتن سنگھ کو صرف اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ پدمنی کو شاہی حرم کے لئے روانہ کر دیا جائے۔ رانی نے جب ان ایذا رسانیوں کا حال سنا جو دہلی میں رتن سنگھ کو دی جا رہی تھیں تو اس نے فوراً گورا اور بادل سے مشورہ کیا اور دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سولہ سو پردہ دار پالکیوں میں پدمنی اور کچھ بہادر ترین راجپوت سورماؤں کو بٹھایا گیا۔ جو پوری طرح ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ پدمنی، اس کی سہیلیاں اور خادمائیں شاہی محل جا رہی ہیں۔ جب یہ جماعت دہلی پہنچی تو پدمنی نے سلطان سے ایک عنایت کرنے کی درخواست کی۔ وہ یہ تھی کہ اس کو اس کے مالک رتن سنگھ سے جس سے وہ ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والی ہے آخری بار مل لینے دیا جائے۔ علاء الدین نے جو اپنی فتح پر مگن تھا بہ آسانی درخواست منظور کر لی۔ وہ پالکیاں جن میں بہادر راجپوت سورما تھے اس جگہ لے جائی گئیں جہاں رتن سنگھ قید تھا۔ اس کو آزاد کرانے میں ذرا بھی وقت برباد نہیں کیا گیا اور وہ اور رانی چتوڑ کی جانب جانے والے راستے پر چل پڑے۔

---

۱۸۔ یہ ناقابلِ یقین ہے۔ رتن جو سلطانوں سے کامیابی کے ساتھ آٹھ سال تک لڑ سکتا تھا علاء الدین کی ایک ایسی احمقانہ اور توہین آمیز درخواست کو قبول کرنے کے لئے ہرگز راضی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان کے فرار میں بادل کے زیر کمان بہادر راجپوت سورما ساتھ تھے۔ گورا نے ان شاہی فوجوں کو روکے رکھا جن کو حیرت زدہ سلطان نے ان کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ شاہی فوجوں اور راجپوتوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں گورا مارا گیا۔ اس معرکہ کی وجہ سے رانا رتن سنگھ کو بحفاظت تمام چتوڑ پہنچنے کا کافی وقت مل گیا۔ جہاں ان کی آمد پر زبردست خوشیاں منائی گئیں۔ وہاں اس نے بھیلنار (کمبھل گڑھ) کے دیوپال کی غداری کی خبر سنی جس نے اس کی عدم موجودگی میں پدمنی کو چتوڑ سے بھگا لے جانے کی کوشش کی تھی۔ رتن سنگھ نے اس کے راج پر حملہ کر کے دیوپال کو مار ڈالا لیکن اس معرکہ میں وہ خود بھی زخمی ہو گیا۔ چتوڑ میں اپنی آمد کے فوراً بعد رتن اپنے زخموں کے سبب مر گیا۔ اور پدمنی اور ایک رانی ناگ متی نے ستی کی رسم ادا کی۔ اس اثنا میں سلطان دوبارہ چتوڑ پہنچا اور اسلام کا پرچم قلعہ پر لہرا دیا گیا۔

ملک محمد جائسی کی اس کہانی نے جس میں رومان، ایڈونچر اور المیہ کا حسین امتزاج ہے بہت جلد عوامی ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا اور یہاں، وہاں ہر جگہ پدمنی کی کہانی بار بار سنائی گئی۔ فارسی تذکرہ نگاروں نے جو افسانہ اور حقیقت میں تمیز کرنے کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے بہ آسانی اس کو صحیح تاریخ تسلیم کر لیا چنانچہ ملک محمد جائسی کے بعد پدمنی کا واقعہ فرشتہ اور حاجی الدبیر کی تصانیف کے علاوہ اور بہت سی تاریخی کتابوں میں ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے مذکور ہوا ہے۔

فرشتہ چتوڑ کا حال دو جگہ لکھتا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ سلطان علاء الدین نے چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد چتوڑ کا قلعہ فتح کر لیا اور اس کو خضر خان کے سپرد کر دیا جس کے ولی عہد ہونے کا اس نے اعلان کر دیا تھا۔ وہ چتوڑ کے اس وقت کے تاجدار تک کا نام نہیں بیان کرتا۔ دوسرے مقام پر وہ ۷۰۴ھ (۱۳۰۴ء) کے واقعات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے کہ راجہ رتن سنگھ جو چتوڑ کے حملہ کے وقت سے مقید تھا بڑے عجیب و غریب طریقے سے اس نے رہائی حاصل کی۔ رتن کی عورتوں (زنان) میں ایک پدمنی تھی جس کے جمال اور ہنرمندی نے سلطان کو اسے حاصل کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس نے رانا سے کہا کہ اگر وہ آزاد ہونا چاہتا ہے تو وہ پدمنی کو سلطان کے حوالے کر دے۔ رتن سنگھ نے یہ تجویز قبول کر لی اور پدمنی کو بلا بھیجا لیکن اس کے اعزا و اقربا نے اس توہین آمیز تجویز کو مسترد کر دیا اور پدمنی اور اس کی نسل کو بے عزتی سے محفوظ رکھنے کے لئے انھوں نے پدمنی کو زہر دینے کا خیال کیا لیکن رتن سنگھ کی ایک بیٹی نے جو اپنی ذہانت اور ہوشیاری کے لئے مشہور تھی ایک ایسا منصوبہ بنایا جس سے اس نے اپنے باپ کو کسی بے غیرتی اور بے عزتی کا ارتکاب کے بغیر

سلطان کی قید سے چھڑا لیا۔ پھر فرشتہ پالکیوں میں بہادر راجپوتوں کے جانے اور رانا کو چھڑا لانے کی جاتی کی کہانی بجنسہٖ نقل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس دن سے کہ رتن سنگھ بحفاظت تمام چتوڑ واپس پہنچ گیا اس نے اپنے ان علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے جن پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ آخر کار سلطان نے چتوڑ پر قبضہ جاری رکھنا بیکار سمجھا اور خضر خان کو اسے خالی کر دینے کا حکم دیا۔ اس وقت وہ رانا کے ایک بھانجے (بہن کے لڑکے) کے سپرد کر دیا گیا۔[19]

ایک دوسرا اہم مورّخ جو پدمنی کے بارے میں لکھتا ہے حاجی الدبیر ہے۔[20] وہ فرشتہ کا ہمعصر تھا۔ پدمنی کے بارے میں اس کا بیان مختلف ہے اور وہ اس کہانی کی ایک سے زیادہ روایتیں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چتوڑ کی فتح کے بعد اس کے ہندو راجہ کو خود چتوڑ کے ایک پہاڑی مکان میں مقید کر دیا گیا تھا۔ اور علاء الدین نے دہلی سے اس کو پیغام بھیجا تھا جس میں اس کو آزادی کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ اپنی بیوی اس کے حوالے کر دے۔ حاجی یہاں پدمنی کا اصل نام نہیں لیتا ہے بلکہ ایک ایسی عورت کا لقب استعمال کرتا ہے جو بعض خاص خوبیوں کی مالک تھی۔ ایک دوسری روایت جو عربی مورخ بیان کرتا ہے یہ ہے کہ علاء الدین نے چتوڑ جانے سے قبل پدمنی کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے بدلہ میں رانا کی رہائی کا وعدہ کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جب سلطان دہلی لوٹ رہا تھا تو کیا عجب ہے کہ راجہ اس کے ہم رکاب رہا ہو۔ ممکن ہے کہ اس نے سلطان سے درخواست کی ہو کہ اسے میواڑ ہی میں رہنے دیا جائے تاکہ وہ اپنی بیوی کو اس کے حرم میں جانے کے لئے آمادہ کر سکے۔ اور اس کو سلطان کے مقرر کئے ہوئے شخص کے سپرد کر دے اور پھر سلطانی محافظوں کی حفاظت میں وہ خود بھی دہلی پہنچ جائے۔ علاء الدین نے عورت کی چاہ میں اسے وہیں چھوڑ دیا اور خود دہلی چلا گیا۔ راجہ نے اپنے قابل اعتماد امراء اور خدام کو خفیہ ہدایات بھیجیں اور وہ ڈھائی ہزار کی تعداد میں پالکیوں میں آئے، لڑے اور اس کو نکال لے گئے۔ علاء الدین نے یہ سن کر چتوڑ کو راجا کی ایک بھانجی (بہن کی لڑکی) کے سپرد کر دیا جو سلطان کے عقد میں آتی تھی لیکن راجہ کے وزیر نے اس کو جلد ہی مار ڈالا۔ جس کے بعد ہندو راجہ اپنے علاقے میں پھر واپس آ گیا اور وہاں اس نے اپنا اقتدار پھر مستحکم کر لیا۔ یہ صورت حال ۹۴۱ھ تک برقرار رہی پھر گجرات کے حاکم بہادر بن مظفر نے چتوڑ

---

۱۹۔ فرشتہ، جلد سوم، ص ۱۱۵۔

۲۰۔ ظفر الوالہ، ص ۷۸۶-۸۸۔ حاجی، رتن سنگھ کا نام نہیں ذکر کرتا۔

فتح کر لیا[21]

راجپوت روایات اور ان کے بھاٹوں (اٹھارہویں صدی کے) پر اعتماد کرتے ہوئے کرنل ٹاڈ بھی پدمنی کی کہانی بڑے پرجوش انداز سے بیان کرتا ہے۔

کہانی کی اصلیت جاننے کے لئے پدمنی کے سلسلہ میں مختلف بیانات کا گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جائسی کے رزمیہ میں بہت سی احمقانہ باتیں اور تضادات بہ صراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ علاء الدین کے حملہ کے وقت رتن سنگھ کو حکومت کرتے ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا اور اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ پدمنی کی تلاش میں لنکا جاتا اور وہاں بارہ سال تک ٹھہرتا۔ مزید برآں رتن سنگھ کا ہمعصر بادشاہ لنکا پراکرم بھاؤ چہارم تھا جو نہ تو جائسی کا گوردھن تھا نہ کرنل ٹاڈ کا ہمیر سنگ[22]۔ اس کے سوا جائسی کا رزمیہ بیان کرتا ہے کہ علاء الدین اور رتن سنگھ کے درمیان آٹھ سال تک جنگ جاری رہی۔ اس بیان کی نہ تو کسی ہمعصر سے نہ بعد کی کسی تحریر سے تصدیق ہوتی ہے۔ مزید برآں جائسی پدمنی کو چتوڑ پر حملہ کا سبب گردانتا ہے لیکن فرشتہ اور حاجی الدبیر جنہوں نے کہانی تسلیم کر لی ہے پدمنی کے حصول کو حملہ کا سبب یا بہانہ نہیں قرار دیتے۔

فرشتہ کا بیان بھی جس نے ملک محمد جائسی کے ستّر سال بعد لکھا اختلاف بھرا پڑا ہے۔ چتوڑ کے تسخیر کے بیان میں وہ چتوڑ کے حکمراں کا نام تک نہیں بیان کرتا اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے امیر خسرو کی ہمعصر سند پر بھروسہ کیا ہے جو خود بھی نام بیان کرنے سے چوک گئے ہیں۔ بعد میں فرشتہ ایک عملی تدبیر کے ذریعہ رتن سنگھ کے فرار کا ذکر کرتا ہے لیکن اسے یہ یقین نہیں کہ پدمنی رتن سنگھ کی بیٹی تھی یا بیوی[23]

۲۱۔ ظفر الوالہ، ص ۸۸۷۔

۲۲۔ اوجھا، راجپوتانہ کا اتہاس، جلد دوم ص ۴۸۴، انڈین فلی کورٹی ۱۹۳۰ء ص ۲۶۹۔

۲۳۔ ایک جگہ (ص ۱۱۵) فرشتہ لکھتا ہے:

"بسمع بادشاہ رسانیدند کہ درمیان زنان راجہ چیتور زنی است پدمنی نام"

(بادشاہ کے کانوں تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ راجہ چتوڑ کی عورتوں میں سے ایک عورت کا نام پدمنی ہے)

لفظی طور پر یہ صحیح مگر ظاہری اعتبار سے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ رتن سنگھ کی بیویوں میں سے ایک تھی۔ اس کے بعد وہ کئی جگہ لفظ زن لکھتا ہے لیکن بعد میں لکھتا ہے کہ راجہ کی ایک لڑکی نے (جس کا نام وہ نہیں دیتا) رتن کے فرار کا ایک عجیب منصوبہ سوچا، دلی گئی اور اپنے باپ کو چھڑا لائی۔

"دختر راجہ کہ بعلم وعقل مشہور خویش و قبیلہ خود بود ۔۔۔۔ بعین دولت تدبیر دختر خوب سیرت از

(باقی اگلے صفحہ پر)

چتوڑ میں بعد میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بھی اس کا بیان قابلِ اعتماد نہیں ہے کیونکہ سلطان علاء الدین ایسا شخص نہیں تھا جو یہ برداشت کر لیتا کہ ایک مفرور قیدی اس کے بیٹے کے علاقوں کو تاراج کرتا رہے چہ جائیکہ وہ خضر خان کو چتوڑ کو خالی کرنے کا حکم دیتا۔ فرشتہ ۱۳۰۴ء (۷۰۴ھ) کے واقعات کے بیان میں خضر خان کے چتوڑ کو خالی کرنے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سلطان نے اس کو رتن سنگھ کے ایک بھانجے (بہن کے لڑکے) کو تفویض کر دیا تھا۔ چتوڑ کو خالی کرنے کی یہ تاریخ غلط ہے کیونکہ دوسری شہادت یہ بتاتی ہے کہ خضر خان نے چتوڑ ۱۳۰۴ء کے بہت بعد چھوڑا۔ اس کے علاوہ رتن سنگھ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بھانجا میواڑ کے تخت پر رونق افروز ہو جب کہ وہ اپنے علاقے میں کامیاب اور زندہ واپس آچکا تھا؟

پدمنی کے بارے میں حاجی الدبیر کا بیان اور بھی الجھن پیدا کرتا ہے۔ مورخ جو بھی لکھ رہا تھا اس کے بارے میں وہ خود شک و شبہ میں مبتلا تھا۔ وہ رتن سنگھ کا نام سرے سے نہیں لیتا اور پدمنی کا ذکر ایک ایسی عورت کے طور پر کرتا ہے جو بعض خوبیوں کی مالک تھی اور کوئی خاص شخصیت نہیں تھی۔ پھر وہ فرار کی تدبیر کو رانے کے ذہن رسا سے منسوب کرتا ہے پدمنی کی ذہانت سے نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اپنے قول کے مطابق رائے کو دہلی میں مقید نہیں رکھا گیا تھا اور مورخ "یہ یقین نہیں ہے کہ پدمنی کا مطالبہ آیا چتوڑ کی تسخیر سے قبل کیا گیا تھا یا سلطان کے ہاتھوں میں رتن سنگھ کے قیدی بن جانے کے بعد۔ حاجی الدبیر کے بیان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ وہ خضر خاں کے نام کا بالکل ذکر نہیں کرتا ہے جو دوسرے ہمعصر مصنفین کے مطابق چتوڑ کی تسخیر کے بعد اس کا گورنر مقرر کیا گیا۔

اس طرح فرشتہ، حاجی الدبیر اور دوسرے فارسی مورخین اور راجپوتانہ کے بھاٹوں کی کہانیاں بجز بعض جزوی اختلاف کے ایک دوسرے سے بہت ہی مشابہ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جائسی کی پدماوت پر مبنی ہیں[۲۴] حال یہ ہے کہ جائسی کے یہاں سولہ سو، فرشتہ کے یہاں سات سو اور حاجی الدبیر کے یہاں صرف پانچ سو پالکیاں ہیں جو دہلی گئی تھیں۔ ملک محمد جائسی اور فرشتہ کہتے ہیں کہ رانا کو دہلی

---

[illegible] چنگ چتوڑ بادشاہ نجات یافتہ:

(رانے کی بیٹی جو اپنی ذہانت اور سمجھ بوجھ کے لئے اپنی قوم میں مشہور تھی۔ ...... اس عملی تدبیر کی بدولت اس سمجھدار لڑکی نے (رانے کو یا اپنے باپ کو یہ متن سے واضح نہیں) سلطان کی بے رحمی کے چنگل سے چھڑا لیا۔

۲۴۔ فرشتہ کے بعد اکثر مورخین پدمنی کے واقعہ کو اپنی تواریخ میں بیان کرتے ہیں۔ بحر المواج بھی (بانکی پور کتب خانہ مخطوطہ) جو کہ اٹھارھویں صدی میں لکھی گئی ہندوستان کی ایک عمومی تاریخ ہے، اس کا ذکر کرتی ہے۔

میں قید کیا گیا تھا جب کہ حاجی الدبیر کا خیال ہے کہ وہ کبھی دہلی نہیں گیا۔ وہ محافظ دستوں کی نگرانی میں اپنے ہی علاقے میں قیدی بنا کر چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ پدمنی کو علاء الدین کے پاس جانے پر آمادہ کرے۔ جائسی کے مطابق وہ رانی پدمنی تھی، فرشتہ کے بقول وہ رتن کی بیٹی تھی اور حاجی الدبیر کے مطابق وہ خود راجا تھا جس نے فرار کا عجیب وغریب منصوبہ بنایا تھا۔ اس طرح چند تبدیلیوں کے سوا پدمنی کی کہانی تمام بھاٹوں کی اور تاریخی تصانیف میں موٹی موٹی تفصیلات میں جائسی کی پدماوت سے مشابہت رکھتی ہے۔ تاہم اس کے بارے میں شبہہ ہے کہ خود جائسی نے جب کہ وہ پدماوت تصنیف کر رہا تھا کبھی یہ خیال کیا ہو کہ وہ چتوڑ کی ایک شہزادی کی داستانِ حیات کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ اپنی کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ "اس رزمیہ میں چتوڑ کا مطلب جسم ہے اور راجہ (رتن سنگھ) کا دماغ۔ سنگھل دویپ (لنکا) دل ہے اور پدمنی عقل ہے ۔۔۔۔۔ اور سلطان علاء الدین ہوس (مایا) ہے۔ عقلمند سمجھ سکتے ہیں کہ اس محبت کی کہانی سے کیا مراد ہے!"[25]

جائسی کے اس بیان سے واضح ہے کہ جائسی ایک تمثیل لکھ رہا ہے، نہ کہ کوئی سچا تاریخی واقعہ۔ یہ ممکن ہے کہ اس مخصوص خیال کو منتخب کرنے کی تحریک جائسی کو اپنے زمانے میں چتوڑ کے المناک جوہر سے ملی ہو جو اس وقت پیش آیا جب گجرات کے بہادر شاہ نے ۱۵۳۴ء میں چتوڑ پر حملہ کیا تھا۔ لیکن ایک بار جب جائسی نے یہ رومانی کہانی لکھ دی تو ہندوستان کے مسلمان مورخین نے جو اکثر وبیشتر دوسری فارسی تاریخوں سے لفظ بہ لفظ نقل کر دینے کے عادی ہیں اس کہانی کو پورا کا پورا اپنا لیا۔ پدماوت علاء الدین کے انتقال کے ۲۲۴ سال بعد اور چتوڑ کے محاصرہ کے ۲۳۷ سال بعد لکھی گئی اور جائسی کی پدماوت سے

---

۲۵۔

(چتوڑ سے مراد ہے جسم اور راجہ سے دماغ،
سنگھل (سیلون) سے مراد دل ہے اور پدمنی سے عقل،
ناگ متی سے دنیاوی معاملات مراد ہیں۔
جس کسی نے اس پر تکیہ کر لیا وہ مرنے کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔
(راگھو عامل ۔۔۔ ایک پاپی (شیطان) تھا۔
سلطان علاء الدین مایا (مجسم) تھا۔
اس رومانی کہانی کو اس پس منظر میں دیکھو اور اگر اسے سمجھ سکو تو سمجھو۔ )
جائسی گرنتھاولی، پدماوت، ص ۳۴۱

قبل کسی ایک مورخ یا تذکرہ نگار نے خواہ وہ فارسی ہو یا راجستھانی پدمنی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔

لیکن اس قصہ کو بالکل مسترد کرنے میں ایک امر باعث تامل ہے "میواڑ کی روایت جو اس کہانی کو تسلیم کرتی ہے بہت قدیم ہے" اور اگر پدمنی کا واقعہ محض "ادبی من گھڑت" تھا تو اسے راجپوتانہ میں اس قدر قبول عام کیوں حاصل ہوا؟[26] بہر حال اس کا جواب کچھ مشکل نہیں ہے۔ روایت تاریخ کا کوئی مستند ماخذ نہیں ہوتی اور یہ کہنا آسان نہیں کہ وہ کتنی قدیم ہے اور کیا وہ سچ مچ جائسی کی پدماوت سے بھی پرانی ہے۔ بھاٹوں کے تذکرے پدماوت کی تکمیل حتیٰ کہ فرشتہ کی تاریخ کے بہت بعد لکھے گئے تھے اور یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بھاٹوں نے پدمنی کے قصوں کی کسی زبانی روایت پر بنیاد رکھی تھی یا پدماوت ہی پر رکھی تھی۔ عین ممکن ہے کہ جائسی کو چتوڑ کی "خوفناک جنگ" سے پدماوت کی کہانی کا تصور اس طرح ملا ہو جس طرح ڈکنس کو "دو شہروں کی ایک کہانی" (A Tale of Two Cities) کی کہانی کا پلاٹ فرانسیسی انقلاب کے غیر معمولی حالات سے ملا تھا۔ اس کو راجپوتانہ میں جو قبول عام حاصل ہوا اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک بار ایسی کہانیاں فضا میں پھیل جاتی ہیں تو پھر وہ مزید واقعات اور افسانوں کے ساتھ ہر جگہ دہرائی جانے لگتی ہیں۔ ہندوستان میں پدمنی کے قصے کو اتنا قبول عام حاصل ہوا کہ نہ صرف فرشتہ اور حاجی الدبیر بلکہ زبردست شرمناک قصوں کا متلاشی منوچی بھی اکبر کے چتوڑ پر حملہ کے سلسلہ میں اس کے واقعات بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پدمنی راجہ جے مل کی رانی تھی جس کو پالکیوں کی حکمت عملی کے ذریعہ شاہی قید سے چھڑایا گیا تھا۔[27]

ان پراگندہ اور مختلف بیانات کے برعکس ہمعصر مورخین، شعراء اور سیاحوں مثلاً برنی، عصامی، امیر خسرو، ابن بطوطہ اور تاریخ محمدی اور تاریخ مبارک شاہی کے مصنفین کی شہادت ہے جو پدمنی کے قصہ کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے۔ ان سب مورخوں اور تذکرہ نگاروں پر یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ انھوں نے جان بوجھ کر چتوڑ کے واقعہ پر خاموش رہنے کی سازش کی ہو گی۔ امیر خسرو جو سلطان کے ساتھ چتوڑ گئے تھے بڑی بے خوفی بلکہ مبالغہ آرائی سے محاصرہ کی تفصیلات فراہم کرتے ہیں پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پدمنی کا قصہ اگر سچ مچ واقع ہوا تھا تو وہ ان کے قلم کی گرفت سے کیسے بچ نکلا؟ پدمنی کا قصہ جائسی کی پدماوت میں ملتا ہے، روایتی گیتوں میں ملتا ہے یا ان تذکروں میں ملتا ہے جن کے بیانات نے اس کو پدماوت یا روایات سے اس کو مستعار لیا ہے۔ بلاشبہ روایت

---

۲۶- ایشوری پرشاد، قرون وسطیٰ کے ہند کی تاریخ، ص ۲۲۶- (History of Medieval India)

۲۷- منوچی Storia Do Mogor، جلد اول، ص ۳۰-۱۲۵-

ایک تاریخی ماخذ ہے لیکن وہ یقیناً سب سے کمزور ماخذ ہے۔ جب تک اس کی تصدیق معاصر شہادت خواہ ادبی، تاریخی، کتبے کی ہو یا سکوں کی ہو نہ ہو جائے وہ صحیح تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ پدمنی کے سلسلہ میں جو روایت ہے خود اس کی قدامت کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ حالانکہ خود کہانی کافی طویل ہے۔ لیکن محض اس بنا پر کہ وہ مقبول تھی اور اتنے طویل عرصہ سے مقبول تھی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ یہ کہنا کہ جہاں اتنا کچھ کہا گیا ہے کچھ نہ کچھ تو صحیح ہوگا ایک مؤرخ اسے قبول نہیں کر سکتا۔

کہانی کے روایتی قصوں کو نظر انداز کرنے کے بعد ٹھوس حقائق یہ ہیں کہ علاءالدین نے ۱۳۰۳ء میں چتوڑ پر حملہ کیا اور تقریباً آٹھ ماہ کی سخت جنگ کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ بہادر راجپوت سپاہی حملہ آوروں سے لڑ کر مر گئے اور دلیر راجپوت عورتیں جوہر کے شعلوں میں بھسم ہو گئیں۔ جو عورتیں جل کر ہلاک ہوئیں ان میں غالباً رتن سنگھ کی ایک رانی تھی جس کا نام پدمنی تھا۔ ان حقائق کے سوا اور سب کچھ من گھڑت افسانہ ہے جو تاریخی تصدیق سے عاری ہے۔

**چتوڑ کی بعد کی تاریخ**

خضر خان نے چتوڑ پر کچھ برس حکومت ضرور کی لیکن سکون کے ساتھ نہیں۔ بہادر راجپوت اپنے علاقے میں کسی غیر ملکی حکومت مشکل ہی سے برداشت کر سکتے تھے۔ چتوڑ میں متعینہ شاہی فوج کو وہ برابر پریشان کرتے رہتے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس قدر جری ہو گئے کہ مسلمانوں کو قلعے کے برجوں سے پھینک دیتے تھے۔ اور شہزادے اور اس کے نائبوں کے لئے وہاں قیام کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان نے خضر خان کو اسے خالی کر دینے کا حکم دیا۔[30] وہ مالدیو کے حوالہ کر دیا گیا جو جالور کے سونگر سردار کانہر دیو چوہان کا بھائی تھا۔ مالدیو نے جالور کے محاصرہ کے دوران علاءالدین کو ایک مہلک حادثہ سے بچا لیا تھا اور سلطان نے احسان مندی کی نشانی کے طور پر اس کو چتوڑ کی گورنری[31] ۱۳۱۰ء اور ۱۳۱۵ء کے درمیان کسی وقت عطا

---

۲۸۔ فرشتہ، ص ۱۱۵۔

۲۹۔ نینسی، کھیاتس، جلد اوّل، ص ۱۵۲۔

۳۰۔ خضر خان کے چتوڑ خالی کرنے کے زمانے کے سلسلہ میں فرشتہ کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ۷۰۴ھ (۱۳۰۴ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے کہ آخر کار یہ محسوس کر کے کہ چتوڑ پر مزید قبضہ جاری رکھنا بیکار محض ہے سلطان نے خضر خان کو اسے خالی کرنے اور راجہ کے بھانجے کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ تاریخ غلط ہے۔ چتوڑ ۱۳ء میں

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

فرمادی۔ مالدیو زندگی بھر سلطان کا باجگذار رہا۔ اس نے پابندی سے نذرانے بھیجے اور پانچ ہزار سواروں اور دس ہزار پیادوں کے ساتھ میدان جنگ میں شاہی پرچم کے نیچے لڑا بھی۔[۳۵]

بہرکیف راجپوت سلطان کے کسی کٹھ پتلی کی اطاعت کرنے پر کبھی بھی آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مالدیو کی راہ میں مشکلات کھڑی کر دیں۔ مالدیو کا سب سے بڑا دشمن سیسودیہ کا رانا ہمیر تھا جس کا دادا لکشمن سنگھ مع ہمیر کے باپ ارسی سنگھ کے اپنے سات بیٹوں کے ساتھ چتوڑ کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ ہمیر کے اکلوتے چچا اجے سنگھ کے بعد جو اس یادگار جنگ میں باقی بچا تھا ہمیر سیسودیہ ریاست کا رانا بنا اور وہ چتوڑ پر قبضہ کرنے کے لیے برابر جنگ کرتا رہا۔ مالدیو نے اس سے صلح صفائی

---

(صفحہ گزشتہ کا باقی)

ایک کتبہ ملا ہے جو سیاہ پتھر کی ایک تختی پر کندہ ہے اور جو پیمائش میں ۵۵ انچ لمبا اور ۲۰ انچ چوڑا ہے اور غیبی پیر کے مزار کے مقبرے کی مغربی دیوار میں نصب ہے۔ یہ مقبرہ شہر کے دہلی دروازے سے باہر تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اس کتبے میں یہ عبارت تحریر ہے:۔

| | |
|---|---|
| شہریار جہاں محمد شاہ | آفتاب زمان و ظل اللہ |
| بوالمظفر سکندر ثانی | شد مسلّم برو جہانبانی |
| عشر ذوالحجہ موسم قربان | سال بر ہفت صد و نہ از ہجران |
| تا بود کعبہ قبلۂ عالم | باد ملک شاہ بنی آدم |

(دنیا کا بادشاہ محمد شاہ زمانہ کا آفتاب ـــــ اور زمین پر خدا کا سایہ ابوالمظفر، سکندر ثانی جس کو خدا نے اقتدار اعلیٰ عطا فرمایا۔ وہ ۱۰ ذی الحجہ یعنی قربانی کا دن تھا اور سال تھا سات سو نو ہجری (پیغمبر کی ہجرت سے) (یعنی ۱۰ ذی الحجہ ۷۰۹، مطابق ۱۳۱۰ء) جب تک کعبہ دنیا کا قبلہ رہے بنی نوع انسان کے بادشاہ کی حکومت بھی برقرار رہے)

ایپی گرافی انڈیا، عربی اور فارسی ضمیمہ ۔ ۱۹۵۹ء، ص ۳۴۔۴۱

اس طرح یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ شاہی فوجوں نے چتوڑ ۱۳۲۰ء تک خالی نہیں کیا تھا۔ خود فرشتہ بھی ۱۳۱۱-۱۲ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "چتوڑ میں راجپوتوں نے مسلمانوں کو فصیلوں پر پھینک دیا اور اپنی آزادی ثابت کر دی۔"[۳۶] اس سے صریحی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال تک شاہی فوج چتوڑ میں موجود تھی اور اس کے بعد ہی قلعہ مالدیو کے حوالہ کیا گیا تھا۔

۳۶۔ فرشتہ، ص ۱۱۵۔

سے اس کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی بیٹی کی شادی ہمیر سے کر دی اور چتوڑ کے بعض علاقے اس کو دے دیئے۔ لیکن ہمیر رانا پورے چتوڑ کو حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ آخر کار تقریباً ۱۳۲۱ء میں مالدیو کی موت کے بعد اس کی کوششوں نے کامیابی کا تاج پہنا۔ ہمیر پورے میواڑ کا مالک بن گیا۔ اس نے مہارانا کا لقب اختیار کیا۔ مہارانا کمبھا کے عہد کے ایک کتبہ میں جس کی تاریخ ۱۴۳۸ء ہے ہمیر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کر کے شہرت حاصل کی تھی[۴۲]۔ ہمیر کی اولاد نے میواڑ پر لگ بھگ موجودہ دور تک حکمرانی کی۔ یہاں تک کہ ان کی ریاست ہندوستانی وفاق میں شامل ہو گئی۔

---

۴۲۔ جرنل آف بمبئی برانچ آف دی ایشیاٹک سوسائٹی، جلد ۲۳، ص ۵۰۔

## باب 8

# مالوہ — سوانا — جالور

**مالوہ کی فتح**

امیر خسرو فرماتے ہیں کہ رنتھمبور اور چتوڑ کی طاقتور سلطنتوں کے اطاعت قبول کر لینے کی وجہ سے ترکوں کی طاقت کے ناقابل تسخیر ہونے نے راجپوتوں کی آنکھیں کھول دیں اور بہت سے حکمرانوں نے کسی جنگ کا خطرہ مول لئے بغیر علاء الدین کی اطاعت قبول کر لی۔ بہرکیف مالوہ کے راجہ مہلک دیو نے وفاداری کی راہ ترک کی[1] اور شہنشاہ کے مقابلے میں اپنے علاقہ کے دفاع کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔[2]

۱۳۰۵ء میں علاء الدین کے مالوہ پر حملہ کرنے سے بہت پہلے مسلم فوجیں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ۳۲-۱۲۳۱ء میں شمس الدین التتمش نے اس کے خلاف پیش قدمی کی، ودیشا (بھیلسا) کے قلعہ پر قبضہ کیا، اجین کو تباہ کیا جس کے دوران اس نے مہاکال کے مشہور مندر کو توڑ ڈالا۔[3] لیکن یہ محض لوٹ مار کا حملہ تھا۔ اور جیسے ہی التتمش دہلی لوٹا، راجہ دیوپال وہاں پہلے کی طرح حکومت کرنے لگا۔ جلال الدین کے عہد حکومت میں بھی ایک چھوٹی سی مہم گئی تھی لیکن اس کو مستقل مہم کا سامنا علاء الدین کے عہد حکومت ہی میں کرنا پڑا اور سلطنت دہلی شہنشاہی میں ضم کر لی گئی۔

---

۱۔ بعض نے اس مہم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ خسرو اس کو خزائن میں بیان کرتے ہیں اور دیول رانی میں بھی اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

۲۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۴۳

۳۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو اپیگرافیا انڈیکا جلد اول، ص ۲۴۳-۲۰۱۔

امیر خسرو کے مطابق[4] مالوہ کے رائے مہلک دیو تیس چالیس ہزار سوار اور بے شمار پیادے رکھتا تھا۔ یحییٰ، فرشتہ اور حاجی الدبیر سب اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ راجہ چالیس ہزار سواروں اور ایک لاکھ پیادوں پر مشتمل ایک فوج کا مالک تھا۔ مہلک کا رضاعی بھائی اور افواج کا سپہ سالار اعلیٰ ہرنند تھا جو کوکا (یا گوگا) پردھان کے نام سے زیادہ معروف تھا اور جو ایک ماہر سیاستدان اور شجاع جنگجو تھا۔[5] علاءالدین نے ان کے باغیانہ طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے لائق و فائق کمانڈر عین الملک ملتانی کی سرکردگی میں جو صاحبِ سیف و قلم تھا[6] دس ہزار چیدہ سپاہ پر مشتمل ایک فوج مالوہ کے خلاف روانہ کی۔ اپنی آمد پر شاہی افواج نے پورے علاقے میں سراسیمگی پھیلا دی۔ ایک معرکہ میں کوکا میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ جہاں تک انسانی آنکھ دیکھ سکتی تھی زمین خون سے لت پت دکھائی دیتی تھی۔[7] اس کا سر دہلی بھیج دیا گیا جہاں اس کو محل کے دروازوں کے نیچے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا گیا۔ کوکا کی موت سے رائے مہلک دیو کو مانڈو کی طرف فرار ہونے میں اور جلدی کرنی پڑی۔

عین الملک ملتانی نے علاقہ کا عمدہ انتظام کیا اور جلد ہی امن و امان قائم ہو گیا کچھ مدت کے بعد ہی اس نے اپنی افواج کے ساتھ مانڈو کے خلاف پیش قدمی کی جو امیر خسرو کے مطابق "دکن کی فتح کی کنجی تھی"۔ مہلک دیو کا ایک فوجی دستہ جو اس کے بیٹے کے زیرِ کمان تھا شاہی جرنل سے نبرد آزما ہوا لیکن اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور شہزادہ قتل کر دیا گیا۔ مانڈو کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اسی دوران ایک غدار نے عین الملک کو ایک خفیہ راستہ بتا دیا اور وہ رات کی تاریکی میں قلعہ میں داخل ہو گیا۔ قلعہ کے اندر دشمن کے اس طرح اچانک در آنے سے مہلک دیو اور اس کی محافظ فوج حیران رہ گئی، پھر تو ایسی بھگدڑ مچی کہ اس میں رانا قتل کر دیا گیا اور شاہی فوج ۲۳ نومبر ۱۳۰۵ء

---

۴- خزائن، ترجمۂ حبیب، ص ۴۳ ؛ دیول رانی، ص ۴۷ -

۵- ایک سفید زرد پتھر میں کندہ ایک کتبہ ایک مسجد کی تعمیر کا حوالہ دیتا ہے جو علاءالدین محمد شاہ کے عہد میں کوکا کے علاقہ (کوکا دیس) میں ۱۳۱۱ء (۷۱۱ھ) میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ کتبہ جو غالباً چندیری کا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوکا یا تو بہت مقبول یا بڑا طاقتور وزیر تھا چنانچہ وہ علاقہ اس کے نام سے موسوم تھا اور اس کے حکمراں مہلک دیو کے نام سے نہیں تھا۔

انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی، جلد اوّل ۱۹۲۵ء، ص ۵۶-۴۵۳

۶- دیول رانی، ص ۴۸-۴۷ -

۷- خزائن، ترجمۂ حبیب، ص ۴۴ -

(۵ رجمادی الاوّل ۷۰۵ھ) کو شہر پر قابض ہوگئی۔[۸]

مانڈو کی فتح کے کچھ ہی بعد اجین، دھار نگری اور چندیری کے شہر بھی فتح ہو گئے۔ ان کے سرداروں کو سلطنت کی فرمانروائی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ عین الملک نے اپنے کارناموں کا مفصّل بیان دہلی بھیجا جہاں مکمل ایک ہفتہ تک خوشیاں منائی گئیں اور ساتوں دن عوام میں مٹھائی بانٹی گئی۔ اس عظیم الشان کامیابی اور شاندار خدمات کے عوض جو عین الملک ملتانی نے انجام دی تھیں مانڈو تک پورا مالوہ اس کے سپرد کر دیا گیا۔[۹]

**سوانا پر قبضہ**

مالوہ کی فتح کے بعد علاء الدین نے اپنے جلیل القدر جنرل ملک نائب کافور کو تو جنوب میں روانہ کیا اور خود اس نے سوانا پر قبضہ کرنے کا ایک موقع فراہم کر لیا۔[۱۰] اس زمانے میں سوانا پرمار راجپوت سردار سائل دیو کے قبضہ میں تھا۔ سائل دیو نے رنتھمبور اور چتوڑ کے طاقتور قلعوں کو خلجی سپہ سالار کے حملوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا تھا تاہم اس نے دہلی سلطان کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ سائل دیو ایک طاقتور اور زبردست حکمران تھا۔ اس نے جنگ میں کئی رایوں کو شکست دی تھی اور متعدد راجپوت راوتوں نے اس کی فرمانروائی تسلیم کر لی تھی۔

سلطان نے ۲ جولائی ۱۳۰۸ء (۱۳ محرم ۷۰۸ھ)[۱۱] کو سوانا کے حکمران کو سزا دینے کے لئے پیش قدمی کی۔ وہاں آتے ہی اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شاہی فوج کے میمنہ کو فصیلوں کے دو اطراف مشرق و مغرب میں تعینات کیا۔ شمال میں میسرہ تھا اور قلب ملک کمال الدین گرگ کے زیر کمان دیا گیا۔ منجنیق سے مسلسل پتھر وغیرہ برسائے جاتے رہے لیکن کافی مدت تک کامیابی

---

۸۔ ایضاً، ۴۹۔ تاریخ مبارک شاہی کا مصنف ۱۳۰۰ء (۷۰۰ھ) کو مالوہ کی فتح کی تاریخ قرار دیتا ہے جو غلط ہے۔ ہمعصر خسرو مذکورہ بالا تاریخ بیان کرتا ہے۔

۹۔ آہنی ستون کا ایک حصہ جو اب دھار کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے بارے میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ مانڈو کے مرکزی مندر (غالباً وشنو مندر) سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو عین الملک ملتانی نے توڑ ڈالا تھا۔

آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۱۹۰۲ء، ص ۲۰۵-۱۲۔

۱۰۔ فرشتہ، ص ۱۱۵۔

۱۱۔ سوانا جودھپور سے پچاس میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔

۱۲۔ خزائن کا الٰہ آباد مخطوطہ، ورق ۴۳، یہ تاریخ دیتا ہے۔ ایلیٹ کے مخطوطہ میں بھی یہی تاریخ ہے لیکن پروفیسر حبیب کے مخطوطہ میں ۱۱ محرم ۷۱۰ھ (۱۳۱۰ء) ہے۔ خزائن، ترجمہ، ص ۵۲۔

نظر نہیں آتی۔ شاہی فوج نے متعدد حربی تدابیر اختیار کیں لیکن وہ سب ناکام رہیں۔[13] راجپوتوں نے بڑے عزم کے ساتھ قلعہ کا دفاع کیا اور فصیلوں سے آگ اور پتھر پھینکتے رہے اور ہفتوں تک ترکی ارغنوں اور ہندی گھنٹوں کی آوازوں سے سانس گھٹتی رہی۔" پدم ناتھ کہتا ہے کہ جب کچھ بھی سودمند ثابت نہ ہوا تو یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ سیہل نامی ایک غدار کو آمادہ کر لیا گیا کہ وہ شاہی کمانڈر کو ایک راستہ بتا دے جس کے ذریعہ ایک منجنیق لے جائی گئی اور ایک گائے کا سر اس جھیل میں ڈال دیا گیا جو محصورین کو پانی فراہم کرتی تھی۔ محافظ فوج نے پانی پینا بند کر دیا اور یوں ان کی قسمت پر مہر لگ گئی۔[13 (الف)]

شاہی افواج قلعہ کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئیں لیکن بڑی مشکل سے سائل دیو نے جالور کی طرف فرار ہونا چاہا لیکن نرغہ میں آ گیا اور ۱۰ نومبر ۱۳۰۸ء (۲۳ ربیع الاول ۷۰۸ھ) کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[14] امیر خسرو کے مطابق سائل دیو، دیوقامت تھا جس وقت اس کا بڑا بھاری سر سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ہر شخص اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سوانا کا انتظام کمال الدین گرگ کے سپرد کیا گیا اور علاء الدین دہلی لوٹ گیا۔

## جالور کی اطاعت

رائے مہلک دیو کی طرح جالور کے چوہان راجہ کانہر دیو نے بھی نافرمانی کی روش اختیار کی اور اسی جیسا برتاؤ اس کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔[15] کانہر دیو جو سالگ رام، گوکل ناتھ[16] اور کرشنا سوم کے ناموں سے مشہور رہے گجرات کے سولنکی راجہ بھیم دیو کے ایک باجگذار سوم سنگھ کا بیٹا تھا۔[17] میواڑ میں علاء الدین کے اقتدار مستحکم کر لینے کے

---

۱۳۔ فتوح، ص ۳۷۔ ۱۳ (الف) فروغ ہتر پیکا، ص ۵۵۔

۱۴۔ فرشتہ کا یہ بیان غلط ہے کہ سائل دیو نے سلطان کو اپنا ایک طلائی مجسمہ بھیجا تھا اور معافی کی درخواست کی تھی جو قبول کر لی گئی ہے۔ غالباً غلطی سے فرشتہ دکن کے بلال دیو کی کہانی سائل دیو سے منسوب کرتا ہے جو خسرو، عصامی اور یحییٰ کے مطابق سوانا پر قبضہ کے دوران ہی مار ڈالا گیا تھا۔

۱۵۔ قدیم زمانے میں جالور جابالی پور کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۲۱۰ء میں التتمش نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد اس نے اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر لی۔ اس کا قلعہ جو ایک پہاڑی پر واقع ہے تقریباً ایک ہزار فیٹ بلند ہے اور سوانا سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔

۱۶۔ بنسی، کھیات، جلد اول، ص ۱۵۲۔

۱۷۔ ریو، مارواڑ کا اتہاس، ص ۱۱۔

بعد کانہر دیو کے نیم آزاد مقام کو سرکشی و تمرد سے تعبیر کیا گیا اور اس کے علاقہ پر حملہ کر دیا گیا۔

نینسی کا بیان ہے کہ علاء الدین نے جالور کے دو محاصرے کئے۔ پہلا محاصرہ اس وقت ہوا تھا جب ۱۲۹۹ء میں شاہی فوج گجرات سے واپس آ رہی تھی اور دوسرا ۱۳۱۱ء میں۔ چونکہ سلطان نے گجرات کی جانب پیش قدمی میں فوجوں کی قیادت نہیں کی تھی اس لئے ۱۲۹۹ء کے محاصرہ کے سلسلہ میں نینسی کی فراہم کردہ تفصیلات پوری طرح تسلیم نہیں کی جا سکتیں۔ وہ سلطان کی موجودگی کا برابر ذکر کرتا ہے۔ لیکن فرشتہ بھی جالور کی دو مہموں کا ذکر کرتا ہے۔ ۷۰۴ھ (۱۳۰۴ء) کے واقعات کے ذکر میں فرشتہ لکھتا ہے کہ جب شاہی جنرل الف خان (الپ خان) اور نصرت خان[18] مالوہ کی فتح سے لوٹ رہے تھے تو وہ جالور پہنچے اور ناہر دیو (کانہر دیو) نے لوکا کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہوئے بلا کسی مزاحمت کے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ فرشتہ کے مطابق دوسرا حملہ ۱۳۰۸ء میں ہوا اور وہ ایک انتہائی عجیب واقعہ کا نتیجہ تھا۔ ایک دن جب کانہر دربار میں موجود تھا اس نے علاء الدین کو کہتے سنا کہ ہندو راجاؤں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی فوجوں کی طاقت کو للکارنے کی جرأت کر سکے۔ اس فقرے سے کانہر کی آن کو چوٹ لگی اور اس نے طلب مبارزت کرتے ہوئے جواب دیا: "اگر میں جنگ لڑوں اور کامیاب نہ رہوں تو مجھے قتل کیا جا سکتا ہے"[19]۔ اس گھمنڈ نے سلطان کو مشتعل کر دیا اور اس نے جالور پر حملہ کا حکم دیا جہاں کانہر دیو پہلے خفیہ طور سے جنگ کی تیاریاں کرنے کے لئے پہنچ چکا تھا۔ حاجی الدبیر اسی قصہ کو دہراتے ہیں[20] جو ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک وقت تو کانہر دیو دہلی پہنچتا ہے کہ اپنی مرضی سے بادشاہ کی اطاعت کرے، چار برس تک غیر متزلزل وفاداری کا اظہار کرتا ہے اور اچانک ایک ایسا گستاخانہ رویہ اختیار کرتا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی رعایا کو انتہائی خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔ نہ تو نینسی[21] کے، نہ ہی فرشتہ اور حاجی الدبیر کے بیان کردہ وجوہات قابلِ یقین معلوم ہوتے ہیں۔ حملہ کا یقینی سبب اصل میں سلطان کا عزم محکم تھا کہ وہ راجپوتانہ کی دوسری ریاستوں کی طرح جالور کی آزادی کو بھی ختم کر دے۔

---

۱۸- فرشتہ، ص ۱۱۸، میں غلطی سے الف (الپ) خان اور نصرت خان ہے۔ نصرت خاں رنتھمبور میں ۱۳۰۱ء میں مر چکا تھا۔ وہ عین الملک ملتانی تھا جس نے ۷۰۴ھ میں مالوہ پر حملہ کیا تھا۔

۱۹- فرشتہ، ص ۱۱۸۔

۲۰- ظفر الوالہ، ص ۸۹-۸۸۷۔

(۲۱- صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

مختصر یہ کہ ۱۳۱۳ء میں ایک شاہی لشکر جالور بھیجا گیا۔ اس مہم کے کماندار کا نام معلوم نہیں تاہم وہ کوئی بہادر جنرل نہیں تھا۔[۲۱] متعدد معرکوں میں راجپوتوں نے شاہی فوجوں کو شکست دی اور کئی موقعوں پر ان کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ ایک بات تو بہر حال یقینی ہے کہ جالور کی جنگ بڑی بھیانک اور غالبًا کافی طویل تھی۔ گجراتی رومانی رزمیے کانہڑدی پربندھ[۲۲] کے مطابق مقابلہ کئی سال جاری رہا اور شاہی افواج کو کئی پسپائیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔

توہین آمیز پسپائیوں کی خبر نے سلطان کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا اور اس نے تجربہ کار کمال الدین گرگ کی زیر کمان ایک طاقتور فوج بھیجی۔ جالور پہنچنے پر کمال الدین نے غیر متزلزل جوش و خروش کے ساتھ محاصرہ میں شدت پیدا کی۔ پدم ناتھ کے مطابق بیجوؤ نامی ایک شخص کو شاہی سونے کی حرص

---

۲۱۔ نینسی نے ایک بڑی دلچسپ وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ علاء الدین کے حرم کی ایک شہزادی کانہڑدیو کے بیٹے وکرم پر جو باپ کی جگہ دربار میں حاضر رہتا تھا عاشق ہو گئی۔ پدم ناتھ اپنی کانہڑدی پربندھ (Kanhad de parbandh) میں کہتا ہے کہ وہ علاء الدین کی ایک بیٹی تھی اور اس کا نام فیروزہ تھا۔ سلطان اور حرم کی خواتین نے پہلے تو لڑکی کو خیال بدلنے کے لئے ڈرایا دھمکایا مگر اس کی ضد دیکھ کر علاء الدین نے وکرم سے اصرار کیا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ نوجوان راجپوت ایک ترک لڑکی سے شادی کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور وہ جالور یہ وعدہ کر کے روانہ ہوا کہ تھوڑی مدت کے اندر ہی وہ برات لے کر آئے گا۔ سلطان کو وکرم کی جانب سے شبہ ہوا اور اس نے راجپوت خاندان کے ایک شہزادے کو بطور یرغمال اپنے پاس روک لیا۔ جیسی کہ توقع تھی وکرم اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے واپس نہیں آیا اور سلطان کو اس غداری پر اس قدر اشتعال ہوا کہ اس نے جالور پر حملہ کر دیا۔

۲۲۔ فرشتہ، ص ۱۱۸، کے مطابق علاء الدین کی ایک داشتہ گل بہشت نے فوج کی قیادت کی۔ بڑی شجاعت سے لڑی لیکن معمولی بیماری کے بعد وہ اچانک چل بسی۔ اس کے بیٹے شاہین نے جنگ جاری رکھی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی وہ مارا ڈالا گیا۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک فوج کی قیادت ایک داشتہ کو سونپی گئی تھی جو بہادر ترک افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی اور انھوں نے اس کے زیر کمان برضا و رغبت خدمت انجام دی۔ کسی ہمعصر مؤرخ نے اس واقعہ کو نہیں بیان کیا اور یہ کہانی فرشتہ کے ذہن کی اختراع سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی چنانچہ اس کو قطعی طور پر مسترد کر دینا چاہیے۔

۲۳۔ کمیسریٹ (Commissariat) گجرات، جلد اول، ص ۱۲؛ کے۔ ایم۔ منشی، گجرات اور اس کا ادب (Gujrat and its Literature)، ص ۱۵-۱۰۲۔

نے اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ ایک خفیہ راستہ کے ذریعہ شاہی افواج کو قلعہ میں لے جائے۔ اس کمینگی اور رذالت کی قیمت اس کو اپنی بیوی ہی کے ہاتھوں جان گنوا کر چکانی پڑی تاہم اس نے کمال الدین کے کام کو آسان بنا دیا۔ آخر کار دست بدست جنگ میں گوکل ناتھ، اس کا بیٹا وکرم دیو اور اس کے حامی مارے گئے اور قلعہ پر قبضہ ہو گیا۔ جالور کی فتح کے بعد ہونے والے قتل عام میں کانہڑ دیو کا ایک بھائی مالدیو بچ رہا۔ بعد میں وہ سلطان کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کو سلطان نے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا، خضر خان سے چتوڑ کا قبضہ حاصل کر لینے کے لئے مقرر کیا تھا۔

جالور کی فتح کے سلسلہ میں نینسی کی تاریخ (۱۳۶۸ سمبت/۱۲-۱۳۱۱ء) فرشتہ کی تاریخ ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) سے مختلف ہے۔ ۱۳۰۸ء میں سوانا کی فتح کا بیڑا اٹھایا گیا تھا نیز دکن کو ایک بڑی فوج روانہ کی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا بڑا امکان ہے کہ جالور پہ حملہ بعد کی تاریخ ہی میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ نینسی کی تاریخ کی تصدیق جین پربھا سوری کی تیرتھ کلپ سے بھی ہوتی ہے جس کا بیان ہے کہ ۱۳۶۷ سمبت/۱۳۱۰ء میں علاء الدین نے سنچور کے مہاویر کے مندر کو تباہ کیا تھا جو جالور کے قریب کا ایک مقام ہے۔ اس مندر کی تباہی زیادہ بڑی مہم یعنی جالور پر حملہ کا ایک حصہ ہو گی۔ ریو نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جالور نے ۱۳۱۱ء میں اطاعت کی۔[25] اس فتح کی یادگار میں علاء الدین نے جالور میں سونگیر کے مشہور قلعہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو اب بھی موجود ہے۔[26]

جالور کی فتح کے راجپوتانہ کی تقریباً تمام اہم ریاستیں یکے بعد دیگرے اطاعت اختیار کر چکی تھیں۔ جیسلمیر، رنتھمبور، چتوڑ، سوانا اور جالور اور ان کے متصل ریاستیں بوندی، مندرو اور ٹونک

---

۲۴۔ نیز ملاحظہ ہو ایشوری پرشاد، قرامنہ ترکوں کی تاریخ (A History of Qaraunah Turks)، جلد اول

۲۵۔ ریو، مارواڑ کا اتہاس، ص ۵۱۔ کنہڑ دے پربندھ میں بھی کانہڑ دیو کی موت کی تاریخ ۱۳۶۸ وکرم سمبت/۱۳۱۱ء ہے (شودھ پتریکا، ص ۹۲)۔ اس تصنیف سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جالور کے ساتھ جنگ اس وقت سے شروع ہوئی جب کانہڑ دیو نے شاہی فوج اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جب کہ وہ گجرات جا رہی تھی (ص ۵۲) اور اسی وقت سے لڑائیوں اور جھڑپوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو ۱۳۱۱ء تک جاری رہا۔ درمیان میں صلح کے بعض وقفے بھی آتے رہے۔ (ص ۶۲-۵۲)

۲۶۔ وہ عمارت جو اب توپ خانہ کے نام سے معروف ہے اصل میں ایک مسجد تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو علاء الدین نے تعمیر کرایا تھا۔ ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۲۰-۱۹۱۹ء، حصہ اول، ص ۵۵۔ نیز ملاحظہ ہو، گیزیٹیر، گجرات، جلد اول، ص ۵۰۔

سب ہم قلعہ ہو چکا تھا[۱]۔ بظاہر جودھپور (مارواڑ) بھی سلطنت کے زیرِ نگیں آگیا تھا اگرچہ اس پر علاء الدین کے قبضہ کا کوئی صریح ذکر نہیں ملتا ہے لیکن (جودھپور میں) پنڈو کے مرضع ۱۳۵۸ سمبت (۱۳۰۱ء) کے ایک کتبہ میں جگنی پور (دہلی) کے علاوہ دی علاء الدین کا ذکر بطور صاحبِ اقتدار بادشاہ کے کیا گیا ہے[۲۸]۔ چنانچہ چودھویں صدی کی ابتدائی دہائی کے خاتمے تک پورا راجپوتانہ یعنی ہندوستان کی شجاعت کا عظیم خطہ دہلی کے شہنشاہ کے قدموں میں آ چکا تھا تاہم پورے راجپوتانہ پر مکمل تسلط ناممکن تھا وہاں علاء الدین کی کامیابی مختصر انداز کی تھی۔

## راجپوتانہ کی مہموں کی خصوصیت اور راجپوتوں کی شکست کے اسباب

۱۳۰۰ء سے لگ بھگ کہ سلطان علاء الدین نے رنتھمبور کی فتح کا بیڑا اٹھایا تھا ۱۳۱۱ء میں جالور کی فتح تک اس کی فوجیں راجستھان میں برابر لڑتی رہیں۔ ایک بار جب کسی قلعہ کا محاصرہ کیا جا چکا ہوتا تو وہاں سے فوجوں کو واپس بلانا سلطان کے وقار کے منافی تھا اور راجپوتوں کی شجاعت دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قلعہ کے سامنے خون ریز جنگیں لڑی گئیں۔ چنانچہ راجپوتانہ میں مختلف جنگوں کو بیان کرنا اصل میں خون اور قتل، دلیرانہ جنگ و جدل اور عظیم الشان شہادت کے قصے دہرانا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی قلعہ کے سامنے مقابلہ برسوں تک جاری رہا اور اس کا خاتمہ آبادی کے قتلِ عام کی صورت میں رونما ہوا جس کے بعد جوہر کی آگ میں عورتوں کی بھیانک تباہی عمل میں آئی۔

بدقسمتی سے راجپوت آزادی کے بغیر زندگی کو بے وقعت سمجھتے تھے شجاعت و دلیری سے متصف ضرور تھے لیکن اتفاق و اتحاد کی روح سے عاری تھے۔ انفرادی طور پر قلعوں نے سخت مزاحمت کی لیکن طاقت کے لحاظ سے ان میں سے کوئی بھی سلطنت دہلی کا مدِمقابل نہ تھا۔ اگر سلطان کے مقابلے میں دو یا تین راجپوت حکمران متحد ہو گئے ہوتے تو وہ اس کو شکست دینے میں یقیناً کامیاب ہو جاتے۔ لیکن اپنے پہاڑی قلعوں میں اپنے آپ کو محفوظ تصور کر کے انھوں نے صرف اپنے معاملات سے سروکار رکھا اور اپنے بے جا گھمنڈ پر نازاں رہے جب کہ علاء الدین نے

---

۱۔ ٹاڈ، اینلز، جلد اول، ص ۳۰۹۔

۲۸۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ، ۰۹-۱۹۰۸ء، ص ۱۱۲۔

یکے بعد دیگرے دوسری ریاست پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا حالانکہ چالوکیہ کے درمیان تعلقات اس قدر
بے توجہی کی ایک مثال یہ ہے دشمن شمال میں بڑھ رہا تھا جب راجپوت سردار ایک دوسرے کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ اس وقت
جبکہ سوائے ترک چینی ہو گئی تھی چالوکیہ کا حکمران جو وہاں سے صرف چار سو میل کے فاصلہ پر تھا تاہم بھی
متاثر نہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی برس بعد ایک حملہ میں چالوکیہ بھی ختم ہو گیا۔

راجپوتوں کی شکست کا دوسرا سبب ان کے قلعے تھے۔ وہ عام طور سے کسی پہاڑی کی چوٹی پر بنائے جاتے تھے تاکہ جب کبھی کوئی اچانک حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے پیادہ فوج قلعہ سے باہر نکلیں تو عورتوں، بچوں اور مویشیوں کی حفاظت کی جا سکے۔ اگرچہ حملہ آور کے لئے پہاڑی کی چوٹی پر چڑھائی کرنا مشکل تھا تاہم جب قلعہ کا محاصرہ کر لیا جاتا تھا تو وہ نیچے کے میدانوں سے بالکل الگ ہو جاتا تھا۔ اس طرح باہر کی دنیا سے حاصل ہونے والا اناج اور حاصل تو یکجا ہو چکی کیا اور ان میں چلے جاتے تھے۔ محاصرہ کے دوران قرب و جوار کے تمام لوگ وقت پر قلعہ میں پناہ لینے کے لئے فرار نہیں ہو پاتے تھے ان میں سے بہت سے نیچے کے میدانوں میں رہ جاتے تھے۔ ان کی حیثیت دشمن سے ان کو نفرت کرنے پر مجبور کرتی تھی لیکن حکمرانوں سے ان کو دفاع سے پہلے کسی طرح الگ نہیں کر سکتی تھی جو قلعہ کے اندر بحفاظت تمام بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ قلعہ کے اندرونی حالات بھی الگ یا دلکش نہیں ہوتے تھے۔ محاصرہ کے دوران معمولی آبادی کی تعداد سے کہیں زیادہ بھیڑ ہو جاتی تھی اور رسد اور اسباب اور پانی کے لئے خاص انتظامات نہیں ہوتے تھے۔ دشمن جو کہ اس پہاڑی کے دامن میں پڑا ہوا ہوتا تھا جہاں قلعہ واقع ہوتا ہے کو آسانی سے سامان رسد کے قافلوں کا راستہ بند کر سکتا تھا اور اس طرح رسد کی کمی بیشتر دفاع کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ چالوکیہ کے مضبوط قلعے سب کے سب تقریباً بیکار ہو گئے۔ مزید برآں منظم حکومت کی صورت حال کچھ دو قسمی ہیں یعنی ... کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ذات پات کے امتیازات اور تعصبات نے ہندی ... یا اتحاد کی جگہ لے لی۔ دشمن خوب واقف تھا اور اس نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا اور چالوکیہ کی شاندار مثالیں دہرائے جانے کے قابل ہیں۔ بعض قلعہ داروں کی سازشوں کی وجہ سے کئی ... کے گوداموں میں پانی کے ... کے ذخیرے ... میں پھینک دیے گئے۔ اور اس طرح رسد ناپاک ہو گئی اور قلعے دشمن کے قبضے میں آ گئے۔

اس وقت تک راجپوت فوج جب کی اپنی تنظیم روایات سے چمٹے ہوئے تھے اور ان کا

اپنی فوجی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے بہت کم مواقع حاصل تھے۔ وسطی ایشیا کے ممالک سے یا تو سرے سے ان کے تعلقات تھے ہی نہیں اور تھے بھی تو بہت کم، اور وہ فن حرب میں ان انقلابی تبدیلیوں سے قطعی ناواقف تھے جن کا لڑائیوں میں منگول نے آغاز کیا تھا۔ دہلی کے سلاطین کو منگول حملہ آوروں سے اکثر و بیشتر لڑنا پڑتا تھا اور انھوں نے ان کے چھپ کر یورش کرنے، گھات لگا کر وار کرنے اور مصنوعی پسپائی کے بہت سے طور طریقے سیکھ لئے تھے۔ وہ عرادہ، گرگج اور منجنیق جیسے حربی آلات کے مالک تھے۔ راجپوت کھلے میدان میں قوی ہیکل ہاتھیوں کے ساتھ لڑتے تھے۔ ان کی حکومت جاگیردارانہ اصول پر مبنی تھی اور جنگ کے زمانے میں مختلف ماتحت ریاستیں مقررہ تعداد میں سپاہی فراہم کرتی تھیں۔ محاصرہ کے زمانے میں ایسی مدد دشمنوں کی کارروائیوں کی وجہ سے نہیں پہنچ پاتی تھی اور محصورین کو تن تنہا لڑنا پڑتا تھا۔

علاوہ بر آں ایک راجپوت راجہ کے وسائل محدود تھے۔ اس کا علاقہ بنجر تھا، غلے اور پانی کی کمی تھی۔ اس کے علاقے کا پہاڑی ہونا اسکی دولت تھی۔ وہ دہلی سلطان کے مقابلے میں کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا جو ملک کے زرخیز ترین خطوں پنجاب، اودھ اور گجرات کا مالک تھا اور جو سامان رسد اور فوجی امداد کی غیر محدود فراہمی پر تکیہ کر سکتا تھا۔

پھر یہ کہ راجپوت صرف جان دینا جانتے تھے۔ ان کی نظر میں میدان جنگ میں مرنا سب سے بڑی سعادت اور سب سے بلند عزت تھی۔ دلیری ان کی رگ رگ میں پیوست تھی۔ وہ تدبیر اور غداری سے نفرت کرتے تھے۔ ترکوں کے نزدیک شجاعت پہلا وصف اور تدبیر دوسری صفت تھی۔ ان کے نزدیک موت سب سے بڑی بدقسمتی تھی۔ وہ اس دنیا میں زندہ رہنا اور فتح کے ثمرات سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اس کا تو فتح چاہیئے تھی چاہے اس کے لئے کوئی بھی ذرائع و طریقے اختیار کئے جائیں۔ راجپوت جب اپنے آپ کو جنگ میں جھونک دیتے تھے ترک مہم کے ہر پہلو کو جانچ کر قدم اٹھاتے تھے۔ راجپوت جلد بازی کے ساتھ جنگ لڑتے اور ترک فن حرب کے اصولوں کے مطابق۔ راجپوتوں میں حکمت عملی مفقود تھی اور مسلمانوں میں وہ ان کی کامیابی کا اصل راز تھی۔

لیکن راجپوتانہ میں سلطان کی کامیابی عارضی تھی۔ راجپوتوں نے جن کو اپنے ملک سے محبت تھی اور جن کو اپنی عزت و آبرو کو بچانا تھا علاء الدین کے گورنروں کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اگر کسی معرکہ میں ان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا تھا تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندانوں کو توہین کرنے والے حملہ آوروں سے کیونکر بچا سکتا ہے جوں ہی حملہ کا سیلاب اترتا تھا وہ اپنے علاقوں کو

پھر حاصل کر لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوتانہ پر علاء الدین کا تسلط غیر مستقل رہا۔ رنتھمبور کی فتح کے چھ ماہ کے اندر ہی الغ خان کے اس کو چھوڑنے کے بعد اس پر قبضہ ہو جانا غیر یقینی ہے۔ خضر خان کو چتوڑ علاء الدین کی زندگی ہی میں خالی کرنا پڑا تھا۔ جالور اپنے فتح ہونے کے فوراً ہی بعد آزاد ہو گیا تھا۔ بھاٹوں کا ادب مسلمانوں اور راجپوتوں کے درمیان مسلسل آویزش کے واقعات سناتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ راجپوتانہ نے مکمل طریقے سے اطاعت نہیں کی اور پیدائشی سورماؤں کی اس سرزمین میں کوئی نہ کوئی ریاست ہمیشہ کامیابی کے ساتھ سلطنت دہلی کے ساتھ لڑائی رہی۔

## شمالی ہند میں علاء الدین کے کارنامے

لیکن وہ قسمت آزما جس نے صرف سونے چاندی کے حصول کے لئے دیوگری پر حملہ کیا تھا اور شاہی تاج پہننے کی خاطر جس نے اپنے چچا کو مار ڈالا تھا ایک نفرت انگیز لٹیرا اور قاتل کے علاوہ اور بھی کچھ تھا۔ اس نے راجپوتانہ میں اپنے خدا داد جوہر دکھائے تھے جہاں وہ جیسلمیر کے ریتیلے صحراؤں اور چتوڑ اور رنتھمبور کی چٹانی زمین میں صرف اس لئے نہیں لڑا تھا کہ فتوحات حاصل کرے یا اپنی فوج کی طاقت کا مظاہرہ کرے بلکہ وہ اپنے اقتدار کے تحت پورے ملک کو متحد کرنا چاہتا تھا۔ کم از کم یہاں اس کو سونے کی طمع نہیں لائی تھی کیونکہ راجپوتانہ سے کسی قسم کی دولت نہیں حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس کے برخلاف اس علاقے میں فتوحات بڑی مہنگی ثابت ہوتی ہوں گی۔ البتہ انھوں نے اس کے وقار میں اضافہ کیا۔ جالور کی فتح کے ساتھ نہ صرف پورا راجپوتانہ بلکہ شمالی ہند اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ شمال مغرب میں اس کی فوجیں غزنی تک[29] پیش قدمی کر چکی تھیں اور شمال مشرق میں نیپال کے دور دراز علاقے[30] تک میں اس کا سکہ جم گیا تھا۔ محض اپنی صلاحیت اور اپنے دل کی امنگ کے شعلوں کی بدولت علاء الدین دہلی کے معمولی سلطان سے ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا تھا۔ اس کے دور دراز پھیلے ہوئے خطے اس کے مقرر کردہ گورنروں یا مقطعوں کے زیر حکومت تھے جو سب کے سب وفاداری اور اطاعت گذاری کے ساتھ اس کی خدمت کرتے تھے۔

شمالی ہند کی فتح کے ساتھ ساتھ علاء الدین نے جنوبی جزیرہ نما کی فتح کا بھی بیڑا اٹھایا۔ اس مہم میں اس کی فوجیں ۱۳۰۸ سے ۱۳۱۲ تک مسلسل مشغول رہیں۔ ان مہمات کا امیر وہ خود شہنشاہ نہیں تھا بلکہ اس کا محبوب جنرل ملک کافور تھا۔ اس نے دہلی سے پیش قدمی کر کے یکے بعد دیگرے جنوب کی تمام ریاستوں کو اکھاڑ پھینکا۔ لیکن جنوبی مہموں کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان پر منگولوں کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کی جائیں جن کی طرف گذشتہ صفحات میں کئی مقامات پر مختصر طور سے اشارے کئے جا چکے ہیں۔

۲۹۔ ملاحظہ ہو باب پنجم۔ ۳۰۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ الف۔

# باب نو

# منگول حملے

## منگول — ان کا عروج اور میراث

علاء الدین کی فوجی مہمات میں شمال مغرب کے منگول لٹیروں کے حملے بار بار خلل انداز ہوتے رہے۔ زمانہ قدیم سے وحشیوں کی ایک نسل چین کے صحرائے گوبی کے شمال میں ایک غیر آباد اور الگ تھلگ علاقہ میں رہتی چلی آرہی تھی۔ بارہویں صدی میں وہ قہر خداوندی بن کر نازل ہوئی اور چنگیز خان[1] کی پیدائش کے کچھ صدیوں بعد ہی مغل یا منگول[2] ناقابل تسخیر اور ناقابل فتح سمجھے جانے لگے۔ مشرق و مغرب ہر جگہ محض ان کا نام ہی دہشت پیدا کر دیتا تھا۔ ایک تند و تیز سیلاب کی مانند ان کے بے شمار ٹڈی دل لشکر[3] اپنے وسطی ایشیا کے پہاڑی

---

۱۔ چنگیز خان، دیلم بولدک میں جو دریائے اونان کے قریب ہے ۱۱۵۵ء میں پیدا ہوا تھا۔

۲۔ لفظ منگول "مونگ" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "بہادر" اور "باہمت"۔ مسلم مورخین مغل استعمال کرتے ہیں جب کہ یورپی مصنفین منگول یا تاتار استعمال کرتے ہیں۔" اوّلاً اس سے قبیلوں یا قوموں کا وہ مجموعہ مراد ہے جو شمالی حملہ آور یلا کی نوجوان پر مشتمل تھا۔ اس میں اس کی نسلی اصل کی طرف یا تو بالکل ہی اشارہ نہیں ہے یا بہت کم۔ اور دوسرے بابر کے زمانے میں اس کو حقارت کی ایک اصطلاح سے کچھ زیادہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔" ایلیاس اور راس، تاریخ رشیدی کا مقدمہ ص ۸۸-۸۹۔ اس کتاب میں مغل کے مقابلہ میں منگول استعمال کیا گیا ہے تاکہ منگول حملہ آوروں اور ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے درمیان امتیاز کیا جا سکے۔

۳۔ وسطی ایشیا کے شہروں میں چنگیز کے مظالم کی وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو ویمبرے (Vambery) کی تاریخ بخارا (History of Bokhara) ص ۳۹-۱۱۹۔

گھوڑوں سے نکل کر روس، ترکی، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی جانب پھیل گئے۔ گبن نے ان کی برق رفتار فتوحات کو فطرت کے ان قدیم زلزلوں سے تعبیر کیا ہے جو کرۂ ارض میں ہلچل پیدا کر کے اس کی سطح کی شکل بدل دیتے ہیں[4] وہ چاہے طاقتور سلطنتیں ہوں یا معمولی ریاستیں سب کی سب ان لشکروں کے آگے دھواں بن کر اڑ گئیں۔ ترکستان کے خوارزم شاہیوں اور عباسیوں جیسے طاقتور اور متمدن سلاطین کا خاتمہ کر دیا گیا، اور آخری خلیفہ المستعصم باللہ روند کر مار ڈالا گیا۔ "تاریخی زمانہ کا کوئی حملہ اپنے تمام ہیبت ناکیوں یا دور رس نتائج کے اعتبار سے منگولوں کے حملہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"[5] انھوں نے آبادیاں نیست و نابود کر دیں اور تہذیبیں مٹا ڈالیں۔

اپنی تاریخ کے ابتدائی زمانے میں منگول[6] خستہ حالی، خانہ بدوشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ مویشیوں اور گھوڑوں کو پالتے تھے اور تہذیب کے ترازو میں بہت ہلکے تلتے تھے۔ ابن الاثیر، جوینی اور شہاب الدین کی ہمعصر تصنیفات نیز کارپینی (Carpini) اور ربر وقس (Rubruquis) کی تصانیف بیان کرتی ہیں کہ منگول "زرد جلد، ابھری ہوئی گالوں کی ہڈیاں، چپٹا چوڑا چہرہ، سیاہ گھونگھریالے بال، ترچھی آنکھیں۔ ----- چھوٹی ٹھوڑی، چوڑے گداز ہونٹ، چمکتی آنکھیں۔ ----- لمبے کان اور گول کھوپڑی رکھتے تھے۔"[7] ان کے ملک کی آب و ہوا نے ان کی جلد کو سنولا دیا اور زرد بنا دیا تھا۔[8] وہ بنیادی طور پر گندی نسل سے تھے۔ مرد شاید ہی کبھی نہاتے ہوں، عورتیں کبھی نہیں نہاتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ منگولوں میں سب سے عام بیماری خارش تھی۔ وہ ہر قسم کا گوشت کھا لیتے تھے اس میں انسانی گوشت بھی شامل تھا۔[9]

---

۴۔ گبن، رومی سلطنت کا عروج و زوال جلد دوم ص ۱۲۶۔

۵۔ سائکس (Sykes)، تاریخ ایران (History of Persia)، جلد دوم ص ۷۰۔

۶۔ وسط ایشیا کے کسی دوسرے قبیلہ کی طرح منگولوں کی ابتدائی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہے۔ منگولوں پر ملاحظہ ہو سر ولیم ڈگلس، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں، چہاردہم طبع، جلد شانزدہم، ص ۱۶۷۔

۷۔ ہوورتھ، منگولوں کی تاریخ (History of Mongols)، جز چہارم ص ۴۲

۸۔ امیر خسرو جو ایک بار ان کے قیدی ہو گئے تھے، منگولوں کی بہت عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔ قِران السعدین

۹۔ پولس کے وِنسنٹ (Vincent of Beauvais) [illegible] کہتے ہیں [illegible] اپنے جانی دشمنوں کا گوشت کھاتے اور خون پی جاتے تھے۔ یول، سر مارکو پولو (Marco Polo) جلد اوّل ص ۳۰۔

کارپینی لکھتا ہے کہ چین میں ایک شہر کے محاصرہ کے دوران جب کہ فوج میں رسد بالکل نہیں رہی تھی۔ ان کی اپنی فوج کے دس آدمیوں میں سے ایک آدمی دوسروں کی خوراک فراہم کرنے کے لئے قربان کر دیا گیا۔

منگول غیر معمولی تضادات کا مجموعہ تھے۔ جب انھیں موقع ملتا تھا تو وہ انتہائی سست اور کاہل بن جاتے تھے لیکن جب انھیں کام کرنے کو کہا جاتا تھا تو وہ بے حد محنت بھی برداشت کر سکتے تھے۔ جب کھانے پینے کی اشیا فراہم ہوتی تھیں تو وہ بڑے پیٹو تھے لیکن وہ کھائے پیے بغیر کئی کئی دن گزار سکتے تھے۔[10] قدرت کی طرف سے انھیں بے حد قوت برداشت ملی تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں چالیس گھنٹے تک گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کر سکتے تھے۔ ورنہ وہ احدی رہنا پسند کرتے تھے۔ منگولوں میں عورتوں کا اخلاق بہت گھٹیا تھا۔ زنا کا رواج عام تھا۔ ماں کا احترام کیا جاتا تھا اور خاص بیوی گھر کا سارا کام کاج انجام دیتی تھی۔[11] عورتیں سخت محنت کرتی تھیں اور سماج میں اچھے مقام کی مالک تھیں۔ وہ گھریلو کام کاج کرتی تھیں مردوں کے ساتھ شکار کو جاتی تھیں حتی کہ میدان جنگ میں لڑتی بھی تھیں۔[12] منگولوں کا خاص مشغلہ جوان کی طاقت اور جوانمردی کا اصل سبب تھا، شکار، فوجی مشقیں اور ہمہ وقت جنگ وجدل تھا۔

وہ عظیم اور ملعون چنگیز تھا جس نے کاہل اور غیر مہذب منگولوں کو ایک جنگجو قوم بنا دیا۔ اس نے اپنی افواج کو انتہائی سخت ضبط کے ساتھ تربیت دی کہ ایک ہی صدی میں منگول ایشیا اور یورپ دونوں جگہ حکومت کرنے لگے۔ اس کے علاوہ چنگیز خان نے منگولوں کو ایک مجموعہ قوانین جو یاسا کے (ترکی) کے نام سے معروف تھا اور کچھ سماجی اصول جو بلاک کے نام سے مشہور تھے عطا کئے۔ یاسا پر بڑی شدت سے عمل ہوتا تھا۔ چنگیز خان کی زندگی ہی میں قتل، زناکاری اور دنا جیسی سماجی برائیاں بہت ہی کم ہو گئی تھیں۔[13]

---

(صفحہ گزشتہ کا باقی)

ڈیورنتھ (جز چہارم ص ۵۰۳) نے منگولوں کی گندی خوراک کا بڑا ہیبت ناک بیان دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کتے، بھیڑیے، لومڑیاں چوہے اور گدھے تک کو کھا جاتے تھے۔

۱۰- کارپینی جس کو منگولوں کے درمیان رہنے کا موقع ملا تھا بھوک کی بے تابی سے مستقل پریشان رہا اور وہ ان کی کفایت شعاری پر بڑا متحیر رہتا تھا۔ پراون (Prawdin) منگول سلطنت، اس کا عروج اور ترکہ (The Mongol Empire, Its Rise and Legacy) ص ۷۴۔

۱۱- ہوورتھ، مذکورہ بالا ص ۴۴۴۔

۱۲- ڈیورنتھ، مذکورہ بالا جز چہارم ص ۴۴۴۔ ہندوستانی مورخین بھی یہی کہتے ہیں کہ منگولوں کے ساتھ ان کی عورتیں لڑنے بھی آتے تھے لیکن ان کے بارے میں یہ ذکر کہیں نہیں ملتا کہ انھوں نے جنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔

۱۳- پراون، مذکورہ بالا ص ۹۰۔

مقرر ہے کہ اس فاتح اور بانی قوانین نے خانہ بدوش منگولوں[14] کی قوت برداشت اور بہادری کے اوصاف کو اچھی طرح استعمال کیا اور ان کو دنیا کے ممتاز ترین جنگجوؤں میں بدل دیا۔

اس طرح چنگیز خان نے مٹی سے ایک قوم اٹھا کھڑی کی۔ اس نے منگولوں کو ایک عظیم سلطنت اور لشکر جرار دیئے جو عمدہ تربیت یافتہ اور فن حرب کے ماہر تھے۔ در اصل اس نے فوجی نیز سماجی زندگی کے تمام شعبوں کو بدل ڈالا اور ان کو از سر نو منظم کیا۔ اس نے ایک جگہ کے باشندوں کو ان کے خیموں کی تعداد کے لحاظ سے تقسیم کیا۔ ابتدائی منگولوں میں قصبوں اور شہروں کا وجود نہیں تھا۔ دس خیموں کے مجموعہ کو آؤل (Aoul) کہا جاتا تھا، دس آؤل کے مجموعوں کو الوس (Ulus) یا اوتاک (Obok) اور ان کے دس کے مجموعوں کو اوبوگ (Obogh) یا قبیلہ کہا جاتا تھا۔ ان کی سماجی زندگی کا یہ نظم ان کی فوجی تنظیم سے ماخوذ تھا۔ منگول فوج کی سب سے چھوٹی اکائی جو دس سواروں (یا فرد) پر مشتمل ہوتی تھی اربان کہی جاتی تھی۔ دس اربان کا ایک دوہ (100) یا ایک صدی دستہ ہوتا تھا۔ دس دوہ ایک منگان بناتے تھے اور دس منگان ایک تومان جو دس ہزار سواروں کا مجموعہ ہوتا تھا اسی کا فارسی مورخین اکثر ذکر کرتے ہیں۔ ایک ایک و تنہا فرد یا دس ہزار سواروں کا گروہ سب کو سخت نگرانی و نگہداشت میں رکھا جاتا تھا۔ ان تمام اکائیوں میں سے ہر ایک پر افسر مقرر ہوتے تھے۔ ابتدائی منگولی فتوحات کے زمانے میں ایک تومان کی قیادت شاہی خاندان کے کسی شہزادے کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔[15] بنیادی طور پر ان کی فوجی تنظیم شہسوار فوج پر مشتمل ہوتی تھی۔ منگولوں کی سب سے بڑی دولت گھوڑا تھا اور ان میں گھوڑے کی چوری سب سے بڑا جرم تھا جس پر موت کی سزا ملتی تھی۔ ایک منگول سپاہی کا سامان حرب ایک نیزہ، دشمن کو گھوڑے سے کھینچ لینے کے ایک کمند، کمان اور تیروں اور ایک

---

۱۴۔ چنگیز خان کہا کرتا تھا کہ "انسان کی سب سے بڑی مسرت اپنے دشمنوں کو شکست دینا، ان کو پسپا کر دینا، ان کے مال و اسباب کو چھین لینا، ان کے چہیتوں کو رلانا، ان کے گھوڑوں پر سوار ہونا اور ان کی بیویوں اور لڑکیوں کو باہوں میں بھر لینا ہے۔" جرمنی بحوالہ ولادی میرتسوف Vladimirtsov حیات چنگیز خان، (The Life of Chingis Khan)، ص ۱۴۔

اس سے ایک خانہ بدوش جنگی سورما کی سیرت کی صحیح عکاسی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خانہ بدوش وحشی ان ترغیبات سے کتنے متاثر ہوئے ہوں گے اور اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے ہوں گے۔

۱۵۔ نیز Petis de la Croix، کی عظیم چنگیزی تاریخ (The History of Chengiz Khan The Great)، ص ۸۱-۸۲۔

اس طرح ہندوستان میں مغل حکمرانوں کے ترقی یافتہ منصب داری نظام کی جڑیں چنگیز خان کی فوجی تنظیم میں پیوست ہیں۔

تلوار پر مشتمل ہوتا تھا۔ منگول سپاہی پیدائشی گھوڑ سوار تھا۔ اعلیٰ تربیت نے اگر کوئی خامی تھی بھی تو اس کی تلافی کر دی تھی چنگیز کے عہد قیام سے سپاہی تربیت شدہ تھا اور وہ مسلسل پیش قدمی کرتے تھے اور صرف جنگ میں ہی شکست ہوتی کبھی ہوتی تھی۔[۱۴۴] تیر اندازی میں مہارت پانے کے سوا ہر نوع کی جنگیں ہوتی تھیں۔

بہر حال منگول فوج کی ایک بڑی خصوصیت تھی چونکہ منگولوں کے پاس کوئی تیز ترین ہونے والا نہیں ہوتا تھا اس لئے ان کی فوجیں بھاری نہیں ہوتی تھیں۔ ان کا سامان جنگ صرف ضروری اشیاء پر مشتمل ہوتا تھا اور وہ اپنے ساتھ سازوسامان لے کر نہیں چلتے تھے۔ وہ نمدہ کے خیموں میں رہتے تھے۔ جو سب کے سب ہلکے پھلکے ہوتے تھے اور ان کو تھیلوں کی شکل میں کسی وقت بھی اکھاڑا جا سکتا تھا۔

تلوار، تھیلے اور ہلکی فوج کا سامان ہندوستان تک نہیں ہوتا تھا[۱۴۵] فوجی حکمت عملی کا ایک جدید عالم سپاہی ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے فن حرب کی خصوصیات کو جس طرح سمجھا تھا ان کی مواقع جنگ کے مطابق فن جنگ کی مہارت انتہائی تھی کہ فوجی حکمت عملی کا اس سے بڑا تصور غیر ضروری ہو گیا تھا۔[۱۴۶] یہ جو جوینی لکھتا ہے کہ منگول ہر وقت جنگ کے لئے تیار ہو کر آتے تھے بعض اوقات ایک ہی رات میں غائب بھی ہو جاتے تھے۔ ان کی فوج حرکت پذیر تھی یہ منگول فوج کی تیز رفتاری ہی سب سے اہم تھی۔ وہ کیا اپنے حملہ ور کیا اچانک پیچھے لوٹ کر ان کے تعاقب کرنے والوں سے زیادہ اپنے گھوڑوں کو تیز دوڑا دیتے تھے۔ اگر تعاقب کرنا ہوتا ہی تو وہ بھاگتے بھاگتے اپنے گھوڑوں کے اوپر سے پیچھے کی طرف تیر اندازی کرتے جاتے تھے اور ایسا تعاقب کرنے والوں کو سخت نقصان پہنچاتے تھے۔ وہ مصنوعی طور پر پسپا ہونے چھاپہ مارنے اور اچانک حملہ کرنے کے فن کو خوب سمجھتے تھے اور چونکہ انہوں نے بہت سی قوموں سے مسلسل جنگیں کی تھیں جو فن حرب کے مختلف طریقے اختیار کرتی تھیں اس لئے تجربہ نے ان کو ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔[۱۴۷] مارکوپولو تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ منگول اپنی فتوحات کے دوران کبھی خوف و فقری کا شکار نہیں ہوتے بلکہ وہ برابر دشمنوں کے آگے گھوڑوں پر سوار رہتے اور ان پر تیروں کی بارش کر کے دبتے تھے اور چونکہ وہ جنگ میں فرار کو شرمناک نہیں سمجھتے تھے لہٰذا وہ کبھی کبھی فرار ہونے کا بہانہ کرتے تھے لیکن پھر وہ اچانک مڑتے تھے

---

۱۴۴۔ جہاں کشا جوینی، حصہ اول، ص ۲۲۳۔

۱۴۵۔ تاریخ رشید الدین، مقدمہ، جلد سوم، ص ۵۹۔

۱۴۶۔ کیپٹن لڈل ہارٹ، [illegible]؛ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، جلد ۱۲، ص ۵۰۷-۵۰۵۔

۱۴۷۔ مارکوپولو، جلد اول، ص ۲۶۵۔

اور کامل نظم و نسق کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے اور دشمن کے پیر اکھاڑ دیتے تھے۔[20]

فتح کے بعد منگولوں کی غارتگری کی کوئی حد نہیں تھی۔ ماوراء النہر کے اہم شہروں کی مکمل تباہی ان لٹیروں کی بہیمانہ سفاکی کا واضح ثبوت ہے۔" ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ شہروں کو صحرا بنا دیں اور کسی انسان کو نہ چھوڑیں جو ان کے پیچھے سر اٹھا سکے۔ اپنے قتل عام کی سفاکیوں کے ذریعہ جن میں عمر، صنف اور حالات کا قطعی خیال نہیں رکھا جاتا تھا انھوں نے خوف اور دہشت اپنے چاروں طرف پھیلا دی تھی۔[21] ایک موقعہ پر انھوں نے ایک آدمی کے کانوں میں پگھلی چاندی ڈال کر مار ڈالا۔ اور بخارا، سمرقند اور بلخ کی تباہی کے دوران انھوں نے ایسے ایسے جرموں کا ارتکاب کیا جن کا مشکل ہی سے تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ جوینی بیان کرتا ہے کہ ترمذ کی تباہی کے دوران ایک گرفتار شدہ عورت نے رحم کی درخواست کی اور اس آدمی سے وعدہ کیا جو اسے مارنا چاہتا تھا کہ وہ اسے ایک قیمتی ہیرا دے گی جو اس نے نگل لیا ہے۔ خون آشام منگول نے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور چونکہ ہیرا سچ مچ اس کے پیٹ میں پایا گیا تھا لہٰذا فوری طور پر حکم نافذ کیا گیا کہ لاشوں کے پیٹ چاک کر کے ان کا معاینہ کیا جائے۔ ان میں کسی شخص کی ریڑھ کی ہڈی توڑ کر مار ڈالنا عام طریقہ تھا۔ جنگی قیدیوں سے منگول سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ صحت مند قیدیوں کو سخت کام کے لئے اور حملہ آور دستوں کے لئے بطور سپر استعمال کیا جاتا تھا۔ عورتیں فتح کا انعام سمجھی جاتی تھیں۔ یورپی ممالک میں ان کے حملوں کی دہشت اس قدر تھی کہ ابھی کچھ مدّت پہلے تک مشرقی یورپ کے بعض گرجا گھروں کی دعاؤں میں یہ دعا بھی شامل تھی کہ "خداوندا تاتار کے قہر سے ہمیں محفوظ رکھ۔"[22]

تیرھویں اور چودھویں صدی میں منگولوں نے بحر اسود سے بحر چین تک اور سائبیریا سے دریائے سندھ اور سیستان تک اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔ وہ یا تو آپس ہی میں دست و گریباں رہتے تھے یا لوٹ مار اور فتح کی امید میں غیر علاقوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ ان افواج کی تعداد میں جو "چھوٹیوں اور ٹولیوں"

۲۰- ہوورتھ، مذکورہ بالا، جزو چہارم، ص ۸۵-۸۴-

۲۱- ولیم ارسکن، بابر و ہمایوں کی تاریخ (History of Babar & Humayun)، جلد اوّل، ص ۱۲-

۲۲- بہرکیف یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ منگولوں کی بہیمانہ سزائیں جن کو ایشیا کے مسلمان مورخین بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں اس زمانے میں عام تھیں۔ علاء الدین خلجی نے شکست خوردہ منگولوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اس سلوک سے کسی لحاظ سے بہتر نہیں تھا جو وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ اپنی وحشیانہ سزاؤں کے باوجود منگول دوسری اقوام کے مذہب کے معاملے میں رواداری تھے اور مذہبی اختلافات ان کو بہیمانہ جرائم کرنے پر نہیں اکساتے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو سائکس، مذکورہ بالا، جلد دوم، ص ۱۷-

کے ٹڈی دل کی طرح فتح کرنے کے لیے نکلتی تھی۔ ان کے حملہ کا نشانہ بننے والوں کے خوف اور ان کے شعراء و مورخین کی مبالغہ آرائی کی وجہ سے کئی گنا اضافہ ہوجاتا تھا التتمش کے عہد سے جلال الدین خلجی کے زمانے تک ہندوستان کے حکمرانوں کو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنی پڑیں۔ لیکن بے فائدہ۔ یہ سہرا علاءالدین ہی کے سر ہے کہ اس نے اس ملک پر ہونے والے بعض انتہائی خطرناک حملوں کو کامیابی کے ساتھ پسپا کر دیا۔

بہر حال ان حملوں پر بحث کرنے سے وسطی ایشیا کی معاصر تاریخ پر ایک نظر ڈالنا بہتر ہوگا تاکہ ہندوستان پر اتنے حملوں کے پیچھے پائے جانے والے اسباب کا جائزہ لیا جائے۔ چنگیز خان کا ۱۲۲۷ء میں انتقال ہوگیا۔ اس کی موت کے بعد سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ اوغتائی خان اعظم بن گیا اور چین اور منگولیا کے علاقے جس کے حقیقی حدود بعد میں وجہ اختلاف بنے اس کو ملے۔ جوجی جو کہ چنگیز کی زندگی ہی میں مرگیا تھا، کے اخلاف کو قپچاق کی حکومت ملی اور تولی کو منگولستان کے وطنی قبائل پر اقتدار ملا۔ چغتائی کو ماوراءالنہر پر حکومت کرنی تھی اور تولی کے بیٹے اور چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے ایران کے ایلخانی حکمرانوں کے خاندان کی بنا ڈالی۔ ۱۲۴۲ء میں تولی کے بیٹے منگو خان نے اوغتائی کے بیٹے کیوک کو سلطنت سے نکال باہر کیا اور خود خان اعظم بن بیٹھا اور اوغتائی اور تولی کے حکمرانوں کے درمیان ایک خاندانی جنگ شروع ہوگئی[۲۳]۔ منگو ۱۲۵۹ء میں مرگیا اور تخت شاہی پر اس کا جانشین مشہور قبلائی خان ہوا جو تولی کا دوسرا بیٹا تھا۔ قبلائی کا جانی دشمن قیدو تھا جو اوغتائی کا پوتا تھا اور جس نے اپنے آبائی علاقوں پر تولی کی اولاد کے دعووں کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ قیدو کو ماوراءالنہر کے حکمران دوا خان میں ایک وفادار حلیف مل گیا۔ دوا چغتائی کی اولاد میں سے تھا۔ چغتائی ۱۲۴۱ء میں مرچکا تھا اور اس کا جانشین اس کا پوتا قرا ہلاگو ہوا تھا۔ اس نے ۱۲۴۵ء تک حکومت کی۔ اس کی موت کے بعد عظیم قبلائی خان نے قرا ہلاگو کے بیٹے مبارک شاہ کو ماوراءالنہر کا حکمران مقرر کیا۔ لیکن اس کو چغتائی کے ایک پڑپوتے شہزادہ بورک نے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد تخت شاہی پر نکاتیمور رونق افروز ہوا جس کو بالآخر بورک کے بیٹے دوا نے نکالا۔ دوا نے قیدو کی معاونت سے مشرق میں قبلائی اور اس کے وارثوں سے اور مغرب میں ایل خانیوں سے جو دونوں کے دونوں تولی کے خاندان سے تھے مسلسل نبرد آزمائی کی۔

اس وقت ہمارا ان دو گھرانوں، ایران کے ایل خانیوں اور ماوراءالنہر کے چغتائیوں سے سب سے زیادہ تعلق ہے۔ کیونکہ وسط ایشیا میں جب کبھی ان کو اپنی خاندانی جنگوں سے ذرا بھی فرصت ملتی تھی، تو

---

۲۳۔ رشیدالدین، جامع التواریخ، طہران متن ص ۱۳۲-۳۲۔

وہ ہندوستان پر حملہ کر دیتے تھے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کی طرف بھیجی جانے والی تمام منگول مہمیں یا تو ایران سے بھیجی گئی تھیں یا ماوراءالنہر سے۔ دونوں حکمرانوں میں سے ہر ایک دوسرے کا علاقہ چھین لینا چاہتا تھا۔ اور داوا خان جو اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بدقسمت رہا تھا ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس ملک میں برابر مہمیں بھیجتا رہا۔ ایران کے ایل خانیوں میں علاءالدین کے معاصر غازان خان (۱۲۹۴-۱۳۰۴ء) اور اس کا بھائی سلطان بندہ الجائتو (۱۳۰۴-۱۳۱۶ء) تھے اور ماوراءالنہر میں اس کے ہمعصر داوا خان (۱۲۷۲-۱۳۰۶ء) اور اس کے بیٹے کوندجک (کیوک) کُبک اور تالکو تھے۔ مرکزی علاقہ میں علاءالدین کے ہمعصر خان اعظم الجائتو (۱۲۹۴-۱۳۰۷ء)، کُلُک (۱۳۰۷-۱۳۱۱ء) اور بوینتو (۱۳۱۱-۱۳۲۰ء) تھے۔[۲۴]

داوا ہندوستان کا پکّا دشمن تھا اور وہ ایل خانیوں سے غزنی کو چھیننے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہندوستان کے خلاف حملوں کے لئے اس کو اس نے مرکز بنا لیا تھا۔ اس نے پینتیس سال تک حکومت کی جب تک وہ زندہ رہا وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے فوجیں بھیجتا رہا۔ ہندوستان پہلے ہی منگول حملوں کا مزا چکھ چکا تھا۔ ۱۲۲۱ء میں جب چنگیز خان سندھ کے کنارے تک آیا تھا اس وقت سے ہندوستان کے سیاسی افق پر منگول حملہ کا خطرہ برابر منڈلاتا رہا تھا۔ ۱۲۴۱ء، ۱۲۴۶ء، اور ۱۲۵۷ء کے حملوں کے سلسلہ میں افغانوں نے ہندوستان میں فوج کشی کے فوائد سمجھ لئے تھے اور ترکوں کے روایتی دشمن کھوکھروں نیز بعض غیر مطمئن دہلی کے امراء نے ان کو تعاون دیا تھا اور منگولوں نے پنجاب میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے۔ ۱۲۸۵ء میں ایران کے ایل خان ارغون نے (۱۲۸۴-۱۲۹۱ء) نے اپنی فوجیں ہندوستان بھیجی تھیں اور اس ملک میں یہ حملہ مدّتوں تک یاد رکھا گیا کیونکہ اسی میں سلطان بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد میدان جنگ میں مارا گیا تھا اور امیر خسرو قید کر لئے گئے تھے۔ بلبن کے عہد حکومت کے خاتمہ پر پنجاب میں سلطنت دہلی کی حدود تقریباً دریائے راوی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ جلال الدین کے عہد حکومت میں منگولوں نے ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، سلطان ان کو مکمل شکست نہیں دے سکا بلکہ اس نے توہین آمیز صلح کر لی۔ لیکن اگر ان کا موازنہ ان حملوں سے کیا جائے جن سے علاءالدین کے عہد حکومت میں سابقہ پڑا تھا تو یہ سب معمولی حملے تھے۔ ہندوستان کی خوش نصیبی تھی کہ اس ملک پر سخت ترین حملے اس زمانے میں ہوئے جب علاءالدین جیسا ایک طاقتور بادشاہ یہاں کا حکمراں تھا۔

---

۲۴۔ لین پول مسلم خاندان (Mohammadan Dynasties)۔ ص ۲۱۵۔

## پنجاب پر کادر کا حملہ

علاء الدین کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد ہی منگولوں کا پہلا حملہ ۹۸-۱۲۹۷ء میں ہوا۔[25] ماوراء النہر کے حکمران داؤد نے کادر کے زیر قیادت ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج بھیجی۔ حملہ آور شمال مغرب سے ملک میں گھس آئے، انھوں نے کھوکھروں کے شہر جلا کر راکھ کر ڈالے، پنجاب کے میدانوں میں آئے اور لاہور کے مضافات کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔ حسب دستور ان کے حملہ آوروں نے لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر دی اور علاء الدین نے اپنے جنرلوں الغ خان اور ظفر خان کے زیر کمان ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ جالندھر[26] کے قریب شاہی افواج اور منگولوں کے درمیان ایک معرکہ ہوا جس میں حملہ آوروں کو شکست فاش ہوئی۔ ان کے بیس ہزار[27] سپاہی میدان جنگ میں کھیت رہے اور ان کے افسروں کی ایک بڑی تعداد قیدی بنالی گئی۔ ان کو بڑی بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ الغ خان نے جنگ میں پکڑے جانے والے عورتوں اور بچوں اور مارے جانے والے منگولوں کے سروں کے ساتھ فتح نامہ سلطان کی خدمت میں بھیجا۔

علاء الدین کی تخت نشینی کے ابتدائی ایام میں اس فتح نے اس کے وقار میں بہت اضافہ کیا۔ اور تخت پر اس کے دعوے کو مزید استحکام بخشا۔

## سیوستان سے سلدی کا اخراج

۱۲۹۹ء میں جب الغ خان اور نصرت خان گجرات کی فتح میں مشغول تھے سلدی کے زیر کمان منگول ایک بار

---

۲۵- برنی ۶۹۷ھ تاریخ بیان کرتا ہے۔ فرشتہ میں بھی ۶۹۷ھ ہے لیکن امیر خسرو بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں فوجوں کا تصادم ۲۲ ربیع الآخر ۶۹۷ھ (۶ فروری ۱۲۹۸ء) کو ہوا۔ برنی کے بیان سے یہ صاف نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ حملہ ملتان کی فتح کے بعد کسی وقت واقع ہوا۔ برنی اس مہم کے قائد کے نام کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ عصامی اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتا۔ برنی، ص ۲۵۰؛ خزائن، ترجمہ حبیب ص ۲۳؛ فرشتہ ص ۱۰۲۔

۲۶- امیر خسرو اس مقام کا نام جارن منجور بتاتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ یہ جنگ دریائے ستلج کے کنارے کے قریب لڑی گئی، دیول رانی، ص ۶۰۔ برنی قطعی طور پر کہتا ہے کہ یہ جنگ جالندھر کے مضافات میں لڑی گئی جو دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیان واقع ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ وہ لاہور کے قریب لڑی گئی تھی جس سے جالندھر بھی مراد ہو سکتا ہے۔ دیول رانی، ص ۶۰؛ برنی ص ۲۵۰؛ فرشتہ ص ۱۰۲۔ پروفیسر چودھری والا تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں کہ وہ جگہ جہلی واقع ہے، جو لدھیانہ سے ۷ میل کی مسافت پر واقع ہے لیکن برنی کے جالندھر کے بیّن ذکر سے اختلاف کرنا مناسب نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو چودھری والا، ص ۴۷-۲۴۶۔

۲۷- خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۲۴؛ فرشتہ، ص ۱۰۲ میں بارہ ہزار ہے۔

پھر ہندوستان کی سرحدوں پر نمودار ہوئے۔ اس حملہ کو برنی، عصامی اور فرشتہ نے بیان کیا ہے لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ امیر خسرو نے اس کا بالکل ہی ذکر نہیں کیا ہے۔ ضیاء برنی کے مطابق سلدی اور اس کے بھائی نے ملک کے شمالی مغربی حصہ پر حملہ کیا اور سیوستان پر قبضہ کر لیا[۲۸]۔ سلطان علاء الدین نے ظفر خاں[۲۹] کو سیوستان کی جانب تیز رفتاری سے کوچ کرنے، قلعہ کا محاصرہ کرنے اور حملہ آوروں کو نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔ جلد ہی منگولوں کو شدید محاصرہ کا سامنا کرنا پڑا اور اگرچہ انھوں نے شاہی فوج پر برابر تیروں کی بارش کی لیکن ظفر خاں جس نے منجنیق یا دوسرے آلات حرب تک[۳۰] استعمال نہیں کئے ان کو جلد ہی مغلوب کر لیا۔ بہادر جنرل دونوں جنس کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ دہلی آیا۔ سلدی اور اس کا بھائی بھی گرفتار شدگان میں شامل تھا۔

اس حملہ کو بیان کرتے ہوئے فرشتہ کہتا ہے کہ ماوراء النہر کے داوا خان اور اس کے بھائی چلدی (سلدی) نے سیوستان پر قبضہ کر لیا۔ برنی جنرل کا نام ذکر نہیں کرتا ہے صرف "سلدی اور اس کا بھائی" کہتا ہے۔ داوا وسط ایشیا کی سیاست میں الجھا ہوا تھا اور اس نے سیوستان جیسی چھوٹی مہم پر ایک یا دو جنرلوں کو ہی بھیجا تھا۔ مزید برآں داوا ایسا آدمی نہیں تھا جو بہت سخت مزاحمت کئے بغیر گھٹنے ٹیک دیتا لیکن سیوستان میں ہونے والی مزاحمت برائے نام تھی۔ بعد میں برنی اور فرشتہ کہتے ہیں کہ سلدی اور اس کے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ کسی مورخ نے ان کے انجام کا ذکر نہیں کیا لیکن یہ ذہن میں رکھا جائے کہ علاء الدین ریاست کے دشمنوں کو کبھی نہیں چھوڑتا تھا تو ان کے انجام کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن داوا ماوراء النہر میں ۱۳۰۶ء تک زندہ تھا لہٰذا فرشتہ کا یہ قیاس غلط ہے کہ سلدی کے ساتھ دوسرا جنرل اس کا بھائی داوا تھا۔ اس کے علاوہ تمام مورخین سلدی اور اس کے بھائی کا ذکر کرتے ہیں اور داوا کا نام نہیں لیتے ہیں۔ اگر ماوراء النہر کا حکمراں داوا سلدی کے ساتھ ہوتا تو اس کا نام زیادہ ممتاز ہوتا[۳۱]۔

---

۲۸۔ سیوستان سے سندھ کا شمال مغربی حصہ مراد ہے جس کو سہوان کہا جاتا ہے۔

۲۹۔ میر معصوم کا بیان غلط ہے کہ نصرت خان نے جس کو ارکلی خان کی شکست کے بعد سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، منگولوں کے خلاف پیش قدمی کی اور ان کو شکست فاش دی۔ نصرت خان اس وقت گجرات میں مشغول تھا۔ تاریخ معصومی، ص ۴۴-۴۳۔

۳۰۔ برنی، ص ۲۵۳۔

۳۱۔ فرشتہ، ص ۱۰۳؛ برنی، ص ۵۴-۲۵۳؛ فتوح، ص ۲۴۱۔

جس آسانی کے ساتھ ہزبرالدین ظفر خان نے یہ فتح حاصل کی تھی اس نے لوگوں کی پسندیدگی کو مگر سلطان کے حسد کو ہوا دی۔ علاء الدین اس بہادر جنرل کی جرأت، شجاعت اور سوجھ بوجھ پر سخت متعجب ہوا۔ وہ اس کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اس کا بھائی الغ خان بھی ظفر خان کے خلاف اسی قسم کے جذبات رکھتا تھا۔ کیونکہ منگولوں کے خلاف ظفر خان کے کارناموں نے ملتان اور گجرات میں الغ خان کی کامیابی کو ماند کر دیا تھا۔ اس وقت ظفر سامانہ کا گورنر تھا اور زیادہ تر وہیں رہتا تھا کیونکہ مغرب میں منگول مسلسل خطرہ کا سرچشمہ تھے۔ علاء الدین نے سوچا کہ یا تو اسے دربار میں واپس بلا لے تاکہ وہ مسلسل اس کی خدمت میں حاضر رہے یا اس کو بنگال کے دور دراز علاقے کی طرف بھیج دے تاکہ وہ اس کو فتح کر کے وہاں حکومت کرے۔[42] کینہ پرور سلطان اس حد تک آمادہ تھا کہ اس کو اندھا کر دے یا زہر دے دے لیکن سیاسی حالات نے ایک نئی کروٹ لی جس سے اس کا مقصد کم شقاوت اور زیادہ سہولت اور فطری انداز میں حاصل ہو گیا۔

## قتلغ خواجہ کا حملہ

۱۲۹۹ء کے تقریباً آخر میں داوا خان[43] کے بیٹے قتلغ خواجہ نے سیوستان[44] میں منگولوں کی توہین آمیز شکست کا انتقام لینے کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے ماوراء النہر سے کوچ کیا۔ یہ قدرتی بات تھی کہ قتلغ خواجہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا اور اس مرتبہ وہ ہندوستان کی فتح کا عزم مصمم رکھتا تھا۔ دو لاکھ سوار فوج اس کے ساتھ تھی۔ حملہ آور افواج نے دریائے سندھ عبور کیا اور ملتان اور سامانہ جیسی سرحدی چوکیوں کے کمانداروں کی جانب سے پریشان کئے جانے کے باوجود انھوں نے اپنے راستہ میں پڑنے والے دیہاتی علاقوں کو تاراج کئے بغیر تیز رفتاری کے ساتھ دہلی

---

۴۲۔ اس بیان سے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ (۱) یہ کہ علاء الدین کا بنگال پر کوئی اقتدار نہیں تھا (۲) یہ کہ بنگال سلطنت کے زمانے میں بھی ایک تعزیری صوبہ تھا جیسا کہ مغل شہنشاہوں کے زمانے میں تھا۔ برنی ص ۲۵۴۔

۴۳۔ برنی میں ہے "قتلغ خان پسر زدو العین" (قتلغ خان ولد زدو العین)۔ لعین کا مطلب ہے ملعون۔ لیکن علاء الدین کے زمانے میں ماوراء النہر میں زدو یا زدوا نام کا کوئی بادشاہ نہیں تھا۔ لہذا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الفاظ "پسر دو العین" (دوا یا داوا ملعون کا بیٹا) ہیں۔ داوا چنگیز خان کے براہ راست اولاد میں تھا۔ ابوالفضل اس کا شجرۂ نسب اس طرح دیتا ہے: داوا خان، ابن براق خان ابن یسو توا ابن ماوتکان ابن چغتائی ابن چنگیز۔ اکبرنامہ، بیورج، جلد اول، ص ۲۰۲۔

۴۴۔ امیر خسرو اس حملہ کا ذکر خزائن میں نہیں کرتے ہیں لیکن وہ دیول رانی (ص ۶۲) میں اس کی جانب ایک معمولی اشارہ کرتے ہیں۔ منگول حملہ آوروں کی مذکورہ بالا تعداد برنی نے بیان کی ہے لیکن ایک دوسری جگہ وہ اس فوج کی تعداد ایک لاکھ بیان کرتا ہے۔ برنی ص ۲۵۹، ۲۵۴۔

کے قریب پہنچے۔ شاہی سپاہی دن میں اپنی کمین گاہوں میں چھپ رہتے تھے مگر رات میں نکل آتے تھے اور حملہ آوروں کے بازوؤں کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے لیکن منگول ان تدبیروں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے کیونکہ وہ دہلی میں آخری جنگ کے لئے اپنی تمام طاقت بچا رکھنا چاہتے تھے۔ منگولوں کی تیز رفتار پیش قدمی کی وجہ سے راجدھانی نیز قرب وجوار کے اضلاع کے لوگ دہشت زدہ ہوگئے اور اس سے اور بھی خوفزدہ ہوئے کہ اس بار دشمن کی منزل خود دہلی تھی۔ دور اور نزدیک سے ہر شخص نے راجدھانی کا رخ کیا۔ شہر میں لوگوں کا اس قدر اژدہام ہوگیا کہ سڑکوں پر، بازاروں میں اور مسجدوں میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی[35]۔ معاملات اور بھی سنگین ہوگئے کیونکہ منگولوں نے جو کہ شہر کے مضافات میں منڈلا رہے تھے، شہر میں کاروانوں اور بنجارہ تاجروں کی آمد روک دی۔ دہلی کے باشندوں کو انتہائی مشکل کا سامنا تھا کیونکہ چیزوں کی قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں[36]۔

علاء الدین کو جس لمحہ حملہ کی خبر ملی اس نے صوبائی گورنروں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ راجدھانی کو کمک بھیجیں۔ اس عظیم مسئلہ پر زیادہ غور کئے بغیر جس کا اسے اس وقت سامنا تھا اس نے حملہ آوروں سے نبرد آزما ہونے کے لئے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ کوتوالِ دہلی ملک علاء الملک نے جو منگولوں کے زبردست ساز و سامان اور ان کے مقصد سے پوری طرح واقف تھا سلطان کو جلد بازی سے قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ اس نے کہا کہ "قدیم بادشاہ عام طور سے ایسے خطرناک معرکوں سے پہلو بچاتے تھے۔ جن کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ فتح کس کے قدم چومے گی۔ برابر کے طاقتور حکمرانوں کے درمیان واقع ہونے والی جنگ کے معاملہ میں جب کہ سلطنت محض بساط کی ایک چال پر خطرہ میں پڑ سکتی ہے، بادشاہوں نے انتہائی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے اور جنگ سے اس وقت تک دامن بچایا ہے جب تک ممکن ہوا۔ تو عالیجاہ کیوں برضا و رغبت اور بغیر کسی سوچ بچار اور غور و فکر کے ایک خطرناک آفت میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں؟۔ آپ ان منگولوں سے نبرد آزمائی میں تاخیر کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ہماری فوج بنیادی طور پر ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل ہے جنھوں نے صرف ہندوؤں سے لڑنے میں اپنی زندگی گذاری ہے، منگولوں سے کسی جنگ میں ان کا سابقہ نہیں پڑا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان کے مکر و فریب سے، سادے فوجی تدابیر کے نظام سے ان کے حملوں سے، ان کی گھاتوں سے اور دوسری حربی تدابیر سے ناواقف ہیں[37]"۔ ملک علاء الملک نے اپنی

---

۳۵- برنی، ص ۲۵۵-

۳۶- ایضاً، ص ۲۵۵-

۳۷ ایضاً، ص ۵۷-۲۵۵-

تقریر جاری رکھی جس میں اس نے جنگ کو معرض التوا میں رکھنے کے فوائد بادشاہ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ دشمن کے پاس سامان رسد کی کمی ہو جائے اور جب وہ غذا اور چارہ کی تلاش میں نکلے تو پھر اس کا تعاقب کیا جائے۔ کوتوال کی تقریر کا آخری حصہ موقع کی اہمیت کی نزاکت ظاہر کرتا ہے۔ منگول نہ صرف دہلی پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر کے آئے تھے بلکہ وہ غذا اور چارے کی وافر مقدار بھی اپنے ساتھ لاتے تھے جو کچھ عرصہ کے لئے کافی ہوتی تاکہ ان کے حصول میں ان کو اپنی قوت خواہ مخواہ ضائع نہ کرنی پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دہلی کے اطراف میں بھی لوٹ مار نہیں کی۔ اپنی مرکزی فوج سے ایک درجن سپاہی بھی الگ کئے بغیر وہ اپنی پوری متحدہ قوت کے ساتھ جنگ کے لئے پوری طرح تیار ہندوستان کے پایۂ تخت کے سامنے جمے کھڑے تھے۔

علاء الدین تجربہ کار کوتوال کے پختہ مشورہ پر ہمیشہ کان دھرتا تھا لیکن اس موقع پر اس نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے فوج کے تمام اعلیٰ افسروں کو جمع کیا اور ان کی موجودگی میں اس نے علاء الملک سے خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ منگولوں کی طرف دشمنی کا رویہ اختیار کرنا اور پھر ان سے جنگ کرنے سے گریز کرنا بے معنی ہے۔ اگر وہ حملہ آوروں سے نبرد آزما ہونے سے کتراتے تو وہ دہلی پر اقتدار اعلیٰ کیسے قائم رکھ سکتا ہے؟۔ اگر وہ اپنے آپ کو ایک اونٹ کے پشت کے پیچھے چھپا لے تو اس کے معاصرین اور حریف کیا کہیں گے جو اس سے لڑنے کے لئے دو ہزار کوس چل کر آئے ہیں؟[38]۔ اور بعد کی آنے والی نسلیں اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گی؟ اگر وہ بزدلی کا مجرم بنا اور منگولوں کو حکمت عملی اور گفت و شنید کے ذریعہ واپس کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو اپنا منھ کیسے دکھائے گا یا شاہی حرم میں کیسے داخل ہوگا؟ آخر میں سلطان نے زور دے کر کہا "کچھ بھی ہو میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کل کیلی کے میدان کی طرف پیش قدمی کروں گا۔ اور قتلغ خواجہ سے جنگ لڑوں گا۔۔۔۔[39] اے علاء الملک تجھ کو میں نے کوتوال کا منصب عطا کیا ہے، اور اپنے حرم شاہی، اپنے خزانے اور پورا شہر تیرے حوالے کیا۔ ہم دونوں میں جو کوئی بھی وہ یا میں فتح حاصل کرے تو دروازوں کی کنجیوں اور خزانوں سمیت فاتح کا خیر مقدم کرنا اور ان کو اس کے قدموں میں ڈال دینا اور اس کا وفادار نوکر اور خادم بن کر رہنا"[40]

---

۳۸- اس گفتگو کے دوران برنی نے اس فقرہ کو کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ کسی اونٹ یا اس کے کوہان (کوہان شتری) کے پیچھے چھپ جانے کا سیدھا سادا مطلب ہے جنگ سے گریز کرنا۔

۳۹- فتاوائے جہانداری میں برنی سلطان کے رویہ کی تعریف کرتا ہے اور اپنے چچا علاء الملک کے مشورہ پر تنقید کرتا ہے اگرچہ وہ ان کا ذکر ان کا نام لے کر نہیں کرتا ہے۔ فتاوائے جہانداری ص ۷۷-۷۶

۴۰- برنی، ص ۲۵۸-

اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کر کے جو ایک سیاستدان اور جنگجو سورما کے شایان شان تھا علاء الدین نے اپنی افواج کے ساتھ پیش قدمی کی اور کیلی[41] میں خیمہ زن ہوا جہاں مقابل سمت میں قتلغ خواجہ سپاہیوں کی صف بندی کر چکا تھا۔

کیلی میں ہندوستانی فوج بہت محفوظ مقام پر خیمہ زن ہوئی تھی۔ ایک جانب وہ جمنا سے اور دوسری جانب کانٹوں اور جھاڑیوں کی کثرت کی بنا پر حملہ سے محفوظ تھی[42]۔ علاء الدین نے اپنی فوج کی صف بندی روایتی طریقے سے کی۔ سامانہ، پنجاب اور ملتان کے گورنر ہزبر الدین ظفر خان کو میمنہ کی کمان سونپی۔ اس کے ساتھ ہندوستان کے بعض راجہ جو کہ تجربہ کار جنگجو سپاہی تھے شامل کر دیئے گئے۔ الغ خان کو میسرہ پر تعینات کیا گیا تھا اور اس کو حکم دیا گیا تھا کہ دوران جنگ جس کسی بازو میں وہ کمزوری کے آثار پائے تو اس کی مدد کو پہنچے۔ بادشاہ نے نصرت خان اور بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ قلب کی کمان سنبھالی[43]۔ دشمن کے زبردست حملہ کے پیش نظر بطور ایک حفاظتی دیوار کے ہر دستہ کے سامنے بائیس ہاتھی تعینات کئے گئے۔ اس طرح اپنی فوجوں کی صف بندی کرنے کے بعد سلطان نے بنفس نفیس پوری فوج کا معائنہ کیا اور حکم صادر کیا کہ اس کے احکام کے بعد کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے[44]۔

حملہ آور نے بھی اسی انداز سے اپنی فوج کو ترتیب دیا۔ قتلغ خواجہ قلب میں تھا اور ہجلک اور تمر بغا بالترتیب میسرہ اور میمنہ کی کمان کر رہے تھے۔ ایک اور منگول جنرل طرغی نے ایک اہم دستہ کی قیادت سنبھال رکھی تھی۔ ایسا کیلیہ، کیجیا اور اُتنہ بھی منگول فوج میں اہم مورچوں پر تعینات کئے گئے[45]۔ ظفر خان دشمن سے لڑنے کے لئے اس قدر بیقرار تھا کہ منگولوں کے دہلی پہنچنے سے قبل ہی اس

---

۴۱۔ کیلی دہلی کے شمال میں واقع ہے اور اس سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ کین (Keene) تاریخ ہند، (History of Hindustan)، جلد اوّل، ص ۶۷؛ تھامس، کرونیکلز، ص ۱۶۷۔

۴۲۔ فتوح، ص ۲۴۹۔

۴۳۔ فتوح، ص ۲۵۰؛ فرشتہ، ص ۱۰۴۔

۴۴۔ فرشتہ، ص ۱۰۳ کے مطابق شاہی فوج تین لاکھ سواروں اور دو ہزار سات سو ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر سلطان کے پاس اس قدر فوج تیار ہوتی تو اسے اس حملہ کے سلسلہ میں اس قدر تشویش لاحق نہ ہوتی۔

۴۵۔ فتوح، ص ۲۵۰-۲۴۶۔ عصامی اس حملہ کا سب سے مفصل بیان دیتا ہے۔

نے قتلغ خواجہ کو ایک نجی پیغام میں دعوت مبارزت دی تھی۔[۴۶] اب اس نے اپنے سپاہیوں کو منگول میسرہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا اور حملہ کر دیا۔ ہجلک اور اس کے سپاہی ظفر خان کے سپاہیوں سے دست بدست جنگ میں مشغول رہے۔ ظفر خان کے بیٹے دلیر خان نے منگولوں پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ ان میں افراتفری پھیلا دی۔ ہجلک اس حملہ کی تاب نہ لا سکا اور پسپا ہو گیا۔ شکستہ اور ہزیمت خوردہ منگول فوج کا شاہی سپاہیوں نے زبردست تعاقب کیا لیکن تمر بغا کے سپاہی اپنا تعاقب کرنے والوں پر برابر تیر برساتے رہے، یہ ایک ایسی حربی تدبیر تھی جس کے وہ زبردست ماہر تھے۔ شاہی فوج کے قلب پر دشمن کے حملہ کا سلطان نے مقابلہ کیا، اس کو پسپا کر دیا اور اس کی ایک بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔[۴۷] اس مقابلہ میں بادشاہ نے ہندوستانی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو آزاد کرا لیا جن کو منگولوں نے بطور جنگی قیدی گرفتار کر رکھا تھا۔

## ظفر خان کی موت

بہرحال میمنہ پر منگول تجربہ کار جنرل ہجلک جو واپس پلٹ پڑا تھا ظفر خان پر سخت دباؤ ڈال رہا تھا۔ ظفر خان کو سلطان سے نہ تو کمک ملی اور نہ پسپائی کے احکام، اس دوران دشمن میدان میں اپنے قدم پوری طرح جما رہا تھا۔ الغ خان جو ظفر خان کی مقبولیت کے سبب اس سے حسد رکھتا تھا، مصیبت کے وقت اس کی مدد کے لئے اپنی جگہ سے بھی نہ ہلا۔[۴۸] آخر کار جب ظفر خان اکیلا رہ گیا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو دشمن پر ایک آخری حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ہجلک اس حملہ کی تاب نہ لا سکا اور ایک بار تیزی سے پسپا ہو گیا۔ ظفر خان نے بھاگتے دشمن کا اٹھارہ کوس تک تعاقب کیا اور اس دوران منگولوں کی خاصی بڑی تعداد تلوار کے گھاٹ اتار دی[۴۹] لیکن شکست خوردہ دشمن کا تعاقب ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا یا کم از کم افسوسناک ثابت ہوا۔ پسپائی کے دوران تقریباً دس ہزار منگول طرغی کی قیادت میں گھات میں بیٹھ گئے اور انھوں نے اپنے تعاقب میں آنے والے شاہی سپاہیوں کو ان کی واپسی کی راہ میں ختم کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جوں ہی ظفر خان کو واپس آتے دیکھا انھوں نے اپنی کمین گاہ چھوڑ دی اور جنگ کے لئے صف بستہ ہو گئے۔ بہادر ظفر نے اپنے آپ کو بڑی مشکل میں پایا اور اس کی سوجھ بوجھ ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ایک ہزار شہسوار تھے جب کہ منگول ان سے دس گنا

۴۶۔ فتوح، ص ۴۹-۲۴۷۔

۴۷۔ سلطان نے ہر منگول سر کی قیمت کے بطور ایک طلائی تنکہ کی پیشکش اپنے سپاہیوں کو کی تھی۔ حویلی ورانی، ص ۱۶۔

۴۸۔ ظفر الوالہ، ص ۷۹۷۔

۴۹۔ یہ فاصلہ برنی کے میرٹھ کے مخطوطہ میں دیا گیا ہے لیکن برنی کے بلوچھ کا اڈ کا کے متن میں نہیں ہے۔

زیادہ تھے۔ اس نے اپنے بعض افسروں مثلاً عثمان آخور بیگ، اور علی شاہ رانہ پل سے فوری مشورہ کیا۔ ان سب نے متفقہ طور پر یک جان ہو کر کھیل جانے والی جنگ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ منگولوں سے لڑے بغیر ان کے چنگل سے بچ بھی گئے تو سلطان ان کو سخت سزا دے گا۔

آنے والی جنگ کا نتیجہ معلوم تھا۔ منگولوں نے شاہی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان پر ہلاکت آفریں وار کرنے لگے۔ تاہم ظفر خان ان کے گھیرے کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے یہاں وہاں اور ہر جگہ جنگ کی، تب بھی نہ تو سلطان کی طرف سے نہ الغ خان کی جانب سے کوئی امداد آئی۔ بڑی خوفناک جنگ ہوئی اور اگر عصامی پر اعتماد کیا جائے تو جب دشمنوں کے پانچ ہزار سپاہی مارے جاچکے تھے تو ظفر خان کے صرف آٹھ سو آدمی کام آئے تھے۔ بقیہ دو سو آدمیوں کے ساتھ ظفر خان نے آخری سانس تک جنگ کی یہاں تک کہ جب اس کا گھوڑا مار ڈالا گیا تو وہ پیادہ لڑتا رہا۔ ہمعصر مورخ ظفر خان کی شجاعت کی بڑی شاندار تصویر کھینچتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس کا گھوڑا اس کے نیچے دم توڑ چکا تو بھی وہ شہور زمانہ اور بیتال سوسا پیادہ لڑتا رہا۔ زمین پر تیر اپنے سامنے پھیلا کر اس نے بڑی شدت کا حملہ کیا۔ ہر تیر ایک منگول سوار کو نیچے گرا دیتا تھا۔"[50] ایسے بے نظیر جنرل کی بہادری کی اگرچہ اس کے اپنے حاسد بادشاہ نے قدر نہ کی لیکن قتلغ خواجہ کی طرف سے اس کی بہت تعریف ہوئی۔ اس نے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ "میرے پاس آجاؤ تاکہ میں تمھیں اپنے والد کے پاس لے جاؤں، جو تمھاری عزت دہلی کے شہنشاہ سے بھی بڑھ کر کرے گا۔" لیکن ظفر نے اس کی پیشکش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور اسی طرح بہادری سے لڑتا رہا۔ جب منگولوں نے محسوس کیا کہ وہ ظفر خان کو زندہ نہ پکڑ سکیں گے تو انھوں نے اس پر چاروں طرف سے دباؤ ڈالا اور ایک جنگ مغلوبہ میں اس کو قتل کر دیا۔ بہادر سپاہی ایک ایسی غیر متوازن جنگ کا شکار ہوگیا جس کو اس کے بے انتہا جوش و خروش نے مشتعل کیا تھا۔ اس دن اس تعاقب سے شاہی فوج میں سے کوئی بھی زندہ نہیں لوٹا۔

منگولوں نے ظفر خان کو تو مار ڈالا لیکن انھوں نے ہندوستانی فوج کی صلاحیت کا مشاہدہ کر لیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ دہلی سے تیس کوس دور ہٹ گئے۔[51] وہاں سے کوچ کرتے ہوئے راستہ میں رکے

---

۵۰۔ برنی، ص ۲۶۱-۲۶۰۔

۵۱۔ عصامی بہرکیف یہ کہتا ہے کہ وہ لڑنے بھڑنے بغیر مزید کچھ دنوں تک دہلی کے ارد گرد منڈلاتے رہے اور پھر لوٹ گئے۔ فتوح، ص ۲۶۰-۲۵۸۔

بغیر وہ اپنے ملک لوٹ گئے۔[۵۲] ہمعصر مورخ بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ برسوں تک ظفر خان کی ہیبت منگولوں کے دلوں پر طاری رہی اور جب ان کے مویشی پانی نہیں پیتے تھے تو وہ پوچھا کرتے تھے "کیا تم نے ظفر خان کو دیکھ لیا ہے کہ تم پانی نہیں پیتے؟"[۵۳]

اس فتح کے بعد سلطان کیلی سے لوٹا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جنگ کے ہیرو ظفر خان کی اس کی بہادری اور قربانی کی کسی نے تعریف نہ کی۔ اس کے برعکس سلطان نے اس پر ناعاقبت اندیشانہ جنگ کرنے اور احکامات کے بغیر تعاقب کرنے کا الزام لگایا۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے علاءالدین ہزبرالدین کی موت پر بہت خوش تھا اور اس کی موت کو اس نے دوسرا خوشگوار واقعہ سمجھا جو منگولوں کی شکست سے کچھ کم نہ تھا۔

منگول سیلاب کے اترنے کے بعد سلطان نے راجپوتانہ کی فتح کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے ۱۳۰۰ء میں ایک فوج رنتھمبور بھیجی اور کچھ عرصہ بعد خود بھی میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ منگول کچھ عرصہ تک تو خاموش رہے، اوّل تو اس لئے کہ انھوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی طاقت دیکھ لی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ وسط ایشیا میں اپنے داخلی معاملات میں الجھے رہے۔[۵۵] اس زمانے میں علاءالدین مزید فتوحات کے منصوبے بناتا رہا۔ ۱۳۰۲ء کے اواخر میں اس نے بنگال کے راستے دکن کی جانب ایک لشکر بھیجا اور فروری ۱۳۰۳ء میں خود چتوڑ کی فتح کے لئے روانہ ہوا۔ علاءالدین چتوڑ میں تھا۔ اس دوران میں منگولوں نے دوبارہ اتنی طاقت حاصل کرلی کہ ہندوستان پر حملہ کرسکیں۔

**طرغی کا حملہ**

چتوڑ سے سلطان علاءالدین کی واپسی کو مشکل سے ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ منگول جنرل

---

۵۲- امیر خسرو لکھتے ہیں کہ قتلغ خواجہ ماوراءالنہر جاتے ہوئے واپسی کے سفر میں مرگیا۔ (دیول رانی ص ۶۱) یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ دوا کی ۱۳۰۶ء میں موت کے بعد کیوک، ایک اور تلکو یکے بعد دیگرے ماوراءالنہر کے تخت پر بیٹھے جب کہ اس جنگجو بیٹے کے زندہ ہونے کا ذکر نہیں ملتا کہ وہ تخت پر اپنا دعوی کرتا۔

۵۳- برنی ص ۲۶۱

۵۴- فتوح، ص ۲۵۸۔

۵۵- اس وقت قیدو اور دوا قبلائی خان اور اس کے جانشینوں سے لڑنے میں مشغول تھے۔ ہندوستان میں قتلغ کی مہم کے بعد قیدو اور دوا نے منگول خاقان سے جنگ کرنے کے لئے کوچ کیا لیکن ان کو شکست ہوئی۔ قیدو اپنی شکست کے بعد زیادہ دنوں زندہ نہیں رہا اور ۱۳۰۲ء میں مرگیا۔

طرغی نے ایک لاکھ بیس ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کر دیا۔[56] بلا شبہ راجدھانی میں صورت حال بڑی نازک تھی۔ چتوڑ کے محاصرہ میں شاہی فوج کو سخت نقصان پہنچا تھا اور جنگ کے دوران جو سامان رسد اور دوسرا ساز و سامان بچا تھا وہ دہلی واپس آتے ہوئے راستہ میں ضائع ہو گیا۔ پہلے تو واپسی میں راجپوتانہ کے خشک صحرا کا راستہ اختیار کیا گیا اور پھر بھری برسات میں میدانوں سے گزر ہوا۔ چنانچہ جب منگول دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے تو علاء الدین کی فوجیں لڑنے کے قابل نہیں تھیں۔ وہ لشکر جو مشرق کی سمت میں بھیجا گیا تھا ابھی تک واپس نہیں ہوا تھا۔ تاہم علاء الدین نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے مشرق و مغرب کے صوبائی گورنروں کو کمک بھیجنے کے فوری احکامات بھیجے اور منگول حملہ آور سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

طرغی نے عزم محکم کر لیا تھا کہ قتلغ خواجہ کی فوجوں نے جس افراتفری کا سامنا کیا تھا وہ دہرایا نہ جائے۔ اس کو پورا پورا علم تھا کہ سلطان ایک دور دراز قلعہ کی طرف گیا ہوا ہے اور ایک دوسری فوج تجربہ کار جرنلوں کی قیادت میں ایک دور دراز مہم پر جا چکی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرغی کوچ پر کوچ کرتا ہوا اور اپنے راستہ میں پڑنے والے علاقے کو تاراج کئے بغیر دہلی کی حدود میں پہنچ گیا۔ علاء الدین نے پایہ تخت میں جو کچھ فوج تھی اس کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور سیری کے میدان میں ان کی صف بندی کی۔ چونکہ ایک ایسی مختصر اور بے ساز و سامان فوج سے منگولوں کے ساتھ کھلے معرکہ میں لڑنا ناممکن تھا علاء الدین نے فیصلہ کیا کہ دفاعی خطوط کو مضبوط و مستحکم کر کے وہ محاصرہ کرنے والوں کی ہمت پست کر دے گا۔ سیری کے مشرق میں دریائے جمنا واقع تھا اور جنوب مغرب میں دہلی کا پرانا قلعہ، اگرچہ طرغی کے حملہ کے وقت تک اس کی مرمت نہیں کی جا سکی تھی۔ جنوب میں پرانی دہلی کا گھنا جنگل واقع تھا۔ اس لئے صرف شمال ہی غیر محفوظ سمت تھی جہاں منگولوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اس کے پڑاؤ کے ارد گرد بڑی بڑی خندقیں کھودی جائیں اور ان کے ارد گرد لکڑی کے تختوں کی دیواریں تعمیر کر کے ان کو اور مستحکم بنایا جائے۔ اس زمانہ میں

---

۵۶۔ برنی ص ۳۰۰ میں کہتا ہے " دوازدہ تمن سوار" یعنی ۱۲ تومان سوار یا ایک لاکھ بیس ہزار سوار لیکن اس کے فوراً بعد لکھتا ہے کہ "طرغی ملعون با سی چہل ہزار سوار گزیدہ درآمد" جس کا مطلب ہے کہ "ملعون طرغی کوچ پر کوچ کرتا ہوا تیس چالیس ہزار سواروں کے ساتھ آ پہنچا"۔ پہلی تعداد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ (۱) اس موقع پر بھی ہندوستان کی فتح منگول کا مقصد تھی۔ ایسے عظیم منصوبے کے لئے ایک لشکر جرار کی ضرورت تھی۔ اسی طرح ایک پہلے موقع پر دو لاکھ سوار آئے تھے۔ (۲) تیس چالیس ہزار سواروں سے علاء الدین کو اتنی تشویش لاحق نہیں ہوتی۔ پایہ تخت میں پہلی دہشت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صورت حال ہمیشہ کی طرح دگرگوں تھی۔ فرشتہ میں بھی ایک لاکھ بیس ہزار سوار ہیں۔ فتوحات ص ۲۷۶ میں دو لاکھ ہے۔

جب توپخانہ اور محاصرہ کے دوسرے جدید آلات کا رواج نہیں ہوا تھا۔ باڑھیں، خندقیں اور دمدمے دفاعی اعتبار سے بہترین خدمت انجام دیتے تھے۔ ہر خندق کے عقب میں پانچ عظیم الجثہ ہاتھی کھڑے کیے گئے تھے جو اسلحہ سے لیس تھے[56] اور ایک سوار دستہ اور ایک محافظ دستہ بھی تعینات کیا گیا تھا تاکہ مسلسل نظر رکھی جائے۔ سلطان کے ان بروقت اقدامات نے منگولوں کو شاہی لشکرگاہ میں گھس آنے سے باز رکھا۔[57] منگول خندقوں کے گرد کسی رہگذر یا رخنہ کی تلاش میں منڈلاتے رہتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ وہ شاہی فوج پر اچانک جا پڑیں۔ سلطان نے اپنی سپاہ کو مسلسل مستعد اور تیار اور کسی بھی معرکہ کے لئے اسلحہ سے لیس رکھا حالانکہ وہ نبرد آزمائی سے اس وقت تک پہلو بچانے کا تہیہ کئے ہوئے تھا جب تک کہ دوسرے علاقے سے کمک نہ پہنچ جائے۔ بہرکیف اس کی یہ امید کہ اسے ملتان، سامانہ اور دیوپال پور سے کمک پہنچے گی خیال خام تھا کیونکہ منگول نے مشرق و مغرب سے پایہ تخت کو جانے والی تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ ملک جونا اور ملک چھجو کے زیر کمان بھیجی گئی فوج پوری طرح سے شکستہ اور تباہ حال بنگال سے واپس آئی تھی۔ اس لوٹی پھوٹی فوج کا داخلہ بھی منگولوں نے روک دیا تھا جب کہ بعض مشرقی صوبوں کی منظم فوجیں سیری میں سلطان سے آملنے میں ناکام رہی تھیں اور ان کو کول اور برن میں رکنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

اس اثنا میں منگولوں نے دہلی کے مضافات کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے دارالسلطنت کا اتنا مکمل محاصرہ کیا تھا کہ اس کے لئے پانی، چارہ، ایندھن اور دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی بالکل بند ہو گئی۔ غلہ کی شدید قلت محسوس ہونے لگی۔ دوسری طرف منگول مختلف جماعتوں میں چبوترہ سبحانی، موری، ہودی یہاں تک کہ حوض علائی جیسے مقامات تک جایا کرتے تھے اور بازار کے غلہ اور دوسرے ذخائر چھین لاتے تھے۔ بعض اوقات وہ شہر دہلی پر حملہ کر دیتے تھے اور اناج کے شاہی گوداموں کو لوٹتے تھے لیکن خوش قسمتی سے ان کو زیادہ نہیں ملا۔

دو تین موقعوں پر چھوٹی چھوٹی اکا دکا جھڑپیں لڑی گئیں لیکن کسی بھی جماعت کو فیصلہ کن فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ طرغی کے صبر کا پیمانہ قریب قریب لبریز ہو گیا کیونکہ وہ صرف فتح کے لئے تیار ہو کر آیا تھا اور علاء الدین کی خندقوں کے خطوط کو ناقابل عبور پا کر تقریباً چند ماہ کے قیام کے بعد وہ لوٹ گیا۔[58]

۵۷۔ سیری میں علاء الدین کے محصور ہونے کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، "جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی" بنگال، ۱۸۶۶، ص ۱۹۹ تا ۲۱۸۔

۵۸۔ برنی، ص ۳۰۲؛ فتوح، ص ۲۷۷، صرف چالیس دن بیان کرتی ہے۔

منگولوں کی پسپائی بلاشبہ ایک معجزہ تھا۔ برنی اس صورت حال کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے: "یہ صورت حال جس میں اسلام کے لشکر کو منگول فوج سے کوئی نقصان نہیں پہنچا اور شہر دہلی بیداغ بچ گیا، تمام ذہین لوگوں کو اپنے وقت کے معجزوں میں سے ایک معلوم ہوا۔ کیونکہ منگول موسم کے آغاز میں ایک لشکر جرار لے کر آئے تھے اور انھوں نے کمک اور سامان رسد کی فراہمی کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ اور شاہی فوج مناسب سامان کی قلت سے دوچار تھی جب کہ وہ (منگول) انتہائی خوشگوار اور خوش آیند حالات میں تھے۔"[59]

منگولوں کی اس قدر جلد پسپائی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ اگرچہ برنی اس کو غریبوں کی دعاؤں اور اپنے زمانہ کے قابل احترام بزرگ شیخ نظام الدین اولیا کی برکات سے منسوب کرتا ہے تاہم منگولوں کی پسپائی کا اصل سبب کہیں اور تھا۔ اوّل تو وہ سلطان کا بروقت اقدام تھا جو دشمن کے آگے کسی طرح بھی جھکنے کے لیے تیار نہیں تھا اور جس نے ایسے دفاعی اقدامات کیے جنھوں نے منگول جیسے گرگ باراں دیدہ کو بھی متحیر کر دیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ وسط ایشیا میں اپنی مشغولیت کے سبب جس کا ذکر پہلے آچکا ہے منگول اپنے آپ کو ہندوستان میں زیادہ عرصہ تک قیام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر وہ مختصر مدت میں ہندوستان کی افواج کو مغلوب نہیں کر سکتے تو ان کو وسط ایشیا کے اپنے وطن کی جانب یقینی طور سے اور اچانک واپس ہونا پڑتا۔

طرغی لوٹ گیا تھا لیکن منگولی خطرہ ہمیشہ کے لیے نہیں ٹلا تھا۔ ان کے مسلسل حملوں نے منگولی خطرہ کی اہمیت سلطان کے ذہن نشین کرادی تھی۔ چنانچہ اس نے کچھ مدت کے لیے مزید فتوحات ترک کر دیں اور دفاع کے مسئلے پر اپنی توجہ مبذول رکھی۔ سیری کا قلعہ اور محل تقریباً مکمل ہو چکے تھے لہٰذا اس نے اپنا صدر مقام وہاں منتقل کر دیا۔ اب سیری پایہ تخت سمجھی جانے لگی۔ شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل بھی تعمیر کی گئی تاکہ حملہ آوروں کو شہر میں داخل ہونے سے باز رکھا جائے۔ جن راستوں سے گزر کر منگول ہندوستان میں عام طور سے داخل ہوتے تھے ان پر پرانے قلعوں کی مرمت کی گئی اور نئے قلعے تعمیر کیے گئے۔ شمالی مغربی سرحد پر واقع ان قلعوں میں سے ہر ایک میں تجربہ کار اور ساز و سامان سے لیس سپاہی تعینات کیے گئے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ راجدھانی کی طرف بڑھتے ہوئے حملہ آوروں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دیں۔ فوج کی بھی از سر نو تنظیم کی گئی اور نئے سپاہی بھرتی کیے گئے۔[60]

---

۵۹- برنی، ص ۳۰۲-

۶۰- تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب یازدہم-

علاء الدین کے اختیار کردہ دفاعی اقدامات منگولوں کو کبھی کبھی ہندوستان میں گھس آنے سے کسی طرح بھی باز نہ رکھ سکے لیکن سلطان اب ان کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ مستقبل میں جب کبھی انھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کو کامیابی کے ساتھ شکست دی گئی۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا اور خود ان کو یا تو ہاتھیوں کے پیروں تلے روند ڈالا گیا یا تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

## علی بیگ، ترتاق اور طرغی کا حملہ

منگولوں نے ہندوستانی فوج کے ہاتھوں کئی بار ہزیمتیں اٹھائی تھیں۔ ان کے دلوں میں اس ذلت کی خلش بڑی گہری تھی۔ طرغی قتلغ خواجہ کی ذلت آمیز پسپائی کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس کو ۱۳۰۳ء میں اہانت کا انتقام لینے کا موقع ملا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اسے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوا۔[۹۱] لیکن ان تمام شکستوں نے طرغی کی ہمت پست ہونے نہ دی۔ اس کے برخلاف اس کے انتقام کی آگ اور زیادہ شدت سے بھڑک اٹھی۔ چنانچہ جب ۱۳۰۵ء میں علی بیگ اور ترتاق[۹۲] نے ہندوستان کی جانب پیش قدمی کی تو طرغی ان کے ساتھ ہو گیا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ حملہ بھی ۱۲۹۹ء اور ۱۳۰۳ء کے حملوں سے کسی طرح کم ہیبت ناک نہ تھا۔ منگولوں نے جن کی تعداد پچاس ہزار[۹۳] تھی، سندھ کے شمال مغرب میں واقع پہاڑی خطہ کو پار کیا، خود دریائے سندھ عبور کیا اور کوچ بہ کوچ کرتے ہوئے مشرق کی طرف بڑھے۔ امیر خسرو کے مطابق "طرغی جو فاتحین کے حملوں سے گھبرا کر دو تین بار راہ فرار اختیار کر چکا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ آخر کار ایک تیر کا نشانہ بنا"[۹۴] اور حملہ آور فوج کے دوآبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک معرکہ میں مارا گیا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ برنی اس ممتاز جنرل کے نام تک کا ذکر ان قائدین میں نہیں کرتا ہے جنھوں نے فوج کی رہنمائی کی تھی۔ علی بیگ اور ترتاق بڑھتے رہے اور جہاں جہاں سے گزرے وہاں وحشیانہ مظالم ڈھاتے رہے۔ انھیں علم تھا کہ پایۂ تخت کا دفاع

---

۹۱- عصامی ۱۳۰۴ء اور ۱۳۰۵ء کے درمیان طرغی کے ایک حملہ کا ذکر کرتا ہے لیکن دوسرا کوئی مورخ اس کی تائید نہیں کرتا اور اس کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔ فتوح، ص ۲۸۳-۸۴۔

۹۲- ضیاء برنی اور عصامی اس کو ترتاک کہتے ہیں۔ امیر خسرو ترتاق اور بدایونی ترپاق کہتے ہیں۔ فرشتہ میں خواجہ ترپال ہے، اسے برگس نے خواجہ تاش بنا دیا ہے۔

۹۳- یہ امیر خسرو کی بیان کردہ تعداد ہے۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۲۶؛ برنی تیس چالیس ہزار کہتا ہے۔ برنی کے مطابق علی بیگ چنگیز کی اولاد میں سے تھا۔

۹۴- خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۲۶۔

بہت مستحکم ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پہلے کئی مواقع پر منگول فوج اس پر قبضہ کرنے میں ناکام رہی تھی اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اسے پیچھے چھوڑ کر سیدھے دوآب اور اودھ پر فوج کشی کریں۔ یہ ملک کے زرخیز ترین اور خوشحال ترین علاقے تھے۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ "پریشاں حال باشندے ۔۔۔۔ گنگا کو پار کرنے کے لئے بھاگے اور ہندوستان کے شہروں سے دھواں اٹھنے لگا۔ لوگ اپنے جلتے ہوئے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے ۔۔۔۔۔۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو ندیوں، نالوں میں گرا دیا۔"[٦٥]

جب حملہ آوروں کے سنگین جرائم کی اور عوام کی مایوسی کی خبریں سلطان کو پہنچیں تو اس نے شہسواروں کے افسر اعلیٰ ملک نائک[٦٦] کو جو آخور بیگ میسرہ کے عہدہ پر فائز تھا، تیس چالیس ہزار کے ایک مضبوط لشکر کے ساتھ حملہ آوروں سے نپٹنے کے لئے روانہ کیا۔ شاہی فوج کا حملہ آوروں سے تصادم امروہہ کے مضافات میں ہوا اور اس نے ۲۰ر دسمبر ۱۳۰۵ء (۱۲ر جمادی الثانی ۷۰۵ھ) بروز جمعرات ان کو شکست فاش دی۔[٦٧] منگول فوج کا ایک بڑا حصہ "تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا جو جابجا بکھرے اور منتشر تھے۔ منگولوں کی لاشیں ہر جانب بکھری پڑی تھیں۔"[٦٨] اور ان کے بیس ہزار گھوڑوں پر فاتحین کا قبضہ ہو گیا۔ دونوں منگول جنرل علی بیگ اور ترتاق زندہ گرفتار ہوئے اور زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر دہلی بھیجے گئے۔

مسرّت سے سرشار علاءالدین نے چبوترہ سبحانی پر ایک دربار منعقد کرنے کا حکم دیا جہاں وہ پورے شاہی طمطراق کے ساتھ رونق افروز ہوا تاکہ جنگی قیدی اس کی خدمت میں پیش کئے جائیں اور وہ ان کی قسمت کا فیصلہ کرے۔ اس کی فاتح فوج شاہی تخت سے اندرپت تک دو رویہ کھڑی تھیں۔ اس منظر کو دیکھنے کے لئے اتنی خلقت امنڈ پڑی تھی کہ ایک گلاس پانی کی قیمت بیس جتیل اور نصف تنکہ تک جا پہنچی تھی۔ منگول قیدی انسانوں کے اس انبوہ سے گذر کر تخت شاہی کے سامنے پیش کئے گئے۔ سلطان

---

٦٥۔ ایضاً، ص ۲٦۔

٦٦۔ خسرو کہتے ہیں کہ ملک نائک ایک ہندو تھا۔ برنی بھی کمانڈر کا نام ملک نائک بتاتا ہے۔ عصامی اس کو غلطی سے ملک نائک پڑھتا ہے۔ علاءالدین کی ملازمت میں مانک نامی ایک پایک تھا جس نے اکت خان کے حملہ کے وقت اس کی جان بچائی تھی۔ برنی، ص ۲۷۳۔ لیکن وہ جنرل جس نے منگولوں سے جنگ کی تھی یقینی طور پر ملک نائک تھا جیسا کہ دو ہمعصر مورخین برنی اور خسرو نے بیان کیا ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ ملک نائب اور ملک تغلق بھیجے گئے تھے۔ دیول رانی، ص ٦۲؛ فتوح، ص ۲۹۷؛ برنی، ص ۳۲۰؛ فرشتہ، ص ۱۱۴۔

٦٧۔ یہ تاریخ امیر خسرو کی بیان کردہ ہے جو کہ ہمعصر ہیں۔ فرشتہ میں ۷۰۴ھ ہے۔

٦٨۔ برنی، ص ۳۲۰۔

کے حکم سے ان کو اونٹ کی پیٹھ پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا گیا، اس کے بعد ان کے سر قلم کر دیئے گئے اور ان کے سروں کو قلعہ کے باہر میناروں کی تعمیر میں استعمال کیا گیا۔ فرشتہ کے مطابق سیری کے میناروں کو بنانے کے لئے جو اس وقت زیر تعمیر تھے پتھروں اور اینٹوں کے بجائے آٹھ سو منگولوں کے سروں کو استعمال کیا گیا۔ اس کے بیان کی تصدیق امیر خسرو کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "انھوں نے (منگولوں نے) نئی عمارتوں کو خون دیا"

جہاں تک علی بیگ اور ترتاق کے انجام کا سوال ہے اس کے بارے میں بیانات مختلف ہیں۔ برنی کے مطابق تمام قیدی اپنے سرداروں سمیت ہاتھیوں کے پیروں تلے روند ڈالے گئے۔[69] امیر خسرو کا بیان ہے کہ علی بیگ اور ترتاق کو معافی دے دی گئی تھی۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ "کچھ عرصہ بعد ان میں سے ایک مر گیا جس کو کوئی گزند نہیں پہنچا اور دوسرا نہارہ گیا۔ شہنشاہ اس شکار میں اتنا کامیاب تھا کہ اس نے ایک کے بعد دوسرے کھیل میں ان کی جان لے لی۔"[70] اس عبارت کا آخری جملہ بہت زیادہ واضح نہیں ہے۔ لیکن عصامی ایک ایسا بیان دیتا ہے جو اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اور اس پر مزید روشنی بھی ڈالتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ علاءالدین نے علی بیگ اور ترتاق کو بخش دیا، ان کو خلعت دیئے اور زندگی کی تمام ضرورتیں اور سہولتیں ان کو بہم پہنچائیں۔[71] بہر حال ایک مختصر مدت کے بعد ترتاق کے بارے میں سنا گیا کہ وہ نشہ کے عالم میں اپنے تاج، اسلحہ جات اور فوج کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جب سلطان کو خبر ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ اس کا سر فوراً قلم کر دیا جائے۔ کچھ مدت بعد علی بیگ کا بھی یہی انجام ہوا۔[72]

**کبک[73] اور اقبال مند کا حملہ** دوسرے سال (۱۳۰۶ء) داوا خان نے علی بیگ اور ترتاق کی موت کا

---

۶۹۔ ایضاً، ص ۳۲۱۔

۷۰۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۲۸۔

۷۱۔ وصاف جو ایک غیر ملکی ہمعصر ہے اس حملہ کو غلطی سے ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) میں بتاتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ علی بیگ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور علاءالدین نے اس کو ایک امیر کا منصب عطا کیا تھا۔ وصاف، ص ۵۲۶-۲۷۔

۷۲۔ فتوح، ص ۲۹۸۔

۷۳۔ داوا خان کا ایک بیٹا کبک تھا لیکن جس کبک نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا وہ زندہ گرفتار ہوا اور سلطان کے حکم سے قتل کیا گیا۔ وہ داوا خان کے اس لڑکے کے علاوہ کوئی دوسرا تھا جو ماوراءالنہر کے تخت پر ۱۳۰۷-۸ء میں بیٹھا تھا۔ اس نام کو ہندوستانی مورخین نے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ برنی لکھتا ہے کنک یا کنگ، امیر خسرو کپک یا کبک، عصامی کبک اور فرشتہ گنگ لکھتے ہیں۔

انتقام لینے کے لئے کبک کو بھیجا۔[۷۴] اس نے ایک عظیم لشکر کے ساتھ دریائے سندھ عبور کیا۔ وہ آگ کے شعلے برساتا، قتل عام کرتا اور غارتگری پھیلاتا ہوا راوی کی جانب روانہ ہوا۔ منگول فوج کا ایک دوسرا حصہ جو اقبال مند کے زیر کمان تھا جنوب کی طرف بڑھا اور ناگور[۷۵] کے قریب پہنچا اور ملک کے اس حصہ میں اس نے دہشت پھیلا دی۔ حملہ آوروں کو روکنے اور جنگ میں ان کو ختم کرنے کے لئے علاء الدین نے ملک نائب کافور کو مقرر کیا۔ ملک تغلق شحنۂ بارگاہ اور گورنر دیوپالپور اور ملک عالم جیسے تجربہ کار جنرل ملک نائب کافور کے ہمراہ بھیجے گئے۔ ان کی روانگی سے قبل سلطان نے ملک نائب کی "ازحد تعریف کی تاکہ ایک سرفروشانہ جنگ لڑنے کے لئے اس کا حوصلہ بلند ہو جائے۔"[۷۶] سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے علاؤالدین نے حکم دیا کہ ہر سپاہی کو ایک سال کی تنخواہ بطور انعام دی جائے۔

شاہی فوج نے دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوتے علاقہ کی طرف کوچ کیا اور "رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا حتیٰ کہ وہ اپنے شکار تک پہنچ گئے۔" ملک تغلق نے جو مقدمۃ الجیش کی کمان کر رہا تھا، ایک دن اچانک منگول مخبروں کو دیکھ لیا اور اس نے فوراً ملک کافور کو منگول فوج کی قیام گاہ کے بارے میں خبردار کر دیا۔ اس کے فوراً بعد حریف فوجیں دریائے راوی کے کناروں پر آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔[۷۷] لیکن کوئی بھی فوج حملہ کی ابتدا کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ بالآخر حملہ آوروں نے قرنا پھونکتے ہوئے اور بہت زیادہ شور و غل مچاتے ہوئے پیش قدمی کی۔ کبک نے شاہی فوج کے قلب پر حملہ کیا جس کی قیادت ملک نائب کافور کر رہا تھا اور اس کو تتر بتر کر دیا۔ لیکن ملک نائب کافور نے اپنے سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور اتنی دلیری سے لڑا کہ تھوڑی ہی دیر میں اس نے کبک کے سپاہیوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور ان کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ کبک کو عین اس وقت قیدی بنا لیا گیا جب دہلی کے بعض سپاہی اس کو قتل کرنے والے تھے۔ جنگی قیدی جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، سلطان کے پاس دہلی

---

۷۴۔ دیول رانی، ص ۶۲؛ خزائن، ص ۲۹؛ فرشتہ، ص ۱۱۴-۱۱۵۔

۷۵۔ ناگور راجستھان میں جودھپور سے ۷۵ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔

۷۶۔ فتوح، ص ۳۱۱۔

۷۷۔ خزائن میں خسرو کہتے ہیں کہ یہ جنگ دریائے علی (آب علی) کے قریب لڑی گئی لیکن دیول رانی میں وہ اس کی وضاحت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ منگولوں نے ملتان کی طرف سے عبور کیا تھا اور راوی کے خطہ کو تاراج کرنے لگے تھے۔ برنی میدان جنگ کو "کھیکر" کہتا ہے جب کہ فرشتہ میں نیلاب ہے۔ عصامی "سندھ علی" کہتا ہے۔ خزائن، ص ۳۰؛ دیول رانی، ص ۶۳-۶۲؛ فتوح، ص ۳۱۱؛ فرشتہ، ص ۱۱۶۔

بھیج دیئے گئے۔

اب ملک تغلق اور ملک نائب اس منگول فوج سے نپٹنے کی طرف متوجہ ہوئے جو کامیابی کے ساتھ ناگور تک بڑھ آئی تھی۔ ان کو خبر پہنچی کہ منگول فوج کی قیادت دو جرنلوں اقبال منداور تابو کے ہاتھ میں ہے شاہی جرنلوں نے پیش قدمی جاری رکھی اور اچانک دشمن پر جا پڑے۔ منگولوں نے پسپائی اختیار کی کیونکہ ان کو غالباً کبک کی شکست کی خبر مل چکی تھی، نیز اس لئے بھی کہ ہندوستانی فوج نے ان کے میمنہ پر حملہ کر دیا تھا اور وہ شمال کی جانب" دریائے سندھ کے پار اسی راستہ سے" فرار ہو گئے۔ شاہی لشکر کا کام اب اور بھی آسان ہو گیا۔ انھوں نے دشمن کا تعاقب کیا، اس کو جالیا اور پوری طرح نہس نہس کر ڈالا۔ فاتح فوج جنگی قیدیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ واپس دارالخلافہ آئی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ یہ ایک عجیب وغریب واقعہ تھا کیونکہ پچاس ساٹھ ہزار منگولوں میں تین چار ہزار سے زیادہ زندہ نہیں بچے تھے۔ سلطان علاء الدین حملہ آوروں کی مستقل جسارت پر جو یکے بعد دیگرے ہر سال ملک میں گھس آتے تھے، سخت مشتعل ہوا حکم دیا کہ ان کو ہاتھیوں کے پیروں کے نیچے کچل دیا جائے۔ اور بدایون دروازے کے سامنے ان کی کھوپڑیوں سے ایک مینار تعمیر کیا جائے۔ ان کے عورتوں اور بچوں کو دہلی اور بقیہ ہندوستان میں فروخت کر دیا گیا۔

مختلف ہمعصر اور بعد کے مصنفین نے اس حملہ کو مختلف طریقے سے بیان کیا ہے خزائن الفتوح میں امیر خسرو کا بیان جو لفاظی اور انشا پردازی کا نمونہ ہے کچھ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ تاہم اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ کبک اور اقبال منداور تابو ایک ہی مہم کے تین مختلف فوجوں کے قائد تھے[۷۸]۔ اس واقعہ کو دوبارہ زیادہ صراحت کے ساتھ دیول رانی میں بیان کیا گیا ہے[۷۹]۔ عصامی جو منگول حملوں کا سب سے زیادہ مفصل بیان دیتا ہے اس کو علاء الدین کے عہد کا آخری حملہ بتاتا ہے۔ بہرحال عصامی کبک کے سوا اور کسی کماندار کا ذکر نہیں کرتا ہے[۸۰]۔

بہرکیف ضیاء الدین برنی کے مطابق کنک، ایک اور جرنل جس کا نام وہ نہیں بیان کرتا اور اقبال مند نے تین مختلف مواقع پر اور تین الگ الگ برسوں میں اگرچہ یکے بعد دیگرے برسوں میں نہ سہی، ہندوستان پر حملے کئے۔ ان تین منگول حملوں کے سلسلہ میں اس کا بیان حسب ذیل ہے:

"کنک یا کنگ کے زیر کمان ہونے والے پہلے حملہ میں منگولوں کو لشکر اسلام نے کھیکر میں شکست

۷۸۔ خزائن، ص ۳۱۔ ۲۹۔

۷۹۔ دیول رانی، ص ۶۳۔ ۶۲۔

۸۰۔ فتوح، ص ۱۴۔ ۳۱۰۔

دی۔گنگ اور اس کے بہت سے سپروکار جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے قیدی بنا لئے گئے۔ ان کو ہاتھی کے پیروں تلے کچل ڈالا گیا اور ان کے سروں سے ایک مینار بدایوں دروازے کے سامنے تیار کیا گیا۔ ایک دوسرے موقع پر اور دوسرے سال ہندوستانی فوج کے بعض سالاروں نے شوالک کی پہاڑیوں میں منگولوں سے جنگ کی۔ انھوں نے پسپائی کی راہ مسدود کر دی اور اس علاقہ پر قبضہ کر لیا جس سے دشمن کو گزرنا تھا۔ یہ اس طرح واقع ہوا کہ منگول جو شوالک کے علاقہ کو تاراج کر کے لوٹ رہے تھے وہ ایک دریا کے کنارے پر (دریا کا نام مذکور نہیں) اپنے آپ اور اپنے گھوڑوں کے ساتھ پہنچے۔ یہ پیاس سے جان بہ لب اور پراگندگی کا شکار تھے۔ لشکر اسلام کو اس طرح بڑا سنہری موقع ملا اور منگولوں نے جن کی انگلیاں ان کے منہ میں تھیں، پانی کی بھیک مانگی۔"

تفصیلات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ برنی صراحتاً ناگور سے لوٹنے والے منگولوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو یقیناً اس خطّہ سے گذرے ہوں گے جہاں پانی کی شدید قلّت ہے۔ ان پر حملہ کیا گیا۔ ایک شاندار فتح نے شاہی افواج کے قدم چومے۔ منگولوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ ایک دوسرے برس اقبال مند، امیر علی کی جانب ایک لشکر لے کر آیا لیکن شاہی فوج کے ساتھ ایک معمولی جھڑپ کے بعد پوری طرح شکست کھائی۔ اقبال مند قتل کر ڈالا گیا اور کئی ہزار منگول تلوار کا لقمہ بن گئے۔[۸۲]

مذکورہ بالا بیان بظاہر پراگندہ اور غلط ہے۔ اصل واقعہ کے بہت بعد یہ لکھا گیا تھا اور اس بنا پر اس کا قوی امکان ہے اس میں اختلافات راہ پا گئے ہوں۔ مصنّف ان ہندوستانی سالاروں کا نام نہیں بیان کرتا جنھوں نے ان تین مواقع پر حملہ آوروں سے جنگ کی تھی۔ وہ منگول سالار کا نام بھی نہیں لیتا جو اس بیان کے مطابق ان مہمات میں دوسری مہم کا قائد تھا۔ نہ ہی وہ ان مہموں کی تاریخیں بتاتا ہے۔ ان غلط بیانیوں ہی کو نظام الدین اور فرشتہ نے اپنایا ہے۔ فرشتہ اہم تفصیلات میں اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلتا ہے لیکن وہ صرف دو حملوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطابق ان میں سے ایک مقابلہ دریائے سندھ کے کناروں پر ہوا تھا لیکن دوسرے کے مقام کی نشاندہی اس نے نہیں کی ہے۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ "اس کے مدّتوں بعد (یعنی کبک کے حملہ) اقبال مند نامی ایک منگول ایک لشکر جرّار کے ساتھ ہندوستان

---

۸۱- وہ خسرو کا آب علی ہو سکتا ہے۔

۸۲- برنی، ص ۲۲-۳۲۱۔

آیا اور اس نے سخت غارتگری پھیلا دی۔ غازی ملک تغلق نے اقبال مند کے مقابلہ میں فوج کشی کی اور اس کو قتل کرنے کے بعد اس نے بہت سے منگولوں کو دہلی بھیج دیا تاکہ ان کو عظیم الجثہ اور ہیبت ناک ہاتھیوں کے تلے کچل ڈالا جائے۔[۸۳]

خسرو کا بیان جو کبک، اقبال مند اور تاتبو کے زیر کمان ہونے والے حملہ کو ایک ہی تصور کرتا ہے سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ انھوں نے علاء الدین کی زندگی میں لکھا تھا جب کہ برنی نے اس کے مدتوں بعد لکھا۔ مزید برآں وہ خزائن الفتوح کے اپنے بیان کی تائید دیول رانی میں بھی کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کے بارے میں ان کو یقین تھا۔ ان کے بیانات کی تائید عصامی بھی کرتا ہے جو علاء الدین کے عہد میں کبک کے حملہ کے بعد منگولوں کے کسی دوسرے حملہ کا ذکر نہیں کرتا۔ دوسرے کئی حقائق بھی یہ بتاتے ہیں کہ غالباً کبک کا حملہ آخری تھا۔ ہندوستان کا جانی دشمن داداخان جو ۱۲۷۲ء میں ماوراء النہر کے تخت پر جلوس کے بعد برابر ہندوستان کی طرف مہیں بھیجتا رہا تھا ۱۳۰۶ء کے آخری مہینوں میں مر گیا۔ اس کی موت کے بعد ماوراء النہر میں ابتری پھیل گئی۔ تین برسوں میں یکے بعد دیگرے تین خان تخت نشین ہوئے۔ وہاں حالات اتنے ابتر ہو گئے تھے کہ دیوپالپور کے سرحدی چوکیوں کے محافظ غازی ملک کابل اور غزنی تک اپنی فوجیں لے گیا اور ان علاقوں کو تاخت و تاراج کیا۔ ان حالات میں یہ ناقابل یقین ہے کہ داداخان کی موت کے بعد منگولوں نے ہندوستان پر ایک بار پھر فوج کشی کی ہو گی یا وہ کر سکتے تھے۔

اس طرح کبک کی مہم کے ساتھ منگول جارحیت کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی۔ علاء الدین کے عزم مصمم نے اس منگول خطرہ کا خاتمہ کر دیا جس کی بنا پر اس کے پیشرو اپنے تخت شاہی پر لرز جاتے تھے۔ اس کے اصلاحی اقدامات، اس کی کثیر فوج اور سب سے بڑھ کر اس کی پختہ فوجی قیادت نے سلطنت کو اس خطرہ سے بچا لیا جو مسلسل ہندوستان کے حکمرانوں اور عوام کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ منگولوں نے ہندوستان کے خلاف جارحیت بند کر دی بلکہ ضیاء برنی اور فرشتہ کے مطابق غازی ملک جو اپنے پیشرو شیر خان کی مانند دیوپالپور میں ایک مضبوط فوج کے ساتھ تعینات تھا۔[۸۴] ہر سال کابل، غزنی، قندھار اور گرسیر پر حملے کرتا، ان علاقوں میں غارتگری اور لوٹ مچاتا اور ان کے باشندوں سے خراج وصول کرتا تھا۔ منگولوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کے مقابلے میں آئیں اور اپنی ہی سرحدوں کا

۸۳۔ فرشتہ، ص ۱۱۶۔

۸۴۔ شیر خان نے سلطان ناصر الدین کا خطبہ غزنی میں پڑھوایا تھا، برنی، ص ۷۵۔

دفاع اس کے خلاف کر سکیں۔"[۸۵]

ابن بطوطہ، برنی اور فرشتہ کے بیان کی تائید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے ملتان کی جامع مسجد میں غازی تغلق کا ایک عربی کتبہ دیکھا جس میں تحریر تھا۔ "میں نے انتیس[۸۶] بار تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی اور اسی وجہ سے مجھے غازی ملک کہا جاتا ہے۔"[۸۶] اس طرح علاء الدین کے کارناموں کو گنانے ہوتے جین تصنیف ناٹکی نند نا۔ جنو دھارا۔ پربندھ کا مصنف بیان کرتا ہے کہ "کھرپاروں (منگولوں[۸۷]) کی فوجیں (آزادی سے) اس ملک میں گھومتی پھرتی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ اس طریقہ سے نمٹا کہ ان کی واپسی کی راہ مسدود ہو گئی۔"[۸۸]

منگولوں کو ختم کرنے کا علاء الدین کا کارنامہ بلاشبہہ بہت عظیم تھا۔ جلال الدین کے عہد میں کم وبیش دریائے راوی منگولوں اور سلطنت کے درمیان سرحد تھی۔ اس کا بیٹا ارکلی خان ستلج کے اس پار لاہور اور ملتان کا گورنر تھا جب کہ راوی پار کا علاقہ منگولوں نے اپنے قبضہ میں کر رکھا تھا۔ لیکن علاء الدین نے اپنی مضبوط مستقل مزاجی اور عظیم لشکر کے ذریعہ ان کو دریائے سندھ کے اس پار بھگا دیا۔ مغرب سے مزید حملوں کے خطرات کے خاتمے کے لئے کابل اور غزنی پر قبضہ ضروری تھا۔ چنانچہ ان دونوں فوجی اہمیت کے مقام کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر سلطان ہندوستان میں منگولوں کی قسمت آزمائی کا خاتمہ کرنے میں کامیاب رہا۔

## منگولوں کی شکست کے اسباب

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ کرنا مناسب ہوگا کہ وہ منگول جنھوں نے مشرق ومغرب دونوں جگہ ایک زمانہ میں دہشت کا بازار گرم رکھا تھا اور جنھوں نے علاء الدین کے زمانے میں بھی وسط ایشیا میں خوفناک جنگیں

۸۵۔ برنی، ص ۳۲۲-۳۲۳۔ ضیاء الدین کا تبصرہ بہت اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"ہر سال در ایام زمستان (غازی ملک) با لشکر خاص خود از دیپالپور بیرون آمدی فتا سرحد ہائے مغل برفتی۔ مغل را چراغ برکردہ طلب کردی و مغل را مجال نماندہ بود کہ بر سرحد ہای خود بطریق گشت بیایند۔"

(ہر سال موسم سرما میں (غازی ملک) اپنے آدمیوں (سپاہیوں) کے ساتھ باہر آتا تھا اور منگولوں کے سرحدوں تک پیش قدمی کرتا تھا۔ وہ روشن مشعلوں کی مدد سے منگولوں کو تلاش کرتا تھا (عذو) لیکن منگولوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ گشت کے لئے بھی سرحدوں تک آسکیں۔)

۸۶۔ ابن بطوطہ، جلد سوم، ص ۲۰۲۔

۸۷۔ کھرپاروں سے منگولوں کی شناخت کے لئے ملاحظہ ہو۔ روئداد انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۵۳ء، ص ۸۵-۸۲۔

۸۸۔ P.I.H.C. ۱۹۵۴ء میں ترجمہ کیا گیا، ص ۲۴۱۔

لڑیں۔ آخر ہندوستان کی افواج کے ہاتھوں ہمیشہ کیوں بڑی کامیابی کے ساتھ شکستیں اٹھاتے رہے۔ اس کے کئی سبب بیان کئے جاتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ عالمگیری فتح کا خیال جو منگول سلطنت کی روح رواں رہا تھا۔ چنگیز خان کے مختلف اخلاف کے درمیان خاندانی جنگوں میں دب کر رہ گیا تھا۔ ان منگولوں کو جو ہندوستان پر حملہ کرتے تھے ماوراالنہر کے خان بھیجا کرتے تھے۔ انھوں نے چین کے خاقان اعظم کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی اور وسط ایشیا میں اپنے داخلی مسائل میں الجھے ہوتے تھے۔ ہندوستان کے جانی دشمن داوا خان نے صرف ایشیا میں قریب قریب چالیس جنگیں لڑی تھیں اور اس لئے وہ ہندوستان کی فتح پر پورا دھیان اور تمام طاقت صرف نہیں کر سکتا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر حبیب بجا طور پر تبصرہ کرتے ہیں کہ منگولوں کے آپس کے افتراق اور ان کی اپنی خاندانی جنگوں نے سلطنت دہلی کو بچا لیا ورنہ وہ منگولوں کے متحدہ حملہ کا مقابلہ نہ کر سکتی۔[89]

دوم یہ کہ ان افواج کی تعداد جنھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ عورتیں بچے اور بوڑھے سب کے سب حملوں آوروں کے ہمرکاب ہوتے تھے اور اگرچہ اس صورت میں حملہ آوروں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا تھا اور ان کی نوجی مستعدی بری طرح متاثر ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے قسمت آزما خصوصاً افغانوں اور کھوکھروں میں سے محض لوٹ مار کی لالچ میں حملہ آور افواج میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ ان کو صرف اپنے فوری فائدے میں دلچسپی ہوتی تھی اور فتح کے کسی دور رس منصوبہ میں ان کو مشکل ہی سے رغبت ہوتی تھی۔ کئی مواقع پر علاء الدین نے عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد کو قیدی بنا لیا اور ان کو دہلی کے بازاروں میں فروخت کیا یا تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

تیسرے یہ کہ قدیم منگولوں کی خصوصیات جنھوں نے ان کو ان کی تاریخ کے آغاز میں شاندار فتوحات سے ہمکنار کیا تھا اب معدوم تھیں۔ مستعدی، تیز رفتاری اور صبر و برداشت کے اوصاف اب ان منگولوں میں باقی نہیں رہے تھے جنھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ سچ مچ یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ۱۳۰۰ء اور ۱۳۰۳ء میں دہلی کے دو محاصروں کے موقع پر علاء الدین نے اُن کی قوت برداشت فنا کر دی اور وہ سخت جنگیں لڑے بغیر لوٹ گئے جو ایک سلطنت کی فتح کے لئے ضروری تھیں۔

چہارم یہ کہ داوا خان جس نے پینتیس سال تک حکمرانی کی، وسط ایشیا میں اپنی مشغولیت کے باوجود ہندوستان پر منظم حملے کرا سکتا تھا۔ ۱۳۰۶ء میں اس کے انتقال سے ماوراالنہر میں انتشار پھیل گیا۔ دو یا تین

---

۸۹۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۲۵۔

برسوں کی مدت میں تین خان کیوک، کپک، ہلکو تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد معاملات نہیں سلجھے اور کپک کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کو ۱۳۲۱ء میں پھر تخت نشین کیا گیا۔ ان حالات میں ہندوستان پر حملوں کی نہ تو تنظیم کی جا سکتی تھی اور نہ مقررہ وقفوں کے بعد ان کو بھیجا ہی جا سکتا تھا۔

پنجم یہ کہ ایک سچے ماہر فن حرب کی مانند علاء الدین نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک وہ خود منگولوں کے فوجی مرکزوں پر حملہ آور نہیں ہوگا اس وقت تک وہ پوری طرح سے ان کے حملوں کی روک تھام نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے جارحانہ حکمت عملی کو بہترین مدافعانہ حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جب اس نے صورتحال سازگار پائی تو اس نے اپنی افواج کو پہاڑی دروں کے پار کابل غزنی اور قندھار میں دشمن کے مرکزوں پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس فوجی حکمت عملی نے دشمن کو پوری طرح سے مفلوج کر دیا۔

اور آخری بات یہ ہے کہ منگولوں کی شکست کا اصل سبب اس امر میں مضمر ہے کہ وہ ایک ایسے بادشاہ سے لڑنے آتے تھے جو خود بھی ایک جنگی سورما تھا۔ علاء الدین کی قوت برداشت، مستعدی اور فوجی ذکاوت نیز اس کی عالی ہمتی اور استقلال کا بیّن اظہار ملک علاء الملک سے اس کی گفتگو میں جھلکتا ہے جس نے قتلغ خواجہ سے اس کو جنگ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ علاء الدین نے غیر ملکی حملہ آوروں سے اپنے ملک کا دفاع کرنے کو اپنا اولین فرض سمجھا اور اس نے ان تمام وسائل سے جو اس کے قبضۂ اختیار میں تھے، اس کا دفاع کیا۔ اس نے مختلف اصلاحات کیں، اس نے کثیر فوج بھرتی کی اور اپنے عزم بالجزم سے منگولوں کے حملہ کو پسپا کیا، یہاں تک کہ ان کا کلی طور پر سدّباب کر دیا۔

---

# باب 10

# نظم ونسق

علاء الدین سلطنت عہد کا پہلا حکمراں تھا جس نے تقریباً پورا شمالی اور جنوبی ہند فتح کرلیا۔ بے شمار داخلی اور خارجی خطرات کے باوجود وہ محض اپنی حکومت کے نظم ونسق کی بدولت اتنی وسیع سلطنت قائم اور اس پر موثر طریقہ سے حکومت کرسکا تھا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم فاتح تھا بلکہ ایک عظیم منتظم اور ایک بڑا ناظم تھا۔ اس لئے دکن کی اس عظیم الشان فتح پر بحث کرنے سے پہلے ہم نظم ونسق کے میدان میں اس کے کارناموں کا مطالعہ کریں گے جنھوں نے اس کو اتنی شاندار سربلندی حاصل کرنے کے قابل بنایا تھا۔

## سلطان

یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ قرون وسطی کے ہندوستان میں سلطان انتظامی مشین کا محور تھا۔ وہی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ اور عدلیہ اور انتظامیہ کا سب سے بڑا سربراہ تھا۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کا رہنما (امیر المومنین) ہونے کے علاوہ عوام کا بادشاہ تھا۔ اپنے اعمال کا جواب وہ صرف خدا کے سامنے تھا جس کے زمین پر نائب ہونے کا اسے دعویٰ تھا۔ اس کی رعایا کا فرض تھا کہ وہ اس کی اطاعت کرے اور اگر ضرورت پیش آئے تو بلاچون وچرا اس کے لئے مصیبت سہہ لے۔ ان حالات میں نظریاتی اعتبار سے دہلی کا سلطان ایک مطلق العنان حکمراں تھا جس پر کسی قانون کی پابندی عائد نہیں تھی۔ کسی مادی بندش میں جکڑا ہوا نہیں تھا، اور اپنی ذاتی رائے کے سوا کسی اور کی رائے کا محتاج نہ تھا۔ عوام کے حقوق کا کچھ ذکر نہ تھا، ان پر صرف فرائض کی ادائیگی لازم تھی۔ ان کی زندگی کا مقصد اس کے احکامات کی انجام دہی تھا۔[1]

---

۱۔ اشرف، ہندوستان کے عوام کی زندگی اور حالات (Life and Conditions of the people of Hindustan) ص ۱۲۹۔
نیز ملاحظہ ہو، بشیر احمد، قرون وسطی کے ہند میں انصاف کا انتظام (Administration of Justice in India)

ایسا تھا حقیقی حکمران۔ دستوری حکمران پر بعض فرائض اور ذمہ داریاں تھیں۔ ماوردی مسلم حکمران کے فرائض کی ایک مفصل فہرست دیتا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے (۱) مذہب اسلام کے بنیادی اصولوں کو قائم کرنا اور جو اسلام قبول کرنے سے انکار کریں ان سے جہاد کرنا۔ (۲) اپنے علاقوں کی سرحدوں کی حفاظت کرنا۔ (۳) اپنی مملکت میں کارگزار عمال حکومت کا انتظام کرنا۔ (۴) عدل و انصاف کرنا۔ (۵) چونکہ خلیفہ مسلم دنیا کا سربراہ ہوتا تھا اس لئے دور دراز علاقوں پر حکومت کرنے والے مسلمان بادشاہ بھی اس کے اقتدار کو تسلیم کرتے تھے۔ دہلی کے ابتدائی سلاطین مثلاً التمش تسلیم کرتے تھے کہ ان کی حیثیت، اختیارات اور مرتبہ اسی کی طرف سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے نام کے ساتھ انتہا رعب اور احترام شامل تھا کہ ۱۲۹۶ء تک جلال الدین خلجی کے سکوں پر المعتصم باللہ کا نام کندہ کرایا جاتا رہا، حالانکہ مذکورہ بالا خلیفہ کو منگولوں نے ۱۲۵۸ء میں قتل کر دیا تھا۔ علاء الدین جیسے طاقتور بادشاہ نے بھی اپنا لقب "یمین الخلافہ ناصر امیر المومنین" رکھا تھا۔

دہلی کے سلاطین نے عباسی خلفاء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فتوحات، اپنے بہتر نظام حکومت اور عام و خاص کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کے ذریعہ اپنے مذہب کا تحفظ اور تبلیغ کرنے کی کوشش کی تاہم اسلام کی نشر و اشاعت کے جوش میں انھوں نے غیر مسلم اکثریت کے عقائد اور جذبات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا۔ کافروں کے خلاف پیہم جہاد اس ملک میں ممکن نہیں تھا۔ سندھ میں محمد بن قاسم کی مہم کے ابتدائی زمانے میں بھی چند ہزار عربوں کے سالار نے ایک مقدس جہاد کے نام پر ہندوؤں پر ظلم و تعدی سے باز رہنے کو عاقبت اندیشی تصور کیا تھا تاکہ ان کا ہجوم اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑا ہو[۳]۔ سیاسی مصالح مذہبی رواداری کے متقاضی تھے۔ اندرونی بغاوتیں، جانشینی کا غیر مقررہ اصول، ملک بھر میں متعدد آزاد ہندو بادشاہتوں کا وجود، اور منگولوں کے پیہم حملے ایک متلون مزاج یا متعصب بادشاہ کے بجائے ایک طاقتور حکمران کی موجودگی کا مطالبہ کرتے تھے۔ انھیں اسباب کی بنا پر بلبن، علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق جیسے

۲۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۱۶-۳۔ بحوالہ قریشی، مذکورہ بالا، ص ۲۳۔ نیز خدا بخش، مشرق خلفاء کے عہد میں (Orient under the Caliphate) ص ۶۶، ۲۹۵؛ ٹی پی ہیوز (T.P. Hughes)، ڈکشنری آف اسلام، ص ۶۲۲؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد چہارم، ص ۴۴-۴۳۵۔

۳۔ پندرہویں صدی کا ایک مصنف خلیل بن شاہین الزہری کہتا ہے کہ مشرق یا مغرب کا کوئی بادشاہ اس وقت تک سلطان کا لقب نہیں اختیار کر سکتا جب تک کہ ان کے اور خلیفہ کے درمیان ایک عہد نہ ہو گیا ہو۔
آرنلڈ، خلافت (Caliphate)، ص ۱۰۲-۱۰۱۔

۴۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، ص ۴۔

حکمرانوں نے مذہب کو سیاست پر کبھی فوقیت نہیں دی۔ علاء الدین کے عہد میں خاص طور پر سیاسی اقتدار نے مذہبی اقتدار کو پس منظر میں ڈھکیل دیا تھا۔ بیانہ کے قاضی مغیث الدین کے اس کے مباحثے ایک طرف تو ملکی سیاست کے معاملات میں متعصب علماء کے مشورہ کو ناقابل عمل ہونا صراحتاً دکھاتے ہیں اور دوسری طرف عہد وسطیٰ کے ایک مطلق العنان حکمراں کے رویہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ بادشاہ نے زور دے کر کہا تھا کہ "میں نہیں جانتا کہ ہمارا مذہب ان قوانین کی اجازت دیتا ہے یا نہیں لیکن میں ریاست کے لئے جو چیز مفید سمجھتا ہوں اس کا حکم دیتا ہوں"[5] علاء الدین کی دلیل یہ تھی کہ مذہب کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ بادشاہ کا کام ریاست کا انتظام و انصرام تھا اور شرع کا تعلق علماء، قضاۃ اور مفتیوں کا[6] حتیٰ کہ قدامت پسند مولانا ضیاء الدین برنی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "اگر وہ (بادشاہ) رسول کی احادیث پر عمل کریں۔۔۔۔۔ تو ان کے لیے بادشاہت اور حکومت کرنا ناممکن ہو جائے گا"[7] علماء بھی اپنے مفادات کا بہترین طریقے سے خیال رکھنا جانتے ہیں۔ اگر بادشاہ متعصب ہوتا تو وہ عدم رواداری کی وکالت کرتے تھے ورنہ وہ چپ چاپ اپنی رایوں کو علاء الدین جیسے طاقتور حکمرانوں کا تابع بنا لیتے تھے[8]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاء الدین کے اقتدار کی راہ میں مذہبی طبقہ کے جانب سے نہ کوئی خطرہ تھا نہ کوئی دخل اندازی۔

ہمعصر رائے عامہ بھی قرون وسطیٰ کے ایک حکمراں کی مطلق العنان حیثیت کے حق میں عموماً اور علاء الدین کے حق میں خصوصاً تھی۔ امیر خسرو اور ضیاء برنی دونوں سلطان کو خدا کا نائب یا خلیفہ تصور کرتے تھے[9]۔ برنی کے مطابق موقع کی مناسبت سے سلطان کو نرم یا سخت ہونا چاہیے[10]۔ بلا شبہ صاحب اقتدار و سطوت بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں میں عدل و انصاف نافذ کرے کسی کو بادشاہ پر تفوق نہیں حاصل ہونا چاہیے[11]۔ خزائن الفتوح میں امیر خسرو علاء الدین کو "سلطان عالم" "سلطان السلاطین

۵۔ برنی، ص ۲۹۴- ۲۹۵-

۶ ایضاً، ص ۲۸۹۔

۷۔ فتاوائے جہانداری، ص ۳۹۔

۸۔ برنی، ص ۳۴۴۔

۹۔ دیول رانی، ص ۱۸-۱۷۔

۱۰۔ برنی، ص ۳۵، ۱۹۸ - "مجموع بادشاہی قہر و سطوت و لطف است۔"
(بادشاہت ظلم، رعب اور نرمی کا مجموعہ ہے)۔

۱۱۔ فتاوائے جہانداری، ص ۱۴، اور ۹۷-۹۶۔

الارض" "فاتح زماں" اور عوام کے راعی" کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ یہ خطاب اگرچہ ایک مدح خواں کی روایتی انداز میں تحریر کئے گئے ہیں تاہم وہ اس عہد کے اس تصور کی وضاحت کرتے ہیں کہ بادشاہ ہی ریاست ہوتا تھا اور یہ کہ وہ شاہی مطلق العنانیت کا زمانہ تھا۔

اپنے پیشرو جلال الدین اور اپنے جانشین قطب الدین کے بالکل برعکس علاء الدین میں ایک کامیاب مطلق العنان حکمراں کے تمام اوصاف موجود تھے۔ وہ اپنے احکامات کو نافذ کرنے میں آہنی عزم کا مالک تھا۔ اس نے طبقۂ امراء اور علماء کو اپنی خواہشات کی پیروی کرنے پر مجبور کیا، اور اس نے نظم و نسق کے معاملات میں کسی قسم کے ڈھیلے پن کو برداشت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی کی ذات اقتدار کی مرکز تھی، حکومت کے ہر شعبہ پر وہ بذات خود نگاہ رکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ علاء الدین فرانس کے لوئی چہاردہم کی طرح ریاست میں اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ "سب کچھ وہی تھا اور بس"۔[12] "l'etat c'est moi"

**وزراء** ملک کا نظم و نسق چلانے میں وزراء اور دوسرے افسروں کی ایک جماعت سلطان کی مدد کرتی تھی۔ ملک میں چار اہم حسب ذیل وزارتیں تھیں گویا یہ چار ستون تھیں جن پر انتظامیہ کی عمارت قائم تھی۔[13] (۱) دیوان وزارت، (۲) دیوان عرض، (۳) دیوان انشاء اور (۴) دیوان رسالت۔ ان کے کام اور اختیارات پوری وضاحت کے ساتھ متعین کر دیئے گئے تھے۔

وزیر خاص، وزیر کہلاتا تھا۔ اگرچہ اصطلاحی اعتبار سے وہ تمام وزراء کا سربراہ ہوتا تھا تاہم التتمش کی وفات کے بعد اس کی اہمیت خاصی گھٹ گئی تھی کیونکہ امیر حاجب وکیل در اور آخر میں نائب مملکت نے اقتدار کے لحاظ سے اس پر تفوق حاصل کر لیا تھا۔ کم از کم عملی لحاظ سے وہ محض ایک شعبہ کا سربراہ (دیوان وزارت) بن کر رہ گیا تھا جو مالیات اور محاصل کا نگراں ہوتا تھا۔[14] ماوردی نے بلاشبہ دو قسم کے وزیر تسلیم کئے ہیں۔ ایک وہ وزیر جس کو غیر محدود اختیارات حاصل ہوں (وزارت تفویض) اور دوسرے وہ جس کو محدود اختیارات ملے ہوں (وزارت تنفیذ)۔ اگر ہندوستانی وزراء دوسری قسم سے تعلق رکھتے تھے تاہم مسلم سیاسی مفکرین نے اس عہدہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔[15] ہمعصر ضیاء برنی

۱۲۔ برنی، ص ۳۴۹۔ " انا ولا غیری ۔۔۔۔۔۔ لمن الملک؟"
(یعنی میں ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں ۔۔۔۔۔۔ بادشاہت کس کی ہے؟")

۱۳۔ برنی، ص ۱۵۳۔

۱۴۔ حبیب اللہ، دی فاؤنڈیشن آف مسلم رول آف انڈیا، ص ۲۲۱۔

۱۵۔ قریشی، ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت، طبع دوم ۱۹۴۴ء، ص ۸۷۔

کہتا ہے کہ "ایک عقلمند وزیر کے بغیر بادشاہت بیکار ہے۔" وہ مزید کہتا ہے کہ "ایک عقلمند وزیر سے زیادہ بادشاہ کے لئے فخر و مباہات کا نہ کوئی سرچشمہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔"[16]

وزیر کا خاص کام خالصہ (شاہی زمینوں) سے لگان اور باجگذار حکمرانوں سے خراج وصول کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صوبائی گورنروں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا اور صوبوں سے فاضل محصول (فواضل) وصول کرتا تھا[17]۔ اپنے ان فرائض کی انجام دہی میں اس کی اعانت افسروں اور کلرکوں کی ایک بڑی تعداد کرتی تھی۔ اس کی وزارت کے جانچ پڑتال کے شعبہ کا انتظام مشرف (اکاؤنٹینٹ جنرل) اور مستوفی (آڈیٹر جنرل) کرتا تھا۔ مستوفی کے ماتحت ایک اور افسر ہوتا تھا جس کو وقوف کہا جاتا تھا اور یہ عہدہ جلال الدین خلجی نے جاری کیا تھا۔ اس کا کام مصارف کی مدوں کا جائزہ لینا تھا۔ جلال الدین نے ناظر منصب کا عہدہ بھی نکالا تھا تاکہ وہ عاملوں کے ان حسابات کی جانچ پڑتال کرے جو مشرف کو بھیجتے تھے۔[18] عامل، کارکن اور متصرف جونیئر عملہ میں شامل ہوتے تھے۔ دیوان وزارت کا کام یقینی طور سے کافی وسیع اور پیچیدہ تھا۔ جیسا کہ تغلق عہد کے دو مصنفین شہادت دیتے ہیں۔ شہاب الدین کے مطابق محمد تغلق کے وزیر کے چار دبیر (سکریٹری) تھے، اور ان میں سے ہر ایک کے ماتحت تین سو کلرکوں کا عملہ ہوتا تھا۔[19] فیروز تغلق کے عہد کے بارے میں عفیف لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص دیوان وزارت کے کام کو بیان کرنا چاہے تو اس کو ایک (علیحدہ) کتاب لکھنی پڑے گی۔[20] یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ زراعت، عمارات، خیراتی ادارے، جاسوسی کا محکمہ، کارخانے اور ٹکسال بلاواسطہ یا بالواسطہ دیوان وزارت ہی کے ماتحت تھے۔[21]

علاء الدین نے اپنی تخت نشینی پر خواجہ خطیر کو وزارت کے عہدہ پر مقرر کیا تھا۔ خواجہ وسیع تجربہ اور بڑی ذہانت کا مالک تھا۔ اس نے بلبن کے عہد میں بطور نائب وزیر اور جلال الدین کے عہد میں

---

۱۶۔ فتاوائے جہانداری، ص ۱۰۔

۱۷۔ برنی، ص ۹۱، ۸۹، ۲۸۸۔

۱۸۔ عفیف، ص ۴۲۰۔

۱۹۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم، ص ۵۷۸۔

۲۰۔ عفیف، ص ۴۲۰-۲۱۔ "اگر وظائف اصحاب دیوان نوشتہ شود کتابی جداگانہ باید۔"

۲۱۔ عفیف، ص ۳۴۶، ۳۹-۳۳۷، ۳۳۲۔

وزیر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ وہ ایک مستعد شہری منتظم تھا۔ بیشک ایک عظیم سپاہی نہیں تھا وہ اپنے آقا کی توقعات پر پورا اترا جو ایک فوجی ریاست قائم کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے ۱۲۹۷ء میں نصرت خان کو خواجہ خطیر کی جگہ پر مقرر کیا گیا۔ نصرت خان ایک عظیم فوجی سالار تھا۔ اس نے گجرات پر کامیاب فوج کشی کی اور رنتھمبور میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ لیکن وہ محاصل کے شعبہ کے سربراہ کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہیں ہوا، کیونکہ جلد ہی اس نے لوگوں سے مالی وصولیابی کے سلسلہ میں بدنامی مول لے لی۔ ایک اور وزیر جس کا ذکر فرشتہ نے کیا ہے "بدنام" سید خان تھا۔ جس کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ملک تاج الدین کافور کو سلطان کا نائب کب مقرر کیا گیا۔ وہ سلطان کے نائب ہونے کے ساتھ ساتھ وزیر بھی تھا۔ وہ ریاست کے وزیر کے مقابلے میں بادشاہ کا وزیر زیادہ تھا۔[22] اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک عظیم فوجی جنرل تھا۔ دوسری یہ تھی کہ وہ سلطان کا محبوب تھا۔ چنانچہ علاء الدین کے عہد میں وزیر کا منصب جس کا اہم قلمدان مالیات تھا فوجی سالاروں کو عطا کیا جاتا تھا اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی کیونکہ علاء الدین کو شمال مغرب کے منگول حملہ آوروں سے لڑنا پڑتا تھا اور ساتھ ساتھ ملک میں نئے علاقے بھی فتح کرنے پڑتے تھے۔ مختصر یہ کہ علاء الدین کے نظم ونسق میں سول لحاظ سے محاصل کی وصولیابی اور صوبائی حکومتوں کے نظم ونسق کے لیے بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا۔ فوجی لحاظ سے وہ شاہی افواج کی کمان کرتا تھا اور مختلف سلطنتوں میں فوجی مہمات لے جاتا تھا۔

اہمیت کے لحاظ سے وزیر کے بعد دیوان عرض یا وزیر جنگ تھا۔ اس کا فرض تھا سپاہی بھرتی کرنا، تنخواہ تقسیم کرنا، فوج کے ساز وسامان اور مستعدی کی نگرانی کرنا، اور وقفہ وقفہ سے (عرض) کرنا یا مسلح افواج کا معائنہ کرنا۔[23] وہ یا اس کا نائب (نائب عارض ممالک) بعض اوقات مہموں پر فوج کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ مہم کا سپہ سالار اعظم نہیں ہوتا تھا۔ ہر مہم کے کمانڈر کو سلطان مقرر کرتا تھا۔ میدان جنگ میں عارض اور اس کے نائب یا بخشی فوج کے اہم فرائض تھے۔ صوبائی گورنروں کے بھیجے ہوئے دستے کا خیر مقدم کرنا، سپاہیوں کے ساز وسامان اور عام مستعدی کی دیکھ بھال کرنا، افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہیں تقسیم کرنا، سامان رسد اور ذرائع نقل وحمل کا انتظام کرنا، اور اموال غنیمت کا انتظام والتزام دیکھنا۔[24] اس کو وسیع اختیارات حاصل تھے اور وہ وزیر کے مالی اختیارات کے

---

۲۲۔ ترپاٹھی، مسلم نظم ونسق کے کچھ پہلو۔ (Some Aspects of Muslim Administration) ص ۱۸۰۔

۲۳۔ برنی، ص ۹۵، ۳۱۹؛ عفیف، ص ۲۲۹، ۳۰۔

۲۴۔ برنی، ص ۳۲۶۔

دائرہ سے باہر تھا۔

علاءالدین کے عہد حکومت میں ملک نصیرالملک سراج الدین عارض ممالک تھا اور اس کا نائب خواجہ حاجی نائب عارض تھا۔[25] وہ ملک کافور کے ساتھ دکن کی مہموں پر جاتے رہے اور اگرچہ مورخوں نے کامیابی کا سہرا ملک کافور کے سر باندھا ہے تاہم دکن میں فتوحات میں عارض کے حصے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فتاوائے جہانداری میں برنی سفارش کرتا ہے کہ "عارض کو اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک ماں اور ایک باپ سے بھی زیادہ نرم ہونا چاہیے ۔۔۔۔۔۔ اس کو سپاہیوں کو اسی طرح سزا دینی چاہئے جیسے کہ ایک شفیق باپ اپنے غیر ذمہ دار لڑکے کو سزا دیتا ہے۔ اس کو قساوت پر نہیں اترآنا چاہئے"۔[26] بلبن کے عارض عمادالملک اپنے سپاہیوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتا تھا اور باصلاحیت افراد کی اپنے ذاتی وسائل سے مدد کرتا تھا۔[27] اور بلبن ایک مستعد اور موثر فوج منظم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسی طرح علاءالدین کے زمانے میں ہم کو مالیاتی شعبہ میں سخت سزاؤں کے بارے میں علم ہوتا ہے لیکن ہم کو فوجیوں کو سخت سزائیں دینے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف دکن کی مہموں کے موقع پر ملک کافور کی علاءالدین کی ہدایات سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے افسروں اور جوانوں کے لئے ایک مشفق باپ تھا۔ ایک فوجی سالار اور ایک وسیع سلطنت کے بانی کے طور پر اس کی کامیابی کا بظاہر یہی راز تھا۔

ریاست کا تیسرا اہم وزیر دیوانِ انشاء ہوتا تھا۔ اس کی وزارت کا کام تھا شاہی فرامین اور اعلانات کا مسودہ تیار کرنا، صوبائی گورنروں اور مقامی افسروں کے ساتھ رابطہ رسل ورسائل قائم رکھنا اور حکومت کے دستاویزات کی حفاظت کرنا۔ اس میں سکریٹریوں کا ایک بڑا عملہ ہوتا تھا جن کو دبیر کہا جاتا تھا۔ سربراہ دبیر عموماً دبیر مملکت[29] نیز صاحبِ دیوان انشا کہا جاتا تھا۔ سلطان کا پرائیویٹ سکریٹری دبیر خاص کہلاتا تھا۔ دبیر خاص سلطان کے خط وکتابت کا نگران ہوتا تھا اس کے علاوہ وہ فتحنامہ یا

---

۲۵۔ برنی، ص ۳۲۶-۳۲۸؛ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۹۳۔
۲۶۔ فتاوائے جہانداری، ص ۲۴۔
۲۷۔ برنی، ص ۱۱۵-۱۱۶۔
۲۸۔ ۱۲۹۹ء میں جالور کے قریب سپاہیوں کی بغاوت کو مستثنیٰ کر کے۔ لیکن اس زمانے میں بھی علاءالدین کے نظم و نسق کا دھارا کسی دوسری جانب نہیں مڑا تھا۔
۲۹۔ عفیف، ص ۲۷۹، اور ۳۴۲۔

اس کے کارناموں کی ایک دستاویز بھی ترتیب دیتا تھا۔ علاء الدین کے عہد میں دبیر ممالک تاج الدین عراقی کا فرزند کبیر الدین تھا۔ اس کی صلاحیتوں کی برنی کی پرشوکت مدح سرائی اس کی قابلیت اور مہارت کی شہادت دیتی ہے۔[30] کبیر الدین نے علاء الدین کے عہد میں فتح نامہ (فتوحات کی دستاویز) لکھا تھا۔ بدقسمتی سے وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔

دیوان رسالت چوتھا وزیر ہوتا تھا۔ رسالت کی اصطلاح غیر ملکی اور حکمت عملی سے متعلق مراسلت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ موجودہ دور کے وزارت خارجہ کا ہم پلہ تھی۔[31] وہ اس خط و کتابت کے مسودات تیار کرتا تھا جن کو پڑوسی درباروں میں بھیجنا مقصود ہوتا تھا وہ سفراء اور نمائندوں سے قریبی رابطہ بھی رکھتا تھا جو غیر ممالک میں بھیجے جاتے تھے یا وہاں سے آتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ علاء الدین کے عہد میں اس کا تذکرہ مشکل ہی سے کہیں ملتا ہے۔ علاء الدین کی تخت نشینی کے وقت عہدوں کی تقسیم کا بیان کرتے ہوتے برنی دیوان رسالت کا قطعی ذکر نہیں کرتا۔[32] اس کے عہد کے آخری برسوں کا ذکر کرتے ہوئے مورخ یہ کہتا ہے کہ ملک حمید الدین ملک اعزاز الدین کی عہدے سے معزولی اور شرف قاینی کی شہادت سے دیوان وزارت، دیوان رسالت اور دیوان انشاء کے عہدے پوری طرح سے درہم برہم ہو گئے۔[33] لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ دیوان رسالت کے عہدے پر در اصل کون فائز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلجی سلطان اس وزارت کی نگہداشت خود کرتا تھا اور یہ خدمت اپنے امراء میں سے کسی کو تفویض نہیں کی تھی۔[34] علاء الدین نے ایک نئی وزارت قائم کر کے جس کو دیوان ریاست کہا جاتا تھا۔ وہ پایۂ تخت کے معاشی معاملات کی ذمہ دار تھی۔ ہم اس کے کاموں کا تفصیلی مطالعہ اس باب میں پیش کریں گے، جس کا عنوان ہے "معاشی اقدامات"۔

---

۳۰- برنی، ص ۳۶۱ - "ہنر دبیری و انشار سرآمد عہد علائی و عصر خویش بودہ"۔

۳۱- اسٹینگاس، پرشین-انگلش ڈکشنری، ص ۵۷۴-

ڈاکٹر قریشی کا خیال ہے کہ یہ وزارت مذہبی امور کی دیکھ بھال کرتی تھی اگرچہ وہ اس خیال کی تائید میں کسی سند کا حوالہ نہیں دیتے ہیں، قریشی، مذکورہ بالا، ص ۸۴ -

۳۲- برنی، ص ۲۴۸ - ۲۴۷ -

۳۳- ایضاً، ص ۳۳۷-

۳۴- فتاوائے جہانداری، ص ۴۱-

**عہدہ دارانِ حرمِ شاہی**

بادشاہ کے حرم کا اپنا وسیع انتظامیہ تھا۔ وکیل در (محل کے دروازے کا کلید بردار) اہم ترین افسر تھا جو دربار اور محل سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ پورے محل کے انتظام و انصرام کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ محل کے عملہ کی تنخواہیں تقسیم کرتا تھا اور شاہی اولاد کی تعلیم کے انتظامات کرتا تھا۔ محل کا مطبخ، شاہی ملبوسات خانہ، اور شاہی اصطبل اس کی ذمہ داری میں ہوتے تھے۔ اس سخت فرائض کا تقاضہ تھا کہ وہ زبردست حکمتِ عملی، ذہانت اور صلاحیت کا مالک ہو۔ سلطان کی معمولی سی ناراضگی یا شک و شبہ سے اس کے عہدے سے ہی نہیں بلکہ اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔[35] اس کے کام میں عموماً اس کا نائب (نائب وکیل در) اس کی اعانت کرتا تھا۔

وکیل در کے بعد امیر حاجب (خلوت میں سلطان سے ربط رکھنے والا افسر) ہوتا تھا۔ وہ دربار کے آداب کا نفاذ کرتا تھا، جلسوں اور تقریبات کے انتظامات کرتا اور ایک ایسے افسر کی خدمت انجام دیتا تھا جس کے ذریعہ سلطان اپنے افسروں اور عوام سے تعلق قائم رکھتا تھا۔ اُسے اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے ایک نائب اور متعدد حاجبوں کی اعانت حاصل تھی۔ برنی کے زمانے میں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ امیر حاجب کو زیادہ تر باربک کے نام سے جانا جاتا تھا۔[36] ایک دوسرا افسر سر جاندار ہوتا تھا، یہ بادشاہ کے محافظوں کا سالار تھا جن کو جاندار کہا جاتا تھا۔ جاندار سلطان کے ارد گرد ننگی تلواریں لئے رہتے تھے۔[37] جن سے نہ صرف بادشاہ کے دربار اور جلوس کی شان و شوکت میں اضافہ ہو جاتا تھا بلکہ کسی اچانک حملہ سے اس کا تحفظ بھی ہوتا تھا۔ محل کے بعض دوسرے افسر تھے امیر آخور (گھوڑوں کا افسر)، شحنۂ پیلان (ہاتھیوں کا نگران)، امیر شکار (شاہی شکارگاہ کا نگران)، شرابدار (سلطان کی مشروبات کا ذمہ دار)، سر چاشنی گیر (مطبخ کا نگران جو شاہی دسترخوان پر جانے سے پہلے کھانا چکھتا تھا)، سر سلاح دار (شاہی اسلحہ جات کا محافظ)، مہردار (شاہی مہر بردار)، اور بہت سے دوسرے جن کی فہرست اس کتاب کے حدود کے لحاظ سے بے محل ہوگی۔

شاہی حرم کے وزرا، سکریٹری اور افسران ریاست کے اہم افسر ہوتے تھے۔ اپنے مقام و حیثیت کی بنا پر وہ دربار کے اندر اور باہر خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اسی طرح بہت سے دوسرے

---

۳۵۔ تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۷۔ نیز طبقاتِ ناصری، ریوٹی، جلد اوّل، ص ۶۹۴۔

۳۶۔ برنی، ص ۶۱، ۳۶، ۳۴۔

۳۷۔ برنی، ص ۳۰۔

عہدے دار بھی تھے جن کے مقام اور حیثیت کی بنا پر عوام عام طور سے ان سے خوف کھاتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کا تعلق عدالتی، جاسوسی اور پولیس کے شعبوں سے تھا۔

## عدل وانصاف کا انتظام

ضیاء برنی کہتا ہے کہ "انصاف وہ ترازو ہے جس میں لوگوں کے اچھے یا بُرے اعمال تولے جاتے ہیں"[38] قدیم سیاسی تصور کے مطابق جس کو ہندو اور مسلمان دونوں نے تسلیم کیا ہے حکمراں عدل وانصاف کا منبع ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ بر سر دربار مقدمات کو بہ نفس نفیس فیصل کر سکے[39]۔ التمش، بلبن، علاء الدین اور محمد تغلق جیسے سلاطین ہند نے اس تصور پر عمل کیا اور دربار عام میں بذات خود عدل وانصاف کا فرض انجام دیا۔ اپیل کی سب سے بڑی عدالت سلطان ہوتا تھا۔ ہر شخص کی رسائی بادشاہ تک تھی اور ہر شخص مجاز تھا کہ وہ بادشاہ سے انصاف کا مطالبہ کرے اور انصاف حاصل کرے۔ التمش[40] اور بلبن دونوں عدل وانصاف کو بہت پسند کرنے کی وجہ سے مشہور تھے۔ انھوں نے کبھی جانبداری کا اظہار نہیں کیا، یہاں تک کہ اپنے اعزا اور اقربا کے ساتھ بھی نہیں[41]۔ بلبن ہی کی طرح علاء الدین بھی عدل وانصاف کرنے میں بڑا سخت دل اور مضبوط تھا۔ بدقسمتی سے ابن بطوطہ کی مانند کوئی سیاح اس کے دربار میں نہیں رہا اور ہمعصر مورخین اس طریقہ پر ذرا بھی روشنی نہیں ڈالتے ہیں جس طریقہ سے سلطان اپنے دربار میں عدل وانصاف کرتا تھا۔

سلطان کے بعد عدلیہ کے شعبہ کا سربراہ صدر جہاں قاضی القضاۃ یا سلطنت کا لارڈ چیف جسٹس ہوتا تھا۔ قاضی القضاۃ کے تحت نائب قاضی یا عدل ہوتے تھے۔ اور ان کی مدد مفتی کرتے تھے۔ مفتی قانون کی تشریح کرتے اور پیچیدہ مقدمات پر رائے دیتے تھے۔ ایک اور افسر امیر داد ایک حضرت[42] ہوتا تھا جس کا عہدہ مغلوں کے میر عدل اور خلافت عباسیہ کے دیوان مظالم کے مطابق تھا[43]۔ وہ دار السلطنت (حضرت) کا جج ہوتا تھا اور لشکر گاہ کے جج (قاضی لشکر) سے ممتاز ہوتا تھا۔ امیر داد کا کام

۳۸۔ فتاوائے جہانداری، ص ۱۶۔

۳۹۔ جادوناتھ سرکار، دی مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۱۰۶۔

۴۰۔ ابن بطوطہ، ل، ص ۱۱۲۔ بحوالہ ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم، ص ۵۹۱۔

۴۱۔ برنی، ص ۱۱۱۔ نیز ملاحظہ ہو واحد حسین، ہندوستان میں مسلم حکومت کے عہد میں عدل وانصاف کا انتظام ص ۴۲۔ (Administration of Justice during the Muslim Rule in India)

۴۲۔ علاء الدین کے عہد کے چھٹے سال ملک فخر الدین کوچی کو اس عہدہ پر فائز کیا گیا تھا، برنی، ص ۲۴۸۔

۴۳۔ نیز ملاحظہ ہو برنی کی تاریخ کے ترجمہ میں میجر فلر کا حاشیہ۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۰ء، ص ۱۸۷۔

یہ تھا کہ عدالت میں ایسے بااثر شخص کو پیش کرے جس کے خلاف مقدمہ قائم ہوا اور جو اتنا طاقتور ہو کہ اس پر قاضی کا اختیار نہ چل سکے۔[44] عدلیہ کے افسروں کے مدارج اسی طرح صوبوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ جہاں گورنر، قاضی اور جونیئر افسر عدل و انصاف کرتے تھے۔ چھوٹے قصبات اور مواضعات میں مقدم اور پنچایتیں اختلاف رفع کرتیں اور مقدمات فیصل کرتی تھیں۔

عدلیہ کے ان افسران کے علاوہ شہزادے، افواج کے سالار اور ریاست کے دوسرے بڑے افسران مقدمات کو فیصل کرتے تھے جن میں قانون کی مہارت درکار نہیں تھی۔[45] انصاف طولانی کارروائیوں کے بغیر تیزی سے اور بروقت کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں پیروکار یا وکیل نہیں ہوتے تھے اور قاضی گواہوں کے بیانات سننے کے بعد زیادہ تر قیاس کے اصول یا نظیر پر عمل درآمد کرتے تھے۔

بہرکیف ضیاء الدین برنی علاء الدین کے عہد میں عدل و انصاف کے انتظام سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کے مطابق پہلا قاضی ممالک صدر جہاں صدر الدین اگرچہ صحیح فیصلہ اور وسیع تجربہ سے متصف تھا تاہم وہ متبحر عالم نہیں تھا۔[46] دوسرے چیف جسٹس مولانا ضیاء الدین بیانہ اور ان کے نائب قاضی جلال الدین ملواجی میں اس وقار کی کمی تھی جو پایۂ تخت کے چیف جج میں ہونا چاہیے۔ آخری قاضی مولانا حمید الدین ملتانی بالکل ہی نکما تھا چنانچہ "حمید الدین جب عدلیہ کا سربراہ بنا تو اس کا وقار اور دبدبہ خاک میں مل گیا۔"[47]

اپنے عہد کی عدلیہ کے خلاف برنی کے الزامات سمجھ میں آنے والے ہیں۔ وہ ملک علاء الملک کا بھتیجا تھا جس کا علاء الدین بہت احترام کرتا تھا۔ وہ شرعی اور سیاسی قانون کا متبحر عالم تھا۔ لیکن اسے علاء الدین کے عہد میں کوئی عہدہ نہیں ملا۔ مزید برآں قاضی کی قدامت پسند رائے کی جس کا برنی ایک پرجوش وکیل تھا کم پرواہ کرتے تھے اور علماء کو اگر وہ کسی غلطی کے مجرم پائے جاتے تھے تو سخت سزائیں دیتے تھے۔[48] برنی اپنی مایوسی کی وجہ سے تلخ زبان ہو گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ عدلیہ پر اس کی نکتہ چینی کی۔ اسی طرح مصر کے ایک دینی عالم مولانا شمس الدین ترک کی شہادت بھی جانبداری پر مبنی معلوم

۴۴۔ ایشوری پرساد، ہسٹری آف قرانہ ترکس، جلد اوّل، ص ۲۶۹۔

۴۵۔ بشیر احمد، ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان میڈیول انڈیا، ص ۱۱۷۔

۴۶۔ برنی، ص ۲۵۱۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔

۴۸۔ بحوالہ ایشوری پرشاد، قرانہ ترکس، ص ۲۶۹۔

ہوتی ہے۔ مولانا نے علاء الدین کو لکھا تھا کہ "بدبخت سیاہ رو حکمت چھانٹنے والے مسجدوں میں مشتبہ کتابیں لیے بیٹھے ہیں اور مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو دھوکہ دے کر پیسہ بناتے ہیں اور قاضی یہ واقعات بادشاہ کے علم میں نہیں لاتے۔"[49] مولانا نے قاضی حمید الدین پر بہتان تراشی کرنے کے لئے یہ سب لکھا تھا جن سے ان کو ذاتی عناد تھا۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ زیر تبصرہ زمانے میں قاضیوں کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ وہ سلطنت کے انتہائی طاقتور افسروں کو بھی سزا دے سکتے تھے۔ سلطان علاء الدین اپنے افسروں کے اچھے برتاؤ حتیٰ کہ ان کی نجی زندگی تک کی نگرانی کے معاملہ میں بڑا سخت تھا۔ اس کو ایک قاضی کو جس نے شراب پی تھی سزا دینے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوئی۔[50] پولیس اور جاسوسی کے محکمے اس قدر مستعد تھے کہ خطاکار افسر سزا سے بچ نہیں سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سلطنت کے دور دراز گوشوں میں اس کے بعض قاضی کردار اور مستعدی کا وہ بلند معیار برقرار نہ رکھتے ہوں جن کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔[51] تاہم چونکہ سلطان عوام کے ساتھ عدل و انصاف کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا تھا اس لئے بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کم و بیش عدلیہ غیر جانبدار تھی۔

**سزائیں** یہاں سلطنت کے زمانہ کی سزاؤں کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔ گردن مارنا، ہاتھا کا مثلہ کرنا اور مجرم کو بیڑیاں پہنانا سزا کی عام قسمیں تھیں۔ دُرّے مارنا بھی بہت عام تھا اور ایک موقع پر ایک شخص کو ایک ہزار دُرّے مارے گئے۔[52] فرشتہ فیروز تغلق کے عہد کے خوفناک سزاؤں کی بڑی دردناک تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "بڑی غیر معمولی بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے مواقع پر معمولی جرائم کے لئے مسلمانوں کا خون بہایا جائے، ان کے ہاتھ، پیر، ناک اور کان کاٹ کر ان کا مثلہ کیا جائے اور ان پر ظلم ڈھایا جائے، ان کی آنکھیں نکالی جائیں، زندہ مجرموں کی ہڈیوں کو موسل سے کچل ڈالا جائے، آگ سے جسم جلایا جائے، پھانسی کے تختہ پر ان کو لٹکایا جائے اور ان کے ہاتھوں پیروں میں کیلیں ٹھونکی جائیں، زندہ کھال اتار لی جائے، پیر کی نس کاٹ ڈالی جائے اور انسانوں

---

۴۹۔ برنی، ص ۲۹۹۔

۵۰۔ بدایونی، رینکنگ جلد اوّل، ص ۱۸۷۔

۵۱۔ برنی، ص ۴۴۶، نیز ملاحظہ ہو امیر خسرو، مطلع الانوار میں۔

۵۲۔ فوائد الفواد، لکھنؤ متن، ص ۵۳-۵۴۔

ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جاتا تھا[52]۔ جرم کا اقبال کرانے کے لئے سخت تشدد کیا جاتا تھا۔ فریب دینے والے دکاندار جو کم تولنے کے مجرم پائے جاتے تھے ان کے جسم سے گوشت کاٹ کر کمی پوری کی جاتی تھی۔ زنا کے جرم میں سنگسار کرنا اور مردہ جسم کو کئی کئی دنوں تک نیزے پر لٹکائے رکھنا اور شہر میں ان کو گشت کرانا عام سانحے تھے۔

مجرم کو سزا دینے میں علاء الدین انتہائی سخت تھا، اور شہر میں غیر قانونی طور سے شراب لانے یا پبلک جگہوں پر شراب پینے جیسے جرائم کی پاداش میں مجرموں کو مشہور "کنوؤں" میں قید کر دیا جاتا تھا جو اسی مقصد سے کھودے گئے تھے۔ یہ قید خانے ایسے خوفناک تھے کہ بہت سے انھیں کنوؤں میں مر گئے اور جو وہاں سے زندہ بچ کر نکل آتے ان کی صحت مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ گھوڑوں کی تجارت کے دلال جن کو سلطان کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پایا گیا، دور دراز کے قلعوں میں جلاوطن کر دیئے گئے[53]۔ سیر الاولیا کے مصنف امیر خورد ان جیلوں کے خوفناک حالات بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار ان کے والد سید کمال کو سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں دیوگیری کے قریب بھکسی جیل میں قید کیا گیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ اس جگہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سے کوئی شخص زندہ نہیں نکلتا تھا کیونکہ وہ چوہوں اور سانپوں سے بھرا ہوا تھا[55]۔ مختصر یہ کہ قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں سزائیں وحشیانہ تھیں۔

**پولیس اور جاسوسی** مستعد پولیس اور جاسوسی کا نظام موثر نظم ونسق کے لئے ناگزیر ہے۔ سلطان نے محکمۂ پولیس کو ایک بہت مضبوط بنیاد پر منظم کیا تھا۔ کوتوال پولیس کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات وسیع اور اس کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا ہوتا تھا۔ وہ امن وامان اور قانون کا محافظ ہوتا تھا۔ اہم معاملات پر وہ سلطان کو مشورے دیتا تھا اور پایۂ تخت سے سلطان کی عدم موجودگی میں حرم کے تحفظ کی ذمہ داری اسی کی تھی[56]۔ بلبن اور علاء الدین کے زمانے میں کوتوالوں کا بادشاہ پر بہت اثر تھا۔ دہلی کا کارآزمودہ کوتوال ملک فخر الدین اہم معاملات میں بلبن کو مشورہ دیا کرتا تھا۔ علاء الدین کے پہلے کوتوال نصرت خان سے لوگ بہت ڈرتے تھے۔ اس کے بعد ملک علاء الملک کو کوتوال کا منصب دیا گیا تھا۔ بادشاہ سے علاء الملک کی واضح گفتگو اور اثر ورسوخ کوتوال کے منصب اور اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

---

۵۲۔ برگس، جلد اوّل، ۹۳-۴۶۲۔

۵۴۔ برنی، ص ۳۱۳۔

۵۵۔ سیر الاولیاء، ترجمہ، ص ۱۹۰۔

۵۶۔ جیسا کہ قتلغ خواجہ کے حملہ کے وقت علاء الملک کو حرم کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

علاء الدین نے محکمۂ پولیس کی اصلاح کی، بعض عہدے قائم کئے، اور ان پر مستعد آدمیوں کا تقرر کیا۔ تاجروں پر سخت نگہداشت رکھنے کے لئے دیوان ریاست کا عہدہ قائم کیا گیا۔ شحنہ یا مجسٹریٹ بھی اسی طرح کا ایک افسر تھا۔ اکثر ہمعصر مصنفین نے ایک دوسرے افسر محتسب کا ذکر کیا ہے۔ وہ عوام کے اخلاق کا نگران اعلیٰ ہوتا تھا اور لوگوں کے کردار کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بازار بھی اس کے دائرۂ اختیار میں تھا وہ باٹوں اور پیمائش کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ اس طرح پولیس کا اختیار جامع اور مکمل تھا۔

لیکن اگر پولیس لوگوں کے اخلاق کی درستگی کرتی تھی تو جاسوسی کا سخت نظام ان میں خوف و احساس بھی جاگزیں رکھتا تھا۔ خفیہ جاسوسوں کا تقرر کوئی نیا قدم نہیں تھا اوّل تو اس لئے کہ خفیہ جاسوسی کا محکمہ ہی مطلق العنان حکومت کی بنیاد ہوتا تھا اور دوسرے یہ کہ علاء الدین کے پیشرووں نے جاسوسی سے کام لیا تھا۔ محمود غزنوی کا دیوان شغل اشراف مملکت میں ایک بہت ہی مستعد محکمۂ جاسوسی رکھتا تھا جس میں مرد، عورت دونوں بطور جاسوس کام کرتے تھے۔[57] غیاث الدین بلبن کا بھی جاسوسی محکمہ ایسا ہی مستعد تھا یہاں تک کہ اس کے اپنے بیٹے بغرا خان کی حرکات و سکنات کی خبر بڑی پابندی سے اس کو پہنچائی جاتی تھی۔

محکمۂ جاسوسی کا سربراہ برید ممالک ہوتا تھا۔ اس کی ماتحتی میں بریدوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو شہروں، بازاروں اور تقریباً ہر آباد محلّے میں تعینات ہوتے تھے۔[58] ان کا کام تھا کہ سلطان کی بادشاہت میں جو کچھ وقوع پذیر ہو اس کی خبر دیں۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ "اگر سلطان کو عوام کے حالات کا علم نہ ہو تو وہ ان کی خوشحالی کے ذرائع اختیار نہ کر سکے گا۔[59] پھر اگر کوئی بغاوت یا فتنہ پھوٹنے والا ہو تو وہ اسی وقت ضروری قدم اٹھا سکے گا اگر اس کو "فتنہ انگیزوں کے کچھ کر گزرنے" سے پہلے خبر مل جائے۔[60] برید[61] سلطنت کے کان اور آنکھیں ہوتے تھے۔ ایک مطلق العنان حکومت میں ان کی اہمیت پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

علاء الدین نے کامل ترین جاسوسی کا نظام قائم کیا تھا۔ بریدوں کے علاوہ وہ متعدد مخبروں کو

---

۵۷۔ ناظم، سلطان محمود آف غزنین، ص ۱۴۴۔

۵۸۔ برنی، ص ۴۴، ص ۳۸۔

۵۹۔ فتاوائے جہانداری، ص ۳۰۔

۶۰۔ فتاوائے جہانداری، ص ۳۰۔

۶۱۔ برید ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پیغام رساں یا دوڑنے والا۔

بھی مقرر کرتا تھا جن کو سرکاری زبان میں منہیان کہا جاتا تھا۔ وہ مختلف درجوں میں منقسم ہوتے تھے اور وہ سلطان کو عوام و خواص کے متعلق معمولی سے معمولی معاملات سے باخبر رکھتے تھے۔ منہی لوگوں کے گھروں میں داخل ہو سکتے تھے اور معمولی غلطیوں پر ان سے تعرض کر سکتے تھے۔[۶۲] ضیاء الدین اس سختی کی شہادت دیتا ہے جس کے ساتھ محکمۂ جاسوسی کام کرتا تھا: کوئی شخص اس کے (علاء الدین کے) علم کے بغیر ہل نہیں سکتا تھا اور ملکوں، امیروں، افسروں اور سربرآوردہ اشخاص کے گھروں میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی وقت پر سلطان کو خبر دی جاتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ جاسوسی کے خوف کی وجہ سے امراء نے ہزار ستون میں بلند آواز سے گفتگو کرنا بند کر دی تھی۔ اگر ان کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو وہ اشاروں یا سرگوشیوں میں کہتے سنتے تھے۔ گشت کرنے والے سپاہیوں کی کارکردگی کی بنا پر وہ دن رات اپنے گھروں میں لرزتے رہتے تھے۔ وہ نہ تو کوئی ایسا کام کرتے تھے اور نہ ہی ایک لفظ منہ سے نکالتے تھے جو ان کو سرزنش یا سزا کا مستحق قرار دے۔[۶۳]

برنی کے بیان میں تھوڑی سی مبالغہ آرائی ہو سکتی ہے۔ آج کے سادہ کپڑوں والے خفیہ پولیس افسروں کی طرح جاسوس کام نہیں کرتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ برید اور منہی کون ہیں۔ اس کے باوجود محکمۂ جاسوسی لوگوں کے لئے باعث دہشت بن گیا تھا اور منہیان کی سرگرمی خوف اور نفرت کے جذبات برانگیختہ کرتی تھی۔ امراء، تاجر اور عام لوگ سب کے سب بادشاہ کے مخبروں سے دہشت زدہ رہتے تھے۔ علاء الدین کا بازار کا کنٹرول اس محکمہ کی سخت نگہداشت کی بدولت ہی کامیاب ہوا تھا۔

## ڈاک کا انتظام

ڈاک کے اچھے نظام نے سلطنت کے مختلف حصوں کو جوڑ دیا تھا اور سلطنت کے نظم و نسق میں بڑی سہولت پیدا کر دی تھی۔ ابن بطوطہ اور مسالک الابصار کے مصنف نے علاء الدین اور محمد تغلق کے عہد میں مروج ڈاک کے نظام کا مفصل بیان دیا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی کا مصنف یحییٰ بھی اس کا حوالہ دیتا ہے۔ ضیاء الدین لکھتا ہے کہ جب کبھی سلطان کسی دور کے علاقے کی طرف کوئی مہم بھیجتا تھا تو پایۂ تخت اور فوج کی منزل کے درمیان وہ سواروں (الاق) اور پیادوں (دھا) کی چوکیاں قائم کرتا تھا۔ تلپت سے جو دہلی سے پہلی منزل تھی چوکیاں ہر نصف کوس یا اس کے چھٹے حصہ پر قائم کی جاتی تھیں اور ہر چوکی پر افسر سوار اور محرر بھی مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ افسر پیش قدمی یا محاصرہ کرنے والی فوج کی خبریں روزانہ یا تیسرے دن سلطان کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے۔ قطب الدین مبارک خلجی کے عہد میں ڈاک کے نظام کے سلسلہ میں ابن بطوطہ کے بیان سے بظاہر

۶۲- E.-D. جلد برنی، ص ۲۸۶-

۶۳- ایضاً، ص ۲۸۴-

ہوتا ہے کہ علاء الدین نے اس محکمہ کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "دہلی اور دولت آباد کے درمیان کی شاہراہ کے کنارے پر درخت لگوائے گئے تھے اور ہر میل پر تین ڈاک کی چوکیاں (دھاوا) تھیں یعنی برید۔ ---- ہر چوکی پر وہ تمام چیزیں موجود ہوتی تھیں جن کی ایک مسافر کو ضرورت ہوتی تھی۔ ---- تلنگ اور معبر کے علاقہ تک پوری شاہراہ یکساں ہے"۔ شہاب الدین اس نظام کا مصر اور شام کے ڈاک کے نظاموں سے مقابلہ کرتا ہے اور ہندوستانی محکمہ کو بہتر قرار دیتا ہے "کیونکہ ان کے (چوکیوں کے) درمیان فاصلہ چار تیر کے فاصلہ سے زیادہ نہیں ہے"۔ محمد بن تغلق کے عہد میں ان چوکیوں میں سے ہر ایک پر دس تیز رفتار دوڑنے والے تعینات رہتے تھے۔[94]

بعض اوقات بدلتے ہوئے حالات کے سبب چوکیوں کا رابطہ راجدھانی سے ٹوٹ جاتا تھا۔ ایک بار جب ملک نائب کافور ورنگل کے پایۂ تخت کو فتح کرنے میں مشغول تھا، علاء الدین کو اپنی فوج کی خبر چالیس دن تک نہیں ملی۔ لیکن محکمۂ ڈاک کی کارکردگی کم و بیش باقاعدہ رہتی تھی۔ محکمۂ ڈاک کی مستعد کارکردگی کی بنا پر علاء الدین کو حاجی مولا کی بغاوت کی خبر تیسرے دن ہی بعد مل گئی تھی۔[95] ڈاک کے نظام کی خوبی کا ایک حوالہ اس سے بھی ملتا ہے کہ سلطان قطب الدین کے احکامات پر خسرو خان کو دیوگری سے دہلی ایک ہفتہ کی مدت ہی میں لایا گیا تھا۔[96] یہ حقائق زیر بحث مورخین کے جستہ جستہ حوالے صراحت کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ علاء الدین کے عہد میں محکمۂ ڈاک کافی کامیاب تھا اور دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت بیدار مغزی سے نظر رکھنے میں سلطان کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتا ہوگا۔

## صوبائی نظم و نسق

مختلف صوبوں کا نظم و نسق مرکزی حکومت کے انتظامیہ کی ہو بہو نقل ہوتا تھا۔ سلطنت کو متعدد صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن میں سے ہر ایک صوبہ ایک گورنر کی نگرانی میں رہتا تھا۔ ضیا برنی کے مطابق مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقوں (خالصہ) کے علاوہ حسب ذیل گیارہ صوبے تھے:۔

(۱) گجرات، الپ خان کے تحت۔

(۲) ملتان اور سیوستان (سہوان)، تاج الملک کافور کے تحت۔

۹۴۔ برنی، ص ۳۰۱-۳۰۲؛ ابن بطوطہ، جلد سوم، ص ۹۵-۹۶، اور مہدی حسین کا انگریزی ترجمہ، ص ۴۴؛ مسالک الابصار، ایلیٹ اور ڈاوسن، جلد سوم، ص ۵۷۸۔

۹۵۔ برنی، ص ۲۷۹۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۴۰۰۔

(۳) دیوپال پور، غازی تغلق کے تحت۔

(۴) سامانہ اور سنام، آخور بیگ تاتک کے تحت۔

(۵) دھار اور اجین، عین الملک ملتانی کے تحت۔

(۶) جھائن، فخر الملک میرٹی (میرٹھی یا میرٹھ کے؟) کے تحت۔

(۷) چتوڑ، ملک ابو محمد کے تحت۔

(۸) چندیری اور ایرچ، ملک تمر کے تحت۔

(۹) بدایون، کوتلہ (کولی) اور کرک (کٹیہار؟) ملک دینار کے تحت۔

(۱۰) اودھ، ملک بکتن کے تحت۔

(۱۱) کڑہ، ملک نصیر الدین سوتیلہ کے تحت۔[۴۷]

صوبے کا گورنر چھوٹا موٹا بادشاہ ہوتا تھا۔ جس طرح دہلی میں بادشاہ ہوتا تھا اسی طرح صوبائی گورنر صوبے کی انتظامیہ اور عدلیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ ہر گورنر کو مرکزی فوج کا ایک حصہ تفویض کیا جاتا تھا اور جب کبھی ضرورت پیش آتی اس کو فوجی دستے بھیجنے پڑتے تھے۔[۴۸] گورنر دربار منعقد کرتا تھا، عدل و انصاف کرتا تھا، اور نظم و نسق کے دوسرے شعبوں کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ صوبے کا لگان وصول کرتا تھا اور اپنی مقررہ رقم منہا کر کے فاضل رقم شاہی خزانے میں بھیج دیتا تھا۔[۴۹]

قرون وسطیٰ کے ہندوستانی مورخین ایک صوبائی گورنر کے لئے عام طور سے والی[۵۰] یا مقطع کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جو ایک ولایت یا اقطاع کا نگران ہوتا تھا۔ لفظ اقطاع جس کے معنی میں ایک انتظامی تقسیم

---

۴۷۔ برنی، ص ۳۲۳۔

۴۸۔ مثلاً ۱۲۹۹ء میں گجرات کی فتح کے دوران الغ خان کو حکم دیا گیا کہ وہ جیسلمیر پر حملہ میں شرکت کرے۔ طرغی کے محاصرہ کے دوران صوبائی گورنروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ راجدھانی کا دفاع کریں۔ ۱۳۱۰ء میں الپ خان کو ملک نائب کافور سے اس کی دیوگیر کی مہم میں آملنے کا حکم دیا گیا تھا۔

۴۹۔ یہاں اس کی یاد تازہ کی جاسکتی ہے کہ جلال الدین کے عہد حکومت میں جب علاء الدین کڑہ اور اودھ کا گورنر تھا تو اس نے جلال الدین کی اجازت حاصل کی تھی کہ زائد محاصل (فواضل) کو چندیری پر حملہ کرنے والی فوج اکٹھا کرنے کے لئے استعمال کیا جائے ـــــ برنی، ص ۲۱۔۲۲۰۔

۵۰۔ دونوں الفاظ ایک مترادف معنی میں مستعمل ہیں۔ ملاحظہ ہو برنی، ص ۹۹، ۳۲۰۔
مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو مورلینڈ "اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا" ضمیمہ ب۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کی ریاستوں میں استعمال ہوتا تھا جہاں سے ترکوں نے اسے مستعار لیا ہے[۷۰]۔ سلجوقی اور خوارزمی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقطع اپنے صوبے کی مالیات کی اساس پر اپنی فوج کی کفالت کرتے تھے[۷۱] لیکن "وہ مصر اور شام کی مانند نہیں تھا جہاں ملک اور امیر اور جنرل اپنے تحت ایسے سپاہی رکھتے تھے جن کی وہ ذاتی وسائل سے کفالت کرتے تھے۔ ہندوستان میں افسر کو صرف اپنی فکر رکھنی پڑتی ہے، جہاں تک سپاہیوں کا تعلق ہے۔۔۔۔ ان کو شاہی خزانے سے تنخواہ ملتی ہے۔ ایک خان، امیر، ملک یا جنرل کو جو رقومات ملتی تھیں وہ خالصتاً اس کی ذاتی کفالت کے لئے دی جاتی تھیں[۷۲]"۔

دہلی سلطنت میں مقطع عام طور سے اپنے صوبے میں قیام پذیر رہتا تھا لیکن بعض حالات میں وہ شاہی دربار ہی میں مقیم رہتا تھا اور نائبوں کے ذریعہ صوبے کا نظم و نسق چلاتا تھا۔ اس کی تنخواہ غالباً اس کے اقطاع کے کل محاصل کے تناسب سے مقرر کی جاتی تھی[۷۳ (الف)]۔ جب تک وہ وفادار رہتا تھا اس کے نظم و نسق میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جاتی تھی لیکن اگر وہ سرکشی پر اتر آتا تھا تو اس کے ساتھ سختی برتی جاتی تھی۔

صوبائی گورنر پر متعدد پابندیاں عائد تھیں۔ اس کا تقرر سلطان کرتا تھا۔ وہی اس کا تبادلہ کر سکتا تھا یا اس کو برطرف کر سکتا تھا۔ وہ اپنے صوبائی محاصل کے حسابات کے لئے دیوان وزارت (وزارت مالیات) کے سامنے جوابدہ تھا جہاں ان کی پابندی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی[۷۴]۔ مرکزی حکومت اس کی فوج کی تعداد بھی متعین کرتی تھی جس کو بدلنے کا اختیار مقطع کو حاصل نہیں تھا[۷۵]۔ اس کے دستوں کا معائنہ دیوان عرض یا اس کا نائب کرتا تھا۔ جب کبھی وہ کسی مہم کے سلسلے میں شاہی فوج سے آملتے تھے۔ صوبائی عدالتوں کے خلاف اپیل سلطان کے پاس کی جا سکتی تھی اور برید کی موجودگی جو سلطان کو تمام اہم معاملات کی خبر پہنچاتے رہتے تھے مقطعوں کو وفادار رکھتی تھی لیکن ان پابندیوں کے علاوہ صوبائی گورنروں کو کافی آزادی حاصل تھی۔

۷۱۔ حبیب اللہ، مذکورہ بالا، ص ۲۲۴۔

۷۲۔ ایچ، اے، آر، گب، صلیبی جنگوں کے دمشقی سوانح نگار، Damascus Chronicle of the Crusades لندن ۱۹۳۲ء، ص ۲۲۔

۷۳۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن۔ جلد سوم ص ۵۷۷۔

۷۳ (الف)۔ ابن بطوطہ، ڈُف اور سنگ، جلد سوم، ص ۱۱۷۔

۷۴۔ برنی، ص ۱۰۲-۱۰۱۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۸۰، و ۴۳۱۔

غازی ملک، ملک کافور اور الپ خان جیسے آزمودہ کار جرنیلوں نے وفاداری کے ساتھ اتنی طویل مدت تک خدمت انجام دی وہ علاء الدین کی طاقت اور جابری نیز اس اعتماد کا ثبوت ہے جو اس نے ان میں پیدا کر دیا تھا۔

باجگذار حکمرانوں کا موازنہ حیثیت کے لحاظ سے صوبائی گورنروں سے کیا جا سکتا ہے اگرچہ ان کو زیادہ خود مختاری حاصل تھی۔ ظاہری طور پر محاصل کے لگانے اور ان کی وصولیابی، عدل و انصاف کے انتظام اور مذہبی رسوم کی بجا آوری میں باجگذار حکمران پورا با اختیار ہوتا تھا۔[46] جب تک وہ سالانہ خراج ادا کرتا رہتا تھا جو کہ زمین کے محصول کا ایک حصہ اور غالباً جزیہ پر بھی مشتمل ہوتا تھا، سکوں میں شہنشاہ کا نام شامل رکھتا تھا، اور کم و بیش اس کے احکامات کا احترام کرتا تھا، وہ اپنے علاقوں کا مالک رہتا تھا۔ دیوگیری کے رام دیو اور دوسرے جنوبی ہند کے حکمراں ایسے ہی ماتحت باجگذار تھے۔

بڑے صوبوں کے وجود کے علاوہ مرکزی حکومت کے زیر انتظام بعض علاقے (خالصہ یا مخصوص) بھی تھے جو شہروں اور اضلاع پر مشتمل تھے۔ ان پر مقطع کے بجائے امیر اور شحنہ حکومت کرتے تھے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کے قرب و جوار کے علاقے (حوالی دہلی) اس نظام کے تحت ہوتے تھے۔[47] اس کے شحنہ اور دوسرے افسروں کی تنخواہیں دیوان وزارت مقرر کرتا تھا اور وہی ان کو ادا کرتا تھا اور یہ لوگ اس کے دائرہ اختیار میں تھے۔

**طبقۂ امراء**

وزراء، سکریٹری، فوجی سالار، بادشاہ کے حرم کے افسران، بلاشبہ ریاست کے تمام اعلیٰ افسر سلطنت کے طبقۂ امراء میں شامل تھے۔ نظریاتی اعتبار سے کوئی شخص ایک امیر بننے کی تمنا کر سکتا تھا، اس طبقہ میں داخل ہونے کے لئے کسی قسم کی شرطیں مقرر نہیں تھیں۔ ایبک، التتمش اور بلبن جیسے لوگ سب سے نچلی سیڑھی سے ترقی کر کے عروج پر پہنچے تھے۔ ان کی زندگانی کا آغاز بطور غلام ہوا، انھوں نے ترقی کی اور حتیٰ کہ وہ تخت و تاج کے مالک بن گئے۔ بہر حال عملی لحاظ سے ایک امیر سے اس منصب تک پہنچنے کے لئے توقع کی جاتی تھی کہ وہ فوجی سالار ہو۔ زبردست صلاحیت، ذہانت اور کارکردگی کا حامل ہو۔ چونکہ عملہ کا دروازہ تمام لوگوں کے لئے کھلا ہوا تھا اس لئے مقابلہ بڑا کٹھن تھا لیکن فوجی اوصاف پہلی شرط تھی کیونکہ فوجی صلاحیت (نیز منصب) ان لوگوں کے لئے بھی ضروری تھا جو کسی انتظامی عہدہ پر فائز ہوتے تھے۔

امراء کا عملہ خانوں، ملکوں اور امیروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ خان، ملک اور امیر کے القاب فوجی

---

۴۶۔ حبیب اللہ، مذکورہ بالا، ص ۲۴۳۔

۴۷۔ ، ساوینڈ، مذکورہ بالا، ص ۲۳۔

درجہ بندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ سلطنت کو فوجی اساس ہی پر منظم کیا گیا تھا۔ مسالک الابصار کے مصنف کے مطابق ایک خان کے ماتحت دس ہزار سوار ہوتے تھے، ایک ملک کے زیر کمان ایک ہزار سوار اور ایک امیر کے زیر قیادت سو سوار[78]۔ یہ گنتی ان کے زیر نگران فوجی دستوں کی صحیح عددی طاقت نہیں بتاتی ہے بلکہ صرف درجہ بندی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ صرف خان، ملک اور امیر امراء کے حلقے میں شامل تھے کیونکہ منصب کے لحاظ سے کمتر افسر جیسے سپہ سالار اور سرخیل سلطان تک رسائی کا استحقاق نہیں رکھتے تھے[79]۔ خلجی عہد میں ان کی تنخواہوں کا ذکر نہیں ملتا لیکن تغلقوں کے عہد میں ایک خان کو دو لاکھ تنکہ سالانہ، ایک ملک کو ساٹھ سے پچاس ہزار اور ایک امیر کو چالیس سے تیس ہزار سالانہ ملتا تھا[80]۔ اقطاعات کم از کم علاء الدین کے عہد میں موروثی نہیں تھے۔

ریاست کے اعلیٰ افسر ہونے کی وجہ سے امراء حکمراں طبقہ میں شامل تھے اور وہ بادشاہ کے اقتدار کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ ضیاء برنی ان کی اہمیت تسلیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اگر امراء عالی نسبی، خاندانی وجاہت اور کردار کے اوصاف سے متصف ہوں تو حکومت کے کام پائدار ہوں گے۔ ابتری نہیں پھیلے گی اور انتظامیہ کی ڈور ڈھیلی نہ ہوگی"[81]۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پورے ترکی عہد میں امراء دو محاذی لڑائی میں مشغول تھے۔

ایک طرف تو ان کے درمیان اقتدار کی مسلسل کشمکش تھی۔ امراء بہت سی قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے جیسے ترک، ایرانی، پٹھان (افغان) اور ہندوستانی۔ لیکن اگر منہاج اور برنی کی فہرستیں تسلیم کی جائیں تو خان کے منصب پر کسی غیر ترک کا تقرر نہیں ہوا حتیٰ کہ خلجیوں کو بھی اس وقت تک نہیں ملا جب تک انھوں نے سیاسی اقتدار پر قبضہ نہ کر لیا۔ کٹر برنی بھی پوری طرح ترکوں کے حق میں تھا۔ وہ یہ کہنے کے لیے صفحے کے

---

۷۸۔ ہر منصب میں درجہ بندی قائم تھی۔ مثال کے طور الغ خان (بڑا خان) سب سے بڑا امیر تھا۔ منصب کے لحاظ سے وہ صرف بادشاہ سے کم تھا۔ اصولی طور پر یہ خطاب سینئر شاہی شہزادوں اور ملک کو دیا جاتا تھا جو بادشاہ کے لطف وکرم سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بلبن نے یہ خطاب ولی عہد کو عطا کیا تھا۔ علاء الدین نے اس کو اپنے بھائی الماس بیگ کو بخشا تھا اور موخر الذکر کی موت کے بعد الپ خان کے بھائی کو دیا گیا تھا۔ (فرشتہ، ص ۱۲۳) یہ ظاہر ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی شخص کو دیا جاتا تھا۔

۷۹۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۵۷۷۔

۸۰۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۵۷۷۔

۸۱۔ فتاوائے جہانداری، ص ۹۳۔

صفحے سیاہ کر ڈالتا ہے کہ امراء کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے ہونا چاہئے جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ ان کو ترک ہونا چاہئے۔[۸۲] مراعات یافتہ طبقہ کا یہ سلوک دوسرے طبقات خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت ناگوار گذرتا تھا۔ ناصرالدین کے عہد میں عمادالدین ریحان نے بلبن کی کس طرح مخالفت کی تھی اور کس طرح اس کو عہدہ سے معزول کرایا تھا سب کو معلوم ہے۔ صوبوں کے مسلمان گورنر ایک دوسرے سے مسلسل مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ علاءالدین کے آخری دنوں میں ہندوستانی امیر کافور ہزار دیناری اور الپ خان کے درمیان ہونے والی کشمکش نے سلطنت کے وقار کو خاک میں ملا دیا تھا۔

دوسری طرف اصل طاقت پر قابض رہنے کے لئے امراء اور بادشاہ کے درمیان جدوجہد جاری تھی۔ یہ بھی اس بنا پر تھا کہ ہندوستان کے سلاطین نے حکومت کا کوئی ڈھانچہ مرتب نہیں کیا تھا۔ امراء جس کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکتے یا جس میں وہ اپنے کو محفوظ تصور کر سکتے۔ اگر سلاطین کو امراء کی طاقت پر شبہ ہوتا تھا تو امراء بھی سلاطین سے برابر خوفزدہ رہتے تھے جن کی خوشنودی پر ان کے وقار، ان کی عزت حتیٰ کہ ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ کمزور حکمرانوں مثلاً جلال الدین اور قطب الدین خلجی کے عہد میں امراء حکومت پر چھائے رہتے تھے جب کہ بلبن اور علاءالدین جیسے طاقتور حکمرانوں کے عہد میں وہ فرمانبردار رہنے پر مجبور کر دیئے جاتے تھے۔ طاقتور بادشاہوں کے زمانے میں وہ وفاداری کے ساتھ خدمت انجام دیتے تھے اور بادشاہ کے لئے طاقت کا ایک سرچشمہ ہوتے تھے۔ لیکن کمزور بادشاہوں کے زمانے میں وہ بادشاہ اور سیاست کے لئے حقیقی خطرہ بن جاتے تھے۔

التتمش کے عہد میں امراء نے بہت طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کے چالیس غلاموں کا دستہ چہل گانی ریاست کے معاملات میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ دراصل ترک امراء کے طبقہ نے بادشاہ پر بھی حکومت چلانی شروع کر دی تھی اور بلبن کو ان کی طاقت کی طرف سے خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس نے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کو صرف جزوی کامیابی حاصل ہوئی۔ جلال الدین کی تخت نشینی کے ساتھ امراء نے اپنی تھوڑی سی کھوئی ہوئی طاقت پھر سے حاصل کر لی۔ اوّل تو اس بنا پر کہ خلجی انقلاب کے دوران جلال الدین نے اس کی تائید کرنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے اس لئے کہ سلطان اپنی فطرت کے اعتبار سے نرم دل تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے امراء پر بہت سخت الزام لگائے۔ کبیدہ خاطر سلطان نے کہا کہ "شراب نوشی کی محفلیں سجانے، شراب اور عورت سے لطف اندوز ہونے، قمار بازی اور جوا کھیلنے اور بادشاہ کے خلاف

---

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۰۰-۹۱۔

سازشیں کرنے کے سوا امرا کے پاس اور کوئی کام ہی کیا ہے [۸۳]

یہی وہ امرا تھے جن کے ساتھ علاءالدین کو کام چلانا تھا۔ وہ ان کے کردار کو اور ان کے گذشتہ کارناموں کو خوب جانتا تھا۔ انھوں نے کڑہ میں اس کو فرماں بادشاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تھا اور اس کی مدد کی تھی۔ جب اس کے قبضہ میں طاقت آگئی تو دہلی کے امرا نے بے ایمانی سے جلال الدین کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے در دولت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس نے ان نمک حراموں کو سزا دی تھی لیکن فتنہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ ۶۹۹ھ میں جالور کے قریب سیارسول کا جلد، الغ خان، اکت خان، اشکو خان اور عمر خان کی بغاوتیں اور ۷۰۰ھ میں دہلی میں حاجی مولا کی سرکشی جو یکے بعد دیگرے تابڑ توڑ ہوئی تھیں سلطان کو بہت پریشان کر دیا جس زمانہ میں اس کی توجہ رنتھمبور کے محاصرہ پر پوری طرح لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے معتمد امرا جیسے ملک حمید الدین ملک اعزاز الدین صاحبزادہ علاء دبیر، ملک عین الملک ملتانی اور دوسرے عقلمند اور تجربہ کار امیروں سے بار بار واقع ہونے والے سیاسی انقلابات پر بحث کی تھی۔ کئی دن تک بحث مباحثے کے بعد متفقہ طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ناخوشگوار حالات کے چار بنیادی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ سلطان نے اپنے عوام کو نظر انداز کر رکھا تھا اور اس نے یہ جاننے کی پرواہ نہیں کی کہ وہ خوشحال ہیں یا نہیں [۸۴] دوم یہ کہ شراب کا غیر محدود استعمال غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی جرأت دلاتا ہے۔ عموماً شراب نوشی کی محفلوں ہی میں عام طور سے حکومت کے خلاف سازشیں کی جاتی ہیں۔ سوم یہ کہ امیروں کا بے روک ٹوک میل جول اور تعلقات، ان کے ازدواجی اور دوسرے روابط نے ان کو ایک دوسرے کے اتنے قریب کر دیا تھا کہ اگر ان میں سے ایک مشکل میں آ پڑتا تھا تو سو دوسرے اس سے اپنے تعلقات، رشتہ داری اور وابستگی کی بنا پر اس کے حلیف بن جاتے تھے۔ اور آخری یہ کہ دولت نے لوگوں کو متمرد اور نافرمانبردار، گھمنڈی اور سرکش بنا دیا تھا۔

**امرا کا زور توڑنا**

جب فتنہ کے اسباب کی تشخیص ہو چکی تو سلطان نے اس کی روک تھام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۷۰۰ھ میں رنتھمبور سے اپنی واپسی پر اس نے نہ صرف باغیوں کو کچل دیا بلکہ بغاوت کی جڑوں کو ہی اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کیا۔ البرنی نے حاجی مولا کی سرکشی میں خاص دلچسپی لی تھی۔ منگولا امیروں نے خلجی حکومت کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ ان سرکش عناصر کے پر کترنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کے حقوق چھین لئے جائیں۔ امرا کو ایک دوسرے سے ملاقات کرنے

---

۸۳۔ برنی ص ۹۳-۱۹۱۔

۸۴۔ برنی ص ۲۸۲۔

یا باہم مل بیٹھ جانے سے باز رکھا گیا۔ مزید یہ کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر ان کو ازدواجی تعلقات قائم کرنے سے روک دیا گیا۔ رفتہ رفتہ علاء الدین نے امراء کو غلاموں کے درجہ تک گرا دیا اور ان پر غلامی کی تینوں شرائط عائد کر دیں یعنی سلطان امراء کا وارث ہوگا، سلطان کی اجازت کے بغیر کوئی شادی نہیں کی جا سکے گی، اور امراء کے بیٹے اپنی باری آنے پر سلطان کے غلام بن گئے۔ ان ضابطوں کو اتنی سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا کہ ملک اور امیر نے جاسوسی کے محکمے کے خوف کی وجہ سے بہت محتاط اور ذمہ دارانہ روش اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ جب وہ شاہی دربار میں جمع ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے بآواز بلند بولنے کی انھیں جرأت نہ ہوتی تھی اور وہ اشاروں اور سرگوشیوں میں اپنا مدعا ظاہر کرتے تھے۔

معاصر تذکرہ نگاروں کا بیان بعض حصوں میں مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو بھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ علاء الدین کے زمانے میں امراء کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان کی طاقت ٹوٹ جانے سے بادشاہ ایک مطلق العنان حکمران بن گیا اور مرکزی نظم و نسق کے کام میں سہولت پیدا ہو گئی تھی۔ علاء الدین نے عظیم ترین امراء کی بھی حرکات و سکنات پر سخت نگرانی رکھی تھی۔ الغ خان اس کا اپنا بھائی تھا اور الپ خان برادر نسبتی تھا۔ ہزبر الدین ظفر خان عظیم اوصاف کا ایک فوجی سالار تھا اور وقت گزرنے پر کافور ہزار دیناری بھی اسی طرح ثابت ہوا تھا۔ لیکن سلطان ان پر بھی کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ وہ الغ خان کی حوصلہ مندی کی طرف سے مشکوک اور ظفر خان کی مقبولیت کا حاسد بن گیا تھا اور اگرچہ وہ ان کی موت کا اصل سبب نہیں بنا تاہم ان کی موت سے اسے خوشی ضرور ہوئی۔ اگر الپ خان اور کافور نے آخر تک اس کی خدمت وفاداری سے نہ کی ہوتی تو غالباً ان کا بھی بھیانک انجام ہوا ہوتا۔ چھوٹے امیروں نے بڑوں سے سبق حاصل کیا اور انھوں نے کوئی ایسا کام کرنے کی جرأت نہیں کی جو سلطان کی خواہشات کے منافی ہوتی۔

اپنی مقصد براری کے سلسلہ میں اس کا ایک اہم قدم تھا منشیات کے استعمال اور فروخت پر پابندی۔ اس نے شراب بندی کا نفاذ بنیادی طور پر اس لئے نہیں کیا تھا کہ شراب خوری عوام کے لیے عموماً مضرت رساں تھی بلکہ اس لئے کہ اس کا ردعمل لوگوں کو محفل سجانے، بے خود ہو جانے اور بغاوت کے بارے میں سوچنے کا موقعہ دیتا تھا۔ سلطان نے شراب بندی کا حکم اس لئے دیا تھا کہ وہ بغاوت کے محرکات کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

شراب اسلام میں ممنوع ہے۔ اس کے باوجود قرون وسطیٰ میں شراب نوشی مسلم سلاطین اور امراء کی غالباً سب سے بڑی برائی تھی۔ علاء الدین خود بھی بہت پیتا تھا۔ ملک علاء الملک نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ ایک کامیاب حکمران بننا چاہتا ہے تو اسے شراب نوشی کی کثرت سے باز رہنا

چاہیے۔[۸۵] یہ معلوم نہیں کہ اس نصیحت کا علاء الدین پر کیا اثر پڑا تھا لیکن اپنی سلطنت میں مسلسل بغاوتوں کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے اس نے شراب اور دوسری منشیات کے استعمال پر پابندی لگانے کا عزم صمم کر لیا تھا۔ پہلے اس نے شراب کی خرید و فروخت ممنوع قرار دی تھی لیکن بعد میں بھنگ، تاڑی (بگنی) اور دوسری منشیات کے استعمال کو بھی روک دیا تھا۔[۸۶] قماربازی اور جوا بھی ممنوع قرار دیے گئے۔ مختصر یہ کہ علاء الدین نے ان تمام چیزوں کو ممنوع قرار دیا تھا جو "بزم طرب" سجانے کی تحریک دیتی ہیں۔ جہاں "گندی سیاست" پر بحث کی جاتی تھی اور بادشاہ اور حکومت کے خلاف سازشیں کھڑی کی جاتی تھیں۔[۸۷]

سلطان نے شراب کشید کرنے والوں، شراب خوروں، قماربازوں اور بھنگ اور تاڑی فروخت کرنے والوں کو پایہ تخت سے جلا وطن کرکے اس کام کا آغاز کیا۔ اعلیٰ افسروں کو حکم دیا کہ وہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر دہلی کے ہر بازار اور گلی میں بہ بانگ دہل یہ اعلان کریں کہ شراب کا استعمال اور فروخت سختی سے ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس اصول کے مطابق کہ عمل نظریہ سے بہتر ہوتا ہے علاء الدین نے خود بھی شراب نوشی ترک کر دی۔ محل کے تمام خوبصورت جام اور شراب کے برتن توڑ ڈالے گئے اور بدایوں دروازے کے سامنے ان کے ڈھیر لگا دیے گئے۔ سونے اور چاندی کے برتنوں کو پگھلا کر ان کے سکے ڈھالے گئے۔[۸۸] شراب کی بڑی مقدار جو محل کے تہہ خانوں میں جمع تھی سب کے سامنے بہا دی گئی۔ دہلی کی سڑکیں کیچڑ اور گندگی سے اس طرح بھر گئیں جس طرح کہ وہ برسات کے موسم میں بھر جاتی تھیں۔

جوں ہی شراب بندی کے احکامات کا نفاذ عمل میں آیا معزز لوگوں نے فوراً شراب ترک کر دی لیکن عادی شرابیوں نیز ان لوگوں نے جن کی روزی کا دار و مدار شراب کی فروخت پر تھا شراب کی فروخت اور استعمال جاری رکھنے کے غیر قانونی طریقے اختیار کیے۔ انھوں نے شراب کشید کرنے کی

---

۸۵۔ برنی، ص ۱۷۱، ۲۷۰۔

۸۶۔ برنی، ص ۲۸۴،۳ میں ہے "بگنی وبنگ وقمار ----- وشراب"۔

بگنی یا بگنی کو فارسی کی لغات میں ایک ہلکا اور نشہ آور مشروب کہا گیا ہے جس کو نبیذ یا حلال مشروب کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اسٹینگاس کہتا ہے کہ بگنی جو کی شراب یا بیئر ہوتی ہے۔ علاء الدین نے جو ایک تو مسلم کے مکمل شراب بندی کے جوش و خروش سے متاثر ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بگنی کو بھی حرام اور نشہ آور مشروبات کے درجہ میں رکھا تھا اور علماء دین سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گیا تھا۔" بوری والا، ص ۷۷، ۷۶۔

۸۷۔ ملک تاج الدین کوچی کے گھر پر جلال الدین کے خلاف سازش کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ برنی، ص ۱۹۱-۱۹۰۔

۸۸۔ فرشتہ، ص ۱۰۹۔

بھٹیاں بنائیں اور غیر قانونی طور پر شراب کشید کی۔ یہ شراب بلیک مارکیٹ میں فروخت کی جاتی تھی اور خفیہ طور سے پی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ پایۂ تخت میں شراب غیر قانونی طور سے کشید کی جاتی تھی بلکہ وہ دہلی میں غیر قانونی طریقوں سے چمڑوں کے تھیلوں میں لائی جاتی تھی جو گھاس یا ایندھن کے گٹھوں کے نیچے چھپے ہوتے تھے اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ لیکن علاء الدین کے احکام کا نفاذ کبھی جزوی طور پر نہیں ہوتا تھا۔ جوں ہی اسے علم ہوا کہ شراب خفیہ طریقے سے فروخت کی جا رہی ہے اس نے حکم دیا کہ مجرموں کو سخت سزا دی جائے۔ ان کی شراب چھین لی گئی اور شاہی اصطبلوں کے ہاتھیوں کو دے دی گئی اور مجرموں کو ڈنڈوں سے پیٹا گیا، بیڑیوں میں جکڑا گیا اور ان کو زمین دوز جیلوں میں پھینک دیا گیا جو اسی مقصد سے بدایوں دروازے کے سامنے بنائی گئیں۔ ان خوفناک قیدخانوں میں بہت سے مجرم پڑے پڑے سڑ گئے اور مر گئے۔ جن لوگوں کو آزادی نصیب بھی ہوئی تو ان کی صحت اتنی تباہ ہو گئی تھی کہ ان کو پھر سے صحت مند ہونے میں مدتیں لگ گئیں۔ محکمۂ جاسوسی (بریدا و رمنہیان) کی سختی کے سبب دارالسلطنت کے شہر اور اس کے مضافات جیسے غیاث پور، اندرپت اور کیلوگھڑی میں شراب کی خرید و فروخت بالکل ممکن نہ تھی۔

سلطان کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ امراء اور سربرآوردہ لوگوں نے شراب نوشی ترک کر دی ہے لیکن ناقابل اصلاح عادی شرابی سزا پانے کے باوجود شراب پیتے ہیں تو اس نے کسی حد تک اپنے احکام میں نرمی کر دی۔ اس نے نجی طور پر شراب کشید کرنے اور چھپ کر پینے کی اجازت دے دی۔ مختصر یہ کہ لوگوں سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ شریف آدمیوں کی طرح شراب نوشی کریں، اور "بزم طرب" نہ سجائیں۔ اس کے باوجود عام طور سے شراب کی فروخت اور استعمال پر برابر پابندی عائد رہی۔

برنی کے مطابق شراب بندی کے سلسلہ میں علاء الدین کے احکام کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا "جس دن سے شہر میں شراب کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا، سازش اور بغاوت کم ہونے لگی اور لوگوں کے دماغ سے بغاوت کا سودا نکل گیا۔"

## باب ۱۱

# مالی اور فوجی اصلاحات

سلطنت دہلی کے اہم کام تھے (۱) آزاد سلطنتوں کو فتح کرنا تاکہ ملک کو یکساں انتظامیہ کے تحت لے آیا جائے، (۲) غیر ملکی حملوں کے خلاف ملک کا دفاع کرنا (۳) امن و امان قائم رکھنا، اور (۴) محصول وصول کرنا۔ فتح یا دفاع کا کوئی منصوبہ ایک بڑی اور مستند فوج کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ ایک بڑی فوج کی کفالت کے لیے ایک مستحکم مالی نظام ضروری تھا۔ سلطان علاء الدین نے ان تمام مسائل کی باریکیوں پر غور کیا اور مالی اور فوجی شعبوں میں اس نے متعدد اصلاحات کیں۔

بلاشبہ علاء الدین ترک نسب کا پہلا حکمران تھا جس نے مالیاتی اور مال گزاری کی اصلاحات میں گہری دلچسپی لی تھی۔ قطب الدین ایبک سے جلال الدین خلجی تک اس کے پیشروؤں کو یا تو وقت نہیں ملا یا انھیں ہمت نہ پڑی کہ نظم و نسق کے اس پیچیدہ شعبے میں چھان بین کریں۔ انھوں نے موجودہ ڈھانچے سے کام لیا تھا[1] کم از کم یہی نتیجہ جس کی طرف منہاج السراج اور ضیاالدین کی خاموشی اشارہ کرتی ہے۔ ان دونوں مصنفین میں سے موخر الذکر یقیناً زرعی مسائل میں دلچسپی رکھتا تھا اس نے بلبن اور جلال الدین کی زمین کی اصلاحات میں دلچسپی پر ان کی بجا طور پر تعریف کی ہوتی اگر وہ اس کے سزاوار ہوتے۔

علاء الدین کے عہد سے قبل مروج لگان کی تعیین اور وصولیابی کے نظام کا خلاصہ اس طرح بیان

۱۔ نیز ملاحظہ ہو مورلینڈ، ایگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا، صـ۲۷-۲۶ اور قریشی، ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی، صـ۱۳۳

کیا جا سکتا ہے۔ خالصہ زمین براہِ راست، دیوانِ وزارت کے تحت تھی جو اپنے ماتحت عملہ کے ذریعہ محصول وصول کرتا جو عاملوں کارکنوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا پھر اس کے علاوہ صوبائی گورنروں جن کو مقطع کہا جاتا تھا کے تحت زمین ہوتی تھی جو محصول وصول کرتے، اپنی تنخواہ کا حصہ اور صوبائی نظم و نسق کے اخراجات وضع کرتے اور باقی کو مرکزی خزانہ میں داخل کر دیتے تھے۔ محصول کی تعیین اور وصولیابی کا نظام بعض روایات پر مبنی تھا۔ ایک روایت کے مطابق کاشتکار اپنی پیداوار کا کچھ حصہ مقطع کو یا بادشاہ کو جیسا بھی معاملہ ہو ادا کرنے پر راضی ہو جاتا تھا۔ یہ حصہ عموماً پیداوار کا ایک تہائی ہوتا تھا اور وصولیابی کا طریقہ شراکت کا نظام کہا جا سکتا ہے عام طور سے یہ محصول چودھریوں، مقدموں اور خوطوں جیسے گماشتوں کے ذریعہ وصول کیا جاتا تھا۔[2] موخر الذکر حکومت کا حصہ نقد یا جنس میں وصول کرتے تھے اور مقررہ رقم جیسا معاملہ ہو صوبائی یا مرکزی خزانے میں جمع کر دیتے تھے اور اپنے کام کے لیے معاوضہ پاتے تھے۔ یہ محصول کی اجارہ داری کا نظام تھا۔ یہ صورتِ حال تھی جب علاءالدین نے اپنی اصلاحات کے سلسلے کا آغاز کیا۔

**انعامی زمینوں کی منسوخی** علاءالدین کا پہلا قدم تمام انعامی زمینوں کی ضبطی تھا۔ امرا، حکومت کے افسران اور دوسرے افرادِ حکومت کی جانب سے بطور تحفہ، ہبہ یا انعام کے مالک تھے۔ امرا، پڑھے لکھے اشخاص کو اور علمائے دین کو انعامی زمینیں دینے کا پرانا دستور تھا۔ وہ چھوٹے اقطاعات یا زمین کے حصوں کی طرح تھیں جو افراد کو عطا کی جاتی تھیں اور جن کا محصول ان کی تنخواہ یا انعام کے برابر فرض کیا جاتا تھا۔ معمول کے عطیات یا تفویض موروثی نہیں ہوتی تھی لیکن عموماً اولادوں سے ان کی مملوکہ زمینوں کے سلسلے میں دخل اندازی کی جاتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان زمینوں کے مالک، مالدار، کاہل اور مغرور ہو گئے۔ کیونکہ ان کے پاس ایک مقررہ آمدنی ہوتی تھی جس پر وہ تکیہ کر سکتے تھے۔ بلبن نے ایسے لوگوں کے خلاف سخت اقدام کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن ملک فخرالدین کی التجاؤں نے اس کو انتہائی اقدامات کرنے

---

۲۔ ہمعصر تاریخوں میں چودھری، مقدم اور خوط مترادف اصطلاحات کے بطور استعمال کی جاتی ہیں۔ چودھری اور مقدم جیسا کہ یہ الفاظ بتاتے ہیں گاؤں کے مکھیا ہوتے تھے۔ زمرف و نحو کے قواعد کی تھوڑی خلاف ورزی کر کے لفظ خوط کا اشتقاق خط یا نامہ کی اصطلاح سے ہوا ہوگا جو وہ حکومت کی جانب سے محصول کی وصولیابی کے لیے پاتا ہوگا۔
فتاوائے جہانداری کی فرہنگ صفحہ

سے باز رکھا۔[۴] اس طرح خان اور ملک اپنی تمام جائداد سے محروم ہونے سے بچ گئے۔ اس کے باوجود ان کے سابقہ وقار اور طاقت میں کافی کمی ہوگئی اور وہ بلا چون وچرا (اس مضبوط) حکمران کے تابع بن گئے۔

اپنی تخت نشینی کے وقت علاء الدین کو امراء اور سربرآوردہ لوگوں کی ہمدردی اور تائید حاصل کرنے کے لیے ان کو سونا اور زمینیں عطا کرنی پڑی تھیں۔ لیکن جس لمحہ اس نے تخت شاہی پر اپنے کو مضبوطی سے متمکن پایا اس نے ان تمام نمک حراموں کو ان کے سابق بادشاہ جلال الدین سے بے وفائی کرنے کے الزام میں سزا دی۔ دوسری سزاؤں کے علاوہ جن میں اندھا کرنا اور قتل کرنا بھی شامل تھا ان کو ان کی دولت اور جائداد سے بھی محروم ہوگیا۔ ۱۲۹۶ء میں یہ اقدامات ملکوں اور امیروں میں صرف ایک خاص طبقہ تک محدود تھے لیکن ۱۳۰۱ء میں رنتھمبور سے سلطان کی واپسی پر ان کا دائرہ عمل کافی وسیع کر دیا گیا۔ اب ان کو ریاست کے تمام مال دار لوگوں، امراء، تجار اور حتیٰ کہ معمولی زمینداروں مختصر یہ کہ ہر اس شخص کے خلاف جو کسی جائداد کا مالک تھا منعطف کر دیا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام املاک گاؤں اور دوسری زمینیں جو لوگوں کے قبضہ میں بطور ملک (جائداد) انعام (تنخواہ یا عطیہ) اور وقف (تحفہ) ہوں ان کو فوری طور پر ضبط کر لیا جائے اور ان کو خالصہ یا شاہی زمینوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کا امکان ہے کہ تمام آراضی کے عطیات کو ضبط نہ کیا گیا ہو کیونکہ علاء الدین کے زمانے میں زمین عطا کرنے کے نظام کو پوری طرح سے ترک نہیں کیا گیا تھا۔ ملک قبول الغ خانی نے اپنے غلہ منڈی کے شحنہ مقرر ہونے کے بعد ایک جائداد پائی تھی۔[۵] برنی بھی کہتا ہے کہ وہ امرا جن کے پاس جائداد مشتمل بہ آراضی نہیں تھی ان کو قحط کے زمانے میں راشن کا غلہ ملتا تھا۔[۶] اس سے یہ بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے بھی امرا تھے جن کے پاس آراضی پر مشتمل جائداد تھی۔ لیکن سلطان نے تمام آراضی کے عطیات کی ضبطی کو اور اپنے افسروں کو نقد تنخواہ دینے کو ترجیح دی۔[۷] چنانچہ اگر تمام عطیات کو منسوخ بھی نہیں کیا گیا تھا تو کم از کم ان میں سے

---

۴۔ برنی ص۳۱۱

۵۔ برنی ص۳۰۹

۶۔ ایضاً ص۳۰۹

۷۔ قریشی، مذکورہ بالا، ص۹۸

بیشتر کا انتظام و انصرام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔[8] جب آراضی پر مشتمل عطیات اور اوقاف ضبط کر لیے گئے تو زمین کے مالکوں کو اپنی روزی روٹی گاڑھے پسینہ کی کمائی سے حاصل کرنی پڑی۔ اس کے علاوہ مالداروں سے کسی نہ کسی بہانہ سے دولت حاصل کرنے کے لیے ریاستی افسروں کو ممکنہ حد تک سخت ہونے کو کہا گیا ۔ تاکہ کسی شخص کے قبضہ میں بہت دولت نہ باقی بچے ۔ ہمعصر مؤرخ برنی کہتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ صورت حال ہو گئی تھی کہ امرا اور ملتانی (سندھی) تاجروں کے گھروں میں زیادہ دولت نہیں رہ گئی ۔ ان حالات میں کسی شخص کے پاس بغاوت کا نام لینے کا بھی وقت نہیں رہا تھا[9]

آراضی کے عطیات کی ضبطی کے احکامات کے بعد جن کا بنیادی مقصد امراء کو کنگال کرنا تھا دوسرے احکامات نافذ کئے گئے جنھوں نے گاؤں کے کھیاؤں (مقدموں)، زمینداروں (خوطوں) اور حتیٰ کہ معمولی کاشتکاروں (بلاہروں) پر اثر انداز ہوئے[10] سلطان نے اپنے مشیروں سے ان طریقوں اور ذرائع تجویز کرنے کو کہا جن کے ذریعہ ہندؤں کی سرکوبی کی جا سکے جن کی دولت امراء کی دولت کی طرح "سرکشی اور بغاوت کا ایک سرچشمہ تھی" خوطوں اور مقدموں سے علاء الدین کو شکایت تھی کہ جب وہ کاشتکاروں سے زیادہ رقم بطور اپنے وصولیابی کے معاوضہ (حقوق خطی) کے وصول کرتے تھے وہ خود مروجہ محاصل جیسے خراج، جزیہ، کری اور چرائی میں سے کوئی بھی عطا کرنے سے کتراتے تھے۔ صرف یہی نہیں وہ دیوان کی طلبی پر کان نہیں دھرتے تھے، اس کے دفتر میں کبھی حاضری نہیں دیتے تھے، اور محصول کے افسروں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے[11] بادشاہ کے مشیروں نے اس کو مشورہ دیا

---

۸ ۔ برنی، صفحہ ۲۵۰-۵۱

۹ ۔ برنی، صفحہ ۸۲-۲۸۳ اس عبارت کی زبان بہت ہی ناقص ہے لیکن مفہوم بالکل واضح ہے۔

۱۰ ۔ خوط اور بلاہر متبادل الفاظ معلوم ہوتے ہیں جن کو برنی اکثر اپنی فارسی میں استعمال کرتا ہے۔ متن کے رجحان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ خوط ایک قسم کا زمیندار یا محصول وصول کرنے والا تھا اور بلاہر کاشتکار تھا چنانچہ مؤخر الذکر اول الذکر کو محصول ادا کرتا تھا۔ برنی کے متن (ص ۲۸۸) میں ہے "دریں وادی خوطان (را) بلاہران (بلاہر کا خوطوں کو دیا حاصل) ادا کرنا لفظ "را" برٹش میوزیم کے مخطوط میں دیا گیا ہے لیکن ببلوتھکا انڈکا کے متن میں نہیں ہے۔ اس طرح بلاہر ایک خوط کو محصول دیتا تھا جو اسے شاہی خزانے میں جمع کر دیتا تھا۔ پروفیسر ہودی والا کی تشریح (ص ۲۲۲-۲۲۰) بالکل ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ خوط سنسکرت لفظ گرام کوٹ یا گاؤں کے کھیا کی بگڑی ہوئی شکل ہے برنی بھی اس کو اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو ڈاؤسن کا حاشیہ خوط بلاہر کے معنی پر، الیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم صفحہ ۱۸۳

۱۱ ۔ برنی صفحہ ۲۹۱

تھا کہ زمینداروں (خوطوں اور مقدموں) کے تمام مراعات کو ضبط کرلیا جائے اور زمینداروں اور اسامیوں سے لگان کی ادائیگی کے سلسلے میں قانون نافذ کیا جائے اور وصولیابی کے معاوضہ جیسی کوئی چیز نہ چھوڑی جائے "تاکہ" طاقتور کے ذمّہ واجب الادا محصول کمزوروں پر نہ آپڑے۔ ہندوؤں کے سلسلے میں ان کا مشورہ تھا کہ ان کے پاس اتنی طاقت نہ رہنے دی جائے کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے، عمدہ کپڑے پہنتے اور پُرتکلف اور عیش و عشرت والی عادتوں میں مبتلا رہنے کے قابل رہ سکیں۔[12]

ضیاء الدین برنی کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے طاقتوروں کے ذمّہ واجب الادا محصول کمزوروں کے کندھوں پر آپڑتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں زمیندار کسانوں سے اتنی رقم وصول کرتے تھے جتنی ممکن ہوتی تھی اور ریاست کو صرف اس کا واجب الادا حصّہ ادا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اپنے اصل حصّہ سے کہیں زیادہ وہ اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ اس مزید آمدنی نے ان کو قدرتی طور پر مالدار اور حتّٰی کہ مغرور بنا دیا تھا۔ جیسا کہ مورلینڈ بجا طور پر تبصرہ کرتے ہیں کہ برنی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "درحقیقت سوال یہ تھا کہ دیہی رہنماؤں، مکھیاؤں، پرگنات اور گاؤں کے مقدموں کی طاقت کیونکر توڑی جائے۔"[13] یہ امر کہ ہندو سردار اور زمیندار آزادی کی اپنی مسلسل خواہش کی بنا پر اپنے رویّہ میں بہت مغرور و متکبر ہوگئے تھے اُن کے خلاف جلال الدّین کی شکایت سے پوری طرح واضح ہے۔ وہ پان کھاتے تھے، سفید کپڑے پہنتے، گھوڑوں پر سواری کرتے اور مسلمانوں کے درمیان بڑے عیش و آرام سے گھومتے پھرتے تھے۔[14] اگرچہ برنی اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ سلطان جلال الدّین ہندوؤں کی جانب سے ایسا رویّہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ مصطفیٰ کے دین کے بدترین دشمن تھے[15] تاہم یہ واضح ہے کہ ہندوؤں کا

---

۱۲۔ برنی ص۲۸۷

۱۳۔ مورلینڈ، اگریرین سسٹم، ص۳۲، حاشیہ

۱۴۔ برنی ص۲۱۶-۲۱۷

۱۵۔ ضیاء الدین برنی کہتا ہے کہ قاضی مغیث الدین نے علاء الدین سے کہا تھا کہ "ہندواں کہ دشمن ترین دشمنان خدا و دین مصطفیٰ اند" (ہندو جو کہ خدا اور پیغمبر (مصطفیٰ) کے دین کے دشمنوں میں بدترین دشمن ہیں) برنی ص۲۱۶-۲۱۷ نیز ص۲۹۱ اسی انداز میں برنی اپنے فتاوائے جہانداری ص۴۸-۴۶ میں ہندوؤں کے خلاف ایک مکمل مہم کا مشورہ دیتا ہے جس سیاق و سباق میں

اعلیٰ طبقہ معاشی اقتدار سے بہتر تھا اور کسی طرح بھی غلامانہ روش کا اظہار کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ علاء الدین جس نے بڑی شقاوت کے ساتھ امرا کی سرکوبی کی تھی دوسرے سرکش عناصر کو تابع اور مطیع بنائے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا اور اس نے یہ دیکھنے کے لیے اقدامات کیے تھے کہ اس کی مملکت میں کوئی اتنا مالدار نہ رہ جائے جو ریاست کے کسی خطرہ کا باعث بن سکے۔ لیکن ضیاء الدین برنی کا یہ بیان کہ سلطان نے ہندوؤں کی سرکوبی کرنے کے لیے اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ عملی سلطان کے خیالات سے زیادہ خود قدامت پسند مورخ کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

## ایک کمر توڑ محصول کا ڈھانچہ

ایک دوسرے ضابطہ کے ذریعہ شہنشاہ نے پیداوار کا لگان (خراج) پچاس فیصد مقرر کیا اور اس کے تعین کا طریقہ مقرر کیا۔ ہندستان میں علاء الدین پہلا مسلم بادشاہ تھا جس نے زمین کی حقیقی پیمایش پر محصول مقرر کیا۔ محصول کا طریقہ ہندو حکمرانوں کو معلوم تھا اور جنوب میں مروج تھا۔ لیکن شمال میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رواج ختم ہوگیا تھا۔ وہ پھر بحال نہیں کیا گیا۔ برنی ابوالفضل کی طرح اچھا مورخ نہیں تھا اس لیے وہ پیمائش کے طریقہ اور آلات کے بارے میں تفصیلات نہیں دیتا۔ بہرکیف "بسوہ"[1] کے مطابق جو آج بھی مشہور ہے محصول کی وصولیابی کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پیمائش کا یکساں طریقہ رائج کیا گیا تھا۔ اس نظام کے تحت مالداروں اور رعیتوں کے زیر قبضہ تمام زمینیں پچاس فیصد کے یکساں نرخ کے لحاظ سے تعین کے تحت لائی گئی تھیں۔ اس اقدام نے عملی لحاظ سے سرداروں کو خود بخود کسانوں کی جگہ پہنچا دیا تھا۔ ان کی فاضل آمدنی جس کی وصولیابی کا ان پر شبہ کیا جاتا تھا اس طرح بند کردی گئی۔ پیداوار کا نصف شاہی خزانے میں بھیج دیا جاتا تھا اور بقیہ نصف سے چرائی اور دوسرے چھوٹے موٹے محاصل ادا کیے جاتے تھے اور ان کے پاس محض قلیل ترین مقدار رہ جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سردار جو عیش و عشرت کی زندگی کے عادی ہوچکے تھے افسوسناک حالت کو پہنچ گئے۔ اور اگر برنی مبالغہ نہیں کرتا ہے تو

(گزشتہ سے پیوستہ) برنی نے لکھا ہے اس میں بت پرستوں کی حیثیت اسلامی قانون میں اس نے کافی صحیح طور پر دی ہے۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد اول ص۹۵۹ نیز ابو یوسف، کتاب الخراج بحوالہ ترپاٹھی، ص۲۴

[1] فتاوائے جہانداری، مقدمہ ص۸

[1] "حکم مساحت و وفا، بسوہ بکنند" (ہر بسوہ کی پیمائش کے مطابق محصول مقرر کرتے تھے)

ہندو جو زراعت کے مالک کل تھے اس حد تک کنگال ہو گئے کہ ان کے گھروں میں سونے چاندی کا نشان تک نہیں بچا تھا اور خوطوں اور مقدموں کی بیویاں مسلمانوں کے گھرانوں میں کام تلاش کرتی تھیں۔ وہاں کام کرتیں اور یومیہ اجرت پاتی تھیں۔[17]

کل پیداوار پر پچاس فیصد کا مطالبہ یقیناً ایک بڑا سخت ضابطہ تھا۔ ہندو حکمرانوں کے دور میں ریاست کا مطالبہ ۱/۶ سے ۱/۴ تک ہوتا تھا۔ حالات کا جیسا تقاضا ہوتا محصول پیداوار کے ۱/۴ تک بڑھ جاتا یا ۱/۸ تک گر جاتا تھا۔[18] التمش اور بلبن جیسے مسلم حکمرانوں کے عہد میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱/۴ سے زیادہ نہیں بڑھا ہوگا۔ اس لیے علاء الدین کا نصف کا مطالبہ نہ تو زمینداروں کے لیے نہ کاشتکاروں کے لیے خوش آیند ثابت ہوا ہوگا۔ لیکن یہ مطالبہ غیر قانونی نہیں تھا کیونکہ اسلامی قانون پچاس فیصد کو پیداوار میں ریاست کے انتہائی حصہ ہونے کے باوجود جائز قرار دیتا ہے۔[19] مزید برآں شراب بندی اور قمار خانوں کے بند کرنے کے بارے میں سلطان کے احکامات کی وجہ سے شاہی خزانہ کو کافی نقصان ہوا تھا۔[20] علاء الدین نے لگان کو جائز انتہائی مقدار تک بڑھا کر کمی کو پورا کیا تھا۔ محصول نقد نیز جنس میں قبول کیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ سلطان سرکاری غلہ گوداموں میں اناج جمع کرتا تھا اس لیے وہ پایۂ تخت کے قریب کے بعض زرخیز علاقوں سے جنس میں محصول لینے کو ترجیح دیتا تھا۔

لگان کے علاوہ علاء الدین گھر بار محصول اور چرائی کا محصول بھی وصول کرتا تھا۔[21] ضیاء الدین کے بقول گائے بکری جیسے تمام دودھ دینے والے جانوروں پر محصول عائد کیا گیا تھا۔ برنی چرائی کے محصول کی نہ تو حدود بیان کرتا ہے۔ نہ ہی ان کے مستثنیات۔ لیکن فرشتہ کے مطابق دو جوڑ بیل، ایک جوڑ

---

۱۷۔ برنی ص ۲۸۸

۱۸۔ مورلینڈ، اگریرین سسٹم، ص ۵؛ منوسمرتی باب ہشتم؛ ارتھ شاستر ص ۱۴۰

۱۹۔ اغانی ص ۳۲۵۔

۲۰۔ برنی ص ۲۸۴

۲۱۔ برنی ص ۲۸۷ کا متن ہے کہ

"از گاؤمیش یا گوسپند ہرچہ شیر آور بود چرائی بستانیند و چرائی تعین شد و از پس ہر خانہ سکونت گری طلب نمایند" (گائے اور بھیڑ جو بھی دودھ دیتی تھیں ان پر محصول لگانا چاہیے اور ہر گھر سے رہائشی محصول وصول کرنا چاہیے)

یہ الفاظ صراحت سے بتاتے ہیں کہ تمام دودھاری جانوروں پر محصول لیا جاتا تھا اور اس کے علاوہ ہر گھر (ہر خانہ) سے ایک گھر بارہ محصول رہائشی لیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر قریشی (مذکورہ بالا ص ۲۳۳-۱۳۲) کا خیال ہے کہ گری یقیناً

بھینسیں، دو گائیں اور دس بکریاں محصول سے آزاد تھیں[۲۲] مسلم قانون میں ٹیکس کی سب سے کم مقدار (نصاب) گائے اور بھینس میں تیس عدد اور بکری اور بھیڑ میں چالیس ہیں[۲۳] اس نصاب کو مدِنظر رکھتے ہوئے فرشتہ کی بیان کردہ تعداد بالکل مناسب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ نہ تو فرشتہ کی معلومات کا ماخذ معلوم ہے نہ برنی ہی کسی قسم کے استثنا کا ذکر کرتا ہے فرشتہ کی تعداد لغوی طور پر قبول نہیں کی جا سکتی۔ یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین نے صرف ان جانوروں کو مستثنیٰ کیا تھا جو زراعت کے لیے ناگزیر تھے لیکن دودھ بھر گائیں بھینسیں اور بکریاں مستثنیٰ نہیں تھیں کیونکہ وہ دودھ دیتی تھیں، چراگاہ جاتی تھیں، اور ان کے مالکوں کے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ تھیں۔

ایک اور محصول کری یا کرہی تھا۔ اس محصول کے بارے میں کچھ یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ بظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ سنسکرت لفظ کر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں محصول۔ برنی اس کے بارے میں تفصیلات نہیں دیتا ہے لیکن یہ بڑے اطمینان سے فرض کیا جا سکتا ہے کہ کری متعدد چھوٹے محاصل میں سے ایک تھا جو ہندوستانی تاریخ کے ہندو اور مسلم ادوار میں وقتاً فوقتاً وصول کیے جا رہے ہیں۔

جزیہ ایک اور محصول تھا جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا جو نقد میں مساوی ہوتا تھا۔ اس اعانت کے جسے وہ دینے کے ذمہ دار ہوتے اگر وہ اپنے عقاید پر قائم نہ رہتے کیونکہ جس طرح وہ رہتے تھے اس طرح اسلامی ریاست میں رہنے کی وجہ سے ان کو اس کا دفاع کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا[۲۴] مزید برآں اس محصول کی وصولیابی کا اصل مقصد کافروں کو ذلت و رسوائی کا نشانہ بنانا تھا۔ اور ادائیگی کے دوران ذمی کا گریبان پکڑ کر اس کو خوب ہلایا جاتا تھا۔ اور اس کو کھینچا جاتا تھا تاکہ

---

حاشیہ (بقیہ گزشتہ)

غلط ہے۔ "کرہی" زیادہ قابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ "وہ گری کو کرہی پڑھنے کی کوئی وجہ نہیں بتلاتے ہیں۔" یہ اشارہ دیا جا سکتا ہے کہ کری یا کرہی جو گھر بارہ محصول رہائشی سے بالکل مختلف محصول تھا کو برنی نے صفحہ ۲۸۸ پر اور صفحہ ۲۸۹ پر ذکر کیا ہے اور اس کو مؤخر الذکر سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ مسلم قانون میں گھر بارہ کے سلسلے میں ضوابط کے لیے ملاحظہ ہو اغانی صفحہ ۲۸۸

۲۲۔ فرشتہ، اغانی صفحہ ۲۸۸

۲۳۔ اغانی، مذکورہ بالا، صفحہ ۵۲-۲۵۱، صفحہ ۵۳-۲۵۳

۲۴۔ اغانی صفحہ ۳۹۹

اس کی ذلت کا اظہار ہو۔[۲۵] وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جزیہ اس روح کے ساتھ نہیں وصول کیا جاتا تھا اور ایک خالص سادہ محصول بن کر رہ گیا تھا۔ جزیہ عورتوں اور بچوں، پاگلوں اور اپاہجوں پر نہیں لگایا جاتا تھا۔

دہلی کے سلاطین غربا، متوسط طبقہ اور مالداروں سے بالترتیب دس بیس اور چالیس تنکہ بطور جزیہ وصول کرتے تھے۔[۲۶] علاء الدین نے اپنی ہندو رعایا سے جزیہ وصول کیا لیکن اس نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا ماہرین قانون کے خیال کے مطابق عائد نہیں کیا تھا۔ خوطوں اور مقدموں کے گھمنڈ کے بارے میں شکایت کرتے ہوئے سلطان نے کہا تھا کہ "وہ بطور خراج جزیہ کری یا چرائی کے ایک قبیل بھی ادا نہیں کرتے"۔ یہ بصراحت بتاتا ہے کہ جزیہ بڑے مروجہ محاصل میں سے ایک تھا۔[۲۷] اس کے علاوہ دکن کے حکمران شاہی دارالسلطنت کو جو کچھ بطور خراج کے بھیجتے تھے وہ بھی جزیہ کہا جاسکتا ہے اگرچہ غیر مسلموں سے وصول کیے جانے والے محصول سے زیادہ وہ ایک سیاسی خراج تھا۔ اسی قسم کی راجپوت ریاستوں کے خراج تھے۔

ہمعصر مورخین جزیہ کے ذریعہ وصول کی جانے والی محاصل کے اعداد و شمار نہیں دیتے ہیں لیکن وہ تو خراج اور دوسرے محاصل کے بھی اعداد و شمار نہیں دیتے ہیں۔ لیکن یہ بہرکیف فرض کرنا موزوں ہوگا کہ جزیہ سے وصول ہونے والی آمدنی خاص رہی ہوگی کیونکہ وہ کافروں کی اتنی بڑی وسیع آبادی سے وصول کیا جاتا تھا۔ جزیہ صرف غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا اور قدرتی طور پر اسلام قبول کرنے پر منسوخ ہوجاتا تھا۔ اس طرح اسلام قبول کرنے سے اگرچہ مذہب کی سربلندی ہوتی تھی مگر ساتھ ساتھ اس سے ریاست کی آمدنی میں کمی بھی ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاطین جو دولت کے حصول کے بھوکے ہوتے تھے اور مذہب کی طرف جن کا زیادہ میلان نہیں ہوتا تھا وہ تبدیلی مذہب کو بہ نظر پسندیدگی نہ دیکھتے ہوں گے۔ ایسے بادشاہ قدامت پسند علماء کے ہاتھوں

---

۲۵۔ ملاحظہ ہو ابویوسف اتفاق میں صے۲۰۷ اور صے۴۳ اس سلسلے میں سلطان علاء الدین کو ذمیوں کی حیثیت کے بارے میں قاضی مغیث کی لاعلمی کا موازنہ ہو۔ اسلامی قانون میں جہاں تک ذمی کی حیثیت کا تعلق ہے قاضی کی معلومات صحیح تھیں۔

۲۶۔ عفیف صے۳۸۳

۲۷۔ برنی صے۲۹۱ "اصلاً از خراج، جزیہ، کری، و چرائی خود یک جیتل نمید ہند"

۲۸۔ جلال الدین خلجی اس کو ایک باقاعدہ محصول کے طور پر وصول کرتا تھا۔ برنی صے۲۱۸

اچھے سلوک کے سزاوار نہیں ہو سکتے تھے جتنے کہ فیروز شاہ تغلق جیسے سلاطین ہوتے تھے جو بڑے عجیب و غریب طور پر جزیہ اور تبدیلی مذہب دونوں کے بارے میں بیک وقت پُر جوش تھا۔ بلبن، علاء الدین اور محمد تغلق جیسے جابر حاکموں کے نزدیک شاہی خزانے کا معمور ہونا کافروں کی تبدیلیٔ مذہب کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ انھوں نے غیر مسلموں کو بنیادی طور پر اس لیے نہیں برداشت کیا تھا کہ وہ فراخ دل تھے یا اپنے نظریات میں وسیع المشرب تھے بلکہ ان کو غیر مسلموں کے غیر مسلم رہنے سے فائدہ ہوتا تھا۔ علاء الدین بطور بادشاہ کامیاب رہا ہو، اگر اس نے مذہبی طبقہ کی لعنت ملامت مول لے لی ؟

خمس جیسا کہ لفظ ہی سے ظاہر ہوتا ہے جہاد (مذہبی جنگ) کے اموال غنیمت (تمام) میں حکومت کا ۱/۵ حصہ ہوتا تھا۔ ۴/۵ حصہ سپاہیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سلطان علاء الدین نے جس کو اپنے خزانے کے پُر رہنے سے ہمیشہ دلچسپی رہتی تھی اور جو لوگوں کے مالدار ہونے کو ناپسند کرتا تھا قانون کو پس پشت ڈال دیا اور ۴/۵ حصہ ریاست کے لیے وصول کر لیتا تھا۔ یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ فیروز تغلق نے خزانے کے لیے مالِ غنیمت کا ۱/۵ حصہ لینے کے پرانے اصولوں کو پھر سے بحال نہ کیا۔

زکوٰۃ ایک مذہبی محصول ہے جو صرف مسلمانوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ ایک مسلمان زکوٰۃ ادا کر کے اور اپنی جائداد میں غریبوں کو شریک کر کے اپنے آپ کو گناہ سے پاک کر لیتا ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے اور اس کو طاقت کے ذریعہ نہیں وصول کیا جا سکتا [۲۹] لیکن چونکہ زکوٰۃ ادا کرنا ایک ثواب کا کام ہے اور چونکہ وہ قرآن کے نص صریح پر مبنی ہے اس لیے اس کو امام کو وصول کرنا چاہیے۔ زکوٰۃ بنیادی ضروریات زندگی مثلاً رہنے کے گھروں، کپڑوں، برتنوں، غلاموں اور کھیتی باڑی اور سواری کے جانوروں پر نہیں عائد ہوتی ہے [۳۰]۔ وہ صرف "ظاہری جائداد" پر جیسے سونا اور چاندی، گلہ اور سامانِ تجارت اور وہ بھی صرف اس وقت جب یہ محصول کی ایک خاص حد (نصاب) سے زیادہ ہو جائیں تو وصول کی جاتی ہے۔ مسلم ماہرین قانون نصاب کو متعین کرنے میں بڑے وسیع النظر رہے ہیں۔ غیر ظاہر جائداد پر مالک کو اختیار حاصل ہے کہ بغیر کسی قسم کی مجبوری کے جو کچھ چاہے ادا کر سکتا ہے عام

۲۹۔ آغانی ص ۱۔

۳۰۔ آغانی ص ۲۰۵۔ ترپاٹھی، مذکورہ بالا ص ۲۴۴

طور پر زکوٰۃ جائداد کے چالیسویں حصہ کے برابر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں زکوٰۃ محض ایک مذہبی محصول نہیں رہ گئی تھی جو صرف مسلمانوں سے وصول کی جائے اگرچہ فیروز شاہ جیسے ایک قدامت پسند حکمران نے اس کو ریاستی محاصل کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ یہاں زکوٰۃ سامان تجارت پر محصول درآمد کی شکل میں اور تمام دودھ دینے والے یا چراگاہ جانے والے جانوروں پر چرائی کے محصول کے طور پر عائد کی جاتی تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں سے وصول کی جاتی تھی۔[31] اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں کے لیے محصول درآمد کی شرح سامان کا ۵ فیصد اور غیر مسلموں کے لیے دس فیصد تھی۔[32]

---

۳۱۔ ڈاکٹر قریشی (مذکورۂ بالا، ص ۹۴) بیان کرتے ہیں کہ سلاطین دہلی زکوٰۃ وصول کرتے تھے اگرچہ مورخین اس حقیقت کا واضح ذکر نہیں کرتے۔ اس خاموشی کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلم قارئین کے لیے لکھ رہے تھے جن کے لیے ایک اسلامی نظم و نسق کا زکوٰۃ وصول کرنا اتنا ہی ظاہر و باہر تھا کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ دلیل کچھ زیادہ دل کو لگنے والی نہیں۔ غالباً زکوٰۃ کا تعین، سب سے زیادہ مشکل تھا اور اس سے بھی زیادہ مشکل تھی اس کی وصولیابی۔ وہ ظاہری جائداد پر عائد ہوتی تھی۔ اب ہم یہ جانتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں لوگ اپنی املاک چھپایا کرتے تھے کہ کہیں سلطان ان کی دولت کے بارے میں جان نہ جائے۔ علاء الدین کے عہد میں ایسا خاص طور پر ہوتا تھا چنانچہ گھر کی چہار دیواری میں احتیاط سے چھپائی ہوئی یا زیر زمین دفن کی ہوئی دولت پر کوئی زکوٰۃ وصول نہیں کی جا سکتی تھی۔ مزید یہ انسانی فطرت میں ہے کہ کسی محصول کی ادائیگی سے اس وقت تک گریز کرتے ہیں جب تک کہ ریاست ان سے تقریباً زبردستی وصول نہ کرے اور اگر کوئی شخص سزا کی بازپرس سے بچ کر ادائیگی کو نظر انداز کر سکے تو وہ کبھی بھی ادا کرنا پسند نہیں کرے گا۔ زکوٰۃ زبردستی وصول نہیں کی جا سکتی کیونکہ مجبوری اس کی ماہیت کو فاسد کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اطلاق صرف اس جائداد پر ہوتا ہے جو مالک کے قبضے میں کم از کم ایک سال تک رہی ہو۔ اگر کوئی شخص زکوٰۃ سے بچنے کے خیال سے اپنی قابل محصول جائداد کو کسی آدمی کے نام ادائیگی کی تاریخ سے ایک ہی دن پہلے منتقل کر دے تو وہ ادائیگی سے بچ جائیگا (آغانی، ص ۳۳-۵۳۰۔ ایسا ایک معاملہ ملاحظہ ہو بلاخمین، آئین اکبری، ص ۱۸۱) آخری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی آمدنی کی جانچ پڑتال نہیں ہو سکتی۔ کسی وصول کرنے والے افسر زکوٰۃ میں زیادہ رقم وصول کرنے اور خزانے میں کم رقم جمع کرنے پر کوئی روک بھی نہیں تھی۔ ایسے کسی مجہول محصول کی جگہ علاء الدین کے مالی نظم و نسق کے نظام میں نہیں تھی۔

۳۲ — آغانی، ص ۳۱۵

**ظاہری تصویر** جس کامیابی کے ساتھ سلطان کے احکامات کا نفاذ ہوا اس کا اور جمع شدہ محصول کے پورے حصے کا سہرا نائب وزیر شرف قاینی[33] کے سر بندھا ہے۔ کئی برسوں تک اس افسر نے پیہم کوشش کی کہ سلطنت کے زیادہ تر حصوں میں سلطان کے ضوابط کو نافذ کیا جائے وہ پیمائش کے نظام کو دہلی کے قرب و جوار کے اضلاع جیسے پالم ریواڑی افغان پور امروہہ، بدایوں اور کول میں نیز مغرب و شمال میں دیپال پور، لاہور، سامانہ، سنام اور کہتھاپر، مدوہین کھنکھی کے علاقوں میں اور جنوب میں مالوہ اور راجپوتانہ کے حصوں میں (یعنی بیانہ اور جھائن) روشناس کرانے میں کامیاب ہوا تھا لیکن گجرات، مالوہ اور اودھ کے صوبوں میں نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ پیمائش کا نظام ملک کے وسطی علاقے اور شمال اور مغرب کے بعض صوبوں میں نافذ تھا، مگر پوری سلطنت میں نہیں نافذ تھا اس کے باوجود یہ بھی علاء الدین اور اس کے نائب وزیر شرف قاینی کا ایک عظیم کارنامہ تھا جس کی مستعدی اور کارکردگی کو برنی شاندار خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

شرف قاینی نے مالی شعبہ میں بدانتظامی کو دور کرنے کے لیے انقلابی اقدامات کیے مرکزی حکومت کی جانب سے بڑے علاقوں کو خالصہ (شاہی زمین) میں تبدیل کرنے کے لیے بھی محصول کی مرکزی حکومت کی جانب سے پوری وصولیابی کے لیے اقدامات کرنے کو ضروری بنا دیا تھا۔ محصول کی وصولیابی میں نمایاں خرابیوں میں سے ایک تھی ناقص وصولیابی جو عام طور سے بڑے بڑے بقایا چھوڑ دیتی تھی جن کا حساب کیا جانا ہوتا تھا۔ چونکہ مالی نظام کی ابھی شروعات ہی تھی اور تعین اور وصولیابی کا نظم ابھی تک غیر ترقی یافتہ تھا اس لیے وصول نہ ہونے والے بقایا غالباً ناگزیر تھے۔[34] مزید برآں کمتر مالی افسران جن کی تعداد خالصہ زمین کے علاقے میں اضافے کے ساتھ ساتھ یقیناً بڑھی ہوگی۔ بدعنوان اور استحصال کرنے والے تھے۔ علاء الدین ان برائیوں کا خاتمہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس نے ایک شعبہ قائم کیا جس کا نام تھا "دیوان مستخرج" مستخرج کے فرائض میں سے تھا کہ وہ وصول کنندہ کے نام رہ جانے والے بقایا کی چھان بین کرنے اور ان کو وصول کرے۔[35] عالمو

---

۳۳۔ برنی کا کلکتہ متن (صفحہ ۲۸۸) میں شرف قائی ہے لیکن میجر طرکے متن میں شرف قاینی ہے۔ موخر الذکر کا نام صحیح اور ایران میں مشہور ہے۔

۳۴۔ ترپاٹھی، مذکورۂ بالا، صفحہ ۲۶۳۔

۳۵۔ برنی صفحہ ۲۸۸، صفحہ ۲۹

اور کارکنوں کو سخت سزا دیتا تھا اگر وہ پوری پوری بقایا وصول کرنے میں ناکام رہتے تھے بدعنوانی ختم کرنے کے لیے مالی شعبہ کے پٹواریوں اور دوسرے چھوٹے افسروں کے خلاف بھی سخت اقدامات کیے جاتے تھے۔ یہ محسوس کر کے کہ افسروں کی قلیل تنخواہیں ان کو رشوت قبول کرنے یا زبردستی لینے کی ترغیب دیتی ہیں سلطان نے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا "تاکہ وہ عزت و آبرو اور آسائش کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں لیکن جب اس اقدام نے معاملات نہ سدھارے اور چھوٹے افسروں میں بدعنوانی جاری رہی تو سلطان نے ان لوگوں کو بیرحمی سے سزائیں دیں جو بدعنوانی کے مجرم پائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سزائیں یقیناً سخت تھیں کیونکہ علاء الدین نے قاضی مغیث کو بتایا تھا کہ اس نے ہزاروں کلرکوں کو اور وصول کنندوں کو سزا دی۔ ان کو بھکاری بنا کر چھوڑا اور ان کو بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا۔ عاملوں اور پٹواریوں کی روشن پر علاء الدین کی سخت نگہداشت، اعلیٰ افسروں اور خود سلطان کا ان کی مالی کتابوں (بہی کھاتوں) کا معائنہ اور رشوت ستانی اور چھوٹے موٹے حسابات نپٹانے کرنے پر ان کو ملنے والی سخت سزاؤں نے مالی شعبہ کے چھوٹے افسروں کو بدنام کر دیا تھا یا پانچ ایک ہزار تنکہ کے لیے مالی افسروں کو کئی سال کے لیے جیلوں میں رکھا جاتا تھا۔[36] اور شعبۂ مال میں ملازمت کو "طاعون" سے زیادہ خراب تصور کیا جانے لگا تھا۔ برنی مبالغہ کے ساتھ کہتا ہے کہ کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی مالی افسر سے نہیں کرتا تھا جبکہ نگران اعلیٰ (متصرف) کا عہدہ صرف وہ شخص قبول کرتا تھا جس کے نزدیک زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ ان افسروں کے زیادہ دن جیل میں گزرتے تھے جہاں وہ لاتیں گھونسے کھاتے رہتے تھے۔[38] لیکن علاء الدین کی سخت سزاؤں کا خاطر خواہ اثر نکلا۔ ضیاء الدین اس کی تائید کرتا ہے کہ کسی کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ بطور رشوت یا استحصال ایک تنکہ بھی کسی ہندو یا مسلمان سے وصول کر سکے۔[39]

مالی نظم و نسق پر بحث کو ختم کرنے سے قبل یہ کہا جا سکتا ہے کہ علاء الدین نے نہ تو اقطاع نظام یا خوطی کا نظام ختم کیا تھا۔ اس نے صرف زمینداروں طبقہ کی مراعات منسوخ کر دی تھیں اور ان کے غرور

۳۶۔ ایضاً ص ۲۹۶ میں ہزار کی کال گنتی ہے لیکن اس کو لغوی طور پر قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۷۔ یہ امر کہ علاء الدین کے بیٹے اور جانشین قطب الدین مبارک خلجی نے دہلی اور اس کے مضافات کی جیلوں سے سترہ ہزار قیدی رہا کیے تھے یہ بتاتا ہے کہ معصر مورخ کا بیان مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ برنی ص ۳۸۲

۳۸۔ برنی ص ۲۸۹

۳۹۔ برنی ص ۲۸۹

کو خاک میں ملا دیا اور ان کو مجبور کیا تھا کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں مفلوک الحال کی نہ سہی۔ لیکن اپنے سخت مطالبات سے اس نے کاشتکاروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا تھا جس کے لیے ضیاء الدین اس پر سخت تنقید کرتا ہے کہ کاشتکار اپنی پیداوار کا پچاس فیصد بطور لگان ادا کرتا تھا، اس کے علاوہ اس کو جزیہ، گھر یا محصول اور چرائی کا محصول جیسے دوسرے محاصل ادا کرنے پڑتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کو اپنے فاضل غلہ کا ذخیرہ حکومت کے مقرر کردہ نرخ پر فروخت کرنا پڑتا تھا کہ ان گوداموں کو پر کیا جائے جن کو سلطان نے اپنے مارکیٹ کنٹرول کے سلسلے میں تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہم دوسرے باب میں علاء الدین کے بازار کے ضوابط کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ انھوں نے کاشتکاروں کے مفادات پر کس طرح ضرب لگائی تھی یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ کاشتکار کو اپنی محنت کے بدلے میں صرف اقل ترین روزی ملتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ علاء الدین کے ضوابط سیاسی تقاضوں کا نتیجہ تھے تاہم اس کے لیے یہ ناممکن نہ تھا کہ وہ زمین کا سینہ چیر کر دانے نکالنے والوں اور خود اپنے مالی افسران کے لیے جن کی زندگی اس نے اجیرن کر دی تھی ذرا کم ظلم کرتا۔ علاء الدین کے نظم و نسق کی ہر چیز میں تشدد کی جھلک تھی اور اگر شیخ بشیر نے کہا تھا کہ علاء الدین کی حکومت کی بنیادیں بہت کھوکھلی تھیں تو انھوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ معاشی خوشحالی کسی مستحکم حکومت کی بنیاد ہوتی ہے نہ کہ طاقت، لیکن علاء الدین اپنے ملک کے باسیوں کو کنگال کرنا چاہتا تھا تاکہ لفظ "بغاوت" ان کے ہونٹوں سے نہ نکلے۔

علاء الدین کے اقدامات سچ مچ جابرانہ تھے۔ کاشتکار طبقہ کے پاس جو کہ آبادی کی اکثریت پر مشتمل تھا صرف قلیل ترین مقدار چھوڑنے کا تصور ہی ملک کے باشندوں کو کنگال کرنے کے مترادف تھا۔ آنے والے دنوں میں غیاث الدین تغلق نے بھی یہی حکمت عملی اپنائی تھی۔ مالی افسروں کو اس کی ہدایات تھیں کہ "ہندوؤں کے پاس ایک طرف تو نہ اس قدر چھوڑنا چاہیے کہ وہ اپنی دولت کی بنا پر مغرور ہو جائیں اور دوسری طرف وہ نہ ہی اس قدر مفلوک الحال ہو جائیں کہ عالم مایوسی میں اپنی زمینیں اور کاشتکاری چھوڑ بیٹھیں"۴۴ محمد تغلق کا لگان میں اضافہ اس کے نتیجہ میں کاشتکاروں کو ہونے والی دقتیں اتنی معروف ہیں کہ ان کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شمس سراج عفیف سچ مچ ایک "نا ایک تصویر" پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "پچھلے ادوار میں ناعاقبت اندیشانہ ضوابط بنائے گئے اور لگان کی وصولیابی کے سلسلے میں رعایا اور رعیت سے استحصال کیا گیا۔ اس کتاب کے مصنف کو کئی معتقدوں نے بتایا کہ رعیت کے پاس ایک گائے چھوڑ دی جاتی تھی اور بقیہ سب کچھ چھین لیا جاتا

۴۴ — برنی، ص ۴۳۰

تھا۔"[41] تمنا ہوتی ہے کہ کاش اقل ترین مقدار کا اصول صرف خلجی اور تغلق ادوار تک محدود ہوتا مغل عہد میں یقیناً کاشتکاروں کے دن بہتر ہوئے۔ لیکن مغل خاندان کے آخری عظیم شہنشاہ نے بھی ایسے ضوابط نافذ کیے کہ کاشتکاروں کے پاس صرف روزی روٹی کے سوا اور کچھ نہ بچا" اورنگ زیب کی ہدایات تھیں کہ "ہر اس شخص کے لیے جو اپنی زمین پر کاشت کرتا ہے صرف اتنا چھوڑا جائے گا جو اس کی اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کے لیے اور بیج کے لیے اگلی فصل تک کافی ہو۔ صرف اتنا ہی اس کے پاس چھوڑا جائے گا جو کچھ بچ رہتا ہے وہ لگان ہے اور وہ ریاستی خزانے میں داخل کیا جائے گا"

ڈاکٹر تارا چند مزید کہتے ہیں کہ "یہ حکمت عملی خودکشی پر مبنی تھی کیونکہ اس نے ان مرغی کو ہی مار ڈالا جو سونے کے انڈے دیتی تھی۔ اس نے پیداوار میں اضافہ کرنے یا کاشتکاری کے طریقے کو ترقی دینے کے لیے کوئی محرک نہیں چھوڑا۔"[42] اس کے مدنظر قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہندوستانی عوام کو کنگال کرنے کا الزام بجا طور پر لگایا جاتا ہے۔

## فوجی اصلاحات

ہمعصر مورخ اور سیاسی مفکر ضیاء الدین برنی کہتا ہے کہ "بادشاہت دو ستون پر قائم ہوتی ہے، پہلا ستون نظم و نسق ہوتا ہے اور دوسرا ستون فتوحات ہوتی ہیں۔ ان دونوں ستونوں کو فوج سنبھالتی ہے۔ اگر بادشاہ فوج کے بارے میں کوتاہ اندیش ہوتا ہے تو وہ سلطنت کو اپنے ہی دونوں ہاتھوں سے تباہ کرنے لگتا ہے"[43] بجا طور پر قرون وسطیٰ کا یہی تصور تھا "بادشاہت فوج ہے اور فوج بادشاہت ہے"[44]

علاء الدین جیسا ایک سلطنت کا بانی اپنی فوج کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ اس نے اپنے عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں اس کو از سر نو منظم کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔ رنتھمبور اور چتوڑ میں اس کے نقصانات، مشرق میں ملک جونا کی ناکام مہم اور اس اثنا میں خود دہلی میں

---

41۔ تاریخ فیروز شاہی، مترجمہ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم ص ۲۸۹-۹۰

42۔ فرمنگر (Firminger) اور جان اسٹریچی (John Strachey) بحوالہ تارا چند، ہندوستان میں تحریک آزادی کی تاریخ (History of Freedom Movement in India) جلد اول، شعبہ اشاعت The Publication Division. ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۲۱

43۔ تارا چند، مذکورہ بالا، ص ۱۲۷

44۔ فتاوائے جہانداری، ص ۲۲ - نیز موازنہ ہو کیقباد کو بغرا خان کی نصیحت، ز برنی ص ۱۰۴

45۔ ایضاً، ص ۲۲

طرغی کے زیرِ قیادت منگولوں کی آمد نے مسلح افواج کو ایک موثر مقام تک پہنچانے کی شدید ضرورت سلطان کے ذہن نشین کرادی تھی اور اس نے فوجی نظم و نسق کو از سرِ نو ترتیب دینے کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کردی۔

**قلعے**

جس طرح فوج سلطنت کی پشت پناہ تھی اسی طرح قلعے فوج کی فصیل تھے وہ فوجی چوکیوں کا کام دیتے تھے، منگول حملوں کے خلاف سلطنت کی حفاظت کرتے تھے اور سپاہیوں کے لیے گھر مہیا کرتے تھے۔ برنی ہم کو بتاتا ہے کہ بلبن نے قلعوں کی تعمیر پر خاص توجہ دی تھی۔ شمال مغربی سرحد پر متعدد قلعوں کو تعمیر کرنے کے علاوہ اس نے بعض مستحکم قلعے کامپل، پٹیالی اور بھوج پور جیسے مقامات پر تعمیر کیے۔ ۱۳۰۳ء میں طرغی کے حملے کے بعد علاء الدین نے قلعہ بندی کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے فوجی اہمیت کے مقامات پر پرانے قلعوں کو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ان قلعوں میں آزمودہ کار اور ہوشیار کماندار مقرر کیے گئے جن کو کوتوال کہا جاتا تھا۔ تمام قلعوں میں منجنیقوں اور عرادوں کو بنانے، ماہر فن انجنیروں کو ملازم رکھنے، ہر قسم کے ہتھیاروں کو فراہم کرنے اور غلہ اور چارے کے گوداموں کا انتظام کرنے کے احکامات صادر ہوئے۔“ ۴۶

**فوج**

اگرچہ بالقوہ تمام مسلمان ریاست کی فوج کے سپاہی تھے، تاہم عام طور سے صرف پیشہ ور سپاہی ہی اس میں بھرتی کیے جاتے تھے۔ وہ سپاہیوں کے کئی طبقات پر مشتمل تھی پہلے تو سلطان کے ذاتی محافظ تھے جن کو جاندار کہا جاتا تھا۔ وہ براہِ راست سلطان کی نگرانی اور مستقل ملازمت میں رہتے تھے۔ دوسرے گھوڑ سوار اور پیادے تھے۔ وہ سلطنت کی مستقل اور معینہ فوج کا حصہ ہوتے تھے۔ تیسرے مخصوص سپاہی ہوتے تھے جو ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اور جنگ کے زمانے میں بھرتی کیے جاتے تھے۔ ۴۷

علاء الدین خلجی فوج کو براہِ راست بھرتی کرتا اور ریاست کے خزانے سے سپاہیوں کو نقد تنخواہیں دیتا تھا۔ شہاب الدین عباس احمد سلطنت کی فوج کے بارے میں یوں لکھتا ہے: ”فوج شہسواروں پر مشتمل ہے۔۔۔ ان میں سے کچھ سلطان کے پاس تعینات رہتے تھے اور بقیہ سلطنت کے مختلف حصوں میں منقسم ہوتے تھے۔ ان سب کا ریاست کے رجسٹروں میں اندراج ہوتا ہے۔۔۔ یہ سپاہی ترکوں، خطا کے باشندوں، ایرانیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں لڑاکے (پہلوان) دوڑنے والے (شطار) اور ہر قسم کے لوگ

۴۶۔ برنی ص ۳۰۳۔ ۳۰۲

۴۷۔ ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی فوج میں غیر مسلموں کی بھرتی کے خلاف تھا۔ فتاوائے جہانداری ص ۲۶۔ ۲۵

پائے جاتے ہیں۔ ان کے پاس بہترین گھوڑے، شان دار اسلحے اور خوبصورت ملبوسات ہیں۔ بیٹا[۴۸] اگرچہ شہاب الدین محمد بن تغلق کے عہد حکومت کے بارے میں لکھتا ہے لیکن یہ بیان علاء الدین کے عہد پر پوری طرح صادق آتا ہے کیونکہ علاء الدین ہی نے فوجی نظام کی بنیادیں ڈالی تھیں جس کو آنے والے سلاطین نے اپنایا تھا۔

علاء الدین کی فوج ترکی نمونہ پر مبنی تھی اور اکائیوں کے تقسیم اعشاری نظام پر قائم تھی۔ اس کی تصدیق برنی، شہاب الدین احمد اور حاجی الدبیر کرتے ہیں۔ اس نصیحت میں جو برنی بغرا خان کے منہ سے کہلواتا ہے وہ فوج کی تنظیم کی تشریح اس طرح کرتا ہے۔ "ایک سرخیل دس شہسواروں کی کمان کرتا ہے۔ ایک سپہ سالار دس سرخیلوں کی، ایک امیر دس سپہ سالاروں کی، ایک ملک دس امیروں کی اور ایک خان دس ملکوں کا افسر ہوتا ہے"[۴۹] یہاں کچھ تضاد ہے کیونکہ اگر اس بیان کی بنیاد پر حساب لگانے سے ایک خان کو ایک لاکھ سپاہیوں کی کمان کرنا چاہیے جبکہ مسالک الابصار کے مصنف شہاب الدین کے مطابق وہ صرف دس ہزار سپاہیوں کا افسر ہوتا تھا۔ لیکن ان اشکال کا ازالہ ہو سکتا ہے اگر یہ بات یاد رکھی جائے کہ امیر کی اصطلاح عموماً ایک کلی مفہوم میں تمام اعلیٰ شہری اور فوجی حکام کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی جب کہ سپہ سالار کو بعض اوقات ایک فوجی افسر کے لیے بلا امتیاز اس کے منصب اور مقام کا لحاظ کیے بغیر استعمال کیا جاتا تھا۔

**لشکر گاہ اور اسلحے** امیر خسرو ایک مہم کے دوران کھلے میدان میں لشکر گاہ کا ایک عام خاکہ بھی دیتے ہیں۔ ہر تومان کو ایک ہزار سوار اور سو گز زمین دی جاتی تھی، خیموں سے گھرے ہوئے قلعہ کا پورا قطر بارہ ہزار پانچ سو چھیالیس گز ہوتا تھا[۵۰]۔ جنگ میں سپاہی اور اس کا گھوڑا پوری طرح محفوظ رہتا تھا۔ گھوڑا لوہے میں پوری طرح غرق ہوتا تھا اور سپاہی زرہ بکتر اور خود سے لیس ہوتا تھا۔ سپاہی کے پاس دو تلواریں ہوتی تھیں اس کے علاوہ اس کے پاس کمانیں اور نیزے اور جنگی کلہاڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ معمول ہے کہ ہندستان میں ایک سپاہی دو تلواریں لے کر چلتا ہے، ایک جس کو رکاب کی تلوار کہا جاتا تھا جو اس کی زین سے بندھی ہوتی

۴۸۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم ص ۵۷۶

۴۹۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۵؛ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۲۰۰؛ ظفر الوالہ، ص ۸۴۴

۵۰۔ خزائن۔ ترجمہ حبیب ص ۴۴

تھی اور دوسری اس کے ترکش میں ہوتی تھی۔[۵۰] ہاتھی دھات کے بکتروں میں ملبوس ہوتے تھے اور پیادہ سپاہیوں کو تلوار اور خنجر کے علاوہ لمبی کمانیں اور تیر فراہم کیے جاتے تھے۔ محاصرہ کے آلات منجنیق، عرادہ اور مغربی پر مشتمل ہوتے تھے۔ وہ پتھر اور پھینکے جانے والے آلات ہوتے تھے۔ گرگچ ایک مسقف چبوترہ ہوتا تھا جس میں پہیے ہوتے تھے تاکہ اس کی حفاظت میں قلعہ کی جڑ تک پہنچا جا سکے۔ وہاں اونچی مچان ہوتی تھی تاکہ کسی حملے کے دوران قلعہ کی چوٹی پر پہنچا جائے۔ فوج خاص طور سے گھڑسواروں اور پیادوں پر مشتمل ہوتی تھی، ہاتھی بھی جنگ کے زمانے میں استعمال کیے جاتے تھے۔ دیوان عرض (وزیر جنگ) ہر سپاہی کا ایک توضیحی رجسٹر رکھتا تھا۔ علاء الدین نے گھوڑوں کو نشان زد کرنے[۵۱] (گرم لوہے سے داغنا یا داغ) کے نظام کو جاری کیا تھا تاکہ معائنہ کے وقت ایک گھوڑا دوبارہ نہ پیش کیا جا سکے یا اس کی جگہ کوئی کمزور گھوڑا بدل دیا جائے۔ وقتاً فوقتاً فوج کا بڑا سخت معائنہ کیا جاتا تھا اور سپاہیوں کے گھوڑوں اور اسلحوں کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ سپاہیوں اور اسلحہ جات کی جانچ مکمل ہوتی تھی۔ امیر خسرو کے مطابق وارنگل جانے والی فوج کے معائنہ اور عرض میں چودہ دن لگے تھے۔[۵۲]

علاء الدین نے مستقل طور پر ایک تربیتی شدہ فوج کی کفالت کی اور کوئی فتح حاصل ہونے یا کوئی غیر ملکی حملہ پسپا کر لانے کے فوراً بعد وہ اپنے سپاہیوں کو برخاست نہیں کرتا تھا۔ فرشتہ کے سبب سلطان کا عظیم لشکر چار لاکھ کچھتر ہزار سواروں پر مشتمل تھا جو پوری طرح سے لیس اور تربیت یافتہ تھا۔

## ایک سپاہی کی تنخواہ

ایک سپاہی کی تنخواہ سے متعلق برنی کی عبارت ناقص ہے اور وہ کافی اختلاف کا باعث بنی ہے۔ اس کے ترجمہ میں علاء الدین کہتا ہے:

دو لاکھ چالیس ہزار تنکہ مرتب و معظم (؟) دستخط کرے گا ... اس کے علاوہ ان کا ... تعداد ... [illegible]

۵۱۔ ... ابن بطوطہ ... [illegible]

۵۲۔ برنی ص ۳۱۹

۵۳۔ خزائن الفتوح، ترجمہ حبیب، ص ۵۸

۵۴۔ برنی ص ۳۰۲

(میں دو سو چونتیس تنکہ ایک مرتب کو اور اٹھتر تنکہ ایک دواسپہ کو دیتا ہوں میں دو گھوڑے اور اسی کی مناسبت سے ساز و سامان مرتب سے اور ایک گھوڑا اور اسی کے مناسب ساز و سامان اس سے چاہتا ہوں)

مرتب کا مطلب ہے بوجھ لادنے والا جانور۔ مرتب سے مراد ہے جس کو ترتیب دی گئی ہو۔ یعنی مرتب: درجہ بند مستقل۔ یہ لفظ مرتبہ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جس نے کوئی مقام یا مرتبہ حاصل کر لیا ہو۔ چنانچہ مرتب کے معنی ہیں ایک مستقل سپاہی (جو غیر مستقل سپاہی جس کو کسی مہم کے وقت فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے اور اس کے فوراً بعد برطرف کر دیا جاتا ہے کی ضد ہوتا ہے) کے ہیں جو دیوان کے عرض یا معائنہ کے بعد بھرتی کیا جاتا ہے اور جس کو ریاست کے خزانے سے براہ راست تنخواہ ملتی ہے۔ اس زمانے میں غیر تربیت یافتہ سپاہی مستقل فوجی کے بطور بھرتی نہیں کیے جاتے تھے صرف پیشہ ور سپاہی جن کے پاس اچھا ساز و سامان اور اسلحے ہوتے تھے فوج میں لیے جاتے تھے۔ ایک سپاہی جس کا مناسب معاینہ اور بھرتی ہو جاتی تھی مرکزی اصطلاح میں مرتب کیا جاتا تھا۔ سلطان اس کی تنخواہ دو سو چونتیس تنکہ سالانہ مقرر کرتا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ایک ایسے سپاہی کے پاس (کم از کم) ایک گھوڑا ہو۔ لیکن اگر اس کے پاس دو گھوڑے ہوں (جو اس کی استعداد میں اضافہ کرتے ہیں) تو اس کو فالتو گھوڑے کے لیے ۷۸ تنکہ کا ایک الگ بھتہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ دو گھوڑوں والا سپاہی جو تکنیکی لحاظ سے دو اسپہ کے نام سے معروف تھا تین سو بارہ تنکہ تنخواہ پاتا تھا۔ دو سو چونتیس تنکہ ایک گھوڑے والے سپاہی کی ذاتی تنخواہ کے بطور اور ۷۸ تنکہ ایک گھوڑا رکھنے کی وجہ سے۔ چونکہ اس کو ایک فالتو گھوڑے کے لیے علاحدہ سے بھتہ ملتا تھا اس لیے سلطان کا اصرار تھا کہ وہ فالتو گھوڑے ضرور رکھے۔ لیکن عام طور سے ایک سپاہی دو سو چونتیس تنکہ پاتا تھا۔ اس کو صرف ایک گھوڑا رکھنا پڑتا تھا اور تکنیکی طور سے یک اسپہ کہا جاتا تھا۔ یہ ظاہری بات ہے کہ ایک یک اسپہ کو یا جس کے پاس دو سے زیادہ گھوڑے ہوتے تھے کوئی مزید بھتہ نہیں ملتا تھا۔

اس لیے برنی کی مذکورہ بالا عبارت کا حسب ذیل ترجمہ کیا جا سکتا ہے:

"میں ایک مرتب یا مستقل سپاہی کو دو سو چونتیس تنکہ دیتا ہوں اور (مزید) ۷۸ تنکہ ایک دو اسپہ (یا دو گھوڑوں والے سپاہی) کو دیتا ہوں۔ میں دو اسپہ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ دو گھوڑوں اور اپنے کے تناسب سے ان کا ساز و سامان فراہم کرے گا۔۔۔۔"

برنی کی ایک دوسری عبارت میں اسی خیال کو دہرایا گیا ہے [55] جس میں وہ کہتا ہے کہ ایک سپاہی (مرتب) کی تنخواہ اور ایک دو اسپہ کا مزید بھتہ ان کے لیے بالکل کافی ہوتا تھا۔

"از پس آنکہ نرخہای اسباب ارزانی گرفت چشم مرتب بدویست سی چہار تنکہ و دو اسپہ بہفتاد و ہشت تنکہ بسیار مستقیم گشت۔"

(جب اشیائے ضروری کی قیمتیں ارزاں ہوگئیں ایک مرتب دو سو چونتیس تنکہ میں ملازم رکھا جا سکتا تھا اور ایک دو اسپہ اٹھتر تنکہ میں (اس لحاظ سے فوج میں) اضافہ ہوا اور وہ مستحکم ہوگئی)

اس خیال کی مزید تصدیق حسب ذیل عبارت سے ہوتی ہے جس میں قاضی مغیث الدین بادشاہ کو ایک معمولی سپاہی کی زندگی بسر کرنے [56] اور خود پر اور اپنے خاندان پر صرف دو سو چونتیس تنکہ خرچ کرنے کی ہدایت کرتا ہے:

"چنانکہ خداوند عالم اہل جہاد را دویست سی و چہار تنکہ تعین کردہ است ہماں مقدار خداوند عالم را از برائے نفقۂ خاصہ و حرم خود بر باید داشت۔"

(جس طرح عالی جاہ نے اہل جہاد کے لیے دو سو چونتیس تنکہ مقرر کیے ہیں اسی طرح عالیجاہ کو بھی اپنے اور اپنے خاندان والوں کے اخراجات کے لیے اتنی ہی رقم لینی چاہیے)

ہمعصر مورخ کی عبارتوں سے جو اوپر مذکور ہوئیں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ایک سپاہی (اہل جہاد) کی تنخواہ دو سو چونتیس تنکہ تھی جب کہ دو گھوڑوں کے مالک کو اٹھتر تنکہ کا ایک الگ بھتہ ملتا تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی [57] بہرکیف فرشتہ سے اتفاق کرنے کی طرف مائل ہیں۔ جو کہتا ہے کہ سپاہیوں کے تین طبقات تھے اور وہ بالترتیب دو سو چونتیس، ایک سو چھپن اور اٹھتر تنکہ پائے جاتے تھے۔ فرشتہ کے متن کی عبارت یوں ہے:

"مواجب سالیانہ سپاہی را بریں نہج مقرر ساخت۔ اول، دویست و سی چہار تنکہ، دوم یک صد و پنجاہ و شش تنکہ، سوم ہفتاد و ہشت تنکہ۔ و چوں عمال بدیں دستور عمل نمودند چہار لک و ہفتاد پنج ہزار سوار بقلم در آمد۔"

(ایک سپاہی کی سالانہ تنخواہ اس طرح سے مقرر کی جاتی تھی۔ اول ۲۳۴ تنکہ، دوم ۱۵۶ تنکہ (اور) سوم ۷۸ تنکہ اور جب عاملوں (مالیہ کے افسروں) نے اس اصول پر عمل کیا تو ۴,۷۵,۰۰۰ سوار بھرتی کیے گئے)

---

۵۵۔ ایضاً ص ۳۱۹ ۵۶۔ برنی ص ۲۹۴-۲۹۳

۵۷۔ ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی، ص ۲۳۴-۳۵

ڈاکٹر قریشی کا خیال ہے کہ سواروں کے تین طبقات تھے، مرتب، سوار اور دو اسپہ اور وہ بالترتیب ۲۳۴، ۱۵۶ اور ۷۸ تنکہ پاتے تھے۔ وہ یہ دکھانے کے لیے برنی کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں[۵۸] کہ سوار ایک دو اسپہ سے اعلیٰ تر تھا کیونکہ جب اول الذکر اپنے سامنے سے ایک سو منگول سواروں کو مار بھگاتا تھا تو موخر الذکر صرف دس کو قید کر پاتا تھا۔

"لشکر اسلام بر لشکر مغل چناں چیرہ گشت کہ یکدو اسپہ دہ مغل را رشتہ در گردن انداختہ می آورد یک سوار مسلمان صد سوار مغل را پیش کردہ می دوانید"

(لشکر اسلام منگولوں کے لشکر پر اتنا حاوی ہوگیا تھا کہ ایک دو اسپہ دس منگولوں کو ان کی گردنوں میں پھندہ ڈال کر پکڑ لیتا تھا اور ایک مسلم سوار اپنے سامنے سے سو منگول سواروں کو مار بھگاتا تھا۔)

اول تو یہ بات ہے کہ کوئی بات یہ نہیں بتاتی کہ مرتب فوج میں کوئی اعلیٰ افسر ہوتا تھا۔ اگر وہ ایسا افسر ہوتا تو برنی اس کا منصب دیتا یا کم از کم ایسی کوئی بات کہتا۔ اس کے برعکس مرتب ایک معمولی سپاہی (اہل جہاد) سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا کیونکہ دونوں دو سو چونتیس تنکہ پاتے تھے۔ برنی کسی جگہ سوار کا ذکر بطور طبقہ کے افسر کے نہیں کرتا اور نہ یہ کہتا ہے کہ سب سے نچلے طبقہ کا سپاہی دو اسپہ کے نام سے معروف تھا۔ مذکورہ بالا عبارت میں برنی لفظ سوار کو محض ایک شہسوار کے مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ وہ صراحت سے اس کا ذکر نہیں کرتا کہ ایک سوار کسی طرح بھی ایک دو اسپہ سے برتر ہوتا تھا۔ اس کے کہنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندستانی سپاہی اتنے حاوی ہو گیے تھے کہ ایک دو اسپہ دس جنگی قیدی پکڑ سکتا تھا اور ایک سپاہی یا سوار اپنے سامنے سے سو منگولوں کو بھگا سکتا تھا۔ سو آدمیوں کو مار بھگانے سے دس آدمیوں کو پکڑنا زیادہ مشکل ہے اور مذکورہ بالا عبارت ایک دو اسپہ پر ایک سوار کی برتری ثابت نہیں کرتی۔ یہ صرف ہندستانی سپاہیوں کی برتری ظاہر کرنے کا ایک مبالغہ آمیز طریقہ ہے اور اس عبارت کو لغوی طور پر نہیں قبول کرنا چاہئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ایک باقاعدہ طور پر بھرتی کیے جانے والے سپاہی کی تنخواہ ۲۳۴ تنکہ سالانہ یا ۱۹½ تنکہ ماہانہ مقرر تھی۔ ایک فالتو گھوڑا رکھنے کے لیے ۶½ تنکہ اور ملتے تھے۔ بہرکیف فرشتہ کی تجویز کردہ خطوط پر سپاہیوں کے کوئی طبقات نہیں تھے۔

سپاہی کی تنخواہ کافی کم تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین اپنی فوج کو مطمئن رکھنے کے لیے بہت کوشاں رہتا تھا۔ ملک تاج الدین کافور کو اس کی ہدایات جب کہ اول الذکر وارنگل

---

۵۸۔ برنی ص ۳۲۰

کی جانب ایک مہم پرروانہ ہوا تھا علاءالدین کی دلچسپی کو واضح انداز سے بتاتی ہیں جو وہ اپنے
سپاہیوں کی فلاح و بہبود میں رکھتا تھا۔ وہ اپنے جنرلوں اور سپاہیوں پر جب بھی وہ دکن سے
واپس آتے تھے انعام و اکرام کی بارش کیا کرتا تھا۔ لیکن بادشاہ اپنے سپاہیوں کو اعلیٰ تنخواہیں
نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ان کی کفالت کے لیے زمینوں کے عطیات بھی دینے کے خلاف تھا۔ اس
کے نتیجہ میں اس نے ضروریات زندگی ارزاں کر دیں۔ بازار کو کنٹرول کیا اور مختلف دوسرے
معاشی اقدامات کیے جن کا مطالعہ اگلے باب میں کیا جائے گا۔ یہ اصلاحات سپاہیوں کو فائدہ
پہنچانے کی غرض سے کی گئی تھیں اور وہ سلطان کی اس دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں جو وہ فوج کی
فلاح و بہبود میں لیتا تھا کہ جس پر اس کے حوصلوں کی تکمیل اور ریاست کا دفاع منحصر تھا۔

# باب 12

# معاشی ضوابط

لگاتار فتوحات کے لیے علاء الدین کا جوش اور شمال مغرب سے منگول لٹیروں کے مسلسل حملوں نے ایک کثیر فوج کی فراہمی ناگزیر بنا دی تھی۔ فوج کے علاوہ سرکاری افسران کے ایک بڑے عملہ، شہری اور فوجی نظم و نسق اور غلاموں[1] کے اخراجات شاہی خزانے پر بھاری بوجھ تھے۔ سلطان جلال الدین کے عہد میں جمع شدہ دولت،[2] ۶۹۶ھ میں دیوگیری پر حملے سے حاصل شدہ خزانے اور سلطنت کے مختلف صوبوں اور ماتحت علاقوں سے وصول کردہ سالانہ خراج اس مالی بوجھ کو اٹھانے میں ناکافی ثابت ہوئے۔ حتیٰ کہ لگان کا پیداوار میں پچاس فیصد تک اضافہ، مختلف قسم کے محاصل کا اجراء، شراب نوشی کے طلائی و نقرئی جام و صراحی کو سکوں میں ڈھالنا[3] بھی مملکت کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہے۔ حساب لگایا گیا کہ اگر بادشاہ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو اوسط درجہ کی تنخواہ پر بھی بھرتی کرے تو پانچ یا چھ سال کے عرصہ میں مملکت کا تمام خزانہ خالی ہو جائے گا۔[4] چنانچہ علاء الدین نے سپاہیوں کی تنخواہیں کم کرنے کا فیصلہ

---

۱۔ فرشتہ کے مطابق علاء الدین کے پاس پچاس ہزار غلام تھے۔

۲۔ جلال الدین فضول خرچ حکمران نہیں تھا۔ وہ شاندار دربار منعقد کرنے پر دولت ضائع نہیں کرتا تھا۔ اس نے شاندار فتوحات کا بیڑا اٹھایا تھا کہ جو کثیر اخراجات کا موجب ہوتیں۔ تاریخ حقی (بانکی پور مخطوطہ، ورق ۲۰) کے مطابق وہ فراخ دل نہیں تھا۔ نیز برنی صفحہ ۱۸۹

۳۔ فرشتہ، صفحہ ۱۰۹

۴۔ برنی، صفحہ ۳۰۳

کیا لیکن ان کو معاشی پریشانی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے اس نے روزمرہ ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ آسان سا ریاضی کا حساب اور سادہ معاشی اصول تھا، چونکہ اس نے سپاہیوں کی تنخواہ کم کرکے مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہذا اس نے عام استعمال کی اشیاء کی قیمتوں کو کم کرنے اور متعین کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس نے مختلف ضابطے نافذ کیے جنھوں نے زندگی بسر کرنے کے خرچ کم کر دیے۔ یہ ضوابط جن کو اس کی معاشی اصلاحات یا اس کا مارکیٹ کنٹرول کہا جا سکتا ہے اس کے نظم و نسق کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

**مارکیٹ کنٹرول**

دہلی میں ضروریات زندگی کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی ضرورت یہ تھی۔ منگول بار بار ملک پر حملہ کرتے تھے اور ان کا نشانہ دہلی تھا۔ ۱۳۰۳ء میں منگول حملہ آور طرغی نے شہر کے اردگرد کی تمام راہوں، جمنا پر کشتیوں پر قبضہ کر کے تمام سامان رسد پہنچنے سے روک دیا تھا۔ ایسی صورت حال نے دارالسلطنت میں غلہ کی سخت قلت پیدا کر دی تھی کیونکہ اس زمانے میں نقل و حمل کے تقریباً معمولی ذرائع اس ناکہ بندی کے بار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ علاءالدین نے نقل و حمل اور غلہ کی دشواریوں پر قابو پانے کی غرض سے ایک طرف تو دارالسلطنت میں اناج کا ذخیرہ کرنے اور دوسری طرف قیمتیں مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے اس نے مختلف اقدامات کیے جو قابل مطالعہ ہیں کیونکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ چودھویں صدی کے پہلے زمانے میں بھی ناگہانی میں اضافہ، قیمتوں کو مقرر کرنے اور راشن جاری کرنے کے اصول اسی طرح قابل فہم ہیں جس طرح آج ہیں۔

انسان کی بنیادی ضرورت غذا ہے جس کی طرف سلطان نے پہلی کی اور پوری توجہ دی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اناج کی قیمتوں پر پابندی عائد کی اور ان کا نرخ بہت ہی کم مقرر کیا۔ مقررہ قیمتیں حسب ذیل تھیں:

| | |
|---|---|
| گیہوں | ۷ ½ جیتل فی من |
| جو | ۴ جیتل فی من |
| چنا | ۵ جیتل فی من |
| چاول | ۵ جیتل فی من |
| ماش (ارد) | ۵ جیتل فی من |
| موٹھ | ۳ جیتل فی من |

۵۔ برنی، ص ۳۰۴

شکر ۱½ جیتل فی سیر
گڑ ½ جیتل فی سیر
مکھن یا گھی ۱ جیتل میں ۲½ سیر
سرسوں کا تیل ۱ جیتل میں ۳ سیر
نمک ۱ جیتل میں ½ من ۲

جدید سکوں اور اوزان کے لحاظ سے ان قیمتوں کا حساب لگانا انتہائی مشکل ہے کیونکہ اس زمانے کے سکوں اور اوزان کے تناسب کو جدید اوزان اور سکوں کے ساتھ متعین کرنے کے لیے ضروری معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ چودھویں صدی سے زر نقد کی قوت خرید کافی ہو چکی ہے۔ لہٰذا حتمی طور سے یہ طے کرنا آسان نہیں کہ ان کے مقابلہ میں چودھویں صدی میں لوگ زیادہ خوشحال یا زیادہ بدحال تھے۔ بہرحال اس معاملہ میں کچھ معلومات دستیاب ہیں اور اس زمانہ کے قیمتوں کے ڈھانچہ کو طے کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

فرشتہ بیان کرتا ہے کہ علاء الدین کے زمانے میں ایک تنکہ خواہ وہ سونے کا ہو یا چاندی کا وزن میں ایک تولہ کے برابر ہوتا تھا اور چاندی کے ایک تنکہ میں پچاس جیتل ہوتے تھے۔ جیتل تانبہ کا ایک چھوٹا سکہ تھا یہ فرشتہ کے زمانے میں بھی رائج رہا۔ اس کا وزن بعض کے خیال کے مطابق ایک تولہ اور بعض دوسروں کے مطابق ۱½ تولہ ہوتا تھا۔ فرشتہ مزید کہتا ہے کہ علاء الدین کا تنکہ ایک تولہ کے برابر تھا۔ اس میں ۹۶ رتی ہوتی تھیں اور بعد میں اسے بابر نے بھی اسی طرح پایا تھا۔۷ غرض علاء الدین کا تنکہ وزن میں موجودہ زمانے کے روپیہ کے مساوی تھا۔ جہاں تک جیتل کا تعلق ہے نیلسن رائٹ کی رائے ہے کہ ایک تنکہ ۴۸ جیتل کے مساوی ہو یہ بات زیادہ ممکن ہوگی ۵۰ جیتل کے مساوی ہونے کے مقابلے میں۔ فرشتہ کی رائے میں بھی یہی تناسب ہے۔ رائٹ مزید کہتا ہے کہ سترھویں صدی کے جزوی چاندی کے سکے پُرزور طریقے سے ۴۸ جیتل کے تنکہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اس حد تک فرشتہ کا بیان جو بہرحال چند صدیوں بعد دیا گیا ہے یہ سمجھنا چاہیے کہ بالواسطہ طور پر اس کی تائید ہوتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ہم اسے بالکل صحیح مان لیں۔ جیتل چاندی کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔۸ چنانچہ اگر ہم ایک تنکہ کو ایک روپے کے برابر مان لیں تو ایک جیتل ایک پیسے کے ½ (روپے کا ۱/۶۴) کے برابر ہوگا۔

۶۔ یہ فہرست غذا کی تمام اقسام پر حاوی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اناج کی دوسری اقسام مثلاً دالیں اور مٹر وغیرہ کی قیمتیں بھی اسی طرح منضبط کی گئی ہوں گی۔
۷۔ نیلسن رائٹ (Nelson Wright)، ص ۷۷
۸۔ ایضاً

برنی کہتا ہے کہ ½ ۷ جیتل میں ایک من گیہوں آتا تھا۔ فیروز تغلق کے عہد کا من ۴۰ سیر کا ہوتا تھا اور ایک سیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ستر مثقال کا ہوتا تھا۔ ۷۲ دانوں کے برابر اوسط کے لحاظ سے اگر مثقال کا وزن لیا جائے تو سیر ۵۰۴۰ دانوں کا اور من ۲۰۱۶۰۰ دانوں کے برابر ۲۸.۵۰ پاؤنڈ سوائے ۲۸ پاؤنڈ اور ۱۲ اونس (Pounds Avoirdupois) کا ہوگا۔ مگر فرشتہ کہتا ہے کہ علاء الدین کے عہد کا من چالیس سیر کا ہوتا تھا اور سیر کا وزن ۲۴ تولہ کا ہوتا تھا۔ اس طرح فرشتہ کے مطابق علاء الدین کا عہد کا ایک من ۱۲ سیر کے برابر ہوتا تھا اور [illegible] کے حساب کے مطابق وہ آج کے چودہ سیر کے برابر تھا۔ چنانچہ اگر ½ ۷ جیتل میں ایک من گیہوں ملتے تھے تو ایک جیتل میں ½ ۵ سیر (۲۴ تولہ کے سیر کے مطابق)۔ موجودہ سکوں (اعشاری نظام سے قبل) میں اگر حساب لگایا جائے تو ایک پیسہ (¾) جیتل میں اسی تولہ والے سیر کا [illegible] آئے گا۔ چنانچہ اس زمانے کے ایک روپے میں موجودہ دور کے دو من گیہوں عہد علائی میں آتے۔ اسی بنیاد پر دوسری قیمتوں کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے۔

اب اگرچہ علاء الدین کی مقرر کردہ قیمتیں کافی کم تھیں تاہم برنی سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ وہ سب سے کم تھیں۔ اگر ان قیمتوں سے ان کا موازنہ کیا جائے جو اس کے پیشروں اور جانشینوں کے ادوار میں تھیں۔ بلبن کے زمانے میں پکی ہوئی روٹی ایک جیتل میں [illegible] سیر ملا کرتی تھی۔ لہٰذا گیہوں اور بھی سستا ہوگا۔ مجموعی طور پر قیمتوں کی سطح محمد بن تغلق کے زمانے میں اونچی ہو گئی تھی لیکن فیروز تغلق کے زمانے میں وہ پھر علاء الدین کی سابق سطح پر آ گئی۔ حسب ذیل فہرست جو شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ اس نکتہ کو واضح کر دے گی۔

| نام جنس | قیمت عہد علاء الدین میں | فیروز کے عہد میں |
|---|---|---|
| گیہوں | [illegible] جیتل | [illegible] جیتل |
| [illegible] | [illegible] جیتل | [illegible] جیتل |
| [illegible] | [illegible] جیتل | ۴ جیتل |
| [illegible] | ۵ جیتل | ۴ جیتل |

یہ ممکن ہے کہ عفیف نے جب فیروز کے زمانے کی قیمتیں دی ہوں تو اس نے مبالغہ سے کام لیا ہو کیونکہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (خیر المجالس کتاب [illegible]) جو انہوں نے فیروز کے عہد میں لکھی تھی کہتے ہیں کہ علاء الدین کا زمانہ زیادہ ارزانی کا تھا۔ بعد والوں کے زمانے میں قیمتیں اور بھی کم معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخ داؤدی کے مصنف کا بیان ہے

---

[illegible] (calling out the [illegible] …) [illegible]

[illegible] حضرت امیر خسرو [illegible]

کہ سلطان ابراہیم لودی کے زمانے میں اشیا کی قیمتیں سوائے علاء الدین کے آخری زمانے کے دوسرے ہر سلطان کے زمانے میں پائی جانے والی قیمتوں سے کم تھیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ علاء الدین کے زمانے میں قیمتوں کی ارزانی ظلم و تعدی سے کام لے کر برقرار رکھی گئی تھی، ابراہیم کے عہد میں قیمتیں کسی ظلم و تعدی کے بغیر کم تھیں۔ چنانچہ علاء الدین کے عہد میں جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ قیمتوں کی اتنی ارزانی نہیں تھی جتنی کہ بازار میں مقررہ قیمتوں کو برقرار رکھنا جو اس زمانے کے لحاظ سے معجزات میں سے تھے۔

**غلہ منڈی** اناج کی قیمتیں مقرر کرنے کے بعد سلطان نے ایک غلہ منڈی اور بعض سرکاری غلہ کے گودام قائم کیے جہاں سے عوام اور تاجر غلہ حاصل کر سکتے تھے۔ غلہ منڈی کو دو قسم کے تاجر چلاتے تھے، ایک وہ جن کی دہلی میں مستقل دکانیں تھیں اور جن کو خوردہ فروش یا تقسیم کنندہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے کاروانی یا گھومنے پھرنے والے تاجر جو شہر میں غلہ لاتے تھے اور دکانداروں نیز عوام کے ہاتھ بیچتے تھے۔ بازار کے ضوابط کے نفاذ سے قبل دوکاندار اور کاروانی جتنا چاہتے تھے اتنا نفع کمایا کرتے تھے لیکن نئے احکام کے اعلان کے بعد تاجر جن کے ذریعہ غلہ کی قیمتیں موسم کی ستم ظریفیوں کا لحاظ کیے بغیر ایک کم شرح پر اور ہمیشہ کے لیے مقرر کر دی گئی تھیں، تاجروں کے لیے ایک معمولی نفع چھوڑا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے دوکانداران نے قاعدوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تو کاروانیوں نے شہر میں آنا بند کر دیا۔ لیکن علاء الدین نے اپنے منصوبے کو پوری طرح کامیاب دیکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ لہذا اس نے حکم دیا کہ کاروانی تاجر منڈی کے شحنہ (سپرنٹنڈنٹ) کے پاس اپنا اندراج کرائیں۔ غلہ منڈی کے شحنہ ملک قبول نے کاروانی تجارت کے رہنماؤں کو پکڑا اور گرانی میں رکھا حتی کہ انھوں نے دہلی سے باہر کے علاقوں سے بازار میں مستقل طور پر غلہ لانے اور اس کو مقررہ نرخوں پر بیچنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ جمنا کے کنارے دیہات میں اپنے خاندانوں سمیت شحنہ کے براہ راست

---

یکی از فوائد عہد سلطان ابراہیم آن بودہ کہ غلہ و جامہ و سائر اجناس چنان ارزان شد کہ در ہیچ عصر نبودہ مگر در آخر عہد سلطان علاء الدین خلجی شدہ باشد۔ و ارزانی عہد علاء الدین بعد جبر و تکلیف و سیاست و اکراہ بود و ارزانی عہد ابراہیم آسانی بود۔

(سلطان ابراہیم (لودی) کے عہد کے نوادر میں سے ایک یہ تھا کہ غلہ، کپڑا اور دوسری اشیاء اتنی ارزاں تھیں کہ اتنی سستی کسی عہد میں نہیں ہوئیں، سوائے سلطان علاء الدین خلجی کے آخری دنوں کے۔ لیکن علاء الدین کے عہد (کی قیمتوں) کی ارزانی سزاؤں کا لیف، تعزیرات اور دباؤ کے ساتھ تھی، ابراہیم کے عہد کی (قیمتوں کی) ارزانی آسانی سے تھی۔ تاریخ داودی، بانکی پور مخطوطہ، ورق ص ۲۲ - ۲۲۳

دائرۂ اختیار میں آ گئی تھیں۔ وہ اطاعت کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ انھوں نے بازار میں غلّہ کی مسلسل فراہمی برقرار رکھنے کے انفرادی اور اجتماعی طور پر معاہدوں پر دستخط کیے۔ اس طرح غلّہ منڈی میں رسد کی قلت ہو جانے کا خطرہ ٹل گیا۔ کاروانیوں کے ان قیمتوں پر جو ان کو ایک معمولی منافع دیں، غلّہ حاصل کرنے میں دقتوں کو دور کرنے کے لیے علاء الدین نے دوآب اور دار السلطنت کے قریب کے علاقوں کے تمام مجسٹریٹوں اور وصول کنندوں (شحنگان اور متصرفان) کو ایک شاہی فرمان جاری کیا۔ اس میں ان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ کو اس بات کی تحریری ضمانت دیں کہ وہ کاشتکاروں سے جتنا ممکن ہوگا غلّہ حاصل کریں گے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کسانوں سے پوری سختی کے ساتھ پیداوار کا پچاس فیصد بطور لگان وصول کریں نیز ان کو مجبور کریں کہ وہ اپنے فاضل ذخیرہ کو کھیتوں ہی پر کاروانی تاجروں کے ہاتھ ان نرخوں پر فروخت کریں جو سلطان نے مقرر کی ہیں۔ مالیہ کے افسروں کا فرض تھا کہ کسانوں کو غلّہ کا ذخیرہ کرنے سے روکیں اور یہ دیکھیں کہ ان کے پاس غلّہ صرف گزر بسر کے لیے رہ جائے[12] ان ضوابط کی کسی خلاف ورزی کے لیے افسران ذمہ دار ٹھہرائے جاتے تھے۔ ان سے جواب طلب کیا جاتا تھا۔ اس طرح تمام دستیاب ہونے والا غلّہ بازار میں آتا تھا جو حفاظت سے بھرا رہتا تھا۔ کالے بازار کا دھندہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا منافع ختم ہو گئے تھے۔

---

12۔ برنی کہتا ہے کہ کاشتکار دس من غلّہ تک نہیں روک سکتا تھا۔ برنی کے دو حسب ذیل بیانات سلطان کے تحت احکامات کی شہادت دیتے ہیں۔

(۱) خراج میان دوآب و ولایت صد کروہی چنیں کنند کہ رعایا نتوانند کہ دہ من غلّہ ذخیرہ کنند۔ و چنان بشدت بطلبند (مطبوعہ متن میں غلط ہے) کہ رعیت غلہ بر سر کشت بدست کاروانیان بفروشند (ص ۳۰۵)

(دہلی دوآب اور اس کے سو کوس تک کے علاقہ) میں لگان اس طرح مقرر کرنا چاہیے کہ کاشتکار دس من غلہ تک جمع نہ کر سکیں۔ اور لگان اتنی سختی سے وصول کرنا چاہیے کہ کاشتکار غلّہ کو کھیتوں ہی پر کاروانیوں کے ہاتھ فروخت کر دیں)

(۲) سلطان فرمان دادہ بود تا النہ دیوان اعلیٰ از شحنگان و متصرفان و ولایت میان دوآب کہ بہ شہر نزدیک است خطاستند کہ ایشان از رعایا خراج چنان بشدت طلب نمایند کہ ایشان نتوانند کہ غلہ از کشت ہا و خرمن ہا در درون خانہ ہا در آوردن و احتکار کردن ممکن نبود و ہم بر سر کشت بہ نرخ ارزانی غلہ بدست کاروانیان بفروشند (ص ۳۰۷)

(سلطان نے حکم صادر فرمایا تھا کہ دیوان دہلی و دوآب جو کہ پایۂ تخت سے قریب ہے، متصرف سے اس امر کی تحریری ضمانت حاصل کرے کہ وہ کاشتکاروں سے اتنی سختی کے ساتھ لگان وصول کریں گے کہ ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہے گا کہ وہ غلّہ اپنے گھروں کو لے جائیں اور اس کو جمع کریں اور ان کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ سستے داموں غلّہ کھیتوں ہی پر ارزاں نرخوں پر فروخت کریں)

کاشتکاروں اور کاروانیوں کے علاوہ ایک اور سبب تھا جس سے غلّہ کی فراہمی میں خلل کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ یہ موسم تھا جس پر فصلوں کا انحصار تھا[۱۳]۔ اس پورے طور پر مقابلہ کرنے کے لیے سلطان نے سرکاری غلّہ گودام قائم کیے تھے۔ غلّہ کے یہ گودام خوب بھرے رہتے تھے۔ برنی کہتا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی محلہ ہوتا ہو گا جہاں غلّہ سے خوب بھرے دو تین شاہی گودام موجود نہ ہوتے ہوں۔ یہ غلّہ کی دوکانوں سے مختلف ہوتے تھے۔ یہ گودام ہوتے تھے جہاں غلّہ ہنگامی حالات میں کام آنے کے لیے ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ اگر فصلیں بارش کی کمی یا بے اعتدالی کے سبب تباہ ہو جائیں یا اگر قرونِ وسطیٰ کے ذرائع نقل و حمل کافی مقدار میں غلّہ دارالسلطنت لانے میں ناکام رہیں تو ذخیرہ شدہ غلّہ نکالا جاتا تھا، کاروانیوں کے حوالہ کیا جاتا تھا جو اس کو غلّہ منڈی میں لاتے تھے جہاں وہ عوام کے ہاتھ مقررہ قیمت اور انفرادی خریداروں کے لیے مقررہ مقدار میں فروخت کیا جاتا تھا۔

**راشن کا طریقہ** خوشگوار موسم میں لوگ جتنا چاہیں اتنا غلّہ خرید سکتے تھے لیکن خشک سالی اور قحط کے زمانے میں حالات اس طرح نہیں رہتے تھے۔ قلت کے زمانے میں دہلی کے عوام کو غیر معینہ مقدار میں غلّہ نہیں فروخت کیا جا سکتا تھا اس لیے اور بھی قرب و جوار کے لوگ دارالسلطنت میں آ کر پناہ لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا راشن کر دیا گیا۔ قلت کے زمانے میں ہر گھرانے کو فی یوم نصف من غلّہ دیا جاتا تھا۔ فرشتہ کا بیان تھوڑا سا مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خشک سالی کے زمانے میں ہر خریدار کے لیے ضروری تھا کہ وہ صرف اتنی مقدار میں غلّہ خریدے جتنی کہ اسے ضرورت ہو اور اگر کوئی شخص اپنی ضرورت سے نصف من بھی زیادہ خریدتا تھا تو اس کو سخت سزا ملتی تھی[۱۴]۔ اگرچہ دونوں بیانات مقصد کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں تاہم برنی کا بیان اس بنا پر زیادہ قابلِ قبول ہے کہ نصف من[۱۵] (تقریباً ۲ یا ۲ سیر روزانہ) اس زمانے میں ایک اوسط خاندان کے لیے جس میں ایک یا دو نوکر بھی ہوں ایک مناسب مقدار تھی۔ شہر کے مالدار لوگوں کو بھی جن کے پاس گاؤں یا کھیت نہیں ہوتے تھے جن پر وہ ناخوشگوار موسموں میں تکیہ کر سکیں، ان کی ضروریات کے لیے غلّہ کی ایک مقررہ مقدار دی جاتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں نہ راشن کارڈ ہوتے تھے نہ مقررہ مقدار میں غلّہ حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو گنا یا شمار کیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

---

۱۳۔ ملاحظہ ہو جلال الدین کے عہد میں قحط جب کہ غلّہ کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔

۱۴۔ فرشتہ، ص ۱۱۳

۱۵۔ برنی صاف کہتا ہے (ص ۳۰۹) "نیمگانی من خریداران منڈویہا دادندی"
(غلّہ منڈی خریداروں میں سے ہر ایک کو وہ نصف من غلّہ دیتے تھے)

بازار جاتا تھا، اس کو غلے کی ایک مناسب مقدار دے دی جاتی تھی۔ برنی کہتا ہے کہ خشک سالی کے موسموں میں بازاروں میں غریب اور بے سہارا لوگوں کی بھیڑ ہو جاتی تھی اور بعض اوقات وہ کچل کر مر جاتے تھے۔ ان واقعات میں جہاں افسروں کو ان کے فرائض کی بجا آوری میں غفلت کا مجرم پایا جاتا تھا، ان سے نیز شحنہ منڈی سے بادشاہ جواب طلب کرتا تھا۔[14] مورخ غریب لوگوں کے بارے میں زیادہ نہیں کہتا اور یہ بتاتا ہے کہ قلت کے زمانے میں غلہ کی منصفانہ تقسیم کا بھی کوئی انتظام تھا۔ بہر حال بظاہر کسی شخص کو اس قسم کی کوئی مراعات نہیں دی جاتی تھیں کیونکہ اناج کی قیمتیں پہلے ہی سے کافی ارزاں تھیں۔ راشن کرنے کا نظام علاؤالدین کا ایک نیا خیال تھا۔[15] برنی کہتا ہے کہ اس کے مختلف ضوابط کی بنا پر خشک سالی کے زمانے میں بھی جب کہ لوگ قحط کو ناگزیر سمجھتے تھے، دہلی میں کبھی قحط نہیں پڑا۔ کم از کم دہلی کے لوگ اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کو قلت کا کوئی خدشہ لاحق نہیں ہوتا تھا۔

### بازار کے افسر

بازار طریق کار کا ایسا جامع نظام جس کے تحت اشیاء کی قیمتیں مقرر کی گئیں، تاجروں کا اندراج ہوا اور منافع خوری اور سٹہ بازی بالکل ممنوع قرار پائی، افسروں کے ایک مستعد اور بڑے عملے کے بغیر کامیابی کے ساتھ نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ علاؤالدین نے ملک قبول کو جو الغ خان کا ایک معتمد ملازم تھا اور جس کو برنی دور اندیشی، قوت فیصلہ اور اعتماد کا مالک بتاتا ہے بطور شحنہ بازار ایک نگران مقرر کیا۔ اس کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے کے لیے سواروں اور پیادوں کا ایک بڑا دستہ دیا گیا۔ اس کے اختیارات بہت وسیع تھے اور وہ شہر کے تمام دوکانداروں اور کاروانیوں کا نگراں اعلیٰ تھا۔ وہ یہ دیکھتا تھا کہ وہ بازار میں باقاعدگی سے غلہ لاتے رہیں، بادشاہ کے مقرر کردہ نرخوں پر اسے فروخت کریں اور کچھ بھی جمع یا کالے بازار میں فروخت نہ کیا جائے۔ وہ دہلی کے بازار میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ اور بازار کے حالات اور ان کے اثرات کے بارے میں بادشاہ کو اطلاعات بہم پہنچایا کرتا تھا۔ اس کی رپورٹوں کی تصدیق دوسرے ذرائع سے کی جاتی تھی جن کا ذیل میں ذکر آئے گا۔ اور اگر شحنہ اور بازار کے دوسرے افسروں کی رپورٹوں میں تھوڑا بھی اختلاف پایا جاتا تھا تو اختلاف کا سبب جاننے کے لیے پوری تحقیق کی جاتی تھی اور مجرموں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ شحنہ کو جو

---

۱۴۔ ایضاً ص ۳۰۹

۱۵۔ ڈاکٹر موتی چندر کے مطابق قدیم ہند میں قحط کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے راشن کا طریقہ اپنایا گیا تھا (جرنل آف دی یوپی ہسٹاریکل سوسائٹی، جلد ۱۹ دسمبر ۱۹۴۶ء)
ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو لیکن جہاں تک قرون وسطیٰ کا تعلق ہے علاؤالدین کا منصوبہ بالکل نیا تھا۔

ایک بڑے منصب پر فائز تھا اور بڑے علاقوں کا مالک تھا سلطان سے سخت خوف لاحق رہتا تھا کسی بھی غفلت کے لیے اس سے سخت جواب طلب کیا جاتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ بازار میں سلطان کے احکامات یا خواہشات کے خلاف کوئی بات نہ ہو مبادا بادشاہ کا قہر اس پر نازل ہو جائے۔[18] بازار میں اپنے بلند منصب کے باوجود ملک قبول سلطان کے احکامات میں کسی ترمیم یا تبدیلی کا مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔ جب خشک سالی کے موسموں میں ایک یا دو بار اس نے غلّہ کی تھوڑی سی قیمت زیادہ کرنے کی درخواست کی تو اس کو بیس دُرّوں کا انعام ملا۔[19] نتیجہ یہ ہوا کہ شحنہ کے لیے سوائے اس کے کہ وہ ایک بیرحم اور سخت افسر بن جائے کوئی اور چارہ نہ رہا۔ وہ غلّہ منڈی میں قریبی تاجروں کو ملا یکوڑے مارتا پھرتا تھا۔ شحنہ کی سختی نے لوگوں کو اپنے معاملات میں ایماندار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

غلّہ منڈی کے دوسرے افسران بھی تھے۔ برید منڈی جو سامان کے معیار پر رپورٹ دیتا تھا، اور منہیان جن کا آج کی خفیہ پولیس سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ منصب کے اعتبار سے یہ افسر شحنۂ منڈی کے مقابلہ میں کمتر درجہ کے ہوتے تھے۔ وہ سلطان کو الگ سے اور براہِ راست اپنی رپورٹیں دیتے تھے شحنہ کے توسط سے نہیں۔ اس طرح عقلمند سلطان تین مختلف ذرائع سے بازار کی رپورٹیں حاصل کرتا تھا اور بڑی احتیاط سے ان کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ اس نے بازار کے افسروں کو اپنے حسابات میں صاف اور معاملات میں ایماندار ہونے پر مجبور کر دیا۔ تاجر بھی بازار کے ضابطوں سے انحراف کرتے تھے کیونکہ ان کو کسی ایک افسر سے بھی کسی قسم کی حمایت ملنے کی امید نہیں تھی۔

**کپڑا بازار** غذا کے بعد قیمت کے کنٹرول کی دوسری اہم مد کپڑا تھی۔ دراصل سلطان نے ایک سپاہی کی ضرورت کی تمام اشیاء کے لیے الگ الگ بازار قائم کیے تھے۔ گھوڑوں کا بازار، غلاموں کا بازار، مویشیوں اور مٹھائیوں کا بازار، مسالہ جات، پھلوں، ہتھیاروں، جوتوں وغیرہ کے بازار۔ ضیاءالدین برنی تفصیل سے کپڑا بازار کے حالات بیان کرتا ہے جس کا انتظام غلہ منڈی کے مطابق ہوتا تھا۔ ملک یعقوب کو بطور دیوان ریاست یا کپڑا بازار کا نگراں مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کا دائرۂ اختیار دوسرے بازاروں تک تھا۔ سلطان نے اس کو دیوان ریاست کا عہدہ بطور ناظر (سپرنٹنڈنٹ) اور محتسب (عوام کے اخلاق کے نگراں) کے فرائض کے ساتھ عطا کیا تھا۔[20] چنانچہ اس کے اختیارات بلاشبہ بہت وسیع تھے اور اگرچہ ملک قبول غلہ منڈی میں سیاہ و سفید کا مالک تھا تاہم منصب کے لحاظ سے وہ ملک یعقوب کا

۱۸۔ برنی ص ۳۰۸

۱۹۔ برنی ص ۱۷۔۳

ماتحت تھا۔ کیونکہ برنی ایک جگہ کہتا ہے کہ یعقوب شہر کے دوسرے مختلف بازاروں میں سے ہر ایک کے لیے شحنہ مقرر کرتا تھا[20]۔ دیوان ریاست صرف قابل اعتماد اور ایماندار ہی نہیں تھا بلکہ غصہ ور سخت گیر انتہا پسند، بیرحم اور اکھڑ بھی تھا۔ اپنے منصب اور مزاج کی بنا پر اس کو جو احترام اور اطاعت ملی ہوئی تھی اور وہ سخت سزائیں جو وہ بازار کے لوگوں کو دیتا تھا ان سب نے بازار میں لین دین کی حالت بہتر بنا دی تھی۔

کپڑا بازار اس عمارت میں واقع ہوا تھا جو سرائے عدل کے نام سے موسوم تھی۔ وہ بدایوں دروازے کے اندر کوشک سبز کی سمت میں جس کو برسوں سے استعمال نہیں کیا گیا تھا، واقع تھی۔ سرائے عدل صبح سویرے سے رات گئے عشا کی نماز تک کھلی رہتی تھی۔ لہٰذا عوام دن میں کسی وقت بھی کپڑا خرید سکتے تھے۔ شہر میں بس یہی بازار تھا جہاں کپڑے کا کاروبار ہوتا تھا کیونکہ کسی تاجر کو اپنا سامان چھپا کر، یا سلطان کی مقرر کردہ قیمتوں سے زیادہ پر بیچنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو لوگ اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کرتے تھے ان کو سخت سزا دی جاتی تھی اور ان کا سامان ضبط کر لیا جاتا تھا۔ ضیاالدین ریشم اور سوت کے کپڑوں کی ایک طویل فہرست دیتا ہے جن کی قیمتیں بادشاہ نے مقرر کی تھیں۔ کپڑوں کی قیمتوں کا تعین کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اس زمانے کی پیمائش اور سکے تناسب کے لحاظ سے جدید سکوں میں ہمیشہ حساب نہیں لگایا جا سکتا اور اس لیے بھی کہ ہمعصر مورخ بہت سی صورتوں میں اس کپڑے کا پیمانہ نہیں دیتا جس کی قیمت وہ بیان کرتا ہے۔ وہ کسی خاص پیمانے کا ذکر کیے بغیر صرف چیز کا نام اور اس کی قیمت بیان کرتا ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قرون وسطیٰ میں کپڑا سستا نہیں تھا۔ گیہوں ۷ جیتل میں ایک من ملتا تھا ایک چادر بظاہر ایک عام سائز کی دس جیتل ملتی تھی۔ عمدہ قسم کا لٹھا ایک تنکہ میں بیس گز ملتا تھا۔ یہی صرف ایک شے ہے جس کا برنی پیمانہ دیتا ہے۔ شیخ نصیرالدین چراغ خیرالمجالس میں فرماتے ہیں کہ علاءالدین کے زمانے میں ایک لحاف ایک یا دو تنکہ میں بن جاتا تھا۔ اوپر کا کپڑا (فرد) بیس جیتل کا ملتا تھا، عام قسم کی گوٹ تیس جیتل میں، روئی اور نیچے کا کپڑا (استر) ۱۲ جیتل میں ملتا تھا۔ دھنائی اور سلائی کا مطلب تھا ۶ سے ۷ جیتل تک کی مزید لاگت۔ ایک دوسری جگہ شیخ لکھتے ہیں کہ ایک تنکہ میں ایک پوری دعوت کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ غرض کھانے کے مقابلہ میں عام قسم کا کپڑا بھی اس زمانہ میں مہنگا تھا۔

---

۲۰۔ برنی ص ۳۱۸

ریشم کی قیمت بلا شبہ بہت زیادہ تھی۔ خز دہلی ۱۶ تنکہ میں فروخت ہوتی تھی یعنی ایک سپاہی کی تقریباً پورے ماہ کی تنخواہ کے برابر۔ سلہٹی ایک معمولی سوتی کپڑا جو آج بھی معروف ہے اور جو اکبر کے زمانے میں سستا تھا،[۲۱] ۲ تنکہ میں فروخت ہوتا تھا۔ یہ امر کہ علاء الدین نے کپڑے کی قیمتیں مقرر کی تھیں اور تاجروں کو دہلی میں سامان درآمد کرنے کے لیے پیشگی رقم دی تھی بتاتا ہے کہ سلطان کے ضابطوں کے نفاذ سے قبل کپڑا اور بھی مہنگا تھا۔ برنی بیان کرتا ہے کہ ایک ضابطہ جاری کیا گیا تھا جس کے ذریعہ لوگوں کو اس بات سے روک دیا گیا تھا کہ وہ دہلی میں ریشمی کپڑا سستے داموں خریدیں اور دہلی کے باہر جا کر پانچ گنی قیمتوں پر اُن کو بیچ دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالسلطنت کے باہر کپڑے کی قیمت اور بھی زیادہ تھی۔ کپڑے کی حسب ذیل اقسام اور ان کی مقررہ قیمتیں برنی نے دی ہیں:

| | |
|---|---|
| دہلی خز ریشم | ۱۶ تنکہ |
| نارنجی رنگ کی معمولی ریشم | ۶ تنکہ |
| آدھی ریشم بالوں سے ملی ہوئی | ۳ تنکہ |
| شیریں باف عمدہ | ۵ تنکہ |
| شیریں باف اوسط | ۳ تنکہ |
| شیریں باف معمول | ۲ تنکہ |
| سلہٹی عمدہ | ۶ تنکہ |
| سلہٹی اوسط | ۴ تنکہ |
| سلہٹی معمول | ۲ تنکہ |
| لال دھاریوں والا کپڑا | ۶ جیتل |
| عام کپڑا | ۳ ۱/۲ جیتل |
| ناگور کا سرخ استر | ۲۴ جیتل |
| معمولی استر | ۱۲ جیتل |
| لٹھا عمدہ | ایک تنکہ میں بیس گز |
| لٹھا معمولی | ایک تنکہ میں چالیس گز |
| چادر | ۱۰ جیتل |

۲۱۔ بلاخ مین، آئین اکبری ص ۹۵۔

ہمعصر مؤرخ ضیاالدین برنی کے مطابق سلطان نے اشیا کی قیمتیں پیداواری قیمت (نرخ برآمد) اور فروشندہ کے لیے معمولی منافع کو مدِنظر رکھ کر مقرر کی تھیں۔[22] لیکن بظاہر پیداواری قیمت ہمیشہ مدِنظر نہیں رکھی جاتی تھی کیونکہ برنی خود لکھتا ہے کہ خشک سالی کے موسم میں ایک بار جب شحنۂ منڈی ملک قبول نے سلطان سے غلّہ کی تھوڑی سی قیمت بڑھانے کی درخواست کی تو اس کو کوڑے سے کڑی سزا دی گئی۔ عام حالات میں دوکاندار جتنا کماتے تھے نفع کی شرح اس سے بھی کم تھی، اسی وجہ سے بے اطمینانی تھی اور اس کے تشدّد کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اگر قیمتیں مقرر کرتے وقت پیداواری قیمت اور نفع کی مناسب شرح مدِنظر رکھی جاتی تو قیمتوں میں گوشوارہ اشیا کی بدلتی ہوئی قیمتوں کے ساتھ ساتھ جو کہ خشک سالی اور فراوانی کے بدلتے ہوئے موسموں سے متاثر ہوتی رہتی تھیں بدلتا رہتا۔ لیکن قیمتوں کا گوشوارہ جب ایک بار طے کر کے دیوانِ ریاست کو دے دیا جاتا تھا تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ برنی بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ جب تک علاءالدین نے حکومت کی اشیا کی قیمتیں نہ گھٹنے دیں اور نہ بڑھنے دیں۔ وہ ہمیشہ یکساں مقرر رہیں۔[23] اس قسم کی ساکن معیشت سے سلطان اور اس کے وقائع نگار دونوں کو خشک یعنی نام کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔[24]

کپڑے کی قیمتوں کے ضابطے انھیں مسائل کو منظرِ عام پر لائے جو غلّہ کے معاملہ میں رونما ہو چکے تھے۔ تاجر دہلی میں اپنا سامان بیچنے کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ انھیں اتنے منافع کی اجازت نہیں تھی جس کے وہ عادی تھے۔ مزید برآں وہ اپنا سامان دور دراز علاقوں میں ان قیمتوں پر خریدتے تھے جو کسی ضابطہ کی پابند نہیں تھیں، وہ ان کو دہلی میں لانے میں مصارف برداشت کرتے تھے۔ ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ان کو سلطان کی مقرر کردہ قیمتوں پر فروخت کریں گے۔ زرعی پیداوار کے مقابلے میں دوآب اور دوسرے علاقوں کے کاشتکاروں کو مجبور کیا تھا کہ وہ کاروانی تاجروں کے ہاتھ مقررہ نرخوں پر غلّہ فروخت کریں۔ دیوگیری اور ملتان[25] جیسے دور دراز علاقوں کے صنعت کاروں کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تاجروں کے ہاتھ مقررہ نرخوں پر سامان فروخت کریں۔ لہٰذا اس نے غلّہ تاجروں کو جتنی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں، اس سے کہیں زیادہ کپڑے کے تاجروں کو فراہم کیں۔ جہاں تک اندراج کا تعلق تھا کوئی رعایت

---

۲۲۔ برنی ص ۳۱۶ نیز فتاوائے جہانداری ص ۳۵

۲۳۔ برنی ص ۳۰۷

۲۴۔ فتاوائے جہانداری، ص ۳۴۔

۲۵۔ دیوگیری کی ریشم کے کپڑے، غیر ملکی نسل کے گھوڑے، تلواریں اور کچھ دوسری اشیا دور دراز علاقوں سے لائی جاتی تھیں۔

نہیں دی گئی تھی۔ ہر تاجر کو جو دہلی میں تجارت کرتا تھا [26] حکم دیا گیا کہ وہ دیوانِ ریاست کے پاس اپنا نام درج کرائے۔ اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرے جس کے تحت یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ شہر میں سامان تجارت کی مقررہ مقدار لاتا رہے گا اور اس کو مقررہ نرخوں پر فروخت کیا کرے گا۔ لیکن سلطان نے ملتانی تاجروں کو شاہی خزانے سے پیشگی رقم دی تاکہ وہ کسی اور جگہ سے سامان خریدیں اور مقررہ نرخوں پر اس کو سرائے عدل میں فروخت کریں۔ سلطان نے جو پیشگی رقم دی تھی وہ تقریباً دو ملین تنکہ کے برابر تھی۔ ضیاء الدین یہ نہیں بتاتا ہے کہ تاجروں کو وہ رقم شاہی خزانے کو واپس کرنی پڑتی تھی یا نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ دہلی کے باہر زیادہ نرخوں پر اشیاء کو خریدنے اور دہلی میں ان کو سستے داموں بیچنے کے لیے وہ رقم دی جاتی تھی۔ لہٰذا تاجروں سے اس کو واپس کرنے کی توقع نہیں ہوتی ہوگی۔ لیکن برنی کا مشاہدہ ہے کہ بادشاہ مختلف اشیا کی قیمتوں کو طے کرتا تھا تاجر کے لیے وہ منافع کی مناسب شرح چھوڑتا تھا۔[27] یہ نتیجہ نکالنے کی جانب رہنمائی کرتا ہے کہ جب اس کا سامان فروخت ہو جاتا تھا تو تاجر سرکاری رقم واپس کر دیتا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان اس نکتہ کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطان نے سامان تجارت پر تمام محصول ختم کر دیئے، تاجروں کو رقم پیشگی دی اور ان کو ہدایت کی "اس رقم سے بیل اور بھیڑیں خریدو اور ان کو بیچو" ان سے جو قیمت آئے وہ خزانے میں داخل کی جائے۔ تم ان کی فروخت پہ معاوضہ پاؤ گے۔[28] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتانی (سندھی) تاجر اور دوسرے کاروباری جن کو دہلی میں تجارت کرنے کی ترغیب دی گئی تھی صحیح اصطلاحی معنوں میں وہ تاجر نہیں تھے کہ منافع بخش نرخوں پر سامان فروخت کرتے بلکہ وہ اصل میں حکومت کے کارندے تھے۔ ان کو غیر ممالک میں سامان خریدنے اور دہلی میں اُن کو بیچنے کے لیے پیشگی رقم دی جاتی تھی اور اس خدمت کے لیے ان کو معاوضہ ملتا تھا۔ اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان لین دین میں ریاست کو کچھ نہ کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہوگا۔

کالے بازار کے کاروبار کو روکنے کے لیے عمدہ قسم کے کپڑوں کی خرید و فروخت پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ دہلی کے باہر ریشم اونچے داموں بکتا تھا اور اندیشہ تھا کہ لوگ دارالسلطنت میں قیمتی اشیاء مقررہ نرخوں پر خریدیں اور ان کو چار پانچ گنی قیمتوں پر دہلی کے باہر بیچ دیں۔ اس طرح مملکت کو نقصان

---

۲۶۔ برنی کہتا ہے "سلطنت کے تاجر" لیکن یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ علاء الدین کو صرف دہلی سے مطلب تھا جہاں قیمتیں مقرر تھیں۔

۲۷۔ برنی، ص ۳۱۶

۲۸۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد ۳، ص 599

پہونچاکر نفع خوری کی برائی کا شدید خطرہ تھا۔ عوام کی جانب سے نفع خوری کے بعض معاملات سلطان کی علم میں لائے گئے جس نے ان کا جواب دینے کے لیے احکام نافذ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ان احکام کے مطابق کسی شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ قیمتی اشیا رجیسے تسبیح اور تبریزی، دہلی کی عمدہ ریشم (خز)، کمخواب، شستری، حریری، چینی، بھیرم اور دیوگیری کی ریشم سونے کے دھاگوں سے کڑھے ہوئے کپڑے[29]۔ اور اسی طرح کی دوسری اشیا دیوان ریاست سے پیشگی اجازت نامہ حاصل کیے بغیر نہیں خرید سکتا تھا۔ دیوان ملکوں اور امیروں اور دوسرے مشہور لوگوں کو جن کے حالات سے وہ مطمئن ہوتا تھا۔ اجازت نامے جاری کرتا تھا۔ خریدار کو اپنی خرید کردہ شے کے اقرار کے طور پر ایک تحریری رسید دینی پڑتی تھی۔ اس طرح کاسے بازار اور بے جا نفع خوری کا ہر امکان ختم ہوگیا تھا۔

دوسرے بازار | گھوڑوں، مویشیوں اور غلاموں کی فروخت کو منضبط کرنے کے قوانین بھی بنائے گئے تھے۔ قرون وسطیٰ میں گھوڑسوار دستہ فوج کا سب سے اہم شعبہ تھا اور گھوڑوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ وسط ایشیا میں منگولوں میں گھوڑوں کو چرانے کی سزا موت تھی۔ جنوبی ہند میں ہندو راجہ عرب اور قبچاق جیسے مالک سے گھوڑے حاصل کرنے پر کثیر رقم خرچ کرتے تھے۔ شمالی ہند میں اچھی نسل کے گھوڑے عرب، ایران اور افغانستان سے زیادہ درآمد کیے جاتے تھے لیکن منگولوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے تجارت گھٹ گئی تھی۔ اور گھوڑوں کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن علاء الدین کسی ایسی شے کی زیادہ قیمت کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جس کی ضرورت ایک سپاہی کو پیش آئے۔ لہٰذا گھوڑوں کی قیمت بھی مقرر کردی گئی۔ فوجی خدمات کے لیے موزوں سمجھے جانے والے گھوڑوں کو اپنی نسل اور معیار کے لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کیے گئے۔ بہترین قسم کے گھوڑے کی قیمت ایک سو اور ۱۲۰ تنکہ کے درمیان ہوتی تھی، دوسری قسم کی ۸۰ اور ۹۰ کے درمیان اور تیسری قسم کی ۶۵ اور ۷۰ تنکہ کے درمیان۔ وہ گھوڑے جن کو دیوان[30] فوجی خدمت کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے اور جو ٹٹو کہلاتے تھے، دس اور پندرہ تنکہ کی قیمت میں بکتے تھے۔ ان کم قیمتوں کو برقرار رکھنے کے لیے علاء الدین کو گھوڑوں کی تجارت کے دلالوں اور بیچ کے بیوپاریوں کے ساتھ بڑی سختی کا سلوک کرنا پڑا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ کسی بیوپاری یا اس کے

۲۹۔ برنی، ص ۳۱۱

۳۰۔ برنی، ص ۳۱۳ پر ہے: "(اسامی؟) اسپہائی کہ بنام حشم در دیوان بگذرند"
(گھوڑے جو کہ دیوان (کے دفتر) میں آتے تھے کہ وہ فوج میں گھوڑسوار دستے کے لیے موزوں ہیں)
دیوان سے یہاں مراد دیوان عرض ہے۔

کارندے کو اجازت نہ دی جائے کہ وہ بازار میں اس ارادہ سے جائے کہ آمد و رفت رکھے کہ وہ گھوڑے کو خریدے اور اسے زیادہ قیمت پر دوبارہ بیچ دے۔ لیکن دلالوں پر قابو پانا بہت آسان نہ تھا۔ آج بھی دلال یا بیچ کے بیوپاری منڈی کے لوگوں میں سب سے زیادہ چالاک اور قابو سے باہر ہوتے ہیں ضیاالدین بیان کرتا ہے کہ اس زمانے میں دلال اور بیچ کے بیوپاری لوگوں میں سب سے زیادہ مغرور، سرکش اور گھمنڈی طبقہ تھا۔ وہ بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں سے کمیشن لینے کے عادی تھے اور انھوں نے کاروبار اتنا پیچیدہ بنا دیا تھا کہ ان کی مدد کے بغیر لین دین نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً وہ بازار کے بادشاہ تھے۔ سلطان ان دلالوں پر بڑی مشکل سے قابو پا سکا۔ اس نے دلالوں کی جو برسوں سے اونچی بولی اور سٹہ بازی پر اپنی روزی کما رہے تھے۔ نفرت انگیز سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے بڑے سخت احکام نافذ کیے۔ جو دلال اپنے پرانے طریقوں پر جمے رہے اُن کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ تاجروں اور دلالوں کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ حیلہ فریب کی باتیں کریں یا جھوٹ بولیں اور سلطان کی مقرر کردہ گھوڑوں کی قیمتیں شہر میں تسلیم کی جانے لگیں۔

علاءالدین ہر چھ ہفتوں یا دو مہینوں کے بعد ہر قسم کے گھوڑوں کو معائنہ کے لیے طلب کرتا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ ہر قسم اپنی مقررہ قیمت پر فروخت ہو رہی ہے۔ اگر کسی قسم کی کمی بیشی معلوم ہو جاتی تھی: تو کارندوں کو جرمانے اور سزائیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ خوف دلوں کو ہوشیار رکھتا تھا اور خریداروں کی سادہ لوحی سے ان کو فائدہ اٹھانے سے باز رکھتا تھا۔ اس طرح سے بادشاہ ہر قسم کے گھوڑوں کی مقرر کردہ قیمتیں برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔

انھیں خطوط پر غلاموں اور مویشیوں کی قیمتیں بھی متعین کی گئی تھیں۔ قرون وسطیٰ میں ہر جنس کی طرح مرد غلام اور عورتیں لونڈیاں بن کر بازار میں بکا کرتے تھے۔ سلطان نے ان کی بھی قیمتیں مقرر کردی تھیں۔ ایک کام کاج والی لونڈی کی معیاری قیمت ۵ سے ۱۲ تنکہ مقرر تھی۔ اور ایک خوبصورت لونڈی کی قیمت بیس سے تیس حتیٰ کہ چالیس تنکہ تک تھی۔ اگر بہت زیادہ قیمت کی مثلاً ہزار یا دو ہزار تنکہ کی کوئی بہت ہی خوبصورت لڑکی بازار میں فروخت کے لیے پیش کی جاتی تھی کوئی آدمی اس کو منہیان (خفیہ پولیس) کے ڈر سے خریدنے کی ہمت نہیں کرتا تھا[۲۱] مبادا کہ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہو جائے کہ فلاں آدمی اتنا مالدار ہے کہ وہ ایک کنیز کے لیے اتنی بڑی رقم ادا کر سکتا ہے۔ لڑکوں کی قیمتیں بیس سے تیس تنکہ کے درمیان مقرر تھیں۔ بدشکل لڑکے نو یا آٹھ تنکہ ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔ غلام لڑکوں کی تقسیم

---

۲۱۔ برنی ص ۳۱۴

ان کے خدوخال اور کام کرنے کی صلاحیت کے مطابق کی جاتی تھی۔ جیسا کہ گھوڑوں کے بازار کا معاملہ تھا اسی طرح غلاموں کے بازار میں بیوپاریوں اور دولتمند لوگوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ غلام لڑکوں یا لڑکیوں کو دیکھتے دکھاتے اور ان کی قیمتوں میں مول تول کرتے پھریں۔ سلطان کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے پر دلالوں کو جو سزائیں دی گئی تھیں وہ بہت کڑی تھیں اور برنی مبالغہ آمیزی کے ساتھ، مگر ٹھیک کہتا ہے کہ دلالوں کو ایسی سزائیں دی گئیں تھیں کہ زندگی ان کے لیے اجیرن ہوگئی تھی اور وہ موت کی تمنا کرنے لگے تھے۔[۳۲]

اسی قسم کے قاعدے مویشیوں کے بازار میں بھی جاری کیے گئے تھے۔ سواری کا ایک اچھا جانور جو بعد میں تغلق عہد میں ۸۰ تنکہ کی قیمت کا ہوتا تھا، علاء الدین کے عہد میں ۴ یا زیادہ سے زیادہ ۵ تنکہ کا بکا کرتا تھا ذبیحہ کی گائے ڈیڑھ تنکہ میں جب کہ دودھاری گائے تین چار تنکہ میں فروخت ہوتی تھی۔ دودھ دینے والی بھینس کی قیمت اوسطاً دس سے بارہ تنکہ ہوتی تھی۔

بڑے بازاروں کے بارے میں بس یہ کہنا کافی ہے۔ ابتدا ہی میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ علاء الدین نے ہر ہر شے کی قیمت مقرر کی تھی۔ خواہ وہ کتنی ہی معمولی ہو۔ یہ ایک مستحکم معاشی حکمت عملی کا بھی معاملہ تھا۔ مختلف اشیاء کی قیمتوں کا ایک دوسرے سے ربط ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر گیہوں، گھی اور شکر کی قیمتیں مقرر ہو جائیں اور مٹھائی کی قیمت مقرر نہ کی جائے تو ضابطہ مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ مٹھائیوں کی مثلاً ہریسہ، ریوڑی، مصری اور حلوہ، سبزیوں، روئی، کنگھوں، جوتیوں، موزوں، جوتوں، چاقوں، گھڑوں، پیالوں، سوئی، سپاری حتیٰ کہ پان کی قیمتیں مقرر کر دی گئی تھیں۔

### احکامات کے نفاذ کے ذرائع

ان ضابطوں کو تاجروں، تھوک فروشوں نیز خوردہ فروشوں کے حلق سے اتارنا جو تدتوں سے کثیر منافع سے لطف اندوز ہوتے تھے، آسان نہ تھا۔ لیکن بادشاہ یہ دیکھنے کا تہیہ کر چکا تھا کہ اس کے احکام پر ایمانداری سے عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے احکامات کے مؤثر نفاذ ہی پر اس کی مسلح افواج کی مستعدی اور خوشحالی، غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف مملکت کی حفاظت اور فتوحات کے ذریعہ بادشاہ کا وقار منحصر تھا۔[۳۳]

مختلف اشیاء کی قیمتوں کا ایک گوشوارہ تیار کیا گیا اور بائع کو نفع کی ایک مناسب شرح کی اجازت

---

۳۲۔ برنی، ص ۳۱۵

۳۳۔ فتاوائے جہانداری، ص ۳۶

دی گئی ہے[34] چونکہ یہ شرح بادشاہ نے تاجروں سے مشورہ کیے بغیر متعین کی تھی لہٰذا یہ بے خوف و خطر فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ نفع پر مشتمل نہیں تھی۔ گوشوارہ دیوان ریاست کے حوالہ کر دیا جاتا تھا جس کا یہ فرض منصبی تھا کہ وہ اس کو بازار میں نافذ کرے۔ ملک یعقوب، دیوان ریاست یا دہلی کے بازاروں کا ناظم اعلیٰ مختلف بازاروں کے لیے جو متعدد اشیاء کا کاروبار کرتے تھے۔ شحنہ یا نگران مقرر کرتا تھا۔ شحنہ اپنے بازار پر پورا اختیار رکھتا تھا اور براہِ راست سلطان کو جوابدہ ہوتا تھا۔ شحنہ کا منصب بلند ہوتا تھا جیسا کہ ملک قبول کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جاتا ہے۔ شحنہ اپنے بازار کے نرخوں کے گوشوارہ کی نقل پاتا تھا۔ نگرانوں کو ہدایت تھی کہ وہ خریداروں سے معلوم کریں کہ انھوں نے کسی خاص شے کے لیے کیا قیمت ادا کی ہے اور ان کے بیانات لکھنے ہوتے تھے تاکہ ان کی تصدیق کی جا سکے کہ آیا وصول کردہ قیمیں گوشوارہ کی قیمتوں کی خلاف ورزی تو نہیں کرتیں۔ اگر دوکانداروں کو زیادہ قیمتوں پر چیزیں فروخت کرتے پایا جاتا تھا تو فوراً ہی ان کو سزا دی جاتی تھی۔ ہر بازار کے لیے ایک شحنہ کا تقرر قیمتوں کو یکساں اور باقاعدہ رکھنے میں انتہائی معاون ثابت ہو۔

بازار کے افسروں کو عطا کردہ اختیارات بلاشبہ بہت وسیع تھے وہ ہر طرح سے تاجروں پر ظلم کرتے، کوڑے لگاتے اور خوفزدہ کرتے تھے۔ لیکن زیادہ تر صورتوں میں بازار کے لوگ اپنے ساتھ کیے جانے والے سخت سلوک کے لیے خود ہی ذمہ دار تھے۔ دوکانداروں کا مول تول کرنا، سودا بازی کرنا اور فریب دینا آج بھی ہندوستانی بازاروں کی ایک عام خصوصیت ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ چودھویں صدی میں حالات اور بھی ابتر تھے۔ دکاندار کاروباری لین دین کرنے، بدمعاشی، بدسلوکی بے شرمی اور بے حیائی کے عجیب طریقے اختیار کرتے تھے (وہ) اپنے کانچ کے ٹکڑوں کو ہیروں کا نام دیتے تھے تاکہ انھیں ہیروں کے دام پر فروخت کریں اور دوسرے بیچنے والوں کے ہیروں کو محض پتھر بتاتے تھے تاکہ ان کو پتھروں کے دام خرید لیں[35] ـــــ مختصر یہ کہ وہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو دھوکہ دیتے تھے۔ ضیاء الدین ان کو (دنیا میں بسنے والے) لوگوں کے بہتر طبقات میں سب سے بڑا جھوٹا بتاتا ہے۔[36] برنی وہ اپنے زمانے کے دلالوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سرکاری ضوابط کے نفاذ سے قبل وہ قیمتیں مقرر کرتے تھے اور بائع اور مشتری دونوں کو فریب دیتے تھے۔ مؤرخ اپنا بیان جاری رکھتا

۳۴۔ برنی ص، ۳۱۶

۳۵۔ فتاوائے جہانداری، ص ۳۶

۳۶۔ برنی، ص ۳۴۳

ہے کہ قدیم زمانے کے بادشاہوں میں یہ کہاوت چلی آرہی تھی کہ بازار کے بے ایمان لوگوں کو قابو میں کرنے سے ایک جنگل صاف کر دینا یا دور دراز ممالک کو فتح کر لینا آسان ہے۔ اونچی قیمتوں پر فروخت کرنا اور کم تولنا ان کی عام عادتیں تھیں۔

قیمت کے ضابطہ کے سلسلے میں اپنے احکامات کی خلاف ورزی کے لیے علاء الدین نے انتہائی سخت سزاؤں کا حکم دیا تھا اور ناظر یعقوب ان کو نافذ کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ یعقوب کی سخت گیری کے بارے میں بوڑھوں اور نوجوانوں میں ہر جگہ خوب گفتگو کی جاتی تھی۔ روزانہ ناظر بازار میں لین دین میں کئی بار معلومات حاصل کرتا تھا اور معمولی سے فرق کے معلوم ہو جانے پر وہ بیوپاریوں کو بڑی بے رحمی سے کوڑے لگاتا تھا۔[۲۷] اس سخت گیری کے باوجود تاجر خریداروں کو دھوکہ دیتے رہتے تھے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ جب بچے بازار میں چیزیں خریدنے آتے تھے تو کم تولنے کی ترکیب پر عموماً عمل کیا جاتا تھا۔ ان کی شرارت کا پتہ لگانے کے لیے سلطان اپنے غلام لڑکوں کو بلاتا، کچھ جیتل دیتا، اور ان کو بازار بھیجتا تھا۔ ایک سے روٹی لانے کو کہتا، دوسرے سے حلوہ، تیسرے سے یخنی، چوتھے سے ریوڑی، پانچویں سے خربوزہ، چھٹے سے کھیرا ککڑی وغیرہ اور جب یہ لڑکے خریداری کر کے لوٹتے تو سلطان دیوان ریاست کو بلا بھیجتا اور لڑکوں کی خرید کردہ اشیا کو اس کی موجودگی میں تلواتا تھا۔ اگر کوئی چیز وزن میں کم پائی جاتی وہ فوراً اس دکان پر جاتا جہاں سے چیز لی گئی ہوتی۔ وزن میں کمی کے برابر مقدار میں فریب شدہ بائع کے سرینوں سے گوشت کاٹ لیا جاتا اور اس کو اس کی دکان سے نکال دیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی خوفناک سزائیں صرف ناقابل اصلاح مجرموں کو دی جاتی رہی ہوں گی۔ مؤرخ کہتا ہے کہ کچھ عرصہ تک دہشتناک سزائیں دی جاتی رہیں آخر کار بیوپاری بالکل ہی فرمانبردار ہو گئے اور انھوں نے کم تولنا بند کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ بسا اوقات اصل وزن سے بھی زیادہ تول کر دیتے تھے۔

**مارکیٹ کنٹرول کے اثرات** اب یہ دوسری انتہا تھی۔ اگر نفع خوری، کم تولنے اور خریداروں کو مختلف طریقوں سے دھوکہ دینے کی حوصلہ شکنی کی ضرورت تھی، تو انتہائی سخت سزائیں جنھوں نے دوکانداروں کو اصل مقدار سے زیادہ تولنے پر مجبور کیا۔ سلطان کی دور اندیشی کے فقدان کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ ان حالات میں کہ دوکانداروں کو مناسب منافع ملے بغیر کام کرنا پڑے کب تک تجارت فروغ پا سکتی ہے؟ علاء الدین کے بازار کے ضوابط نے بیوپاریوں کو

۲۸۔ برنی، ص ۳۱۸ میں "درہم" ہے

کا نی نفع کی اجازت نہیں دی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بیوپار اور تجارت کی حوصلہ افزائی نہیں کی ۔ بادشاہ نے قیمتوں میں ذرا بھی نرمی کی اجازت نہیں دی اور جہاں نفع کی امید اٹھ جائے وہاں تجارت کے لیے کوئی ترغیب باقی نہیں رہتی ۔ مزید برآں وہ ضوابط جو بیوپاریوں کو مشکل سے ہی فائدہ پہنچاتے تھے ان سے زبردستی منوائے گئے ۔ مبالغہ آرائی کا اکثر برنی خوگر ہے اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی ایسے واقعات کہ گھوڑے مویشی اور غلاموں کے بازار کے دلالوں کو اتنی کڑی سزائیں دی جاتی تھیں کہ "زندگی ان کے لیے اجیرن بن جاتی تھی اور وہ موت کی تمنا کرتے تھے" بصراحت بتاتے ہیں کہ بازار کے لوگ یقیناً متنفر ہوئے ہوں گے ۔ تجارت کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی ۔ اس بات سے واضح طور پر تصدیق ہے کہ اناج اور دوسری اشیا میں بیوپاریوں کو دہلی میں بسنے پر مجبور کیا گیا تھا ان کو معاہدوں پر دستخط کرنے پڑتے تھے جن کی رو سے وہ "انفرادی اور اجتماعی طور پر" ایک دوسرے کے لیے ذمہ دار ہوتے تھے ۔ سرکاری افسروں کا اقتدار و اختیار ان کے بیوی بچوں تک وسیع تھا ۔[۳۹] اس سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کے سخت ضوابط کے تحت تاجر کس قدر پیچ و تاب کھاتے ہوں گے اور کس طرح اس صورت حال کے ختم ہونے کی تمنا کرتے ہوں گے ۔

صرف کاروبار اور تجارت ہی نہیں بلکہ زراعت بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی ۔ پچھلے باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ کے مالگزاری کے ضوابط نیز معاشی اقدامات زراعت پیشہ لوگوں کے لیے کس قدر نقصان دہ تھے ۔ یہاں ایک بار پھر اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ضوابط نے کاشتکاروں کی حالت دگرگوں کر دی تھی ۔ مورلینڈ کا خیال ہے کہ سلطان کے مال گزاری کے ضوابط کا مقصد لوگوں کو کچلنا تھا غریب کاشتکاروں یا کسانوں کے "گلے" کو دبانا مقصود نہیں تھا ۔ لیکن یہ بات بعید از فہم ہے کہ غریب کاشتکار بازار کے ضوابط کے تحت کیونکر خوش رہے ہونگے ۔ یہ صحیح ہے کہ علاء الدین نے زمینداروں کو غلامی تک پہونچا دیا تھا ۔ لیکن اس سے کاشتکاروں کو کس طرح کا فائدہ نہیں ہوا ۔ یہ قابل فہم ہے کہ زمین کی پیداوار کی پچاس فیصد جنس کی وصولیابی سے دارالسلطنت میں غلہ ذخیرہ جمع کرنا مقصود تھا کاشتکاروں پر ظلم کرنا نہیں ، تاہم جب ایک کسان اپنے گاڑھے پسینے کی پیداوار کا نصف لگان میں ادا کر دیتا اور بقیہ میں سے کچھ دوسرے مختلف محاصل میں دے دیتا تھا اور پھر وہ مجبور کیا جاتا تھا کہ اپنے غلہ کو سستے داموں کاروانی تاجروں کے ہاتھ فروخت کرے اور اس کا ذخیرہ حاصل کرنے میں سرکاری افسر جن کی مدد کرتے تھے یہ اس زمانے کے کاشتکاروں کی عام حالت

۳۸۔ [illegible]

کے بارے میں کسی بہتری پر دلالت نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کاشتکار بڑے شہروں کے بازاروں میں جو ان کے کھیتوں کے قریب واقع تھے اپنا غلّہ لے جانے کی مشقت سے بچ گئے تھے اور نفع خور درمیانی لوگوں اور سٹّہ بازوں کی ترغیبات کا شکار ہونے سے محفوظ ہو گئے تھے۔" تاہم وہ اپنے غلہ کو حکومت کی مقرر کردہ سستی قیمت پر فروخت کرنے سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ اپنے لیے کسی بازار کا انتخاب کرنے اور نفع کے لیے کوشش کرنے کی آزادی سے محروم تھے۔ نفع حاصل کرنے کی خواہش کو جو پیداوار کی سب سے بڑی محرک ہوتی ہے۔ علاالدین کے بازار کے ضوابط نے پوری طرح کچل دیا تھا۔ اور چاہے بالکل قلاش کی نہ ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکار یکساں اور کم معیار کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سلطان کا مقصد غریب کسانوں کو دبانا نہ ہو۔ ان کے خلاف کینے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ البتہ ریاست کی ناگہانی ضرورت کا تقاضا تھا کہ ایسے قدم اٹھائے جائیں جن کے تحت تجارت اور زراعت کے مفادات کو فوج کے مفادات پر قربان کر دیا جائے۔ ایک کاشتکار ہمیشہ ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتا، اگر اسے اس کی پیداوار کی مناسب قیمت دی جائے تو وہ ذخیرہ اندوزی نہیں کرے گا۔ وہ کچھ غلہ برے موسموں کے خلاف احتیاط کے طور پر ذخیرہ کر لیتا ہے اُسے اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کے پاس موجود غلّہ کا ہر من دہلی کی غلّہ منڈی کو بھیج دیا جاتا تھا۔ سلطان کے گودام فاضل غلہ سے ہمیشہ بھرے رہتے تھے چنانچہ ابن بطوطہ نے ایک بار وہ چاول کھایا تھا جو علاءالدین کے عہد میں ذخیرہ کیا گیا تھا۔ اس کا رنگ کالا پڑ گیا تھا لیکن مزا باقی تھا۔ صرف یہی واقعہ بتاتا ہے کہ حکومت نے غلہ کی کثیر مقدار جمع کر لی تھی جو ریاست کی ضروریات سے بہت زیادہ تھی، اتنی زیادہ کہ بادشاہ کے انتقال کے تیس سال بعد بھی وہ دستیاب تھا۔

## قیمتوں پر کنٹرول کی اصل اور حد

علاءالدین کے بازار کے ضابطے پر بحث ختم کرنے سے پہلے دو نکتوں کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ ان کی وجہ سے حال میں کچھ اختلاف پیدا ہوا ہے[40]۔ پہلا تو یہ کہ آیا بازار کے ضوابط مملکت کی ضرورت کا نتیجہ تھے یا ایثار پسند اور انسان دوستی کے محرکات کا ۔۔۔۔ یا یوں کہیے کہ وہ صرف فوج کے فائدہ کے لیے بنائے گئے تھے، یا عام لوگوں کا فائدہ مقصود تھا۔ دوسرا یہ کہ یہ معاشی ضوابط صرف دارالسلطنت دہلی تک محدود تھے، یا وہ پوری سلطنت میں جاری تھے۔

پہلے نکتہ کے سلسلے میں شیخ نصیر الدین مصنف خیر المجالس نوشتہ (۵۳-۱۳۵۲ء) نے ایک بڑا دلچسپ

۴۰۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو انسر بیگم اور محمد حبیب "قادائے جانداری میں حاشیے ص ۴۸-۴۳

واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ رات کے کھانے کے بعد کی گفتگو میں قاضی حمید الدین نے شیخ سے علاء الدین کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیا۔ قاضی نے کہا کہ ایک بار اس نے سلطان کو سوچ بچار میں غرق اور اداس دیکھا۔ فکر مند لگا اور دماغ پریشان تھا۔ ملک قرابیگ جو اس موقعہ پر موجود تھا سلطان سے اس کے پُرسکوت غور و فکر اور سخت خاموشی کا سبب ظاہر کرنے کی التجا کی۔ سلطان نے جواب دیا "سنو! میرے ذہن میں یہ خیال اکثر آیا ہے کہ خدا کی اس دنیا میں جہاں بہت سے لوگ رہتے ہیں مجھ کو (ان پر) حکومت کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھ پر لازم ہے، کہ میں کچھ ایسا کام کروں جس کے فائدہ سے ہر شخص لطف اندوز ہو (بہ ہمہ خلق)۔ میں جانتا ہوں کہ اگر تمام خزانے جو میری ملکیت میں ہیں تقسیم کردوں یا لوگوں کو تمام زمینیں اور گاؤں بانٹ دوں تب بھی میں ان کے پورے طبقہ کو فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔ بہرکیف ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے اور میں اس پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے غلّہ کو سستا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اور (اس قدم کا) فائدہ ہر شخص کو پہونچے گا۔ اناج اس طریقہ سے سستا ہوگا کہ میں تمام نائیگان (گھومنے والے تاجروں) کو جو شہر میں غلّہ لاتے ہیں، طلب کروں گا اور ان کو غلّہ خریدنے اور (شہر میں) لانے کے لیے خزانہ سے روپیہ دوں گا۔ (اس کے بدلے میں) میں تاجروں کو اپنے خاندانوں کی کفالت کے لیے لباس اور روپیہ دوں گا۔" اسی کے مطابق احکامات جاری کیے گئے اور ہر چہار جانب سے غلّہ آنے لگا۔ نصیر الدین کے مطابق اس مقصد کو مدِ نظر رکھ کر علاء الدین نے قیمت پر کنٹرول کے مختلف ضوابط جاری کیے۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد شیخ تبصرہ فرماتے ہیں کہ "سلطان علاء الدین ایسا ہی تھا لوگ اس کے مقبرہ پر عقیدت کے پھول چڑھانے جاتے تھے، اس کی قبر پر منت کے دھاگے باندھتے تھے، مرادیں مانگتے تھے اور ان کی التجائیں پوری ہو جاتی تھیں۔" [41]

کسی معصر یا بعد کے مؤرخ نے یہ واقعہ نہیں بیان کیا۔ یہ صوفیوں سے متعلق ایک کتاب میں مذکور ہے جو بازار کے ضوابط کے نفاذ کے تقریباً پچاس سال بعد لکھی گئی تھی۔ اگر اس کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے کیونکہ سلطان سے قاضی کی گفتگو ایک نجی مجلس میں ہوئی تھی تب بھی سلطان کا انسان دوستی کا محرک جیسا کہ خیر المجالس کے مصنف نے ذکر کیا ہے اس کے دماغ کے ایک وقتی خیال سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ علاء الدین کی سرکاری پالیسیوں کا مسلّمہ مقصد لوگوں کو کنگال کرنا تھا تاکہ "بغاوت ان کے لبوں تک نہ آئے"۔ لوگوں کو خوشحال اور مسرور بنانے کا کوئی بھی قدم عوام کو بالکل ہی مفلوک الحال بنانے کے اس

۴۱ ۔ خیر المجالس، پروفیسر حبیب کا مخطوط، ورق ۹۲-۲۹۰

کے اپنے منصوبوں کی نفی کے مترادف ہوتا۔ ترک حکومت کی روح رواں عموماً اور علاء الدین کی حکومت کی خصوصاً تشدد کے ذریعہ حکمرانی کرنا تھی۔ وہ عوام کی مرضی یا فلاح و بہبود پر مبنی نہیں تھی۔

ہمعصر مورخ برنی حتمی طور پر بیان کرتا ہے کہ علاء الدین نے شاہی افواج کے فائدہ کے لیے قیمت پر کنٹرول کا طریقہ رائج کیا تھا۔ وہ قیمتوں میں زیادتی کے رجحان اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کی تکلیف کو دور کرنے کی کوئی شہادت نہیں بہم پہنچاتا جس کی بنا پر سلطان نے قیمت پر کنٹرول کی تدبیر اختیار کی۔ وہ نہیں کہتا ہے کہ اس وقت کے لیے کوئی ضروری یا فوری معاشی معقول وجہ تھی۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ منگول خطرے کی وجہ سے علاء الدین ایک لشکر جرار بھرتی کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ وہ سپاہیوں کو اچھی تنخواہیں نہیں دے رہا تھا اور پھر بھی ان کو مطمئن رکھنا چاہتا تھا لہذا اس نے فیصلہ کیا کہ ان اشیاء کی قیمتیں کم کر دے جن کی سپاہیوں کو ضرورت پڑتی تھی جیسے گھوڑے اور اسلحہ نیز اناج اور کپڑا۔[42] چنانچہ اصل مقصد حکومت کے نظم و نسق کے اخراجات کو کم اور کم تنخواہ پانے والے سپاہیوں کو مطمئن رکھنا تھا اور یہ صرف قیمت پر کنٹرول کے ذریعہ کیا جا سکتا تھا۔

یقیناً قیمت پر کنٹرول کی ضرورت پر اس زمانے کی رائے منقسم تھی۔ بہت سے لوگ اس اقدام پر معترض تھے لیکن برنی ان کے دلائل کو اس بنیاد پر مسترد کر دیتا ہے کہ وہ فوج اور نظم و نسق کے مسائل سے ناواقف تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جو لوگ نظم و نسق اور فتوحات کی اصل حیثیت کا علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ بادشاہ کو قیمت پر کنٹرول اور قیمت کے تعین کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ کم قیمتیں افراط پر موقوف ہوتی ہیں"۔[43] لیکن سلطان کے لیے جو فوج اور نظم و نسق کے مسائل جانتا تھا قیمت پر کنٹرول ایک سیاسی ضرورت تھی۔ عام طور سے برنی علاء الدین کے بہت سے ضوابط پر معترض ہے جو لوگوں کی تکلیف کا سبب بنے لیکن وہ مالگزاری اور بازار کے ضوابط کی سختی اور ان کو نافذ کرنے میں افسروں کی درشتی کی تفصیلات بیان کرنے میں بدخوئی پر مبنی مسرت محسوس کرتا ہے۔[44] کیونکہ اس کے مطابق "کاسد ہندو کا ہندو بیوپاری اپنے گناہوں کی پاداش میں سزا پانے کا مستحق تھا"۔[45]

---

42۔ برنی، ص ۳۰۳ ـ ۳۰۴۔

43۔ فتاویٰ جہانداری، ص ۳۰

44۔ برنی، ص ۲۹۱ ـ ۳۰۴

45۔ ذخیرہ اندوزی ہندوؤں کا پیشہ ہے ۔۔۔ اگر سلطان ارزاں قیمتوں کے معاملے میں کوشش کرے گا تو خدا نے جن کو عزت بخشی (یعنی مسلمان سماج میں) اور زیادہ عزت پائیں گے اور جن کو خدا نے ملعون بنایا ہے (یعنی ہندو) وہ اور بھی مفلوک الحال اور بے چارا ہو جائیں گے۔ نظم و نسق کے معاملے میں یہ زبردست فائدہ ہوگا۔ (فتاویٰ جہانداری، ص ۳۰-۳۱)

یہ صحیح ہے کہ سپاہیوں اور دوسرے سرکاری ملازمین نے جن کی تنخواہیں مقرر تھیں بازار کے ضوابط سے یقیناً فائدہ اٹھایا۔ اگر دہلی کے کچھ اور لوگوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ محض اتفاقی تھا۔ بلاشبہ فوج بنی نوع انسان (خلقِ خدا) ہی کا صرف ایک حصّہ تھی جن کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ بادشاہ ان کو خوش رکھنے کے لیے کوشاں تھا۔ کاشتکار، صنعت کار اور تاجر بھی سپاہیوں ہی کی طرح خلقِ خدا تھے۔ لیکن علاء الدین کے ضوابط ان کے مفادات کے لیے انتہائی مضرت رساں ثابت ہوئے۔ حتیٰ کہ سپاہیوں کو بھی قیمتوں کی ارزانی کا زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ ایک طرف ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں کم کردی گئی تھیں تو دوسری طرف سپاہیوں کی تنخواہیں بھی کم کردی گئیں۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ سپاہیوں کو نئے انتظام سے واقعی بہت فائدہ پہنچا تھا۔ ضیاء الدین کا یہ مزاح تبصرہ کہ دہلی میں ایک کہاوت مشہور ہوگئی تھی کہ "ایک اونٹ ایک دانگ میں لیا جاسکتا تھا لیکن دانگ کہاں؟"[۴۶] پوری طور پر یہ بتاتا ہے کہ بازار کے ضوابط نے اشیاء سستی کردی تھیں لیکن لوگوں کو غریب بنادیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ علاء الدین کا مارکیٹ کنٹرول انسان دوستی کا نہیں ایک سیاسی ضرورت کا تقاضا تھا۔ مزید برآں جس سختی اور تشدد کے ساتھ بازار کے ضوابط کا تقاضا تھا۔ مزید برآں نصیر الدین کی بیان کی ہوئی کہانی سے بہت مختلف ہے۔

غور و فکر کا دوسرا نکتہ تھا آیا قیمت پر کنٹرول کا حکم صرف دہلی کے لیے تھا یا پوری سلطنت کے لیے۔ تاریخِ فیروز شاہی میں اپنے بیان کے دوران برنی کا عام خیال یہ ہے کہ مارکیٹ کنٹرول (بازار کا انضباط) صرف شہر دہلی تک محدود تھا اگرچہ بعض مقامات پر اس کا "شہر" "شہروں" میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ فتاویٰ جہانداری میں بھی وہ بعض اوقات "عمومی بازاروں" کا ذکر کرتا ہے جب کہ فرشتہ حتمی طور پر بیان کرتا ہے کہ دہلی کے لیے مقرر کردہ قیمتیں ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی نافذ تھیں[۴۷]۔ لیکن اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ علاء الدین کے بازار کے ضوابط صرف دہلی تک محدود تھے اور اس کی حدود کے باہر جاری نہیں تھے۔

اول یہ کہ تاریخ فیروز شاہی کے بیان میں جہاں کہیں دیوانِ ریاست، شحنۂ منڈی وغیرہ جیسے عہدیداران کی سرگرمیوں کا ذکر آتا ہے یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ صرف دہلی تک محدود تھیں کسی دوسرے شہر کے کسی شحنہ یا گماشتہ کا ایک بھی نام مدِ نظر میں نہیں آیا ہے۔

---

۴۶ ۔ برنی ص ۳۱۲

۴۷ ۔ فرشتہ ص ۱۱۲

دوم یہ کہ تاجروں اور بیوپاریوں کو دیوان ریاست کے دفتر میں اپنا نام درج کرانا ہوتا تھا اور دہلی میں رہنے اور کام کرنے کی انفرادی اور اجتماعی ضمانت دینی پڑتی تھی۔ پھر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر جانے کا خدشہ کیوں تھا؟ صرف اس لیے کہ کسی اور جگہ قیمتوں پر کنٹرول نہیں تھا اور دہلی کے باہر تاجر بہتر منافع کی امید رکھ سکتے تھے۔[۴۸]

سوم یہ کہ کپڑا بازار کے لیے جو سرائے عدل میں واقع تھی (دہلی میں اس کے باہر کسی دوسرے کپڑے کے بازار کا ذکر نہیں ملتا) سلطان نے بیس لاکھ تنکہ[۴۹] کی رقم تاجروں کو شہر میں کپڑا لانے کے لیے دی تھی۔ یقیناً کپڑا دوسری جگہ مہنگا تھا اور بیوپاری اس کو دہلی میں مقررہ نرخوں پر فروخت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اور خزانے سے ان کو کثیر رقوم بطور پیشگی دیا جانا ضروری تھا تاکہ وہ کسی اور جگہ سے عمدہ کپڑا زیادہ قیمت پر خرید سکیں اور دہلی میں اس کو مقررہ نرخوں پر فروخت کر سکیں۔ اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ دہلی کے مضافات میں بھی ریشمی کپڑا دہلی میں مقررہ قیمتوں سے چار پانچ گنا زیادہ پر بکتا تھا۔[۵۰] شہر دہلی کے باہر کپڑے کی غیر قانونی برآمد کو روکنے کے لیے سربرآوردہ اشخاص کو (امراء وملوک واکابر) کو جن کے حالات سے دیوان ریاست مطمئن ہوتا تھا باقاعدہ اجازت نامے ملتے تھے۔[۵۱] اگر دہلی کے باہر بھی مقررہ قیمتیں نافذ ہوتیں تو غیر قانونی تجارت کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔

چہارم یہ کہ برنی بار بار کہتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کی برائی (کسی شے کو کم داموں خریدنا اور پھر اس کو مہنگے داموں بیچنا) بہت عام تھی۔ دہلی میں ذخیرہ اندوزی کا کوئی سوال نہیں تھا جہاں ہر شخص مقررہ نرخوں پر چیزیں خرید سکتا تھا۔ ذخیرہ اندوزی اور غیر قانونی تجارت بہت نفع بخش

---

۴۸۔ شحنہ نے ہدایت کی تھی کہ گھومنے والے تاجروں کے قائدین (کاروانیان) ہمیشہ اس کے سامنے موجود رہیں (زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے) اور جب تک وہ باہمی تحفظ کے ایک ضمانت نامہ پر دستخط کرنے، اپنے بیوی بچوں، مویشیوں اور سامان سمیت جمنا پر واقع گاؤں میں آ بسنے کے لیے راضی نہ ہوں، جہاں شحنہ کا دائرۂ اختیار تھا: ماں، پدر اور ان کے بیوی بچوں پر حاوی ہو زنجیریں ان کی گردنوں سے نکال جائیں"۔ برنی ص ۳۰۶

تاجر دہلی میں بسنے سے گریز کیوں کرتے تھے؟ ان کو دہلی میں رہنے کے لیے مجبور کرنے کے اس قدر سخت اقدامات کیوں ضروری تھے؟ ظاہر ہے کہ اس کے لیے وہ دوسری جگہ بہتر منافع کما سکتے تھے۔

۴۹۔ برنی، ص ۳۱۱

۵۰۔ برنی، ص ۳۱۲

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲۔۳۱۱

تھی کیونکہ چیزیں دہلی میں مقررہ نرخوں میں خریدی جاسکتی تھیں اور دوسری جگہ جہاں قیمتیں مقرر نہیں تھیں اونچے نرخوں پر بیچی جاسکتی تھیں ۔ فتاوائے جہانداری میں وہ بصراحت بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کو منڈیوں کے گماشتوں اور شہروں کے شحنوں اور کوتوالوں کو حکم دینا چاہیے کہ وہ کسی حالت میں دارالسلطنت میں ذخیرہ اندوزی کی اجازت نہ دیں۔"[۵۲]

وہ بار بار یہ بھی بیان کرتا ہے کہ سلطان کی انتہائی سخت سزائیں بھی لوگوں کو ذخیرہ اندوزی اور غیر قانونی تجارت سے باز نہیں رکھ سکی تھیں محض اس لیے کہ وہ اتنے ہی نفع بخش تھے ۔ درحقیقت قیمت کا کنٹرول دہلی میں تھا کسی اور جگہ نہیں جس نے ذخیرہ اندوزی اور غیر قانونی تجارت کی حوصلہ افزائی کی تھی ۔

پنجم یہ کہ برنی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ دارالسلطنت میں قیمتوں کی ارزانی کی وجہ سے ہر قسم کے علماء اور ہنرمند وہاں آئے اور بس گئے تھے ۔ قیمت کے کنٹرول کے فوائد کو گناتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "پہلا فائدہ : فوج مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے ۔ دوسرا فائدہ: سلطان کا دارالسلطنت چیدہ اشخاص کے وہاں آنے اور بس جانے سے ... ایک عالمگیر دارالخلافہ بن جاتا ہے"[۵۳] چیدہ لوگوں کے دارالسلطنت میں پناہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اگر قیمتیں ہر جگہ یکساں ہوتیں ۔

ششم یہ کہ برنی ایک جگہ پر بہت وضاحت کے ساتھ کہتا ہے کہ قیمت کا کنٹرول صرف دہلی ہی میں جاری تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ "جن برسوں میں بارشیں نہیں ہوتی تھیں اور خشک سالی ناگزیر ہوتی تھی مگر دہلی میں کوئی قحط نہیں پڑتا تھا ، قیمتوں میں ایک دانگ کا بھی اضافہ نہیں ہوتا تھا نہ تو سرکاری غلہ جات میں اور نہ ہی تاجروں کے غلہ میں"[۵۴] ایک دوسری جگہ وہ اس بیان کو دہراتا ہے کہ "مذکورہ ضوابط کی وجہ سے چیزیں دہلی میں سستی ہوگئی تھیں اور برسوں سستی رہیں"[۵۵]

انجام کار سب سے آخری بات یہ کہ دوکانداروں کی دیانت کا امتحان لینے کے لیے چھوٹے بچوں کو سلطان

---

۵۲۔ فتاوائے جہانداری ، ص ۳۵

۵۳۔ ایضاً ص ۳۶

۵۴۔ برنی ، ص ۳۰۸

"درسالہائی کہ امساک باراں شدی و در امساک باراں قحط لازم بود در دہلی قحط نیفتادی و یک دانگ از نرخ سلطانی بالا رفتن نہ در غلۂ سلطانی و نہ در غلہ کاروانی ممکن نگشت ۔"

۵۵۔ برنی ص ۳۱۲

کے بھیجنے اور بچوں کو دھوکہ دینے والوں کو سزا دینے کے لیے دیوان ریاست کی فوراً روانگی کی پوری کہانی صرف دہلی سے متعلق ہے ۔ چنانچہ برنی نیز فرشتہ کے ایک دو جگہ "شہر دن" اور "سلطنت" کے غیر محتاط ذکر کے باوجود قیمت کا کنٹرول صرف راجدھانی میں روبہ عمل تھا ۔ اس کو پوری سلطنت کے لیے وسعت دینے کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا تھا اور وہ دہلی سے باہر جاری نہیں تھا

**خلاصہ کلام**

گذشتہ صفحات کی بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو زراعت نہ بیوپار اور تجارت علاء الدین کے ضوابط کے تحت فروغ پا سکے ۔ مگر زراعت اور تجارت کی ترقی اس کا مقصد ہی نہ تھا ۔ اس کے نزدیک مملکت کی بنیادی ضرورت ایک بڑی فوج کی کفالت تھی جو منگول حملوں کو پسپا کرنے نیز ہندستان کے آزاد حکمران کو مطیع بنانے کے لیے کافی ہو ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بازار کے ضوابط کے فوائد سے دہلی کی شہری نیز فوجی آبادی لطف اندوز ہوتی تھی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا خاص ذکر برنی نہیں بھولتا ہے[۵۶] تاہم دوآب ، دہلی کے مضافات میں واقع علاقوں جھائن اور ریوانہ کے زراعت پیشہ لوگوں نے راجدھانی کے عوام کے فائدہ کے لیے عسرت برداشت کی تھی ۔ اسی طرح بیوپاریوں کو بھی زیادہ فائدہ نہیں حاصل ہوا اور انھوں نے مجبوری کے تحت کام کیا ۔ لیکن علاء الدین اتنا پڑھا لکھا نہیں تھا کہ وہ دور دراز کے بعید مستقبل کے فوائد پر فلسفہ طرازی کرتا اور تجارت ، بیوپار اور زراعت کو ترقی دیتا ۔ اس کا خیال تھا کہ اس کو عمل کرنا چاہیے اور اس نے پورے جوش و خروش سے عمل کر کے دکھلا دیا اور اس نے مستقبل اور مستقبل کے فوائد کو فوج کے عارضی فائدوں پر قربان کر دیا ۔ کسی دوسرے بادشاہ کے عہد میں منگول حملے اتنے لگاتار نہیں ہوتے تھے جتنے علاء الدین کے عہد میں ہوئے ۔ دور سلطنت کے کسی بادشاہ کے زمانے میں بڑے پیمانہ پر اتنی فتوحات بھی نہیں ہوئی ہیں ۔ ان حالات میں اگر اس کی تمام اصلاحات اور ضوابط کا رجحان فوج کے فائدے کے لیے تھا تو یہ بالکل تعجب کی بات نہیں ۔ اور ہندستان کے کتنے مشہور ترک بادشاہوں نے تاجروں اور کاشتکاروں کی مسرت اور خوشحالی کو فوج کی خوشحالی اور مسرت پر ترجیح دینے کی ہمت کی تھی ؟ ضرورت ، مذہبی جوش اور ذاتی حوصلے نے فتوحات کی ناموری ان کے لیے ایسے قوانین جو کاشتکاروں کو مالدار اور تاجروں کو اور بھی مالدار بنائیں زیادہ پرکشش بنا دی تھی ۔ علاء الدین اس سے مستثنیٰ نہ تھا ۔ لہٰذا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ اس نے فوجی ضروریات کو شہری ضروریات پر ترجیح دی ۔ لیکن وہ ایسی مستحکم ، مطمئن اور مستعد فوج تیار کرنے میں ضرور کامیاب ہوا جس نے خواہ اندرون مملکت میں خواہ بیرون سلطنت اپنے حریفوں کو ہمیشہ شکست دی ۔

---

۵۶۔ برنی ، ص ۳۰۴

معاشی ضوابط کی سب سے شاندار خصوصیت ان کی وہ کامیابی تھی جس کے ساتھ ان کا نفاذ ہوا۔ مختلف بازاروں کے لیے شحنوں کا تقرر، بریدوں کی نفسیات اور منہیان کا خفیہ متعدد محکمہ، یہ سب ایک دوسرے سے آزاد تھے اور براہِ راست سلطان کو جوابدہ تھے نظم و نسق کو بہتر بنا دیا تھا۔ کوئی افسر خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو اپنے فرائض سے غفلت نہیں برت سکتا تھا نہ غلط کام کر سکتا تھا کیونکہ سلطان کو اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعہ ہر چیز کے بارے میں مسلسل خبر ملتی رہتی تھی۔ دیوان ریاست سرکاری قوانین کی کسی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ بازار کے نظم و نسق کے سلسلے میں تشدد، سختی اور دہشت وہ طریقے تھے جن کو افسر اختیار کرتے تھے۔ لیکن بازار کے لوگوں کے کردار اور روش نے جیسا کہ برنی نے بیان کیا ہے کافی حد تک ان درشت ذرائع کو جائز کر دیا تھا جو سلطان کو اختیار کرنا پڑے تھے۔ اگر وقائع نگار پر بھروسہ کیا جائے تو علاء الدین نے اپنے معتمد اور تجربہ کار مشیروں اور وزیروں سے مشورہ کرنے کے بعد معاشی ضوابط کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس نے ان کی رائے طلب کی تھی کہ وہ کیا کرے تاکہ "سزائے موت ظلم و زیادتی اور سخت تشدد پر عمل کیے بغیر" معاش کے ذرائع کو انتہائی سستا بنایا جا سکے۔ لیکن اسے دلالوں کو جلا وطن اور بیوپاریوں پر ظلم کرنا پڑا تھا تاکہ وہ اپنے احکامات پر ان کے ایک بار اجرا کے بعد عمل ہوتا دیکھ سکے۔ اگر تاجر زیادہ ایماندار ہوتے اور بادشاہ کم درشت ہوتا تو غالباً جو سزائیں بازار کے لوگوں کو دی گئیں ان سے بچا جا سکتا تھا۔

تاجروں کے علاوہ دہلی کے تمام عوام کو ان ضوابط سے یقیناً فائدہ پہونچا۔ قیمتیں ارزاں اور مستحکم ہو گئی تھیں۔ خشک سالی کے زمانے میں دارالسلطنت میں قحط کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جلال الدین اور محمد تغلق کے زمانے کے خوفناک قحطوں کا ذکر بھی علاء الدین کے عہد میں نہیں سنا گیا۔ کیونکہ کم از کم دارالسلطنت میں کبھی غذا کی کمی نہیں ہوئی۔ اور اگر مملکت کے کسی دور دراز الگ تھلگ حصہ میں قحط پڑا ہوگا تو اس پر ہمعصر وقائع نگاروں کی نگاہ یقیناً نہیں پڑی۔

علاء الدین کے بازار کے ضوابط اسی کے ساتھ مر گئے۔ "قوانین، تحقیقات و جستجو، سختی جس کے ساتھ احکامات کا نفاذ ہوا اور بازار کے لوگوں کو دی جانے والی سزائیں علاء الدین کی موت کے ساتھ ختم ہو گئیں اور اس کا بیٹا قطب الدین عہد علائی کے بازار کے ضوابط نافذ نہیں کر سکا۔"[۵۷] یہ بالکل متوقع تھا۔ علاء الدین کی موت کے بعد نہ تو اس کے جانشین میں جذبہ تھا اور نہ ان کو نافذ کرنے کی ضرورت تھی۔ قطب الدین فتوحات کا اتنا شوقین نہیں تھا جتنا کہ داشتاؤں کا تھا۔ علاء الدین

---

۵۷ برنی، ص ۳۱۹

کی فوجی روایات نے اس کے جانشین کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ مزید برآں منگول طوفان کا زور بھی پڑ گیا تھا اور ان کے حملوں کا دنداں شکن جواب دینے کے لیے کسی لشکر جرار کو برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا تھوڑی تنخواہ پر ایک بڑی فوج بھرتی کرنے کے لیے قیمتوں کے کنٹرول کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مارکیٹ کنٹرول ایک عارضی اقدام تھا جس کی طرف ضرورت کی حالت میں رجوع کیا گیا تھا۔ جب ہنگامی حالات ختم ہو گئے تو ان ضوابط کو بھی متروک ہونے دیا گیا۔

# باب 13

# دکن

چودھویں صدی کی پہلی دہائی کے اختتام تک سلطان علاءالدین نے تقریباً پورے شمالی ہند کی فتح مکمل کر لی تھی۔ منگول حملوں کے سیلاب کو روک دیا تھا اور شہری اور فوجی میدانوں میں اصلاحات کی تھیں۔ اس جابرانہ نظم و نسق کے تحت خوشحالی کا نہیں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ امرا، تاجر نیز کاشتکار سخت نگرانی میں رکھے گئے تھے۔ چنانچہ اس کی مطلق العنان حکمرانی کی تمام مخالفت مفلوج ہو گئی تھی۔ چار لاکھ پچھتر ہزار عمدہ تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل ایک کثیر فوج کو پابندی سے تنخواہ دی جاتی تھی اور مملکت کی طرف سے ان کی اچھی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ شمال میں اس کے اقتدار کا کوئی حریف نہ تھا اور اب اس نے دکنی جزیرہ نما کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا کیونکہ وہ پہلا مسلمان حکمراں تھا جس نے پورے ہندوستان کا مالک بننے کا خواب دیکھا

پچھلے موقعہ پر دیوگیری نے علاءالدین کو بہت بڑا خزانہ فراہم کیا تھا۔ لیکن وہ دولت جو خوش بختی لائی تھی اس نے ایک دہائی سے زیادہ اس کو شمال میں مصروف رکھا۔ اس کے باوجود وہ دکن کی دولت کے بارے میں نہیں بھولا تھا اور جب اس کو شمال کے مسائل سے فرصت ملی تو اس نے جنوب کے بارے میں دوبارہ سوچا۔ چنانچہ سونے کے لالچ اور شہرت کی خواہش نے جو تمام فاتحوں کے دو محرک تھے، یکے بعد دیگرے دکن کی تمام سلطنتوں پر حملہ کرنے کے لیے اس کو آمادہ کیا۔ ایک بار جب فتح کا منصوبہ سوچ لیا

---

1۔ برنی کے مطابق علاءالدین نے شمال مغربی سرحد کی نگرانی کرنے کے لیے متعینہ فوج کے علاوہ ایک نیا لشکر دکن بھیجا تھا۔ فرشتہ کے مطابق فوج کی کل تعداد ...۵۰۰۰ تھی۔ فرشتہ، ص ۱۱۴ برنی، ص ۳۲۷

گیا تھا تو کوئی بہانہ اگر بہانہ ضروری ہوا تو جلد ہی مل جاتا تھا۔ دیوگیری کے رام چندر جس نے ۱۲۹۶ء میں علاءالدین کی اطاعت کر لی تھی اور سالانہ خراج بھیجنے کا وعدہ کیا تھا گزشتہ کچھ عرصے سے دہلی کو کچھ نہیں بھیجتا تھا۔ لہٰذا ملک کافور کو دیوگیری پر فوج کشی کرنے اور خراج کے بقایا وصول کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ۱۳۰۷ء کی یہ مہم اس جیسی متعدد مہموں کا پیش خیمہ تھی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جنوب میں اس وقت سیاسی حالت پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ ان کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھا جا سکے

## دکن کی سلطنتیں

ملک کافور کے حملے کے وقت دکن کا جزیرہ نما چار بڑی اور دولت مند سلطنتوں میں منقسم تھا۔ دیوگیری وندھیاچل کے جنوب میں واقع تھی اور اس کے جنوب مشرق میں تلنگانہ کی سلطنت تھی اس کا دارالخلافہ وارنگل تھا۔ اس پر کاکتیا یا گنپتی راجاؤں کی حکمرانی تھی۔ دیوگیری کے جنوب اور تلنگانہ کے جنوب مغرب میں دوار سمدر کی سلطنت تھی جس پر طاقتور ہوسیلا حکمرانوں کا اقتدار تھا۔ انتہائی جنوب میں پانڈیہ کی طاقتور سلطنت جو مسلم مورخین میں معبر (ملابار) کے علاقہ کے نام سے معروف تھی۔

کسی پچھلے ذکر میں ہم پہلے ہی دیوگیری کی طاقت اور اس کے علاقوں پر بحث کر چکے ہیں۔ جہاں تک تلنگانہ کی سلطنت کا تعلق ہے اس نے گنپتی کی عمدہ حکومت کے تحت فروغ پایا جو ۱۱۹۹-۱۲۰۰ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ گنپتی کا عہد حکومت طویل تھا اور اس نے ساحل پر نیلور سے شمال سمت میں اڑیسہ کی حدود تک وسیع فتوحات کی تھیں۔ اس کے بعد اس کی بیوی رودرما دیوی نے جو دیوگیری کی ایک شہزادی تھی اور ۱۲۶۰ء میں تخت نشین ہوئی تھی پوری تین دہائیوں تک بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ اسی کے عہد حکومت میں مشہور وینس کے سیاح مارکو پولو نے موٹوپلے (Motupalle) کی سیاحت کی جو اس سلطنت کی ایک مشہور بندرگاہ تھی اور جو اب مدراس پریسیڈنسی کے گنٹور ضلع میں واقع ہے۔[2] مارکو پولو رودرما دیوی کو "عظیم صلاحیت کی ایک خاتون، عدل و انصاف اور امن و امان کی طالب"[3] کہتا ہے۔ اس کی تعریف کے بغیر اس کا نام وارنگل کے کاکتیا حکمرانوں کی خاندانی فہرست میں محض ایک نام

۲۔ موٹوپلے جو دریائے کرشنا کے دہانے پر واقع ہے غالباً "ملنکا" یا معبرت الگ کرتا تھا۔ مارکو پولو لکھتا ہے کہ جب تم معبر سے روانہ ہوتے ہو اور شمالی سمت میں پانچ سو میل کا سفر کرتے ہو تو تم تیلنگی کی سلطنت میں پہنچتے ہو۔ وہ اس وقت بیوپار اور تجارت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ وہ اب ضلع کرشنا، مدراس میں محض ایک گاؤں ہے۔

۔یول، سیر مارکو پولو، جلد دوم ص ۳۴۷

۳۔ ایضاً جلد دوم ص ۳۴۰؛ یول اور کارڈیر (Cordier)، جلد دوم، ص ۲۳-۲۵۹

رہ جاتا۔ اُس کی حکومت ۱۲۹۲ء تک جاری رہی، جب اس کی بیٹی کا لڑکا پرتاپ رُدّر دیو سن بلوغ کو پہنچ گیا تو اس کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گئی۔ وہ پرتاپ رُدّر دیو (مسلم مورخین کے لدّر دیو) کا عہد تھا جب ملک نائب کافور کے زیرِ کمان دہلی کی افواج نے تلنگانہ پر حملہ کیا۔

تلنگانہ کے مغرب اور جنوب میں ہوئیسلا حکمرانوں کی سلطنت تھی جس کی راجدھانی دوارسمدر (جدید ہلیبد) میں تھی۔[4] چولا سلطنت کے زوال کے وقت سے شمال سے ہوئیسلا حکمراں اور انتہائی جنوب کے پانڈیہ راجہ چولا فرمانرواؤں کی تذلیل کر کے برابر حکمت عملی کی نبیز فوجی جنگیں لڑتے رہے۔ نارا سمہا ثانی ۱۲۲۴ء کے عہد کی ایک دستاویز میں[5] ہوئیسلا سلطنت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مشرق میں ننگلی (Nangali) تک جنوب میں کونگو (Kongu) (سیلم اور کوئمبٹور) تک، مغرب میں الوکھیدا (جنوبی کنارا) تک اور شمال میں ہڈور (Heddore) (کرشنا) تک وسیع تھی۔ ہوئیسلا حکمران برابر فتوحات کرتے رہے۔ نارا سمہا کے بیٹے سومیسورا (Someswara) کی جنوبی راجدھانی وکرم پورہ کو ترچناپلی کے قریب موجودہ کنانور سے شناخت کیا گیا ہے۔[6] سلطنت کی ناموری کو اُس وقت بٹہ لگا جب سومیسورا کے بعد تخت کے دو دعویدار نارا سمہا ثالث اور ویرا رام ناتھ علٰحدہ ہو گئے، اوّل الذکر آبائی مملکت پر جس کا پایۂ تخت دوارسمدر تھا حکومت کرنے لگا اور موخرالذکر سلطنت کے جنوبی حصّے پر۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ نارا سمہا نے یا ویرا رام ناتھ کو نکال باہر کیا یا اس سے زیادہ

---

۴۔ دوارسمدر کے نام کا اشتقاق واضح نہیں ہے۔ رائس اس کا تعلق دیو رپوری سے بتاتا ہے جو ایک فرضی قصّہ میں مذکور ہے اور ہوئیسلا حکمرانوں کا شجرۂ نسب ایک فرضی شخص سال سے ملاتا ہے۔ کرشنا شاستری کا خیال ہے کہ ہوئیسلا راجدھانی کا نام اس کے بانی کے نام پر پڑا ہوگا جو یا تو دھارا یا ڈورا کہلاتا تھا۔ موجودہ نام ہلیبد (پرانا پایۂ تخت) کا اس پر اطلاق غالباً حکومت کا مرکز وہاں سے ترونلاے (Tiruvannamalai) میں بلال ثالث نے منتقل کرنے کے بعد ہوا ہوگا۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۱۹۰۸ء الحاشیہ ص ۲۳۵

۵۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ، ۱۹۰۸ء ص ۲۳۵

۶۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۱۹۰۹-۱۰ء ص: ۱۵۵

زندہ رہا۔ ۱۲۹۲ء میں نار اسمہا کا جانشین بلّال ثالث (مسلم مورخین کا بلال دیو) ہوا۔ وہ ۱۳۰۲ء میں پوری ہویسلا سلطنت کو متحد کرنے میں کامیاب ہوا لیکن علاء الدین کے لشکر کے آگے اس کی آزادی برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔

انتہائی جنوب میں پانڈیہ حکمرانوں کی سلطنت واقع تھی۔ بارھویں صدی میں اندرونی کشاکش اور اس کے نتیجہ میں چولا حکمرانوں راج ادھیراج دوم اور اس کے ولی عہد کلوتنگا سوم کی شمال سے اور سیلون کے راجہ کی جنوب سے مداخلت کی بنا پر پانڈیہ سلطنت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ لیکن پھر تیرھویں صدی میں پانڈیوں نے اپنا اقتدار دوبارہ بحال کرنا شروع کر دیا اور مارورمن سندر پانڈیہ اول اور دوم (۱۲۱۶-۳۹ء اور ۱۲۳۹-۵۱ء) کے زمانۂ حکومت میں انھوں نے اپنا کھویا ہوا وقار کافی بحال کر لیا۔ بعد کا پانڈیہ حکمران جاٹ ورمن اول ۱۲۵۱ء جس نے ۱۲۷۴ء تک حکومت کی ایک بہت مشہور جنگی سورما تھا۔ اس نے پوری چولا سلطنت فتح کر لی۔ اس نے ملابار علاقہ پر حملہ کیا اور چیرا فرمانروا کو شکست دی اور قتل کر ڈالا۔ اس نے ہویسلا بادشاہ سومیسورا سے بھی جنگ کی۔ جاٹ ورمن کے دو یا تین بھائی تھے جو پانڈیہ سلطنت کی مختلف ریاستوں میں آزاد حکمرانوں کی طرح حکومت کرتے تھے لیکن وہ بڑے راجہ جاٹ ورمن سندر کے ماتحت تھے [8] ان میں سے

---

۷۔ رام ناتھ کے جارحانہ رویّہ کی تصدیق کافی تعداد میں کتبات کرتے ہیں ۱۲۹۰ء جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے خود دوار سمدر پر فوج کشی کی تھی لیکن پانڈیہ مارورمن کا سکھا (۱۲۶۸-۱۳۱۰ء) نے رام ناتھ کو اور اس کے بھائی کو زیادہ نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دی۔ رام ناتھ کا بیٹا وشوناتھ ۹۳-۱۲۹۲ء میں اس کا جانشین ہوا اور اس نے ۱۳۰۲ء تک حکومت کی جب بلّال ثالث کے عہد میں پوری سلطنت متحد کر دی گئی۔

آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۱۰-۱۹۰۹ء ص ۵۹-۱۵۷۔ نیز ایپی گرافی اکرناٹیکا ضلع میسور کے کتاب جز اول ۱۸۹۴ء کتبہ نمبر ۱۲۱

۸۔ رابرٹ سوئل (Robert Sewell) اپنے مضمون بعنوان "پانڈیہ بادشاہت کا شجرۂ نسب" (The Chronology of The Pandya Monarchy) میں اس پر شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ کیسا ن قوت کے ایک سے زیادہ حکمراں ایک ملک پر کیسے حکومت کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہ تو کوئی مطبوعہ کتبہ ہے اور نہ ہی امیر خسرو کی اوصاف کی تصانیف ہی میں اس کا کوئی اشارہ ہے کہ سلطنت متعدد بھائیوں میں منقسم تھی۔

انڈین انٹی کوئری، ۱۹۱۵ء، ص ۴۴

سوئل کا خیال بھی غلط نہیں کیونکہ ایک سلطنت میں ایک سے زیادہ بادشاہ کی موجودگی عجیب معلوم ہوتی ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک کا نام وکرم پانڈیہ اور دوسرے کا ویر پانڈیہ تھا۔ یہ دونوں فتوحات کے دعویدار تھے۔[9] ویر پانڈیہ کی ایک دستاویز بیان کرتی ہے کہ اس نے ایلم (سیلون) کونگو اور سولا منڈلم (چولا علاقہ) پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن پانڈیوں میں سب سے عظیم بادشاہ ماروورمن کل سکھارا (مسلم مورخین کا کلیس دیورم تھا) جو ۱۲۶۸ء میں تخت نشین ہوا[11] اور ۱۳۱۰ء تک حکمران رہا۔ جب اس کی موت پر مسلمان نے پانڈیہ سلطنت پر حملہ کیا۔ اس کے طویل اور خوشحال عہد حکومت میں مارکو پولو نے کایل (Kayal) کی بندرگاہ کی سیاحت کی جو اس کی مملکت میں واقع تھی۔ وہ ملک کی دولت اور فارغ البالی کا مفصل ذکر کرتا ہے اور کل سکھارا کو اشیر (Asciar) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ماروورمن کل سکھارا کونیرن مے کنڈن (Konerinmai Kondan) یا ایک ایسے بادشاہ کے لقب سے جس کا کوئی مدمقابل نہ تھا مشہور تھا اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے پانڈیہ اور چولا دونوں ملکوں پر حکومت کی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مدورا سے حکومت کرتا تھا جو ہویسلا راجاؤں کی سابقہ راجدھانی تھی۔ اس کی فتوحات وسیع اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔[12] اس نے سیلون کی طرف ایک مہم بھیجی تھی اور سیلون کے بادشاہ پراکرم باہو کو ہزیمت دی تھی اور اس کے بھی کئی حوالے پائے جاتے ہیں کہ اس کے عہد میں چین اور معبر (ماپرہ) کے درمیان سفارتی تعلقات تھے۔[13]

---

(باقی صفحہ گزشتہ) لیکن یہ بہرحال غیر ممکن بھی نہیں کہ دو یا تین پانڈیہ شہزادوں نے جو حکمران بادشاہ کے بھائی ہو سکتے ہیں۔ پڑوسی علاقوں کو فتح کیا ہو (اور کتبات بتاتے ہیں کہ پانڈیوں نے جاٹ ورمن سندر پانڈیہ اول کے عہد میں کافی فتوحات کی تھیں) اور وہ وہاں آزاد حکمرانوں کی طرح سے بس گئے ہوں۔ لیکن وہ بڑے راجہ جاٹ ورمن سندر پانڈیہ اول کے کسی طرح نافرمانبردار یا باغی نہیں تھے۔ عرب جغرافیہ نویس القلقشندی مسالک الابصار کے حوالے سے کہتا ہے کہ "دوراسمند (دوار سمدر) میں سلطان بلال دیو اور پانچ کافر بادشاہ تھے" چنانچہ یہ امر متعدد شہزادے دکن میں بیک وقت حکمران تھے مشہور تھا۔ القلقشندی، ص ۶۳

۹۔ آئنگر، مذکورہ بالا، ص ۵۲-۵۳

۱۰۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۶-۱۹۰۵ء ص ۷۰-۱۶۸

۱۱۔ پانڈیہ کتبات میں سے ایک (۱۹۰۴ء کا ۵۵) پروفیسر کیل ہارن (Kielhorn) ۱۲۶۸ء کا تخمینہ کی ماروورمن کل سکھارا اول کے عہد کی ابتدائی تاریخ کے طور پر تصدیق کرتا ہے سند سر (۱۹۰۴ء کا ۴۳) بتاتا ہے کہ ۶۵-۱۲۶۴ء میں پانڈیہ ترچناپلی کے قریب کانور پر قابض تھے جو کہ چولا سلطنت میں ہویسلوں کی راجدھانی تھی۔ پنچ (پانچ) پانڈیہ ہیں: ویر پانڈیہ، وکرم پانڈیہ، پراکرم پانڈیہ، سندر پانڈیہ اور کل (باقی اگلے صفحہ پر)

مارورمن کل سکھار کے دو بیٹے تھے سندر پانڈیہ سوم جو قانونی تھا اور ویر پانڈیہ جو غیر قانونی تھا۔ مسلم مورخین کے مطابق بادشاہ نے ویر پانڈیہ کو اپنی جانشینی کے لیے زیادہ موزوں پایا اور اس کو سچ مچ اپنا جانشین نامزد کیا۔ اس طرح جب کہ ویر پانڈیہ حکومت کے نظم و نسق سے ۱۲۹۶ء سے ہی منسلک تھا اس کے بھائی کو ۱۳۰۲-۳ء تک انتظار کرنا پڑا جب اس کو بھی مملکت کے معاملات میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ کل سکھار ویر پانڈیہ کی علانیہ پاسداری کرتا تھا اس لیے سندر فطری طور پر اس کا حاسد بن گیا۔ معاملے نے انتہائی صورت اس وقت اختیار کی جب مئی ۱۳۱۰ء (۷۰۹ھ) کے اواخر میں[14] سندر پانڈیہ نے اپنے باپ کو مار ڈالا اور دونوں بھائیوں میں تخت کے لیے جنگ آزمائی ہوئی۔ ایک معرکہ میں سندر کو شکست ہوئی اور اس نے تاج حاصل کرنے کے لیے دہلی کے سلطان سے مدد مانگی۔ کہا جاتا ہے کہ یہی بات معبر کے علاقے پر کافور کے حملے کا سبب بنی۔

اس طرح ملک کافور کے حملے کے وقت جنوبی ہند خاندانی جنگوں اور نا اتفاقی کا ایک بدنما منظر پیش کر رہا تھا۔ چار بڑی مملکتوں کی سرحدیں یادوی، ہویسلا، کاکتیوں اور پانڈیوں کے درمیان

(ii) ماروِرمن کلسکھار پانڈیہ

یوگوٹی واری ویشاولی (Velugotivarivamsavali)، ص ۳۸ - ۳۷ بحوالہ وینک رمینہ، جنوب میں ابتدائی مسلم توسیع (The Early Muslim Expansion in South)، ص ۴۶ - ۴۵

۱۲۔ ضلع رمند کے کتبات میں سے ایک بیان کرتا ہے کہ کل سکھار نے کیرالا، چولا اور ہویسلا سلطنتوں سے حاصل کردہ مال غنیمت سے تائی دیل میں ایک مندر کی دیواریں تعمیر کرائی تھیں۔

آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۲۷-۱۹۲۶ء، ص ۲۰۳

۱۳۔ یول، سیر مارکوپولو، جلد دوم ص ۳۳۷ آئنگر مذکورہ بالا، ص ۵۸

ابوالانصار اس کلان کو بصراحت وہ نقطہ بتاتا ہے جہاں ملابار ختم ہوتا تھا وصاف بھی لکھتا ہے کہ وہ نیلاور (نیلور) تک وسیع تھا۔

۱۲۹۳ء کے لگ بھگ تحریر کرتے ہوئے رشید الدین معبر کے بارے میں لکھتا ہے جو بظاہر پانڈیہ علاقہ کا ایک دوسرا نام تھا، وہ کلم (کلان) سے نیلور تک پھیلا ہوا تھا۔ کئی سال پہلے اس بیان کی تصدیق ہو چکی ہے۔ مزید توثیق متعدد تامل دستاویزات سے ہوتی ہے جو ضلع کرنول کے جنوبی حصے میں دستیاب ہوئے ہیں۔

آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۱۹۰۳ء، ص ۲۳۲ نیز یول کا حاشیہ، سیر مارکوپولو جلد دوم ص ۳۱۵

۱۴۔ وصاف ص ۵۳۱

مسلسل آویزش کے سبب لگاتار بدلتی رہتی تھیں۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں کے دوران جنوب کے مختلف مبلغین کی زبردست مذہبی سرگرمیوں کی بنا پر عوام میں افتراق پیدا ہو گیا تھا اور اس نے مملکتوں کے درمیان جنگوں کے ایک اور عنصر کا اضافہ کر دیا تھا۔

**دکن کی دولت**

مختلف مملکتوں کے درمیان ہمیشہ کی جنگوں کے باوجود کسی غیر ملکی فاتح نے دکن کو اس کی دولت سے محروم نہیں کیا تھا جو صدیوں سے اکٹھا ہوتی چلی آرہی تھی۔ وصاف اور مارکوپولو جیسے بہت سے عظیم سیاح دکن کی کثیر دولت کی شہادت دیتے ہیں۔ مارکوپولو معبر کے خزانوں کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جب بادشاہ مرجاتا ہے تو اس کے لڑکوں میں سے کوئی اس کے خزانوں کو چھونے کی جسارت نہیں کرتا۔" وہ کہتے ہیں "جیسے ہمارے باپ نے اپنا خزانہ اکٹھا کیا اسی طرح ہمیں اپنی باری پر اتنا ہی جمع کرنا چاہیے"، اور اس طرح یہ ممکن ہوا ہے کہ اس سلطنت میں کثیر خزانہ جمع ہو گیا ہے۔"[15] وینس کا سیاح بڑی تفصیل سے ان زیورات کو بیان کرتا ہے جو خود بادشاہ پہنتا تھا نیز وہ ذریعے بھی بیان کرتا ہے جس سے "وہ بہت ہی عمدہ اور شاندار ہیرے" معبر میں حاصل کرتے تھے۔ سلطنت سے باہر کسی کو عمدہ قسم کے ہیرے لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مارکوپولو کہتا ہے کہ "یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ ان جیسے تمام ہیروں کو بادشاہ خود اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتا تھا اور در اصل جتنی تعداد اس کے پاس تھی وہ تقریباً ناقابلِ یقین ہے۔"[16] وہ مزید کہتا ہے کہ "پانڈیہ بادشاہ ۔۔ ایک بڑی مملکت کی کفالت کرتا ہے اور اپنی سلطنت کا نظم و نسق بڑے عدل و انصاف کے ساتھ چلاتا ہے۔ اور تاجروں اور غیر ملکیوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کرتا ہے اس لیے وہ اس کے شہر (کیل یا نائن دیلی) کی سیاحت کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔"[17]

ایک اور مصنف جو جنوب کی دولت کا ذکر کرتا ہے شہاب الدین ابوالعباس احمد مصنف مسالک الابصار ہے۔ اس کے مطابق سونا ہندوستان میں صدیوں سے آتا رہا تھا اور وہ کبھی برآمد نہیں کیا گیا۔[18] امیر خسرو، برنی اور فرشتہ کی متفقہ رائے ہے کہ علاء الدین اور اس کا جنرل ملک کافور جنوب

۱۵۔ یول، سیر مارکوپولو، جلد دوم، ص ۳۳۳؛ نیز ملاحظہ ہو وصاف، ص ۵۲۹

۱۶۔ یول، محولۂ بالا، جلد دوم، ص ۳۴۴

۱۷۔ یول، مذکورۂ بالا، جلد دوم ص ۳۷۰

۱۸۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۵۸۳

سے جو سونا اور خزانے لائے تھے وہ بہت زیادہ تھے۔ صرف علاءالدین ہی نہیں بلکہ کچھ برسوں بعد محمد تغلق نے بھی دکن سے کثیر مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ ایک موقع پر صرف ایک مندر سے حاصل شدہ مال غنیمت دو سو ہاتھیوں اور کئی ہزار بیلوں پر لاد کر لایا گیا تھا۔ ان خزانوں کے بعد بھی جو علاءالدین اور محمد بن تغلق شمال میں لے گئے تھے بہمن اور وجیا نگر کی سلطنتوں کے پاس وسیع خزانے تھے۔ عرب سیاح عبدالرزاق جس نے پندرھویں صدی میں دکن کی سیاحت کی، وجیا نگر سلطنت کی طاقت اور خوشحالی کی گواہی دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ملک کا بیشتر حصہ اچھی طرح جوتا بویا جاتا ہے اور زرخیز ہے۔ بادشاہ کے خزانے میں کمرے ہیں جن میں کھدائی کی گئی ہے۔ جو پگھلے سونے سے ایک انبار کی شکل میں تھا بھرے ہوئے تھے۔ ملک کے تمام باشندے خواہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ حتیٰ کہ بازار کے کاریگر بھی ہیرے اور زیورات پہنتے ہیں"۔[19] فرشتہ کا بھی یہی بیان ہے کہ دکن میں غریب لوگ بھی سونے کے زیورات پہنتے تھے اور اونچے طبقہ کے لوگ کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں کھایا کرتے تھے۔[20]

دکن کی یہ دولت تھی جس نے شمال کے سلاطین کو اس خوشحال سرزمین میں لوٹ مار کی مہموں کی قیادت کرنے کی ترغیب دی تھی۔ محمود غزنوی اور محمد غوری دونوں جن کو اس کی دولت کا علم تھا دکن پر نظر رکھتے تھے۔ محمود صرف گجرات تک پیش قدمی کر سکا تھا اور محمد کو وہاں سے پسپا کر دیا تھا اور اگرچہ یہ دونوں فاتحین دکن تک نہیں پہنچ سکے تھے تاہم جنوب کو فتح کرنے اور اس کی دولت حاصل کرنے کا خیال شمال کے ترک فاتحین کو مسحور کر چکا تھا۔ علاءالدین خلجی پہلا فاتح تھا جس نے ۱۲۹۶ء میں پیش قدمی کی۔

**دیوگیری کی دوسری مہم** یہ دیکھا جا چکا ہے کہ یادو حکمران رام دیو نے ۱۲۹۶ء میں کس طرح شہزادہ علاءالدین کی اطاعت کی تھی۔ اس وقت سے وہ سالانہ خراج دربار دہلی کو بھیجا کرتا تھا جہاں دیوگیری کا حملہ آور ایک شہنشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔ لیکن ۱۳۰۸ء سے دو یا تین سال پہلے اس نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔[21] رام چندر کی روش میں تبدیلی کے اسباب نہیں دیے گئے لیکن وہ آسانی سے قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ محض

---

۱۹۔ مطلع السعدین، ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد چہارم ص ۱۰۶-۷

۲۰۔ فرشتہ، ص ۱۲۰

۲۱۔ برنی، ص ۳۲۶؛ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۴۳-۶۹

اتفاق تھا کہ ایک ڈاکو یادو حکمراں پر اور اس کے دلیر بیٹے سنگھا نا پر ۱۲۹۶ء میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے بعد سے دکن میں اس کا نام بھی نہیں سنا گیا یہاں تک کہ گجرات کے بھگوڑے راجہ کرن بگھیلا نے بھی ۱۲۹۹ء میں یادو مملکت میں پناہ لی تو دہلی سے سرزنش نہیں ہوئی حتیٰ کہ احتجاج بھی نہیں کیا گیا۔ کچھ برسوں تک رام دیو سالانہ خراج پابندی سے بھیجتا رہا۔ اس کے بعد اس نے دہلی اور دیوگیری کے درمیان فاصلہ، نیز علاء الدین کی منگولوں اور راجپوتوں میں مشغولیت کا فائدہ اٹھایا اور ۱۳۰۵ء یا ۱۳۰۶ء کے بعد سے خراج روک لیا۔ عصامی کے مطابق رام دیو کی وفاداری شک شبہ سے بالاتر تھی لیکن اس کے بیٹے[22] نے ملک کے عوام کی مدد سے اپنے باپ کی خواہشات کے برخلاف آزادی اختیار کرنی چاہی اس پر رام دیو اتنا برہم ہوا کہ اس نے علاء الدین سے اپنے بیٹے کو سزا دینے کی درخواست کی[23]۔ لیکن مہم کے واقعات اس بیان کی تائید نہیں کرتے ہیں۔ برنی کے بیان کردہ حملہ کا یہ سبب کہ رام چندر نے کچھ برسوں سے خراج روک رکھا تھا سب سے زیادہ قابل یقین معلوم ہوتا ہے۔

رام چندر کا اندازہ غلط تھا سلطان علاء الدین دیوگیری سے حاصل ہونے والے اچھے خاصے کثیر خراج کو ہاتھ سے جانے دینے کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا ۱۳۰۷ء میں اس نے ملک نائب کافور کو جو ہزار دیناری غلام تھا اور گجرات میں پکڑا گیا تھا اور جو رفتہ رفتہ نائب سلطان کے عہدہ تک محض اپنی صلاحیت کی وجہ سے ترقی کر گیا تھا ایک بڑے لشکر کے ساتھ دیوگیری پر حملہ کرنے اور رام دیو سے خراج کا بقایا وصول کرنے کے لیے مقرر کیا۔ ملک کافور کے تیس ہزار سواروں کو

---

۲۲۔ عصامی صرف ایک راجکمار بھیلا کا ذکر کرتا ہے لیکن وہ خاص طور سے سنگھا نا تھا جو ہمیشہ شمال کے مسلمانوں کی مزاحمت کرتا رہا اور جنوب میں فتوحات کے پرچم لہراتا رہا۔

۲۳۔ فتوح، ص ۲۷۶-۲۷۷

۲۴۔ فرشتہ کے مطابق یہ مہم ۱۳۰۶ء میں بھیجی گئی، امیر خسرو کے مطابق مارچ ۱۳۰۷ء (رمضان ۷۰۶ھ) میں اور برنی کے مطابق ۱۳۰۸ء میں کسی وقت۔ فرشتہ یہ مزید کہتا ہے کہ سیوانا کی فتح اسی سنہ میں ہوئی تھی جس سنہ میں دیوگیری کو مہم بھیجی گئی۔ امیر خسرو بھی سیوانا کی فتح اس مہم کے فوراً بعد بیان کرتے ہیں (خزائن ترجمہ حبیب ص ۵۲) سیوانا پر قبضہ فرشتہ کے مطابق ۱۳۰۸ء میں اور خسرو کے مطابق ۱۳۱۰ء میں ہوا۔ تاریخ میں اختلاف باعث الجھن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاصر مورخ برنی کی تاریخ صحیح ہے اور ۱۳۰۸ء سب سے زیادہ قابل یقین ہے کیونکہ وہ سیوانا کی فتح کے سنہ سے قریب پڑتی ہے

خواجہ حاجی، عین الملک ملتانی اور الپ خان گورنر گجرات کی افواج سے کمک پہنچائی گئی۔ ان کی متحدہ افواج کو مجرم مرہٹہ سردار کو سزا دینی تھی، اس سے تین سال کا خراج وصول کرنا تھا اور گجرات کے سابق راجہ اور اس وقت نندربار میں پناہ گزیں رائے کرن بگھیلا کی چھوٹی بیٹی دیول رانی پر قبضہ کرنا تھا۔

فرشتہ کے مطابق راجہ کرن کی بیوی کملا دیوی کی جس کو گجرات کی فتح کے بعد شاہی حرم میں زبردستی داخل کیا گیا تھا اس کے سابق شوہر سے دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی مر چکی تھی اور چھوٹی جو گجرات پر حملہ کے وقت چھ ماہ کی دودھ پیتی بچی تھی راجہ کرن کے پاس رہ گئی تھی۔ کملا کی مادرانہ محبت جوش میں آئی۔ جب اس نے سنا کہ ایک فوج دیوگیری بھیجی جا رہی ہے جہاں کرن نے پناہ لے رکھی تھی تو اس نے سلطان سے دیول دیوی کو حاصل کرنے کی درخواست کی۔ اس طرح گجرات کی سابقہ رانی اپنے پہلے شوہر کی سخت بے عزتی اور پریشانی کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔[25]

جب سے سلطنت گجرات کو مسلمانوں نے تاراج کیا تھا رائے کرن نے دیوگیری کے یادو راجہ کے پاس پناہ لے رکھی تھی جو علاء الدین کی ناقابل تسخیر افواج کا ایک باجگزار تھا۔ رام چندر نے پناہ گزیں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اس کو حکومت کرنے کے لیے اپنے علاقہ کا ایک حصہ بگلانہ دیا۔ رائے کرن نے اپنا پایۂ تخت نندربار[26] بنایا اور وہاں سکون و چین سے حکومت کرنے لگا۔ اس دور زمانے میں رام دیو کے بیٹے سنگھانا دیو نے کرن کی بیٹی سے شادی کرنے کی خواہش کی تھی لیکن رائے اپنی جلاوطنی کے دوران بھی ایک راجپوت شہزادی کو ایک مرہٹہ کے ساتھ بیاہ دینے کی ذلت برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا اور برابر اس پیشکش کو ٹھکراتا رہا تھا۔ اسی اثنا میں ملک کافور نے جنوب کی سمت فوج کشی کی اور اس سے الپ خان اور عین الملک ملتانی آملے۔ مالوہ عبور کرنے کے بعد ملک کافور نے رائے کرن کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی بیٹی حوالے کر دے ورنہ شاہی افواج کے

---

۲۵۔ ضیاء برنی نے یہ واقعہ نہیں بیان کیا ہے۔ نظام الدین ۱۲۹۹ء کی (گجرات کی) اور ۱۳۰۸ء کی (دیوگیری کی) دو مہموں کو خلط ملط کر دیتا ہے اور ایک بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیول رانی اس وقت پکڑ دی گئی جب کرن کے ہاتھ سے گجرات نکل گیا تھا۔ امیر خسرو دیول رانی کی گرفتاری کو ایک الگ مہم کے تحت بیان کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی تاریخ نہیں بتاتے۔ فرشتہ اس مہم کو مفصل طور پر بیان کرتا ہے اور اس کو ۱۳۰۶ء (ج ۱، ص ۷۶) کے واقعات میں ذکر کرتا ہے۔

۲۶۔ ابن بطوطہ نذربار (نندربار) کو ایک ایسا چھوٹا شہر بتاتا ہے جہاں مرہٹوں کی آبادی تھی۔

ساتھ معرکہ کے لیے تیار ہو جائے۔ کرن گھیلا نے اس توہین آمیز پیغام کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور دفاع کے لیے تیار ہو گیا۔ ملک نائب کافور نے الپ خاں سے خواہش کی کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ بگلانہ کے پہاڑوں کے راستے پیش قدمی کرے اور شہزادی کو حاصل کرے جبکہ وہ خود سیدھا دیوگیری کی جانب بڑھتا رہا۔ دو ماہ تک کرن جما رہا اور زبردستی گریز جانے کی الپ خان کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ سنگھانا دیو نے گھیلا بادشاہ کو سخت دباؤ کے حالات میں پایا تو اس نے شادی کی پیشکش کی تجدید کی اور اپنے چھوٹے بھائی بھیلما کو دلھن کو دیوگیری لے آنے کے لیے بھیجا۔ راجپوت راجہ نے اپنی مایوس کن حالت میں شہزادی کو بھیلما کی نگرانی میں ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ دیوگیری کی طرف بھیجدیا

لیکن قسمت کا فیصلہ دوسرا تھا۔ جب دلھن اپنے نئے گھر کے راستے میں تھی کرن پر الپ خاں کا سخت دباؤ پڑ رہا تھا ایک شدید معرکہ میں اس کو مکمل شکست ہوئی۔ اپنا سامان اور خیمے میدان جنگ میں چھوڑ کر وہ خود بھی دیوگیری کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دشمن اس کے تعاقب میں تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ایک دن تعاقب کے دوران تقریباً تین سو مسلم سپاہی اپنے کمانڈر کی اجازت سے ایلورا کے مشہور غار دیکھنے کے لیے گئے۔ اچانک انھوں نے سپاہیوں کا ایک دستہ اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور وہ اس کو بھگوڑے کرن کا دستہ سمجھ کر اس پر جا پڑے اور ایک شدید معرکہ برپا ہو گیا۔ یہ سپاہی راے کرن کا کوئی دستہ نہیں تھے بلکہ سنگھانا کی ہونے والی دلھن دیول رانی کے محافظ سپاہی تھے۔ ایک تیر اس کے گھوڑے کو چھید گیا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ فوجی سپاہیوں نے اس کو فوراً گھیر لیا لیکن جب ان کو خبر ہوئی کہ وہی دیول دیوی ہے جس کی انھیں سخت تلاش تھی تو وہ اس کو اپنے کمانڈر کے پاس لے گئے۔ ان ڈرامائی حالات میں اس کی گرفتاری نے الپ خاں کے دل میں مسرت بھر دی۔ شہزادی کو دہلی بھیجدیا گیا تاکہ وہ وہاں شاہی حرم میں داخل کی جائے۔ وہ ایک المناک زندگی گزارنے اور برے انجام کو پہنچے۔

دیول رانی کی گرفتاری کے بعد الپ خاں رام دیو کے خلاف ملک نائب کافور سے ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں اور خود راجدھانی میں لوٹ مار مچاتا غارت گری پھیلاتا ہوا کافور دیوگیری پہنچا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رام چندر کسی حملہ کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ مگر شاہی افواج کی مزاحمت کے لیے اس نے بہرحال ایک کمزور سی فوج اکٹھا کر لی۔ جنگ میں اس کو مکمل شکست ہوئی لیکن اس کا بیٹا جو دشمن کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا میدان جنگ سے اپنے بعض رفیقوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔[۲] رام چندر نے صلح کی درخواست کی ملک کافور نے کچھ ہاتھی اور کافی خزانہ

وصول کیا۔ اور رام دیو اور اس کے خاندان اور رشتہ داروں کو سلطان کی خدمت میں بہ نفس نفیس اطاعت کے لیے دہلی بھیجدیا۔[27] علاء الدین اپنے سالار کی کامیابی پر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے رام دیو کا بہتر خیر مقدم کیا اور راجدھانی میں اس کو شاہانہ آرام و آسائش فراہم کی اور اس طرح جنوبی ہند میں اس نے ایک وفادار حلیف بنالیا۔ چھ ماہ کے قیام کے بعد رام چندر کو اپنی مملکت واپس ہونے کی اجازت مرحمت ہوئی اور رائے رایان کے لقب اور چتر شاہی سے اس کی عزت افزائی کی گئی۔ ان امتیازات کے ساتھ ساتھ یادو حکمران کو ایک لاکھ سونے کے تنکے دیے گئے اور ضلع نوساری اس کی مملکت میں شامل کر دیا گیا۔[29]

۱۳۰۸ء کے اواخر تک رام چندر دیوگیری واپس پہنچ گیا۔ وہ علاء الدین کی نرمی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس کا احسان مند محسوس کرتا تھا اور اس کے بعد سے پورے طور پر وہ دہلی کے سلطان کا وفادار رہا۔ اس کے احکامات کی کبھی نافرمانی نہیں کی اور اپنی موت تک وہ راجدھانی کو برابر پابندی کے ساتھ خراج بھیجتا رہا۔[30] رام دیو کے ساتھ کیا جانے والا سلوک علاء الدین کی عظیم حکمت عملی تھی۔ اب جنوب میں اس کا ایک غیر متزلزل حلیف پیدا ہو گیا جو سلطان کے مزید منصوبوں میں اس کی یقینی طور پر مدد کرتا تھا۔ جین دستاویز نابھی۔ نندنا۔ جنو دھار۔ پربندھ بجا طور پر کہتی ہے کہ "دیوگیری جاکر علاء الدین نے اس کے حکمران کو پکڑ لیا لیکن اس کو وہاں خدمت کے لیے بحال

---

۲۸۔ حاجی الدبیر کہتا ہے کہ رام چندر ملک کافور سے اس لیے ملا تھا کہ اس کو علاء الدین پر اعتماد تھا۔ لیکن کافور نے اس کو گرفتار کر لیا اور وہ سب کچھ چھین لیا جو اس کے پاس تھا وہ اس کو دہلی لے گیا اور بادشاہ کو اپنے کارنامہ سے باخبر کیا۔ سلطان نے ایک شکست خوردہ حکمران کے ساتھ برا سلوک کرنے پر اس کو سرزنش کی اور رام دیو کی عزت افزائی کی۔ ظفر الوالہ، ص ۱۵۵

اس بیان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ بعد کی مہموں کے موقع پر کافور کو علاء الدین کی ہدایات بصراحت یہ بتاتی ہیں کہ شکست خوردہ حکمرانوں کے ساتھ کافور کی جانب سے غیر مناسب برتاؤ پر سلطان نے سرزنش کی تھی۔

۲۹۔ برنی، ص ۳۲۶؛ فرشتہ ص، ۱۱۸

۳۰۔ برنی ص ۳۲۶ میں ہے

"از آں تاریخ تا زیست رام دیو سلطان علاء الدین را اطاعت کرد و سر از خط فرمان بیرون نیاورد و دانقیاد زندگانی بسر برد و خدمت متواتر در شہر میفرستاد۔"

(اس وقت کے بعد ہمیشہ جب تک وہ زندہ رہا رام دیو سلطان علاء الدین کا فرمانبردار رہا۔ اس کے احکامات

(باقی اگلے صفحہ پر)

کردیا گویا کہ وہ فتح کا ایک ستون تھا طاقت میں اندر کے حائل ہونے کی وجہ سے اس نے (علاءالدین) نے کرناٹا، پانڈوا و تلنگانہ کی مملکتوں کے حکمرانوں کو زیر کیا۔[۳۰الف] جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا کہ انھوں نے ملک کافور کی مزید جنوب میں پیش قدمی میں اس کو گرانقدر امداد دی۔

**وارنگل میں مہم**

دیوگیری کی مہم بلاشبہ ایک شاندار کامیابی تھی اور سلطان علاءالدین نے اپنی توجہ انتہائی جنوب میں واقع سلطنتوں کی جانب مبذول کی جیسا کہ ڈاکٹر آئنگر بجا طور پر تبصرہ کرتے ہیں "دکن اور انتہائی جنوب کے ان مختلف حصوں میں علاءالدین کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کو سونے کا دودھ دینے والی گائے بنانا چاہتا تھا جس کی اسے اکثر ضرورت رہتی تھی تاکہ ہندستان کو اندرونی گڑبڑ اور باہر سے منگولوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی فوج کی بھرپور کفالت کر سکے"۔[۳۱] یہ امر کہ سچ مچ یہی اس کی حکمت عملی تھی ان ہدایات سے واضح ہے جو اس نے وارنگل کی مہم سے قبل ملک کافور کو دی تھیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ گزشتہ دو مواقع پر مسلم افواج نے دیوگیری میں شاندار فتوحات حاصل کی تھیں سلطان اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ جنوب ایک دور دراز کا اجنبی دیس ہے۔ اور اسی وجہ سے ملک کافور کو وارنگل بھیجنے سے قبل علاءالدین نے اس کو بعض بہت قیمتی ہدایات دی تھیں۔ اس نے کہا کہ وہ ایک غیر مانوس علاقہ میں جا رہا ہے لہٰذا اس کو بہت زیادہ خودرائی اور ضد نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو عارض ممالک ملک سراج الدین اور دوسرے بڑے افسروں سے تعاون کرنا چاہیے۔ ان کو فوجیوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ناراضگی اور بغاوت کا کوئی سبب پیدا نہ ہو۔ سپاہیوں کے ناشائستہ فعل اور غیر ذمہ دارانہ روش کی معمولی باتوں سے صرف نظر کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اگر کسی سپاہی کو ایک تازہ دم گھوڑے یا کسی قرض کی ضرورت پیش آئے تو وہ اس کو بے دریغ دے دیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس کو اپنے افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ نہ تو اتنا نرم ہونا چاہیے کہ وہ گستاخ اور بدتمیز ہو جائیں اور نہ ہی وہ اپنی سختی سے ان کو اپنا دشمن بنا لے۔ جہاں تک وارنگل کے راجہ کے ساتھ سلوک کا تعلق تھا ملک کافور

---

(باقی صفحہ گزشتہ) سے کبھی اس نے انحراف نہیں کیا۔ اس نے اپنی زندگی اس کی خدمت (اطاعت) میں گزار دی اور شہر (راجدھانی کو پابندی کے ساتھ خراج بھیجتا رہا)

۳۰الف۔ تذکرۃ آفرین ہسٹاریکل کوارٹرلی میں، جلد ۳۲ (۱۹۵۶ء)، ص ۹۶

۳۱۔ آئنگر، مذکورہ بالا، ص ۷۸۔

کو قلعہ پر قبضہ کرنے اور راجہ کو مغلوب کرنے کا مر[illegible]ہ دیا گیا۔ لیکن اگر رائے پرتاپ رودر دیو (مسلم مورخین کا لدر دیو) اپنے خزانے اور ہاتھی حوالے کر دینے پر آمادہ بعد سالانہ خراج ادا کرنے پر رضا مند ہو جائے تو شاہی سالار اعظم کو زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ مبادا رائے مایوس ہو کر مزاحمت کرنے پر مجبور ہو جائے اگر وہ وارنگل کے خزانے اور ہاتھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو یہ اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ رائے بہ نفس نفیس اس کی خدمت میں حاضری دے کر آداب بجا لائے اور محض اپنے نام اور شہرت کی خاطر رائے کو اپنے ساتھ دہلی بھی نہ لایا جائے۔"[۳۲]

ان ہدایات کو سننے کے بعد ملک کافور ۳۱ ر اکتوبر ۱۳۰۹ء (۲۵ ر جمادی الاول ۷۰۹ھ) کو جنوب کی جانب اپنے خوش نصیب شہسواروں کی قیادت کرنے کے لیے اور تلنگانہ کی سلطنت جس کا پایۂ تخت وارنگل (مسلم مورخین کے ارنگل) میں تھا فتح کرنے کے لیے دہلی سے ایک سرخ چتر اور کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ ربری (ربواڑی) جو اس کا اپنا اقطاع تھا سے گزرتے ہوئے وہ براہ چندیری پرانے راستے پر گامزن ہوا اور اس نے کئی تیز بہاؤ والے دریا مثلاً چنبل، کنواری، سندھ اور بتوا[۳۳] عبور کیے اور پہاڑی علاقوں سے گزرا۔ راستے میں بہت سے راجہ اور گودرز کافور کی فوجوں سے آملے۔ پندرہ منزلوں کے بعد فوج ایرچ پور[۳۴] پہنچی جو سلطانپور کے نام سے بھی مشہور ہے۔ چونکہ ملک نائب دیوگیری کو جانے والی شاہراہ سے پہلے سے اچھی طرح واقف تھا لہٰذا وارنگل جانے کے لیے وہ اس سلطنت کی جانب سیدھا بڑھتا رہا۔ دسمبر ۱۳۰۹ء (رجب ۷۰۹ھ) کے پہلے ہفتے میں فوج کھنڈا[۳۵] پہونچی جہاں وہ

---

۳۲۔ برنی، ص ۳۲۸-۳۲۷

۳۳۔ خزائن میں ہے جون (جمنا)، چنبل، کنواری، بناس اور بھوجی۔ جمنا غلط ہے کیونکہ جنوب میں جانے کے لیے اس کو عبور کرنے کی ضرورت نہیں تھی چنبل اور کنواری (کواری) بہت مشہور دریا ہیں۔ بناس چنبل کی ایک شاخ ہے لیکن غالباً یہاں دریائے سندھ مراد ہے جس کو فوج نے چنبل کے بعد اپنی جنوبی سمت میں پیش قدمی میں یقیناً عبور کیا ہوگا۔ بھوجی بلاشبہ موجود بتوا ہے جو بھیلسہ اور چندیری کے قریب بہتا ہے۔

۳۴۔ ایرچ گوالیار کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل پر واقع ہے۔ اس کو ایلچ پور سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

۳۵۔ پروفیسر ہنگر اس کو کھنڈر سے شناخت کرنے کا رجحان رکھتے ہیں کہ وہ "بیدر کے شمال میں کہیں واقع ہے۔" لیکن بعد میں وہ اس کو کھنڈا سمجھتے ہیں۔ لیکن امیر خسرو کے مطابق جب فوج پندرہ دن کے قیام کے بعد وہاں سے روانہ ہوئی تو اس نے نربدا کو عبور کیا۔ کھنڈا نربدا کے جنوب میں واقع ہے شمال میں نہیں، اس لیے کھنڈا کھانڈوا نہیں ہو سکتا۔ اس مقام کی شناخت مشکل ہے۔

پندرہ دن مقیم رہی۔ پھر آگے بڑھ کر وہ ایک مقام پر پہنچی جس کو امیر خسرو بنل کنٹھ کہتے ہیں[۳۶] اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دیوگیری کی حد پر واقع ہے۔ وہاں سے وہ خاموشی کے ساتھ بڑھا۔ وزیر کافور نے شہنشاہ کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے علاقہ کو سپاہیوں کی لوٹ مار سے محفوظ رکھا کیونکہ وہ سلطنت دہلی کے ایک حلیف رائے رایان رام چندر کے علاقوں سے گزر رہی تھی[۳۷]۔ رام چندر نے اپنی جانب سے شاہی افواج کی تمام سہولتوں کا خیال رکھا جب کہ وہ وارنگل کی جانب بربط کے تار سے زیادہ پتلے اور کسی حسینہ کے گیسوؤں سے زیادہ سیاہ "راستے پر گامزن تھیں۔ اس نے پیش قدمی کرنے والی افواج کی رسد اور دوسری ضروریات کے مناسب انتظامات کیے اور جن راستوں سے وہ گزریں ان پر بازار قائم کیے تاکہ سپاہی ضروریات زندگی ان نرخوں پر خرید سکیں جو سلطان نے دہلی کے لیے مقرر کیے تھے[۳۸]۔ حتیٰ کہ اس نے بعض مرہٹہ دستوں سے مسلم فوج کو کمک بھی دی۔ وہ خود بھی ملک کافور کے ساتھ کچھ دور گیا۔ پھر دیوگیری لوٹ آیا۔

امیر خسرو بہت سے مقامات کا ذکر کرتے ہیں جن سے شاہی افواج گزریں مگر جن کو اب پہچاننا مشکل ہے۔ یقینی طور پر وہ بسیر گڑھ (ویراگڈھ) کے ہیروں کی کان کنی والے علاقہ سے گزری تھیں۔ جو دو دریاؤں یشر (بیہہ) اور بوچی کے دوآب میں واقع تھا[۳۹]۔ دیوگیری سے نکل کر اور تلنگانہ کے حدود میں داخل ہونے کے بعد ملک کافور نے وارنگل کے اپنے راستے پر واقع شہروں اور گاؤں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس نے سبر (سیرپور)[۴۰] کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جو وارنگل کی سلطنت کی شمالی سمت میں واقع تھا۔ محصورین بڑی بہادری سے لڑے مگر شدید حملوں کی تاب نہ لا کر انھوں نے اپنی بیوی

---

۳۶۔ اس جگہ کی شناخت مشکل ہے۔ وہ دولت آباد اور سیرپور کے درمیان کہیں واقع ہے۔

۳۷۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص، ۵۹۔ ۵۸۔

۳۸۔ فرشتہ ص ۱۱۹

۳۹۔ پروفیسر ہودی والا کہتے ہیں کہ اس میں تھوڑا سا شبہ ہو سکتا ہے کہ بسیر گڈھ کو بیراگڈھ یعنی ویراگڈھ پڑھا گیا ہے الہ آباد یونیورسٹی خزائن مخطوطہ (ورق ۵۴ ب میں) "بیراگر" ہے۔ یہ شہر وین گنگا کے بائیں کنارے پر اس دریا کے ایک معاون ندی کوبرگڈھی پر واقع ہے جو ناگپور سے ۸۰ تا ۸۰ میل مشرق میں ہے۔

(دو دریاؤں کے نام ان ہر دو کے غلط ہیں۔ ان میں سے ایک یقیناً وین گنگا یا خود دریا کی معاون ہی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ہودی والا ص ۲۵۴

۴۰۔ ۱۹/۳۲ درجہ شمال، ۴۵ / ۷۹ مشرق میں واقع ہے۔

بچوں کے لیے بے عزتی کے مقابلے میں لپکتے شعلوں کو ترجیح دی اور مغلوب ہونے کے مقابلے میں میدان جنگ کی شاندار موت پسند کی۔ قلعے کا گورنر (مقدم) غالباً جنگ میں مارا گیا اور اس کا بھائی جس کو امیر خسرو انانور کہتے ہیں مستقبل میں وفاداری کے عہد پر قلعے کا نگران بنا یا گیا۔ جنوری ۱۳۱۰ء (شعبان ۷۰۹ھ) تک فوج وارنگل کے قرب وجوار میں پہنچ گئی۔ ایک ہزار سواروں کے دستے کو الگ کیا گیا اور بطور ہراول دستے کے اس کو آگے بھیجا گیا۔ اس نے ہن موا کنڈا (خسرو کا انمکنڈا) کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا جہاں سے مزید جنوب میں وارنگل کے باغات اور عمارتیں دیکھی جاسکتی تھیں۔

وارنگل کا قلعہ پتھر کا بنا ہوا تھا لیکن وہ ایک موٹی مٹی کی دیوار سے محصور تھا جو غالباً پتھر کی عمارت سے بھی زیادہ مستحکم تھی۔ اس کی تعمیر گنپتی دیو کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اس کی تکمیل اس کی باصلاحیت بیوی مشہور ملکہ رودرما دیوی نے کی تھی۔ وہ جنوبی ہند کے مضبوط ترین قلعوں میں سے ایک تھا۔ ملک کافور نے قلعہ کے گرد اپنے خیمے لگانے سے قبل دوبار اس کا معاینہ کیا اور محاصرہ شروع کرنے کا حکم دیا۔ امیر خسرو حسب دستور اپنے مخصوص انداز میں محاصرہ کا حال بیان کرتے ہیں۔

وہ ۱۳ شعبان (۱۸ جنوری ۱۳۱۰ء) کا دن تھا جب خواجہ نصیر الملک سراج الدولہ نے ایک فروزاں مشعل کے ساتھ سپاہیوں کو بہ نفس نفیس ترتیب دیا۔ ہر دستے کو اس کی مقررہ جگہ پر بھیجا گیا تاکہ قلعہ کا محاصرہ کیا جائے اور محاصرین کو محصورین کی آتشباری سے محفوظ رکھا جائے..... ہر تومان کے لیے ایک ہزار دو سو گز زمین مقرر کی گئی۔ قلعہ کا کل قطر جیسا کہ خیموں سے وہ گھرا تھا بارہ ہزار پانچ سو چھیالیس گز تھا۔[41] دوسری جانب قلعہ کے تمام (کنگرہ) میں بہادر رایوں کو متعین کیا گیا۔ پتھر اکٹھا کیے گئے اور جن لوگوں کو پتھر نہیں ملے انھوں نے محاصرین پر اینٹیں اور ڈھیلے پھینکے۔ ابھی محاصرین اس راستے کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے جس کے ذریعہ قلعہ پر ایک خندق سے محصور و محفوظ تھا حملہ کیا جاسکے کر دنا یک دیو (خسرو کا نیک دیو سنے) جو سلطنت تلنگانہ کا ایک گورنر تھا ایک رات مسلم فوج پر عقب سے حملہ کر دیا اور شاہی لشکر گاہ میں دہشت پھیلادی۔ بہت سے ترک سپاہی مارے گئے لیکن آخر کار ہندوؤں کو شکست ہوئی۔ حملہ ناکام ثابت ہوا۔ اسی اثنا میں میسرہ کے ملک قرابیگ نے قرب وجوار میں حملہ کیا اور کچھ ہاتھیوں کو پکڑ لیا۔

خندق بھرنے کا کام بڑے جوش وخروش کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔ دشمن کی جانب سے اچانک حملہ کے خلاف تحفظ کے طور پر سپاہیوں کو درخت گرا کر ایک مورچہ بنانے کے احکام دیے گئے۔ خندق میں

۴۱۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۹۳۔

کیچڑ، پتھر اور کوڑا کرکٹ، پھینک کر ایک جگہ اس کو پاٹ دیا گیا۔ اب مسلم فوج قلعہ کی جڑ تک پہنچ سکتی تھی۔ ملک نائب نے افسروں کا ایک جلسہ طلب کیا۔ تمام سالاروں نے متفقہ طور پر رائے دی کہ قلعہ کی دیواروں پر چڑھنے کے لیے ایک پاشیب کی تعمیر مشکل ہے لہٰذا انھوں نے فصیلوں میں شگاف ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ فروری کے وسط تک طاقتور کھودنے والوں نے بیرونی فصیل میں ایک شگاف ڈال دیا۔ ایک ہفتہ کی مسلسل اور دلیرانہ کوششوں کے بعد مئی نے بیرونی قلعے پر قبضہ کر دیا گیا اور پھر ایک دوسری خندق کو عبور کرنے کے بعد جو قلعہ بندی کے دو حدوں کے درمیان واقع تھی۔ شاہی سپہ سالار نے سنگین قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔

دہلی میں سلطان وارنگل تک جانے والی پوری شاہراہ پر قائم کی گئی تھیں اور جن کے ذریعہ علاء الدین شاہی فوج کی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا تھا بظاہر دشمن کی کاروائی کے سبب درہم برہم ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ سے زیادہ ملک نائب کے بارے میں کوئی خبر سلطان کو نہیں پہنچی۔ علاء الدین نے اپنی انتہائی پریشانی کے عالم میں اس زمانہ کے واجب التعظیم بزرگ شیخ نظام الدین اولیا کے پاس قاضی مغیث الدین بیانہ کو اس درخواست کے ساتھ بھیجا، کہ وہ فوج کی حالت کے بارے میں پیشگوئی فرمائیں۔ نظام الدین نے بہت پر حوصلہ جواب عنایت فرمایا کہ ان کو نہ صرف اس بار کامیابی کی توقع ہے بلکہ وہ مستقبل میں مزید فتوحات کی بھی امید رکھتے ہیں۔ سلطان شیخ کی پیشگوئی پر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اسی دن وارنگل میں کافور کی فتح کی خبر دارالسلطنت پہونچی۔[۴۴]

جب محاصرہ کافی طویل ہو گیا اور قلعہ کے لوگوں کی حالت دگرگوں ہونے لگی تو پرتاپ اور ردر دیو نے ملک کافور سے صلح کی شرائط کے بارے میں سلسلہ جنبانی کی۔ اس نے خزانے، جواہرات، ہاتھی، گھوڑے اور دوسری قیمتی اشیاء کی پیشکش کی اور اسی قیمت کا سالانہ خراج دہلی بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اس نے اپنی خاکساری اور غیر مشروط سپردگی کی نشانی کے طور پر اپنا ایک طلائی مجسمہ بھی بھیجا جس کی گردن میں ایک طلائی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔

امیر خسرو کا بیان ہے کہ ملک کافور نے علاء الدین کی ہدایت کے بموجب رائے سے اس کی تمام دولت کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے کوئی چیز اپنے لیے پوشیدہ رکھی تو وہ شہر کی آبادی کا قتل عام کرائیگا۔ ردر دیو نے بحالت مجبوری سمجھوتے کی شرائط قبول کر لیں جو اس پر مسلط کی گئی تھیں اور وہ تمام

۴۴۔ برنی، ص ۳۲ ۔ ۳۳

خزانے حوالے کر دیے جو کئی نسلوں کے عرصہ میں جمع کیے جا رہے تھے۔ برنی کے مطابق پرتاپ رودر دیو نے، سو ہاتھی،[۴۳] سات ہزار گھوڑے، اور بہت سی بیش بہا اشیا دیں اور اگلے برسوں میں اسی قدر خراج بھیجنے کا وعدہ کیا۔[۴۴] رائے نے جو ہیرے جواہرات حوالے کیے تھے ان میں مشہور زمانہ کوہ نور بھی تھا جو بعد کے بہت سے مورخین اور خفی خان کے بیان کے مطابق ملک کافور دکن سے لایا تھا۔[۴۵]

سمجھوتہ کی شرائط کے سلسلے میں برنی اور خسرو کے مبالغہ آمیز بیانات کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی قلعہ پر قبضہ نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی پرتاپ رودر دیو بہ نفس نفیس ملک کافور کی خدمت میں اطاعت کا اظہار کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ صرف ان کے سفیروں نے جو صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے گئے تھے چتر شاہی کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا۔[۴۶] عصامی بھی کہتا ہے کہ صلح کی شرائط طے ہو جانے کے بعد ہیرے جواہرات سے مزین ایک خلعت رودر دیو کے پاس قلعہ کے اندر بھیجا گیا۔[۴۷] اس کے پیش نظر امیر خسرو کا بیان کہ رائے پرتاپ رودر کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ "ہر چیز جو رائے کے ملک میں پائی جاتی ہے . . . حتیٰ کہ قلعہ کی آخری کیل تک" حوالے کر دے قابل یقین نہیں معلوم ہوتا۔ مزید برآں رائے نے جو کچھ سپرد کیا تھا وہ اس کی تمام دولت نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال کچھ بھی ہو، ایک ہمعصر ہندو مصنف وشوناتھ کویراج نے بجا طور پر کہا تھا کہ "علاءالدین کے ساتھ جنگ یا صلح دونوں میں بہت کم فرق تھا۔ جنگ میں موت کا خطرہ تھا اور صلح میں انسان کی ملکیت میں پائی جانے والی ہر چیز کا زیاں۔"[۴۸]

مارچ ۱۳۱۰ء کے وسط تک ملک کافور دیوگیری، دھار اور جھائن کے راستے شمال کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے حاصل کردہ اموال غنیمت اس قدر زیادہ تھے کہ خزانوں کے بوجھ کے نیچے "ہزار دل

---

۴۳۔ فرشتہ، ص ۱۱۹ میں تین سو ہاتھی ہیں۔

۴۴۔ برنی۔ ص ۳۳۰

خسرو کے مطابق جس رقم کا رائے نے وعدہ کیا تھا وہ ...... . . . . . . . . ۱۰ تنکہ تھی۔ لیکن یہ محض فرضی اعداد و شمار معلوم ہوتے ہیں۔

۴۵۔ ملاحظہ ہو، لین پول، اورنگ زیب، ص ۱۵۰؛ ٹرےولپرینز کا سفر نامہ، جلد دوم، ضمیمہ الف؛ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۷۷

۴۶۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۷۵، ۷۶

۴۷۔ فتوح، ص ۲۸۳

۴۸۔ بحوالہ دنیکت رقیہ، مذکورہ بالا، ص ۲۲

اونٹ بلبلا رہے تھے؟ اس کے دہلی پہنچنے سے قبل ہی اس کی فتح کی خبر سلطان کو مل چکی تھی۔ فتح کی خبر ملنے پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے، اور کامیابی کے خوشگوار واقعات مساجد کے منبروں پر چڑھ کر سنائے گئے۔ ۲۳ رجون ۱۳۱۰ء (۲۴ رمحرم ۷۱۰ھ) کو چبوترہ ناصری کے سامنے ایک سیاہ خیمے کے اندر ایک آراستہ دربار میں فاتح وزیر کا خیر مقدم کیا گیا[49] دکن سے لائے گئے خزانے سلطان کے سامنے معائنہ کے لیے پیش کیے گئے جو اپنے محبوب جنرل سے بہت خوش ہوا اور اس کو فیاضانہ انعام و اکرام سے نوازا۔

---

۴۹۔ الہ آباد یونیورسٹی کے مخطوطہ (ورق ص ۵۶) میں ذی القعدہ ۷۰۹ھ ہے جو مارچ اپریل ۱۳۱۰ء کے مطابق ہے۔ مذکورہ بالا تاریخ جو پروفیسر حبیب کے ترجمۂ خزائن سے دی گئی ہے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ دہلی پہونچنے میں کافور کو تقریباً دو ماہ لگے ہوں گے۔

(دہلی کی بادشاہت سلاطین [illegible])

باب 14

# انتہائی جنوب

وارنگل سے واپسی پر ملک کافور نے دکن کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ وہ جزیرہ نمائے ہند سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور اس نے مزید جنوب میں واقع الدار مملکتوں یعنی دوارسمدر اور معبر کی سلطنتوں کے بارے میں سلطان کو باخبر کیا۔ اس نے علاء الدین کو بتایا کہ جب وہ وارنگل میں تھا تو اس نے سنا تھا کہ معبر کے بادشاہ کے پاس پانچ سو عظیم الجثہ ہاتھی ہیں۔ اس نے اس دور دراز سلطنت پر فوج کشی کرنے کی زبردست خواہش کا اظہار کیا۔ اپنے وزیر سے زیادہ علاء الدین ہندستان کے گوشوں میں اپنا پرچم لہراتے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ اس نے پہلے ہی سے ایک اور مہم کی قیادت دے کر ملک نائب کو بھیجنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مہم بھیجنے کا مقصد وہی معلوم ہوتا ہے، جو گزشتہ دو مہموں کا تھا یعنی خزانوں اور ہاتھیوں کا حصول، لیکن امیر خسرو فرماتے ہیں کہ "اس بار ایک مخلصانہ مقصد سے" شہنشاہ نے جنوب میں مہم بھیجنے کا خیال کیا "تاکہ شریعت کی روشنی وہاں پہنچ سکے"۔[1]

**دوارسمدر کی مہم** | ۲۰ر نومبر ۱۳۱۰ء (۲۴ جمادی الآخر ۷۱۰ھ)[2] کو، دکن سے اپنی آمد کے صرف پانچ ماہ بعد ملک عزالدولہ نائب کافور ایک بار پھر ایک کثیر فوج کے ساتھ

---

۱۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۸۰۔

۲۔ خزائن کے ترجمہ حبیب میں ۲۶ر جمادی الآخر ہے۔ ایلیٹ اور الہ آباد یونیورسٹی کے مخطوطوں میں ۲۴ر ہے۔ برنی صرف یہ کہتا ہے کہ ۷۱۰ھ کے اواخر میں۔

معبر کی سمت رواں دواں تھا۔ وہ سمندر کے کنارے واقع تھا اور دہلی سے اتنا دور تھا کہ ایک شخص جو کسی مہم کے ساتھ سفر کر رہا ہو وہاں بارہ مہینوں کے سفر کے بعد ہی پہنچ سکتا تھا۔[2] فوج جمنا کے کنارے کنارے جنوب کی سمت میں بڑھی اور ٹنکل یا ٹنگل[3] میں دریا پر ایک گاؤں تھا قیام پذیر ہوئی۔ وہاں وہ پندرہ تک ٹھہری رہی اور جب تمام سپاہی آگئے اور ان کا معائنہ ہو چکا تو اس نے پھر جنوب کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ سپاہی دشوار گزار راستوں سے گزرے اور کیتھون[4] نامی ایک مقام پر پہنچے جس کے بعد انھوں نے نربدا اور اس سے چھوٹے دو دریا عبور کیے۔ اس کوچ کے اختتام پر شاہی سالار اعظم نے پرتاپ رودر دیو کے سفیروں کا استقبال کیا جن کے ساتھ اس نے سلطان کے لیے بطور تحفہ ۲۳ ہاتھی بھیجے تھے۔ فوج نے گرگام (کھرگون)[5] میں قیام کیا جہاں سپاہیوں کا معائنہ ہوا اور راجہ تلنگانہ کے بھیجے ہوئے ہاتھیوں کو دہلی روانہ کر دیا گیا دریائے تاوی (تاپتی) عبور کیا گیا اور ۴ فروری ۱۳۱۱ء (۱۳ رمضان ۷۱۰ھ) کو دیوگیری پہنچے۔ یہاں ملک کافور نے کچھ دن قیام کیا اور "بلال دیو اور دوسرے دیوؤں (راکھشسوں) کو زیر کرنے کے لیے"[7] اس نے نیزے اور تیر اور دوسرے آلات حرب حاصل کیے۔

برنی کا بیان غلط ہے کہ جب ملک نائب دیوگیری پہنچا تو رام دیو مر چکا تھا۔[6] فرشتہ بھی برنی کی اتباع کرتا ہے۔ لیکن امیر خسرو اور عصامی کے بیانات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ

---

۳۔ اب نقشہ پر اس گاؤں کا نشان نہیں تھا۔ بہرکیف برنی وہی راستہ بتاتا ہے جو پہلے موقع پر اختیار کیا گیا تھا۔ کہتا ہے کہ ملک نائب نے پہلے ریواڑی کی سمت میں پیش قدمی کی اور پھر وہاں سے وہ سیدھا دیوگیری گیا۔

۴۔ کیتھون یا کہنور کو پروفیسر آئنگر نے کہنون جو راجپوتانہ میں ہے اور اجین سے دہلی جانے والی شاہراہ سے ذرا دور واقع ہے سے شناخت کیا ہے۔" حملہ آور [illegible]، ص ۱۰۱

۵۔ پروفیسر آئنگر نے پہلے گرگام کو نقشوں کا کھرگام سے شناخت کیا جو اندور کے جنوب مغرب میں تھوڑی دور پر واقع ہے۔ (حملہ آور ص ۱۰۱) اور پھر ان کا میلان یہ ہوا کہ اس کو برہانپور اور تاپتی کے درمیان کوئی جگہ بتائیں اور اس کی صحیح جگہ متعین رہنے دیں (خزائن کا ترجمہ کا مقدمہ ص ۳۰) پروفیسر ہودی والا اس کو کھرگاؤں سمجھتے ہیں، جو دریائے نربدا کی معاون کندی ندی پر واقع ہے۔ [illegible]۵۰، ۲۱ شمال ۲۷، ۷۵ مشرق میں وہ قرون وسطیٰ کے بہت سے مصنفین کے نام دیتے ہیں جنھوں نے اس شہر کا حوالہ دیا ہے۔

ہودی والا ص ۲۵۶

۶ برنی، ص ۳۲۳

جب کافور دوارسمدر جاتے ہوئے دیوگیری سے گزرا تو رام دیو زندہ تھا۔ امیر خسرو تفصیل کے ساتھ اس اعانت کا ذکر کرتے ہیں جو یادو حکمراں نے شاہی فوج کو بہم پہونچائی تھیں۔ عصامی بھی کہتا ہے کہ علاءالدین نے رام چندر کو الپ خان کی دختر سے شہزادہ خضر خان کی شادی میں شریک ہونے کے لیے دہلی بلایا تھا اور اس نے شرکت کی تھی۔[7] یہ شادی فروری ۱۳۱۲ء (رمضان ۷۱۱ھ) کے مہینے میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ رام دیو اس تاریخ کے بعد ہی فوت ہوا۔ مزید برآں خود فرشتہ ایک جگہ کہتا ہے کہ ملک نائب کو ۱۳۱۲-۱۳ء (۷۱۲ھ) میں ایک بار پھر دکن بھیجا گیا تھا کیونکہ سنگھانا دیو نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ لہذا یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دوارسمدر کی مہم کے وقت رام دیو زندہ تھا۔

رائے رایان رام دیو نے شاہی سالار کی ہر ممکن طریقے سے مدد کی۔ اس نے حکم دیا کہ فوج کو جس چیز کی ضرورت ہو وہ بازار میں فراہم کی جائے۔ یہی اس نے وارنگل کے حملہ کے وقت بھی کیا تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں کہ نہ تاجر مسلم سپاہیوں کے ساتھ جھگڑا کرتے تھے نہ سپاہی کسی قسم کا ہنگامہ برپا کرتے تھے اور بازار میں لین دین بہت سکون و اطمینان کے ساتھ ہوتا تھا۔[8] رام دیو نے اپنی جنوبی سرحدوں کے سالار اعلیٰ پرسورام دیو راے (مورخین پرس دیو دلوی) کو ترکی فوج کی اس کی جنوبی سمت کے سفر کے دوران اعانت کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ پرسورام نے "بیر اور دھور سمندر" (دوارسمدر اور ویر پانڈیہ کے مملکت) کی فتح میں پوری پوری مدد اور تعاون دیا۔

ملک کافور دیوگیری امان آباد (امن کا مقام) سے پرس دیو کے خراب آباد (دشوار علاقے) کے لیے روانہ ہوا۔ انھوں نے پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں سفر کیا اور دریا عبور کیے جن میں سے بعض "گھن گرج سے بہنے والے اور دوسرے آہستہ رو تھے۔ دریائے گوداوری، سینی اور بھیما پار کرنے کے بعد وہ پانچ منزلوں میں ہویسلا سلطنت کی حدود میں پہونچ گئے"۔[9]

جب کافور ہویسلا حکمرانوں کے پایۂ تخت کی جانب بڑھ رہا تھا راجہ بلال سوم اپنی فوج کے ساتھ اور بھی آگے جنوب میں گیا ہوا تھا۔ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ماردمن کل سکھارا کے دو بیٹے تھے سندر پانڈیہ اور ویر پانڈیہ۔ سندر پانڈیہ کو بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ اس کا جانشین

---

۷۔ فتوح، ص ۳۱۶۔

۸۔ خزائن، الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ، ورق ۷۱ ب

۹۔ متن میں مقام ملال بدل کر دیا گیا ہے۔ اس میں دریا ہیں "سینی، گوداوری، وربھینور (بھیما)"

نامزد کیا گیا تھا۔ سندر پانڈیہ یہ علانیہ جانبداری برداشت نہ کر سکا اور شدید غصے کے عالم میں اس نے اپنے باپ کو مار ڈالا اور مردی (مدورا) میں اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کی۔[10] اس ناخلفی کے فعل کا نتیجہ دونوں بھائیوں کے درمیان خونریز جنگ کی صورت میں نکلا۔ اپنے عم زاد کی مدد سے ویر پانڈیہ نے سندر کو شکست دی جو شمال کی جانب فرار ہوا اور اس نے دہلی میں علاء الدین سے یا اس کے جنرل ملک کافور سے جو اس وقت دکن میں موجود تھا مدد طلب کی۔[11] پانڈیہ مملکت کی اس غیر یقینی صورت حال نے ویر بلال سوم کو اپنی فوج کے ساتھ فوج کشی کرنے پر دونوں بھائیوں کے لڑائی جھگڑے سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ کیا۔ ٹھیک اسی وقت اس کے اپنے علاقوں پر ملک کافور کے حملے کی خبر اس کے کانوں پر بجلی بن کر گری۔ اسے اپنے ملک کے تحفظ کی فکر تھی، فوراً واپس ہوا دوسرے ملک پر بھلا کیا حملہ کرتا۔

کافور نے بندری[12] میں ہوئیسلا اور پانڈیہ حکمرانوں کی سلطنتوں میں واقع ہونے والے حالات سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ اس نے ایک جنگی مجلس مشاورت منعقد کی اور اس کے فیصلوں کے مطابق کر کے چیدہ سواروں کے ساتھ ۱۴ فروری ۱۳۱۱ء (۲۳ رمضان) کو روانہ ہوا اور پہاڑوں کو پار کرتا ہوا دوارسمدر[13] (خسرو کے دھورسمندر) کے قلعہ کے سامنے بروز جمعرات ۲۵ فروری ۱۳۱۱ء (۵ شوال ۷۱۰ھ) کو پہنچ گیا۔ ویر بلال نے جو وقت پر راجدھانی لوٹ آیا تھا اپنے وزیروں اور فوجی سالاروں سے مشورہ طلب کیا کہ ایسی شدید مصیبت کے وقت کیا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے۔ انھوں نے متفقہ طور پر اطاعت کرنے کے بجائے اس کو لڑنے کا بیسا کھا یار۔ انھوں نے دلیل دی کہ ایک توہین آمیز صلح کے صدمہ کے بعد سلطنت کے وقار کو پھر بحال کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہوئیسلا حکمران کو پریشانی کے عالم میں دیکھ کر ویر پانڈیہ نے بھی بلال کی افواج کو بطور کمک ایک فوج بھیج دی لیکن وہ شروع ہی سے مایوسی کا شکار تھا۔ وہ چھوٹی موٹی جھڑپیں لڑتا لیکن حملہ آوروں سے ایک آخری جنگ لڑنے

---

۱۰۔ آئنگر، مذکورہ بالا، ص ۹۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۳۱

۱۲۔ پروفیسر آئنگر (مذکورہ بالا، ص ۱۰۲) بندری کو پنڈھرپور سے شناخت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یادو اور ہوئیسلا سلطنتوں کے درمیان ایک سرحدی چوکی ہوگی۔

۱۳۔ دو دستاویزیں جو غالباً ۱۳۲۰ء کی ہیں دوارسمدر پر ایک مسلم حملہ آور کا حوالہ دیتی ہیں۔ ایپی گرافی کرناٹیکا، جلد چہارم، حسن تعلق، نمبر ۱۳ اور ۵۲

نے بھی کترا تا رہا۔ اسی اثنا میں اس نے ایک گیسومل (کیسو، کیشو) کو مسلم فوج کی طاقت اور حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ جان کر کہ دشمن سخت جنگ جو ہے اور رام چندر اور پرتاپ رد ر جیسے حکمران اس کے مطیع ہو چکے ہیں اس نے صلح کی درخواست کی۔ امیر خسرو کے مطابق ایک دیو نا ایک وکلائے مطلق کی معیت میں ملک نائب کے لشکر گاہ میں حاضری دی اور اطلاعات کا اظہار کیا۔ ملک کافور کی شرائط واضح تھیں: "خلیفہ (علاء الدین) کی شرائط بلال دیو اور دوسرے رایوں کے بارے میں یہ ہے کہ پہلے تو میں ان کے سامنے کلمۂ شہادت پیش کروں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب منور ہو جائیں۔ لیکن اگر۔۔۔ وہ ہدایت کی روشنی پانے میں ناکام رہیں تو میں ان کی گردنوں میں خراج کا قلادہ (ذمہ) ڈالوں۔ اور اگر وہ اس کو بھی انکار کر دیں اور خراج دینے سے انکار کر دیں، بس ان کی گردنوں کو اس کے سروں کے بوجھ سے آزاد کر دوں گا۔"[14] بلال دیو نے دوسرا متبادل قبول کر لیا اور سالانہ خراج بھیجنے کا وعدہ کیا۔ بہت سا خزانہ جو پورے ایک دن تک کوٹھریوں سے نکالا جاتا رہا اور عظیم الجثہ ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد شاہی سالار کی خدمت میں پیش کی گئی۔[15] ویر بلال بہ نفس نفیس ملک کافور کے پاس آیا اور اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔

صلح کی شرائط طے ہو جانے کے بعد ملک نائب ایک ہفتہ تک دوار سمدر میں قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد اس نے بلال دیو سے معبر کی جانب اس کی رہبری کرنے کی درخواست کی۔ یہ وہ راستہ تھا جس سے شاہی سپہ سالار بالکل ناواقف تھا۔ شکست خوردہ ہویسلا راجہ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ فاتح جنرل نے جو کچھ کہا تھا وہ اس سے اتفاق کرے، اور اپنی جیسی مملکت کی تباہی کی جانب ملک کافور کی رہبری کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔[16]

**ایران کی سفارت** جس زمانے میں ملک کافور جنوب میں آگ اور تلوار کا کھیل کھیل رہا تھا اسی زمانے میں ایران کے ایل خانی سلطان الجائتو خدا بندہ کی جانب سے ایک سفارت علاء الدین کے دربار میں پہنچی (۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) وہ اپنے فرمانروا کی جانب سے یہ پیغام لائے تھے کہ سلاطین دہلی کے تعلقات منگولوں کے چغتائی اور کتائی خاقانوں سے ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔ لیکن یہ بہت عجیب ہے کہ الجائتو کی تخت نشینی کے وقت سے سلطان علاء الدین نے نہ تو

---

۱۴۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۹۱

۱۵۔ برنی کہتا ہے کہ ملک کافور نے ۳۶ ہاتھی اور دوار سمدر کے سارے خزانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

۱۶۔ فتوح، ص ۲۸۷

کوئی مبارک باد کا پیغام بھیجا اور نہ پرانی دوستی کو مضبوط بنانے کے لیے کوئی مراسلہ۔ اب موقع ہے کہ پرانے دوستانہ تعلقات کو پھر سے بحال کیا جائے"[17]

پیغام میں الجائتو نے بہت ہی نرم الفاظ میں یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کے سلطان کی ایک دختر کی شادی شاہ ایران کے حکمران ایل خان کے ساتھ کر دی جائے۔ علاء الدین نے جو اب وسیع خاندانوں کا مالک تھا اور جس نے شمال اور جنوب میں بے نظیر فتوحات کی تھیں الجائتو کی شادی کی تجویز کو اپنی عزت و آبرو کی عمداً توہین تصور کیا اور ان تمام اشخاص کو قید کر لیا جن پر سفارت مشتمل تھی۔ ان لوگوں کو محض قید میں ڈال دینے سے اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا بعد میں اس نے حکم صادر کیا کہ ان کو ہاتھیوں کے پیروں تلے روند ڈالا جائے۔ وصاف کہتا ہے کہ کھلے بندوں حکمت عملی کے منافی فعل کے سبب اس نے "اپنے اچھے نام کے موتی کو دریائے نیل میں غرق کر دیا"[18]

**معبر کی پیشقدمی**

۱۰ مارچ ۱۳۱۱ء (۱۸ شوال ۷۱۰ھ) کو ملک کافور دولسمدر سے معبر[19] کے لیے روانہ ہوا۔ فتوح السلاطین کے مصنف کے مطابق ملک کافور کی انتہائی جنوب کی اس مہم میں شکست خوردہ ہویسلا حکمراں اس کی معیت میں تھا اور اس نے غیر معروف علاقہ میں شاہی سالار کی رہبری کی۔ وہ علاقہ جس سے شاہی فوج گزری بہت ہی ناہموار اور پہاڑی تھا اتنا زیادہ کہ "نوکیلے پتھروں نے گھوڑوں کے سموں کو زخمی کر ڈالا"۔ ہر رات

---

۱۷۔ علاء الدین اور الجائتو کے پیشرو غازان خان (۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۴ء) کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار رہتے۔ غالباً ۱۳۰۲ء کے اکتوبر میں غازان خان نے تبریز سے ایک ہاتھی پر سفر کیا جو سلطان دہلی کی جانب سے اس کو بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔ تبریز کے لوگوں کے لیے وہ منظر بالکل نیا تھا۔

ہوورتھ، تاریخ مغول، جلد سوم ص ۴۷۹

۱۸۔ یہ واقعہ صرف وصاف نے بیان کیا ہے (ص ۵۲۸) کوئی ہندوستانی مورخ اس کا حوالہ نہیں دیتا۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق ایران سے ہے اس لیے وصاف پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی مورخین ملک کافور کی دکن میں شاندار فتوحات کو بیان کرتے وقت ایک ایسے معمولی واقعہ کو نظر انداز کر دیا ہو۔

۱۹۔ پانڈیہ علاقہ مسلمانوں کو معبر کے نام سے معلوم تھا۔ وہ کولون سے نیلور تک پھیلا ہوا تھا جو سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ تقریباً ۳۰۰ فرسنگ تھا۔

سپاہی ایسی زمین پر سوتے تھے جو "اونٹ کی پیٹھ سے زیادہ ناہموار تھی"۔ سب لوگ اتنی مصیبت نہیں جھیل سکتے تھے اباجی مغل ایک ممتاز جنرل نے ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ عصامی کے مطابق بہرام کرا۔ کتلہ نہنگ، محمود سرتبہ اور اباجی مغل جیسے اعلیٰ افسروں کی قیادت میں ایک قراولی دستہ شاہی افواج کے ساتھ منسلک تھا۔ ان کمانداروں میں سے ہر ایک بعض ایسے لوگوں کے ساتھ آگے جاتا تھا جو اس علاقہ کی زبان جانتے تھے اور دشمن کے علاقہ کے معاملات کی خبر سے شاہی سالار اعظم کو باخبر کرتے تھے۔ اچانک اباجی مغل نے شاہی فوج چھوڑنے اور معبر کی رائے کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ملک کافور کو قتل کرنے کے بارے میں بھی سوچا۔ اس نے بعض لوگوں سے یہ معاملہ طے کیا کہ وہ اس کو معبر کے رائے کے پاس لے جائیں گے اور وہاں اس کو ایک باعزت منصب دلائیں گے۔ لیکن جب وہ مرکزی فوج کے آگے آگے پیش قدمی کر رہا تھا اس کے سپاہیوں کی جھڑپ معبر کی فوج کے ساتھ ہوگئی۔ اباجی مضطرب اور پریشان ہوکر واپس ہوا۔ اور کافور سے آملا۔ جب شاہی جنرل کو ان واقعات کا علم ہوا تو اس نے اباجی کو زنجیروں میں ڈال دیا اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔[20]

پانچ مشقت طلب منزلوں کے بعد معبر کی حدود آگئیں۔ فوج برابر بڑھتی رہی اور دو درے ترملی[21] اور تبر (تو پور) عبور کرنے کے بعد وہ مردیا (مردی) پہنچی جس کے باشندوں کا قتل عام کیا گیا۔ پھر دریائے کنوبری سے روانہ ہوکر اس نے بیردھول[22] پر فوج کشی کی۔ دیر پانڈیہ کندر جس کو کنانور[23] سے شناخت کیا گیا ہے) کی جانب فرار ہوگیا۔ لیکن اس نے وہاں بھی اپنے کو محفوظ نہیں کیا

---

۲۰۔ معبر میں اپنی فتح کے بعد جب کافور دہلی واپس ہوا تو اباجی مغل کو سلطان کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ فتوح ص ۲۸۸-۲۹۱

۲۱۔ ایلیٹ میں سرلی ہے، الٰہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ میں تملی ہے۔ اس کی شناخت مشکل ہے۔

۲۲۔ پروفیسر آئنگر اس کو دیر (بیر) پانڈیہ کا صدر مقام خیال کرتے ہیں (دیر بار کو پولو، جلد دوم ص ۳۱۹) اے برنل ( A. B. Burnell ) کی سند پر تجویز کرتے ہیں کہ وہ نقشوں کا ورنا چلم ہے جو جنوبی ارکاٹ میں ہے اور تجور کے شمال میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ تقویم البلدان میں ابوالفدا بھی بیرداول کی مملکت معبر کا پایۂ تخت بتاتا ہے (القلقشندی، ص ۳۹ ـ ۳۸)۔ وہاں قدیم اور مشہور مندر ہیں اور قلعوں کے کھنڈر ہیں۔ وہ مشہور زیارت گاہ ہے لیکن بعض مقامات کے نام مثلاً بیر دھول، جالکو نا، سرلی اور کھام مسخ شدہ ہیں اور ان کی شناخت مشکل ہے۔

۲۳۔ کنانور شہر ترچناپلی کے شمال میں تقریباً ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے چولا مملکت میں وہ ہوئیسلا راجدھانی تھی۔ اس کی شناخت کے لیے تفصیلات پر ملاحظہ ہو۔ آئنگر، مذکورہ بالا، ص ۶۲ اور ہودی والا، ص ۲۵۷

اور جنگلوں کی طرف بھاگ نکلا۔ ملک کافور نے اس دوران رائے کا جہاں جہاں وہ گیا تعاقب جاری رکھا۔ تقریباً بیس ہزار مسلمان جو مدتوں پہلے جنوبی ہند میں بس گئے تھے اور جو ہندوؤں کی طرف سے لڑ رہے تھے شاہی افواج سے آملے۔ ان کی جان بخشی کی گئی۔[۲۴] ان لوگوں کی مدد سے فوج نے مفرور راجہ کا نشان و پتہ جاننے کی کوشش کی۔ لیکن شدید بارش نے ان کو بیردھول کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال بھگوڑے کا تعاقب ترک نہیں کیا گیا اور فوج نے بیردھول سے پھر اس کا تعاقب شروع کیا۔ "آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور فوج ان علاقوں سے گزر رہی تھی، جو پانی سے بری طرح بھرے ہوئے تھے۔" خبر ملی کہ رائے شہر کنڈور کی جانب گیا ہے۔ شاہی فوج نے اس شہر پر دھاوا بولا لیکن ویر پانڈیہ وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ ملک کافور کے ہاتھ ایک سو بیس ہاتھی لگے۔ جن پر کچھ خزانہ بھی پایا گیا۔ ملک کافور کا اصل مقصد اپنے دوست سندر کی مدد کرنے سے زیادہ اپنے دشمن ویر پانڈیہ کو تباہ کرنا تھا۔ اس نے کنڈور کے عوام کا قتلِ عام کیا لیکن بے نتیجہ کیونکہ رائے بہت پہلے وہ مقام چھوڑ چکا تھا۔ اسی اثنا میں یہ خبر ملی کہ وہ جلگوٹا[۲۵] کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ ملک نائب نے اس سمت میں پیش قدمی کی۔ لیکن کانٹے دار جھاڑیاں تعاقب میں مزاحم ہوئیں اور وہ کنڈور لوٹ آیا جہاں اس نے مزید ہاتھیوں اور خزانے کی تلاش جاری رکھی۔ اس اثنا میں اس کنڈور کے مضافات میں واقع تمام مندروں اور تمام علاقوں کے خزانوں کے بارے میں معلومات

---

۲۴۔ برنی سنہ ۱۲۹۶ء کی دیوگیری کی پہلی مہم کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس سے پہلے جنوب کے لوگوں نے مسلمانوں کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ کہتا ہے (۲۲۲): "خلق دیوگیر دقتی از اوقات و از زمان ماضی خبر اسلام نشنیدہ و ہیچ گہی زمین مرہٹ را لشکری نمالیدہ۔"

(دیوگیری کے لوگوں نے ماضی میں کبھی اسلام کے بارے میں نہیں سنا تھا اور (اسلام کے) کسی لشکر نے مرہٹوں کی سرزمین پامال نہیں کی تھی)

لیکن یہ غلط ہے۔ یہ امر کہ ہندو راجہ کی مسلمان رعایا کی ایک بڑی تعداد کافور سے مل گئی تھی۔ بہ صراحت بتایا ہے کہ سری رنگم کے پاس کنانور میں اور دوسرے مقامات پر مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ شمالی ہند میں حملہ آوروں کی صورت میں داخل ہونے سے پہلے مسلمان جنوبی ہند میں امن پسند تاجروں کی حیثیت سے آچکے تھے۔

۲۵۔ الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ میں جلکوٹا ہے۔ پروفیسر آئنگر کا خیال ہے کہ اس سے مراد ہے پانی کا قلعہ یا ایک ایسا جزیرہ جو اپنے اردگرد گھیرے پانی سے محفوظ ہو۔ (حملہ آور، ص ۱۱۱)

اکٹھا کرلیں۔ معلوم ہوا کہ برہمت پوری (بربا پوری) یا چدمبرم میں ایک سنہری مندر ہے اور وہاں رائے کے ہاتھی اکٹھے کیے گئے ہیں۔ مندر پر حملہ کیا گیا اور ڈھائی سو ہاتھی پکڑ دیے گئے "رام کی سنہری لنکا" یا شداد کی جنت جو کھوئے جانے کے بعد ان جہنمیوں نے پھر بسائی تھی" جیسا مندر لوٹا گیا اور اس کے بت "لنگ مہادیو کو توڑ دیا گیا۔ وہ سنہری مندر جو صدیوں سے ہندوؤں کی عبادت گاہ رہا تھا۔ اس کی بنیاد کھود ڈالی گئی۔" جہاں کبھی ہیرے جگمگاتے تھے وہاں اب تلواریں چمک رہی تھیں۔۔۔ اور برہمنوں اور بت پرستوں کے سر ناچتے ہوئے ان کی گردنوں سے ان کے قدموں میں گر رہے تھے"[۲۷]

برہمت پوری (چدمبرم) کے مندر کی تباہی کا یہ شاعرانہ بیان ہے۔ سری زنگم کا مندر بھی لوٹا گیا کیونکہ کنانور کے قریب کے تمام مندروں پر حملہ کیا گیا تھا اور اس مفروضہ کی تصویر ایک تامل تصنیف کوئی لوہو (Koyilolugu) سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب سری زنگم رنگا ناتھ کے مندر کو دیے گئے عطیات اور اس میں کھانے والی مرمتوں کی ایک دستاویز ہے۔ وہ تامل نثر میں لکھی گئی ہے اور تیرھویں صدی سے سولھویں صدی عیسوی تک جنوبی ہند کے سلسلے وار واقعات کی تقریباً پوری کہانی بیان کرتی ہے۔ اس کی شہادت تامبے اور پتھر کے کتبات پر مبنی ہے۔ اور وہ تاریخی اہمیت کا ایک عظیم ماخذ ہے۔[۲۸] وہ بیان کرتی ہے کہ سری زنگم کی تباہی کے وقت بظاہر ملک نائب کے ہاتھوں سری زنگا ناتھ کا مندر آریہ بھٹوں یا شمالی برہمنوں کی نگرانی میں تھا۔ ان کو مسلمانوں نے مغلوب کر لیا اور مندر کی تمام دولت بھگوان رنگا ناتھ کی مورتی سمیت چھین لی گئی۔ وہاں ایک ایسی عورت تھی جو روزانہ مورتی کا درشن کیے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھی۔ وہ واپس ہوتی ہوئی ایک سادھو کے بھیس میں فوج کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور آخر کار دہلی پہنچ گئی۔ رنگا ناتھ کا تب ایک شہزادی کو دیا گیا جس کو وہ پسند آ گیا تھا۔ عورت مورتی کو محفوظ ہاتھوں میں پا کر سری سری زنگم لوٹ آئی تاکہ مندر میں اس کو واپس لانے کی تدبیر کر سکے۔ وہاں سے کچھ لوگ اس عورت کی رہبری میں دہلی تک گئے اپنی موسیقی سے انھوں نے سلطان کو خوش کیا اور انعام میں مورتی واپس لے آئے۔ لیکن شہزادی اس کو جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کے علم کے بغیر مورتی جنوبی ہند کے باسیوں کے حوالے کی جا چکی تھی۔ جب اس کو اس نقصان کا پتہ چلا تو وہ محافظ دستے کے ساتھ مورتی کو چھین لینے کے لیے

---

۲۶۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ ب

۲۷۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۵۔ ۱۰۳

۲۸۔ انڈین اینٹی کوئری، سنہ ۱۹۱۱ء، ص ۴۴۔ ۱۳۱۔ کے وی رامینہ کا مضمون "کوئی لوہو" پر

دکن کے لیے روانہ ہوئی۔ تروپتی ۲۸ ، مورتی لانے والے لوگوں کو معلوم ہوا کہ شہزادی اور اس کا محافظ دستہ ان کے تعاقب میں آرہا ہے۔ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھ کر ان کی جماعت کئی حصوں میں بٹ گئی اور مورتی کو تین آدمیوں کی نگرانی میں دے دیا جن میں سے ایک باپ اور ایک بیٹا اور اس کا ماموں تھا۔ مسلم فوج کے خوف نے ان تین ہندوؤں کو ایک کم آمدورفت والی پہاڑی کے غار میں چھپ جانے پر مجبور کر دیا۔ شہزادی سیدھی سری رنگم چلی گئی اور مندر کو اجڑا پا کر اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ مر گئی۔ ساٹھ سال گزر گئے۔ باپ اور ماموں مر چکے تھے۔ بیٹا اسی سال کا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اپنا آخری وقت قریب سمجھ کر وہ پہاڑی کے باسیوں کے پاس آیا اور ان کو لمبی کہانی سنائی کہ وہ وہاں کیسے پہونچا۔ اس وقت تک وجیا نگر کی ہندو سلطنت کی طاقت پوری طرح سے مستحکم ہو چکی تھی اور ۱۳۷۱ء میں مورتی سری رنگم کے مندر میں پھر سے نصب کر دی گئی۔[29]

یہ دومانی کہانی صرف ایک مندر کے بارے میں بیان کی جاتی ہے لیکن کافور نے ان کی ایک بڑی تعداد کو تباہ کیا تھا اور ان کی دولت لوٹ لی تھی۔ بیر دھول کے مندر بھی جہاں براہ راست پوری سے فوج پہونچی تھی پوری طرح سے تہس نہس کر دالے گئے۔ جو تباہی ملک کافور نے پھیلائی تھی اس کا تصور اس حقیقت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ دیر پانڈیہ کی تلاش میں مسلم فوج ایک جگہ سے دوسری جگہ گئی اور بعض مقامات پر تو کئی کئی بار پہنچی۔ جہاں کہیں وہ گئی وہاں بھگوڑے کو نہ پا کر انھیں جو مایوسی ہوئی اور غصہ آیا اس میں انھوں نے مندروں اور عمارتوں کو تباہ کر ڈالا اور لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔[30]

دیر پانڈیہ کے تعاقب میں شاہی فوج پیش قدمی کرتی رہی۔ ۱۴ اپریل ۱۳۱۱ء (۱۰ ذی القعدہ

۲۹۔ آئنگر، مذکورہ بالا، ص ۱۶۔ ۱۱۳

۳۰۔ دیول رانی میں خسرو بھی معبر کے مختلف مندروں کی تباہی کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ (دیول رانی ص ۷۰) مندر دولت و ثروت کے مخزن تھے۔ ہندو راجہ اور دوسرے دولت مند لوگ ان کو سونے اور ہیروں کے چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان کے اداروں کی کفالت کے لیے گاؤں وقف کرتے تھے۔ اس طرح ایک مندر کی دولت کسی بڑے پیمانے پر خرچ ہوئے بغیر بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی مسلمان کسی جگہ حملہ کرتے تھے تو اس کے مندروں کو خاص طور سے لوٹتے تھے تاکہ ان کی دولت ان سے چھینی جا سکے۔ لیکن جنگ کے اشتعال میں تعصب فطری طور پر بھڑک اٹھتا تھا اور مندروں کو لوٹنے کے علاوہ حملہ آور ان کی عمارتیں بھی کھود ڈالتے تھے اور اکثر مورتیوں کو ایسے مقامات پر پھینک دیتے تھے جہاں وہ مسلمانوں کے قدموں تلے روندی جائیں۔

کو وہ شہر کم (ایلیٹ، کم[31]) پہنچے اور کچھ دنوں بعد وہ مدورا لوٹ آئے جہاں خیال تھا کہ ویر پانڈیہ موجود ہے۔ رائے اپنے خاندان اور خزانوں سمیت وہاں سے ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا جگنا ریا سوکنا تھ[32] کے مندر میں صرف دو یا تین ہاتھی چھوڑے گئے تھے۔ کافور کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی اس کے صبر کا پیالہ لبریز ہوگیا۔ سخت غصے کے عالم میں اس نے مندر میں آگ لگا دی۔ اس نے ہفتوں مہینوں تک شہروں، جنگلوں اور پہاڑوں میں رائے کو مسلسل تلاش کیا تھا لیکن ہر جگہ ناکام رہا۔ اور اب اس نے یہ دیکھ کر کہ وہ کافی دولت کا مالک بن چکا ہے اور بہت سے ہاتھیوں کو پکڑ چکا ہے اس نے بیسود تعاقب کو ترک کرنے اور گھر لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ لوٹنے سے قبل اس نے اموالِ غنیمت کو ترتیب دینے اور ان کی درجہ بندی کرنے کا حکم دیا۔ اس کے اموالِ غنیمت ۵۱۲ ہاتھی (برنی کے ۶۱۲ ہاتھی) عربی، یمنی اور شامی نسلوں کے پانچ ہزار گھوڑے[33]، (برنی میں بیس ہزار گھوڑے چھیانوے ہزار من سونا ہے) اور پانچ سو من ہر قسم کے زیورات پر[34] مشتمل تھے۔

---

۳۱۔ غالباً کد بوتم ہے یہ شہر اب کھنڈر ہو چکا ہے۔ مگر پرانی قلعہ بندی کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ خاص علاقہ آج کل کد بر کہلاتا ہے اور وہ ترچنا پلی کی شاہراہ پر پڈوکوٹا سے تقریباً گیارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

۳۲۔ آئنگر (ص ۱۰۰) ایلیٹ کی اس تشریح سے کہ وہ "چکن ناتھ ہے یا وہ ایک مندر تھا جو جگنا تھ یا وشنو سے منسوب تھا" اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جگنا تھ سوکن ناتھ کی مسخ شدہ شکل ہے جو شہر مدورا کے سرپرست دیوتا شیو یا سندریشں کا مترادف نام ہے۔ سندریشور کا عظیم مندر شہر کی اب بھی ایک خوبصورت عمارت ہے۔ ملاحظہ ہو خزائن، ترجمہ، مقدمہ ص، ۳۲؛ ہودی والا ص ۲۵۷۔ امپیریل گزیٹیر، جلد ۲۳، ص ۸۰۔۱۷۔

۳۳۔ خزائن، ص، ۱۰۶۔

خسرو مبالغہ نہیں کرتے۔ وصاف اور مارکو پولو دونوں اس کی شہادت دیتے ہیں کہ قاطف، لحسہ، بحرین اور ہرمز جیسے مقامات سے ہر سال گھوڑوں کی خاصی بڑی تعداد معبر میں درآمد کی جاتی ہے۔ چونکہ جنوب والے ان کو صحیح غذا دیتے تھے بلکہ چنے کا دانا اور دودھ دیتے تھے اس لیے وہ جلد مر جاتے تھے اور نئے گھوڑے درآمد کیے جاتے تھے (وصاف، ص، ۳۰۲) مارکو پولو معبر کے بارے میں کہتا ہے کہ "یہاں گھوڑے نہیں پائے جاتے اور اس طرح ملک کی دولت کا بڑا حصہ گھوڑوں کی خرید پر ضائع کر دیا جاتا ہے ..... کس اور ہرمز ... اور عدن کے تاجر جنگی اور دوسرے گھوڑوں کی کافی تعداد اکٹھا کرتے ہیں اور ان کو معبر لاتے ہیں"۔ یول، سیر مارکو پولو، جلد دوم ص ۳۴۰۔ ہندو نسلوں میں پیوند لگانے کے فن سے واقف تھے۔ یہ عربوں کا راز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو اچھی نسل کے گھوڑے ہمیشہ درآمد کرنے پڑتے تھے۔

۳۴۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۷ - ۱۰۵۔

اپنی مہم کے ان انعامات کے ساتھ ملک کافور نے یکشنبہ ۲۵ر اپریل ۱۳۱۱ء (۴ر ذی الحجہ) کو اپنے خیمے اکھاڑے جس پر ہر شخص کو انتہائی مسرت ہوئی۔ وہ دہلی کی طرف اس کڈھب راستے پر چلتے ہوئے آئے جن سے ہو کر انھوں نے جنوب کی فتح کے لیے پیش قدمی کی تھی، چھ ماہ کے مصیبتوں سے بھرے سفر کے بعد پھر دہلی پہونچے۔ سلطان علاؤالدین نے اپنے فاتح جنرل اور سپاہ کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس نے بروز سوموار ۱۸ر اکتوبر ۱۳۱۰ء (۴ر جمادی الثانیہ ۷۱۰ھ)[۳۵] کو بمقام سیری قصر ہزار ستون میں ایک دربار منعقد کیا جہاں ملک کافور نے سب کچھ جو وہ دکن سے لایا تھا سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ برنی کہتا ہے کہ دکن میں اتنی دولت حاصل ہوئی تھی کہ دہلی پر مسلمانوں کے قبضے کے وقت کسی زمانے میں اتنی دولت نہیں ملی تھی۔ ایسے مواقع پر علاءالدین اپنی سخاوت کے مظاہرے میں ناکام نہیں رہتا تھا۔ اس نے اپنے امیروں اور افسروں کو چار، دو، ایک اور نصف مَن سونا دیا۔

بلال دیو ملک کافور کے ساتھ دہلی آیا تھا۔ ہویسلا راجہ معبر کی جانب کافور کی پیش قدمی میں رہبری کرنے اور اس کی جلد تباہی میں مدد دینے کے بعد ملک کافور کے ساتھ دہلی پہونچا تھا۔ سلطان بلال کی اعانت اور وفاداری سے بہت خوش تھا۔ اس نے اس کو ایک خاص خلعت، ایک تاج اور چتر عطا کیا۔ نیز اس کو دس لاکھ تنکہ کی ایک تھیلی بھی مرحمت فرمائی۔ ہویسلا حکمراں کچھ مدت دہلی میں اقامت پذیر رہا اور پھر دوارسمدر لوٹ گیا۔ سلطان نے اس کی مملکت اس کو بحال کر دی تھی۔

بلاشبہ یہ عجیب بات ہے کہ امیر خسرو اور برنی ملک کافور کے لیے ترتیب دیے جانے والے مخصوص خیر مقدم کو بیان کرتے ہوئے بلال دیو کا کوئی ذکر نہیں کرتے جو وہاں ایک اہم شخصیت رہا ہوگا۔ مگر عصامی بیان کرتا ہے کہ علاءالدین نے بلال کا کس طرح خیر مقدم کیا تھا[۳۶]۔ اس امر کی کہ اس حکمراں نے دہلی کی سیاحت کی تھی جس طرح کہ چند برس بیشتر یادو حکمراں رام چندر نے کی تھی ایک کتبہ سے تصدیق ہوتی ہے جس کا ترجمہ ہے کہ: "جب پرتاپ۔ چکرورتی ہویسلا ویر بلال دیو دوارسمدر ایک امن پسند سلطنت پر حکومت کر رہا تھا، ترک حملہ واقع ہوا۔ بلال دہلی گیا اور دہلی سے واپس ہونے پر ۶ر مئی ۱۳۱۳ء کی تاریخ بصراحت موجود ہے اس نے نئے اور پرانے محاصل دوا گذاشت کیے۔۔۔"[۳۷]

---

۳۵۔ خزائن، مذکورہ بالا، ص ۱۰۸ میں ۱۴ر جمادی الثانی ہے یہ غلط ہے کیونکہ ۱۴ر کو دوشنبہ نہیں جمعرات تھی۔ علیگڑھ اور الہ آباد یونیورسٹی کے مخطوطات میں ۴ر جمادی الثانی ہے جو صحیح ہے۔

۳۶۔ فتوح، ص ۲۹۰۔

۳۷۔ ایپی گرافیا کرناٹیکا، جلد ہفتم، شموگا تعلق، کتبہ، ص ۶۸

## دیوگیری کی تیسری مہم

دوسرے سال ۱۳۱۲ء (۷۱۲-۱۱ھ) میں ملک کافور ایک بار پھر دکن پر فوج کشی کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ سلطان علاء الدین کا سب سے قدیم اور انتہائی وفادار حلیف رام دیو ۱۳۱۲ء میں کسی وقت انتقال کر چکا تھا اور اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا تھا۔ جب سے ترک دکن میں داخل ہوئے تھے سنگھانا ان کا جانی دشمن رہا تھا۔ ۱۲۹۲ء میں اس کے باپ کی توہین آمیز اطاعت کے بعد ایک اور بے عزتی ہوئی۔ اس کی منگیتر دیول رانی اس سے چھین لی گئی۔ زخموں پر اس طرح نمک چھڑکے جانے کے بعد سنگھانا کے دل میں عداوت کی آگ پھر سے بھڑک اٹھی۔ اگر عصامی پر اعتماد کیا جائے تو اس کی ناراضگی اتنی شدید تھی کہ ایک بار تو رام چندر کو بھی علاء الدین سے درخواست کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا کہ دہلی کی حکومت کی علانیہ مخالفت اختیار کرنے سے سنگھانا کو باز رکھنے میں اس کی مدد کرے۔[۳۸] اپنے باپ کی موت کے بعد ۱۳۱۲ء یا ۱۳۱۳ء میں سنگھانا تخت کا وارث بنا اور جیسی کہ توقع کی جا سکتی تھی اس نے سلطنت سے سارے تعلقات توڑ[۳۹] ڈالے اور آزادی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔

اسی اثنا میں تلنگانہ کے راجہ پرتاب رُدّر دیو نے جو یا تو بہت خوفزدہ تھا یا اپنے وعدے کا پکا تھا۔ علاء الدین کے لیے بیس ہاتھی اور ایک خط بھیجا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ وہ سالانہ خراج جس کا اس نے وعدہ کیا تھا، اس شخص کو ادا کرنے کے لیے تیار ہے جسے سلطان اس مقصد سے مقرر کرے۔ ملک نائب کافور نے جو فرشتہ کے مطابق ملکہ جہاں اور اس کے بیٹے خضر خاں سے خوفزدہ اور ان کا مخالف تھا اور دہلی سے دور چلا جانا چاہتا تھا سلطان سے درخواست کی کہ وہ اس کو خراج وصول کرنے کے لیے دکن بھیج دے۔ اس نے سرکش سنگھانا کو سزا دینے اور دکن کو باغی عناصر سے پاک کر دینے کا بھی وعدہ کیا۔[۴۰] علاء الدین نے یہ تجویز مان لی اور ملک نائب کو باغی یادو حکمراں کی سرکوبی کرنے کے لیے دیوگیری کا نظم و نسق چلانے کے لیے مقرر کر دیا۔[۴۱]

---

۳۸۔ فتوح ص ۲۷۴

۳۹۔ فرشتہ، ص ۱۲۲، نیز برنی ص، ۳۳۴
خسرو اس کے بارے میں کچھ نہیں بیان کرتے ہیں کیونکہ خزائن الفتوح ۷۱۱ھ میں مکمل ہو گئی تھی اور یہ واقعہ بعد میں ہوا۔

۴۰۔ فرشتہ، ص ۱۲۲

۴۱۔ فتوح، ص ۳۲۶

ایک بار پھر ملک کافور نے دکن پر فوج کشی کی اور دائیں بائیں جس حکمراں نے بھی سر اٹھایا اس کا سر کچل دیا۔ پہلے تو وہ دیوگیری گیا اور سنگھانا سے ایک سخت جنگ کی۔ بہادر مرہٹہ جو اپنی پوری زندگی میں دہلی کی فرمانروائی تسلیم کرنے کا مخالف رہا تھا حملہ کی شدت کی تاب نہ لاسکا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ عصامی کا بیان کہ راجہ نے لڑے بغیر دیوگیری کو خالی کر دیا تھا مشکوک معلوم ہوتا ہے کیونکہ پھر سنگھانا کے بارے میں جب تک ملک نائب دکن میں رہا کچھ نہیں سنا گیا۔ حتیٰ کہ ملک کافور کی دہلی کو واپسی کے بعد بھی دیوگیری کے راجہ کی حیثیت سے رام دیو کے داماد ہرپال دیو کا نام لیا جاتا ہے سنگھانا کا نہیں۔

یادو علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد ملک نائب نے تلنگانہ اور ہوئیسلا مملکتوں میں قریب اور دور کے بعض اور شہروں پر بھی حملہ کیا اور دکن کے لوگوں کے دلوں میں اس قدر دہشت بٹھا دی کہ دہلی حکومت کی رہی سہی مخالفت بھی ختم ہوگئی۔ ملک کافور نے دیوگیری واپس اسے پہلے سے اپنا صدر مقام قرار دیا۔ یہ اسی کی صلاحیت اور قوت کی بنا پر سلطان کی موت تک سلطنت کی طاقت اور اس کا وقار دکن میں ہمیشہ محسوس کیا جاتا رہا۔[۴۲] ملک نائب نے تلنگانہ اور کرناٹک کی سلطنتوں سے چند برسوں کا خراج دارالسلطنت بھیجا۔ وہ تقریباً ۱۳۱۴ء تک دکن میں رہا یہاں تک کہ علاء الدین نے جو سخت بیمار پڑ گیا تھا اس کو دہلی واپس بلا لیا۔[۴۳]

۴۲۔ ۷۱۵ھ (۱۶ - ۱۳۱۵ء) کا علاء الدین خلجی کا ایک کتبہ جو ضلع بجنور کے مری بہل تعلق میں واقع ملت وارد نامی ایک گاؤں میں پایا گیا ہے اسی قسم کی زبان اور خطابات سلطان کے لیے استعمال کرتا ہے جیسے کہ دہلی میں ہمعصر کتبات میں استعمال ہوتے تھے (آرکیالوجیکل سروے رپورٹ ۱۹۲۶-۲۷ء، ص ۱۹۰) یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت تک علاء الدین دیوگیری کا فرماں روائے مطلق تھا۔ وہ کتبہ اپی گرافی انڈو مسلکا میں ۱۹۲۶-۲۷ء، ص ۱۷-۱۸ میں شائع اور ترجمہ ہو چکا ہے۔

۴۳۔ برنی جنوب کی اس مہم کو بیان نہیں کرتا ہے لیکن علاء الدین کے آخری ایام کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب شہنشاہ بہت سخت بیمار پڑا تو اس نے دکن سے ملک نائب کو اور الپ خاں کو گجرات سے بلایا (ص ۳۶۹)۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ ۱۳۱۵-۱۳۱۴ء میں ملک کافور دکن میں تھا اور کچھ مدت پہلے ضرور وہاں گیا ہوگا۔ بہرکیف عصامی رام دیو کی موت، سنگھانا (جس کو وہ ہمیشہ بھلا کہتا ہے) کی سرکشی، اور دکن میں ملک کافور کے جانے کے اور وہاں دیوگیری کے نئے تخت نشین بادشاہ سمیت تمام باغی عناصر کی سرکوبی کے بارے میں لکھتا ہے۔ (فتوح ص ۲۸-۳۲۵) وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سلطان نے الپ خاں کی دختر سے شہزادہ شادی خاں کی شادی کے سلسلے میں جو کہ عہد علاء الدین کے آخری ایام کا ایک واقعہ تھا اپنے محبوب جنرل کو دہلی واپس بلا بھیجا تھا۔

**علائی مہموں کی کامیابی کے اسباب**

عارضی طور پر ملک کافور کے مختلف حملوں نے دکنی جزیرہ نما میں پرامن حالات کو تباہ کر دیا تھا۔ جنوب کی تمام ممتاز مملکتیں، یادو، کاکتیا، ہویسلا اور پانڈیہ۔ اس کے خوفناک حملوں کے سامنے گھٹنے ٹیک چکی تھیں۔ بے شمار دولت شمال کو لے جائی گئی تھی۔ اور ہندوؤں کے ان مقدس مقامات اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ان کو لوٹا گیا اور خاک میں ملا دیا گیا جن کو وہ صدیوں سے متبرک سمجھتے تھے۔ غالباً ملک کافور کو اپنی فوج کشی کے دوران سچ تو یہ ہے کہ کسی جگہ سخت مزاحمت کا سامنا نہیں ہوا۔

دکن میں شاہی فوج کی کامیابی کے اسباب کو کہیں دور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیوگیری، تلنگانہ، ہویسلا اور پانڈیہ کی جنوبی مملکتیں شمال کی راجپوت ریاستوں کی طرح ایک دوسرے سے مسلسل برسرِ پیکار رہتی تھیں۔[۴۴] جب ۱۲۹۶ء میں علاءالدین نے دیوگیری پر فوج کشی کی تو سنگھانا دیو اپنی افواج کے ساتھ ہویسلا حدود کی سمت گیا ہوا تھا؛ جب کافور نے ہویسلا سلطنت کے خلاف پیش قدمی کی تو اس کا راجہ بلال دیو انتہائی جنوب میں پانڈیہ مملکت کے کسی حصے پر قبضہ کرنے کی غرض سے غیر حاضر تھا۔ اور دونوں شہزادے سندر پانڈیہ اور ویر پانڈیہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ایک غیر ملکی حملہ آور کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کرنے اور مدد کرنے کے بجائے انھوں نے اپنے ہی پڑوسیوں کے خلاف حملہ آوروں کی مدد کی۔ چنانچہ رام چندر نے تلنگانہ کی فتح میں ملک کافور کی مدد کی اور ویر بلال نے آگے جنوب میں معبر میں شاہی فوج کی رہبری کی۔ سندر پانڈیہ نے تو اپنے سوتیلے بھائی کے خلاف ملک کافور سے مدد چاہی اور اپنے ہی دیس کے باسیوں کے لیے ناقابلِ بیان مصیبت و تکلیف کا سبب بنا۔[۴۵]

جنوبی حکمرانوں کی شکست پوری طرح صرف ان کی نااتفاقی کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ علاءالدین کی فوج اس کی مختلف فوجی اصلاحات کی بنا پر مستعد، ساز و سامان سے لیس اور منظم تھی۔ اس کے گھوڑسواروں کی برق رفتاری مثالی تھی اس نے دیوگیری اور دہلی کے درمیان کی مسافت تقریباً معدوم کر دی تھی اور اس کی شہسوار فوج پوری طرح مطمئن رکھی جاتی تھی۔ سلطان نے ملک نائب کو کئی بار

---

۴۴۔ نیز ملاحظہ ہو اعجازِ خسروی، جلد اول، ص ۸، جلد دوم، ص ۱۲۵

۴۵۔ اس تصویر میں صرف ایک روشن پہلو ہے کہ جب بلال دیو ملک کافور سے برسرِ پیکار تھا تو پانڈیہ حکمراں ویر نے بلال دیو کی فوجوں کو کمک پہونچانے کے لیے ایک دستہ بھیجا تھا۔

ہدایت کی تھی کہ ایک دور دراز اور نامانوس علاقے میں وہ اپنے سپاہیوں کے لیے فیاض اور نرم دل رہے۔ ترک سخت جنگجو تھے اور ان میں مذہبی جوشش اور مالِ غنیمت کے حرص کی آمیزش تھی۔ تربیت، فوجی حکمت عملی اور حربی تدابیر کے لحاظ سے شمالی افواج جنوبی فوجوں سے کہیں بہتر تھیں۔ جسمانی طاقت کے اعتبار سے بھی جنوب کے سپاہی شمال کے سپاہیوں کے مدِمقابل نہیں تھے۔ مارکوپولو بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں جنوبی ہند کے سپاہیوں کے خراب معیار کی گواہی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس علاقہ کے لوگ میدانِ جنگ میں بالکل برہنہ جاتے ہیں۔ ان کے پاس صرف ایک نیزہ اور ایک ڈھال ہوتی ہے اور وہ انتہائی نکمے سپاہی ہیں۔۔۔۔" سیاح مزید کہتا ہے کہ وہ زیادہ تر سبزی خور تھے، چاول کھاتے تھے اور بہت ہی قدامت پرست لوگ تھے۔ وہ جنگجوئی سے زیادہ پابندی سے اشنان کرتے اور چھوت چھات کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔[۴۶] جنوب کے سپاہیوں کے اس تجزیہ کو بہت سخت کہا جا سکتا ہے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ان افواج کے ساتھ کامیابی سے نہیں لڑ سکے جنھوں نے منگولوں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔[۴۷] مزید برآں علاءالدین وندھیاچل کے پرے دور دراز علاقے کا الحاق کبھی مقصود نہیں تھا۔ اس کے لیے جنوبی مہموں کا مقصود حصولِ دولت تھا۔ اس کی برق رفتار افواج جنوبی سلطنتوں پر باز کی طرح جھپٹیں، ان کی دولت ان سے چھینی اور فاتحانہ واپس آگئیں۔

**دکن کی فتح کی اہمیت**

حالات کا یہ بڑا عجیب اتفاق رہا ہے کہ بہت سے جنرلوں اور حکمرانوں کے لیے دکن ایک موثر آغاز کار ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔ علاءالدین، مہابت خان، شاہ جہاں اور اورنگ زیب سب نے دکن ہی میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی طرح جنوب میں کافور کی مہموں نے سلطنت کے عہد کی تاریخ میں اس کا نام زندۂ جاوید کر دیا۔ وصاف کا یہ بیان مبالغہ آمیز نہیں۔ دکن میں کافور کے شاندار کارناموں نے ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات ماند کر دیں۔[۴۸] سچ تو یہ ہے کہ جنوب میں کافور کی مہموں کے پیچھے وہی مقاصد کارفرما تھے جو شمال میں محمود کے مقاصد تھے۔ ہر چیز سے زیادہ دکن کی کثیر دولت نے اس کو وندھیاچل کے

---

۴۶۔ یول، سیر مارکوپولو، جلد دوم، ص ۲۷ ۔ ۳۲۶

۴۷۔ فتوح، ص ۲۷۵

۴۸۔ وصاف، ص ۲۵۷

پرے کی سلطنت پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ جب وہ ساری دولت جو ممکنہ طور پر دکن میں موجود تھی حاصل کر لی گئی تو سلطنت دہلی سے سلطنتوں کے الحاق کی یا اس کے لیے مئے مصائب کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں باقی رہی تھی۔ راجپوتانہ میں مسلسل اور بار بار کی جنگوں نے ایک توسیع پسندانہ حکمت عملی کے نقصانات علاء الدین کے ذہن نشین کرا دیے تھے۔ وہ راجپوتانہ میں کی گئی اپنی غلطیوں کو دکن میں دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ مزید برآں جنوب کی فتح کبھی مکمل نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوگیری وارنگل، دوار سمدر اور معبر کی دولت لوٹ لی گئی یا صلحناموں کی شرائط کے ذریعہ حاصل کی گئی تاہم نہ تو سنگھانا، نہ ہی پرتاپ ردّر دیو نے مکمل شکست تسلیم کی۔ سنگھانا نے پھر سے آزادی حاصل کرنے کی مسلسل کوششیں کیں اور اس میں شبہ ہے کہ وارنگل کا قلعہ کبھی مطیع ہوا تھا۔ بلاشبہ ہویسلا حکمراں نے پوری طرح شکست کھائی، اور اس نے اپنا مقدس دھاگہ (زنّار) بچانے کے لیے اپنا خزانہ حوالے کر دیا تھا۔ ویرپانڈیہ نے کافور کے ساتھ جم کر لڑنے سے ہمیشہ گریز کیا تھا اور ملک کافور نے پانڈیہ علاقے کو تاراج تو کر دیا مگر اس کو وہاں کے راجہ کو شکست دینے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ ان حالات میں ان سلطنتوں کا الحاق دہلی سلطنت کے محض ذمہ داری کا ایک بوجھ ثابت ہوتا۔ مزید برآں محمد تغلق کی مشکلات بصراحت ظاہر کرتی ہیں کہ دکن کا الحاق خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لیکن علاء الدین کی تمنّا الحاق کے بغیر ہی پوری ہو گئی۔ رام چندر نے بلال دیو جیسے بڑے راجہ دہلی آئے، وہ شہنشاہ کی خدمت میں بذات خود تسلیم بجا لائے، ان کے خزانے چھین لیے گئے، سلطنت کے وقار میں اضافہ ہوا اور دکن کی دولت سے مملکت کا خزانہ بھر گیا۔

اس کے باوجود دکن میں ملک کافور کی کامیابی عارضی تھی۔ ملک کافور کی یادو سلطنت پر تیسرا حملہ، تلنگانہ اور کرناٹک جیسی دوسری مملکتوں کے بہت سے شہروں میں اس کے حملے اور دیوگیری میں اس کا اپنا صدر مقام بنانا وضاحت سے بتاتے ہیں کہ جوں ہی شمال کی فاتح افواج شمال کے شکست خوردہ سلطنتوں سے اپنی طرف پیٹھ پھیرتے تھے۔ یہ مملکتیں سلطنت کی طرف کھلم کھلا بغاوت کا نہ سہی مگر بے اعتنائی کا رویّہ اختیار کر لیتی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ علاء الدین کے عہد کے اواخر میں جب ملک کافور کو دہلی طلب کر لیا گیا تو دکن ایک بار پھر بغاوت و سرکشی سے ابل رہا تھا اور مبارک خلجی اور محمد تغلق کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ایک بار پھر

جنوبی ہند کو فتح کریں۔

**علاء الدین کی سلطنت کی حد**

بہتر ہوگا کہ اس باب کو علاء الدین کی سلطنت کے جائزے پر ختم کیا جائے۔ شمال مغرب میں اندازاً دریائے سندھ پر ہندوستانی سلطنت کی سرحد سمجھی جاسکتی ہے۔ دریائے سندھ کے اس پار کا علاقہ منگولوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ہمیشہ نزاعی رہا[49] اگرچہ ۱۳۰۶ء کے بعد کابل اور غزنین تک کس علاقے میں علاء الدین کا اقتدار اچھی طرح مستحکم ہوگیا تھا۔ دیپالپور غازی ملک کی نگہداشت میں تھا ملتان اور سیوستان پہلے ظفر خان اور پھر ملک کافور کے زیر حکومت رہے۔ شمالی ہند میں وہ پورا علاقہ جو اب پنجاب، سندھ اور اتر پردیش پر مشتمل ہے براہ راست مرکزی حکومت کے زیر انتظام تھا۔ راجپوتانہ کی مختلف ریاستیں پورے طور پر کبھی مفتوح نہیں ہوسکیں اس لیے بہ آسانی ان کی درجہ بندی باجگذار سلطنتوں کے تحت کی جاسکتی ہے[50] مشرق میں ترک سلطنت دارالسی (بنارس) اور اودھ (دریائے سرجو پر ایودھیا) سے پرے پھیلی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ بہار اور بنگال پر بالترتیب ہرسمہا اور شمس الدین فیروز کی حکومت تھی یہ دونوں دہلی سلطنت سے آزاد تھے[51]۔ وہ علاقے جو اب اڑیسہ اور مشرق کی ریاستوں پر مشتمل ہیں ان تک علاءالدین یا اس کے پیشروؤں کی مسلم افواج نہیں پہونچی تھیں۔ وسطی ہند کا بیشتر حصہ اہم مقامات سمیت مثلاً چندیری دھار، ایلچ پور، اجین اور مانڈو براہ راست گورنروں کے زیر اقتدار تھا جن کو مرکزی حکومت مقرر کرتی تھی۔ گجرات سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور علاء الدین کے آخری زمانے تک اس پر

---

۴۹۔ ملاحظہ ہو باب نہم

۵۰۔ برنی (ص ۳۲۳) کہتا ہے کہ:

"رنتھنبور و چتور و مندل کیر و دھار و اجین و مندو و کھر و علاپور و چندیری و ایرج و سوانہ و جالور کہ از بلاد مضبوط خارج بودند در ضبط ولات و مقطعان درآمد۔"

(رنتھنبور، چتوڑ، منڈل کیر (چتوڑ میں منڈل گڑھ)، دھار، اجین، مانڈو، کھر و اور علاپور، چندیری اور ایرج سوانہ اور جالور جو شہر کہ آزاد اور مضبوط تھے وہ اقطاع داروں اور گورنروں کے زیر انتظام لائے گئے (بظاہر وہ ہندو اور مسلم دونوں تھے)۔

۵۱۔ ملاحظہ ہو باب پنجم۔

الپ خان نے بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ؔ یادو، ہوسیلا اور کاکیتا سلطنتیں باجگذار تھیں۔ ان پر مسلم گورنر حکومت نہیں کرتے تھے بجز دوگیری کے جزوی استثناء کے جہاں کچھ مدت کے لیے ملک کافور نے اپنا صدر مقام قائم کیا تھا۔ دوار سمدر کے پرے ملک کافور کوئی غارت گری کی مہم نہیں لے گیا۔ پانڈیہ حکمرانوں نے کبھی مسلم فرماں روائی تسلیم نہیں کی اور نہ کبھی خراج ادا کیا۔

## باب 15

# علاء الدین کے آخری ایام

ان مختلف اقدامات کے باوجود جو سلطان نے اپنی مملکت کے استحکام کے لیے کیے تھے اور ان شاندار فتوحات کے باوجود جو ملک کافور جنوب میں ۱۳۱۱ء تک حاصل کرتا رہا۔ علاء الدین کی حکومت رفتہ رفتہ اپنی طاقت اور استحکام کھو رہی تھی۔ جوں جوں سلطان کی صحت بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ خراب ہوتی جا رہی تھی اقتدار کو اپنے ہی ہاتھوں میں مرکوز کرنے کا اس کا شدید جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اورنگ زیب کی طرح علاء الدین اپنے بڑھاپے میں نہ مشورہ سنتا نہ کسی مخالفت کو برداشت کرتا۔ اپنے ابتدائی برسوں کے برعکس کہ جب علاء الملک، نصرت خان اور الغ خان جیسے اس کے قابل مشیر تھے۔ اب اس کے عہد حکومت کے اختتام پر صرف خوشامدی اور چاپلوس اس کے اردگرد رہ گئے تھے۔ مزید برآں وہ انتہائی تنک مزاج اور شکی ہو گیا تھا۔ اس لیے کچھ حیرت انگیز نہیں کہ اس کے آخری ایام میں نومسلموں کا نفرت آمیز قتل عام ہوا۔ جاگیروں کی خالصہ زمینوں میں تبدیلی نے پہلے ہی بہت سے منگولوں کو مفلوک الحال بنا دیا تھا۔ بعض نومسلم سابق سپاہیوں نے بڑے افسروں اور امرا کے یہاں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن ان کی اکثریت بے روزگار ہو کر رہ گئی تھی۔ ان آزردہ خاطر لوگوں نے سلطان پر رعیت پر مظالم ڈھانے زبردستی جائداد چھین لینے، شراب بندی مسلط کرنے اور مختلف قسم کے بھاری محاصل جاری کرنے کا الزام لگایا۔[1] ملک کافور کی معبر کی مہم کے بعد اباجی مغل کے قتل پر بھی انھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ فوج کے نومسلموں کی مدد اور عام

---

۱۔ فتوح، ص ۲۹۱

لوگوں کی پسندیدگی پر جو کہ سلطان کے ظلم سے نجات پا جائیں گے۔ بھروسہ کرکے انھوں نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی۔ سازش کا بھید کھل گیا اور سلطان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ حکم صادر ہوا کہ ایک خاص دن تمام منگولوں کو وہ جہاں بھی پائے جائیں قتل کر دیا جائے اور "ان کے بیوی بچوں کو ان کے قاتلوں کے سپرد کر دیا جائے"[2] احکامات پر لفظ بہ لفظ عمل کیا گیا اور تقریباً تیس ہزار منگول جن میں سے بیشتر سازش کا علم تک نہیں رکھتے تھے۔ بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔[3] اگرچہ یہ سب کچھ بے سبب نہیں ہوا۔ تاہم نومسلموں کو بھیانک ہیبت کے ساتھ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ کوئی بات اس وحشیانہ طریقے کا جواز نہیں فراہم کر سکتی جس طریقے سے ان کا پورا طبقہ کیا معصوم اور کیا مجرم نیست و نابود کر دیا گیا۔

ایک طرف تو ایسی ظلم پسندی اور دوسری طرف اپنے محبوبوں کے ساتھ اس کے شرمناک تعلق نے سلطان کے وقار کو سخت نقصان پہونچایا۔ خواجہ سرا کافور کو اس کے عشق نے سلطنت میں سب سے زیادہ طاقتور بنا دیا تھا اور جوں جوں بادشاہ کی صحت تیزی سے گرتی گئی اس شخص نے اپنے خود غرضانہ مفادات پورے کرنے کے لیے بیشمار جرائم کا ارتکاب کیا۔ ملک حمید الدین اور ملک اعز الدین کے عہدے سے برطرفی اور شرف قاینی کی شہادت کے ساتھ دیوان وزارت، دیوان رسالت اور دیوان انشاء کے عہدے بالکل تباہ ہو گئے۔[4] قابل افسروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ نالائق کلرک اور فرومایہ خوشامدیوں نے ان قابل احترام منصبوں کو جن پر وہ مقرر کیے گئے رسوا کر دیا۔[5] بہاء الدین جیسے ایک کمزور طبیعت شخص کو عمدۃ الملک بنا دیا گیا۔[6] اگرچہ امیر شکار ملک قیران اور ملک قرا بیگ کو تھوڑی بہت عزت حاصل تھی مگر وہ نہ تو اہم منصبوں پر فائز تھے اور نہ دربار میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ سلطان نے جب تمام اقتدار اپنے ہی ہاتھوں میں مرکوز کر لیا تھا تو کسی دانشمند کو اتنی اجازت نہیں تھی کہ وہ پیچیدہ مسائل پر رائے ظاہر کر سکے۔ ابتدائی زمانے میں امراء کی سرکوبی نے سلطان کے کام میں آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

۲۔ برنی، ص ۳۲۵

۳۔ ایضاً، ص ۳۲۶۔۳۳۵

۴۔ یہ منگولوں کی دی ہوئی تعداد ہے۔ فرشتہ، ص ۱۲۱، میں ۱۴ سے ۱۵ ہزار ہے۔

۵۔ عصامی، فتوح السلاطین، ص ۳۲۷

۶۔ ایضاً، ص ۳۲۷

جب تک علاء الدین کی صحت بہت اچھی رہی آس کی چوکس آنکھیں اور آہنی پنجہ مملکت کی کشتی اچھی طرح کھیتے رہے ۔ لیکن جوں ہی اُس کی صحت گرنی شروع ہوئی چاروں طرف سے مشکلات اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ امراء کا ایک کمزور طبقہ نہ تو کافور کے مظالم کا سدِ باب کر سکتا تھا نہ وہ نظم و نسق کو وقار بخش سکتا یا اس میں نئی روح پھونک سکتا تھا اور سیاسی افق پر ایک المناک تباہی کا خطرہ خوفناک نظر آنے لگا ۔

**خضر خان اور شادی خاں کی شادیاں** شاہی خاندان کے شہزادوں کی شادیوں کے بعد حکومت کا انحطاط اور بھی تیز ہو گیا ۔ ۱۳۱۲ء میں شمس الحق ملقب بہ خضر خان ، بادشاہ کے فرزند اکبر کی شادی گورنر گجرات اور ملکہ جہاں کے بھائی الپ خاں کی دختر سے ہوئی ۔ خضر خان اس شادی سے کبھی خوش نہیں رہا ۔ وہ گجرات کے رائے کرن کی بیٹی دیول رانی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا ۔ وہ عجیب و غریب حالات جن میں اس کی گرفتاری دکن میں عمل میں آئی تھی پہلے بیان کیے جا چکے ہیں ۔ تب سے وہ اپنی ماں کملا دیوی کے ساتھ شاہی محل میں رہی تھی جہاں خضر خان اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ۔ یہ بات جلد ہی ظاہر ہو گئی ۔ مگر چونکہ ماہرو جو علاء الدین کی جوانی کے زمانے کی محبوبہ تھی اور وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کرنا چاہتی تھی اس لیے دونوں کو الگ کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ۔ دیول رانی کو اس کی سہیلیوں کے ساتھ قصر لعل میں بھیج دیا گیا ۔ حیا و شرم کی وجہ سے خضر خاں خاموش رہا احتجاج میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور ملکہ جہاں نے زبردست تیاریوں اور سلطنت کے دور دراز علاقوں سے راجاؤں اور گورنروں کو مدعو کرنے کے بعد اپنے فرزند اکبر کی شادی الپ خاں کی بیٹی سے ۴ فروری ۱۳۱۲ء (۲۳ رمضان ۷۱۱ھ) کو کر دی ۔

بہر کیف خضر خاں اپنی محبت نہیں بھول سکا ۔ وہ اپنی بیوی سے الگ تھلگ اور خفیہ طریقہ سے دیول رانی سے ملتا رہتا تھا ۔ اس کی صحت گرنے لگی اور ماہرو کو اس کے بارے میں فکر

۷ ۔ خسرو کے مطابق گجرات کے پہلے حملہ کے وقت ۱۲۹۹ء میں دیول رانی صرف چھ ماہ کی تھی ۔ (دیول رانی ، ص ، ۱۸۸) ایک دوسری جگہ وہ اس بیان کی یہ کہہ کر توثیق کرتے ہیں کہ وہ جب ۱۳۰۷ء میں گرفتار ہوئی تو آٹھ سال کی تھی ۔ (ص ۲۰۹) فرشتہ کے مطابق ۱۲۹۹ء میں جب وہ اپنی ماں سے بچھڑ گئی تھی ، تو چار سال کی تھی (فرشتہ ص ۱۰۱ - ۱۱۲) معاصر امیر خسرو کے مقابلے میں فرشتہ کا بیان قبول کرنے کی وجہ نہیں ہے ۔

۸ ۔ عصامی کے مطابق دیوگیری کے رام دیو کو اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا ۔ فتوح ص ، ۳۱۶ ۔

ہوئی تو اس نے یہ بات مناسب خیال نہیں کی اپنے بھائی کی بیٹی کی خاطر اپنے بیٹے کی زندگی خطرہ میں ڈال دے۔ لہٰذا ملکہ جہاں نے خضر خان کی دیول رانی سے شادی کرنے کی اجازت علاء الدین سے حاصل کرلی۔

اسی زمانے میں دیوگیری کے رام دیو کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بیٹے نے جس نے سلطنت کے سامنے کبھی سرِ تسلیم خم نہیں کیا تھا مخالفانہ روش اختیار کرلی۔ باغی کی سرکوبی کے لیے ملک نائب کافور کو بھیجا گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں الپ خاں اور ملکہ جہاں نے دربار میں غلبہ حاصل کرلیا۔ ماہرو نے اپنے دوسرے بیٹے شادی خان کی اپنے بھائی کی دوسری بیٹی سے شادی کرنے کے انتظامات شروع کردیے۔ بادشاہ کی صحت دگرگوں تھی لیکن ملکہ جہاں شادی کی تقریبات انجام دینے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ اس نے دور دراز کے صوبوں کے امرا اور گورنروں کو دعوت نامے بھیجے۔ ملک کافور بھی راجدھانی آیا جہاں شہزادہ شادی خاں کی الپ خاں کی بیٹی سے بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اسی موقع پر دیول دیوی کی بھی شادی خضر خاں سے اور اس کی اذیت ناک جدائی کے دن ختم ہوگئے۔ یہ شادیاں ۱۳۱۲ء میں کسی وقت انجام پذیر ہوئیں۔

اسی اثنا میں سلطان کی صحت خراب سے خراب تر ہوگئی۔ اس کی زندگی کے آخری تین برس تلخی اور کرب سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کا ناقابلِ تسخیر حوصلہ اور ناموری کے لیے اس کا شدید جذبہ سخت اور مشقت طلب کام کا متقاضی تھا۔ اس پر طرہ اس کی بے قاعدہ عادتیں تھیں۔ اس سب کا اس کی جسمانی طاقت پر شدید اثر پڑا۔ لہٰذا یہ فطری بات تھی کہ نظم و نسق پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس کے کاسہ لیس ایک طرف نا اہل اور باصلاحیت لوگ دوسری طرف عداوت کے جذبات کو دل میں جگہ دینے لگے۔ الپ خاں اور کافور ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ تمام ظاہری اعتبارات سے الپ خاں غلبہ حاصل کرنے جا رہا تھا۔ اس نے مختلف مواقع پر اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے گزشتہ پندرہ سال تک صوبۂ گجرات کا نظم و نسق چلایا تھا اور وہاں عوام میں بہت مقبول تھا۔ وہ سلطنت کی ملکۂ خاص کا حقیقی بھائی تھا اور سلطان کا بھی محبوب تھا۔ شاہی خاندان کے دو شہزادے اس کے داماد تھے جن میں سے بڑے کو سلطان نے تخت کا ولی عہد مقرر کردیا تھا۔ سلطان نے اپنی موت کے بعد خضر خان کی تخت نشینی کو حتمی بنانے کے لیے مملکت کے تمام امرا سے تحریری وعدے حاصل کرلیے تھے[9]۔ اس طرح راجدھانی

---

۹۔ ... برنی، ص ۶۸-۳۶۷؛ "خضر خان را ولیعہد خود گردانید و عہد نامہ نویسانید و دستخط از ان کل ملوک درآں ستد"
(باقی آئندہ صفحہ پر)

میں الپ خاں کی حیثیت بہت مضبوط تھی ۔ چنانچہ ملک نائب کافور جو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا فطری طور پر اس صورت حال پر بہت مضطرب ہوا[9] ۱۲۹۹ء میں گجرات کے حملہ میں گرفتار ہو کر آنے کے بعد وہ ہمیشہ سلطان کی محبت اور اعتماد سے متمتع ہوتا اور ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ پر ترقی کرتا رہا تھا یہاں تک کہ وہ نائب سلطان بن گیا ۔ اس نے ان افواج کی قیادت کی تھی جو ۱۳۰۶ء اور ۱۳۱۲ء کے درمیان کئی بار دکن گئی تھیں ۔ اس کے کارنامے اتنے شاندار تھے کہ علاءالدین نے اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے دکن کا وائسرائے مقرر کر دیا اور اس کا صدر مقام دیوگیری قرار پایا[10] شاہی خاندان کے شہزادوں کی شادی کے موقعہ پر اس کو دہلی بلایا گیا تھا جہاں اس نے شاہ کی چہیتی ملکہ، اس کے بھائی الپ خاں اور شہزادہ خضر خاں کا زبردست غلبہ پایا ۔ کافور جیسے ہوشیار آدمی نے جو آخری دنوں میں بادشاہ کا روح رواں بن گیا تھا یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگائی کہ اگر اس نے اس وقت میں کچھ نہ کیا تو سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا ۔

**الپ خاں کا قتل** بادشاہ کی بیماری روز افزوں خطرناک ہوتی جا رہی تھی ۔ وہ استسقا اور دوسرے جسمانی امراض میں مبتلا تھا[11] اپنی بیماری نیز ذہنی ناتوانی کے سبب جو بڑھتی عمر کے تقاضے ہوتے ہیں وہ تنک مزاج اور شکی ہو گیا تھا جب ملک نائب دکن سے لوٹا تو سلطان نے اپنی تکلیفوں کی کہانی سنائی کہ ملکۂ جہاں اور خضر خان نے اس کو نظر انداز کر رکھا ہے ۔ بیمار بادشاہ نے شکایت کی کہ ملکہ ہمیشہ شادیوں اور حرم کی دوسری تقریبات میں منہمک رہتی ہے اور خضر خاں اپنی انتہائی محبوب دیول رانی کو حاصل کرنے کے بعد موسیقی اور تفریح میں کھویا رہتا ہے اور بادشاہ یا دربار کے بارے میں بہت کم پرواہ کرتا ہے ۔ ملک کافور کے لیے جو اتنا کینہ توز تھا جتنا کہ با صلاحیت یہ ایک سنہری موقع تھا کہ ان سب کے خلاف جن کو وہ اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا سلطان کے کان بھرے ۔ ایک دن جب کافور علاءالدین کے پاس خلوت میں تھا اس نے اپنے مبینہ دشمنوں کے خلاف

(باقی صفحہ گزشتہ) (سلطان نے خضر خاں کو اپنی سلطنت کا ولی عہد مقرر کیا اور جانشینی کا عہد نامہ لکھا گیا اور تمام امیروں کے دستخط اس پر لیے گئے) ۔

۱۰۔ ملاحظہ ہو چودھواں باب

۱۱۔ برنی کے مطابق علاءالدین استسقا میں مبتلا تھا اور خسرو کے مطابق بخار میں ۔ فرشتہ بہر کیف یہ کہتا ہے کہ سلطان اپنی جنسی عادت کی زیادتی کی بنا پر ایک بہت خطرناک مرض میں مبتلا ہو گیا تھا (ص ۱۲۲) ۔ یہ ممکن ہے کہ وہ کافی دنوں سے استسقا میں مبتلا ہو ۔ جب وہ مرنے کے قریب ہو گیا تو اس کو بخار بھی آ گیا تھا ۔ یہ بالکل فطری ہے ۔

بڑی تلخی سے شکایت کی اور کہا کہ وہ محض اس لیے اس کی زندگی کے خواہاں ہو گئے ہیں کہ اس پر سلطان کی نظر کرم ہے۔ ان کو صرف سلطان کی موت کا انتظار ہے اور وہ اس کے بعد اس کو جان سے مار دیں گے۔ چونکہ علاءالدین کافور کی بات غور سے سن رہا تھا لہٰذا اس نے اپنی زہریلی تقریر جاری رکھی اور الپ خاں کو تمام مصیبتوں کی جڑ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ الپ خان کا ملکہ اور شہزادوں پر اثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ گجرات میں اپنے اقطاع میں واپس جانے میں تامل کر رہا ہے۔ اسے صرف اس کا انتظار ہے کہ سلطان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوتے ہی وہ پورے اقتدار کو غصب کرے۔ کافور نے بات پوری کرتے ہوئے کہا کہ الپ خاں کو قتل کر دیا جائے تو شہزادوں کی جانب سے اس کو کوئی خوف نہیں رہے گا۔[12] عصامی کہتا ہے کہ کافور پر مہربان ہونے کے باوجود سلطان نے اپنے وفادار گورنر کے خلاف لگائے ہوئے غلط الزامات کو سننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے اس کی جانب سے کوئی ایسا شبہ نہیں ہے۔[13] لیکن ملک کافور جانتا تھا کہ الپ خاں سے کس طرح چھٹکارا پایا جائے۔ بادشاہ بستر سے لگا ہوا تھا اور حرکت کرنے تک سے معذور تھا۔ ایک دن جب الپ خاں شاہی محل میں داخل ہوا تھا ملک نائب اور ملک کافور کمال الدین گرگ نے اس کو پکڑ کر بے دردی سے مار ڈالا۔[14]

**ملک کافور کی بالادستی** الپ خان کی موت نے ملک کافور کی مسلمہ بالادستی کا راستہ صاف کر دیا۔ اس کی حیثیت اس سے پہلے بھی نہایت مستحکم تھی۔ سلطان اب سخت بیمار تھا اور ملک نائب خود سلطان کے نام پر مملکت کا سارا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس کے کنبے کا دوسرا شکار شہزادہ خضر خاں ہوا۔ سلطان کی دگرگوں حالت نے محل میں ہر شخص کو مضطر کر دیا تھا۔ مناسب اور باقاعدہ علاج کے باوجود اس کی حالت میں بہتری کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ اس کی بحالی صحت کے لیے جوش اور ولولے کے ساتھ دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ اس کے چاہنے والے بیٹے خضر خاں نے منت مانی کہ جب اس کا باپ اپنی بیماری سے رو بصحت ہو جائے گا تو وہ

---

۱۲۔ فتوح، ص، ۳۰-۳۲۹

۱۳۔ ایضاً، ص، ۳۳۰

۱۴۔ فتوح، ص ۳۳۱؛ تاریخ مبارک شاہی ص، ۸۰

د ملک نائب نے الپ خاں کے بھائی ملک نظام الدین الغ خاں کو جو جالور کا گورنر تھا ختم کرنے کے لیے ملک کمال الدین گرگ کو وہاں بھیجا تھا۔ (فرشتہ، ص ۱۲۳)

ہستناپور کے بزرگوں کی خانقاہوں کی زیارت کو پیدل جائے گا حیرت انگیز طور پر علاء الدین میں بحالی کے کچھ آثار نظر آئے تو شہزادہ اپنے وعدے کو ایفا کرنے کے لیے رقاصوں اور موسیقاروں کے ایک گروہ کے ساتھ شادان و فرحاں پیدل ہستناپور گیا۔ ملک کافور نے جو کسی موقع کی تلاش میں تھا کینہ توزی سے شہزادہ کے ارادوں کو غلط معنی پہنائے۔ بادشاہ سے کہا کہ جب وہ بستر علالت پر دراز تھا خضر خاں تفریحی سفروں پر جاتا رہا۔[15] اس نے بادشاہ کے نام سے فوراً ایک فرمان لکھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ چونکہ خضر خاں کو اپنے ماموں اور خسر کی موت پر یقیناً رنج پہونچا ہوگا لہٰذا اس کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ وہ راجدھانی لوٹنے کے بجائے شکار کے لیے چلا جائے۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ خضر خاں امروہہ چلا جائے اور اس وقت تک دہلی نہ آئے جب تک کہ اس کو طلب نہ کیا جائے۔ اس دوران وہ بادشاہت کے تمام لوازمات چتر اور دورباش بلاتاخیر بھیج دے جو اس کو بعد میں واپس کر دیے جائیں گے۔[16]

جب شاہی حکم خضر خان کو پہونچا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ غمزدہ دل سے اس نے بادشاہ کے تمام لوازم ملک حسام الدین کے حوالے کیے اور خود امروہہ کا رخ کیا۔ اس کے ذہن کو سکون نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس سے اس قدر کیوں خفا ہو گیا ہے۔ اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دہلی واپس جائے اور باپ کے قدموں میں گر پڑے۔ شاعر مورخ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ راجدھانی پہونچنے کے لیے اس نے رات دن سفر کیا اور اپنی آمد پر اس نے اپنے باپ سے معافی مانگی۔ علاء الدین اپنے بیٹے کو اپنے قریب پاکر بہت خوش ہوا۔ اس کو اس نے گلے سے لگا لیا اور اس کی تمام خطائیں معاف کر دیں۔ شمس الحق شاہی حرم میں گیا، اپنے اعزہ سے ملا اور اپنی تمام گزشتہ تکالیف بھول گیا۔

خضر خاں کی تربیت آغوش محبت میں ہوئی تھی ادبار کی گود میں نہیں۔ نازو نعم میں پلے ہونے

---

۱۵۔ دیول رانی، ص ۲۷ – ۲۳۲

۱۶۔ دیول رانی، ص ۲۳۲۔ شیخ نظام الدین اولیا کے ایک انتہائی معتقد مرید امیر خسرو کے نزدیک خضر خاں پر یہ سب مصیبت اس لیے آئی تھی کہ ہستناپور جانے سے قبل وہ شیخ کی خدمت میں آداب بجالانے میں ناکام رہا تھا۔ ابن بطوطہ کے مطابق خضر خاں نے الپ خاں کے قتل پر جو بادشاہ کے حکم سے کیا گیا تھا اپنی ناراضگی کھلم کھلا ظاہر کی تھی۔ علاء الدین نے خضر خاں کے رویے کو پسند نہیں کیا اور اس کو گوالیار بھیج دیا گیا۔ ابن بطوطہ جلد سوم، ص ۱۸۸

کی وجہ سے وہ موروثی شاہزادوں کی پُر آسائش حفاظت کے اطمینان پر مگن تھا۔ قدرتی طور پر وہ ملک کافور کی ریشہ دوانیوں کو نہیں سمجھ سکا۔ ملک نائب اپنی طرف سے یہ تہیّہ کیے بیٹھا تھا کہ وہ اقتدار کے تمام ممکن حریفوں سے اپنا راستہ صاف کرے۔ ایک بار پھر اس نے شہزادے کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ اس نے شہزادہ پر الزام لگایا تھا کہ وہ امروہہ سے بلا طلب اس ارادہ سے واپس آیا ہے کہ ملکہ جہاں کے ساتھ مل کر تخت حاصل کرنے کی سازش کرے۔ علاء الدین کبھی موقع نہیں دیتا تھا کہ کوئی شخص اس کو نصیحت کرے اور سزا سے بچ جائے اب بڑھاپے اور بیماری کی کمزوری کی بنا پر اپنے محبوب وزیر ہزار دیناری کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کو یقین دلا دیا گیا کہ شہزادہ حرم میں سارا وقت برباد کرتا ہے۔ اور اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کی پرواہ نہیں کرتا۔ ملک کافور نے سلطان سے ایک فرمان حاصل کر لیا جس کی رو سے تخت پر خضر خاں کے تمام حقوق سلب کر لیے گئے اور اس کو قلعۂ گوالیار میں قید کرنے کے لیے بھیج دیا گیا [۱۶] اگر امیر خسرو پر اعتماد کیا جائے تو بے بس بادشاہ اپنے بیٹے کو الوداع کہتے وقت بری طرح رو پڑا۔ اور کہا کہ قسمت اس کو شہزادے رہی ہے بادشاہت نہیں۔[۱۷] ایسا کس قدر قابل رحم ہے کرتوت و عمل کا یہ شخص اپنے بڑھاپے میں کس قدر تقدیر پسند ہو گیا تھا اور کیونکر اس کے کثر عدل و انصاف کی جگہ ان چیزوں نے لے لی تھی جو ہر اعتبار سے غلط تھیں۔ کافور سے بار بار یقین دہانیاں حاصل کرنے کے بعد کہ شہزادہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ علاء الدین نے اپنے بیٹے کو خدا حافظ کہا۔ خضر خاں حکومت کے قیدی کی حیثیت میں گوالیار بھیجا گیا جہاں اس کی مصیبت میں شریک ہونے کے لیے اس کی محبوب دیول رانی بھی اس سے آکر مل گئی۔ خضر خاں کی ماں ملکہ جہاں بھی جو علاء الدین کی جوانی کی محبوبہ ماہرو تھی بے رحم خواجہ سرا کے جبر و ستم سے نہ بچ سکی اور دہلی کے قصر لعل میں شاہی قیدی کی طرح مقید کر دی گئی۔

**علاء الدین کا انتقال**

جب کہ کافور نے راجدھانی میں اپنا بے مثل تسلط جما لیا تھا، جب کہ وہ الپ خاں جیسے جنرلوں کو قتل کر رہا تھا اور خضر خاں جیسے شہزادوں کو قید میں ڈال رہا تھا۔ سلطنت کے معاملات ایک انتشار کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے علاء الدین کے عہد کے آخری زمانہ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مختلف صوبوں میں تابڑ توڑ بغاوتیں ہوئیں۔ اپنے

۱۶۔ برنی، ص ۳۷۲

۱۷۔ دیول رانی، ص ۲۶۰

محبوب گورنر الپ خاں کی موت کی خبر سن کر گجرات کی فوج نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اپنے قائدین حیدر اور وزیرک کی قیادت میں انھوں نے کسی شاہی فرمان کے نہ ماننے کا فیصلہ کیا۔[19] ملک کمال الدین گرگ کو بغاوت فرو کرنے کے لیے گجرات بھیجا گیا مگر بجائے اس کے کہ وہ باغی سپاہیوں کی سرکوبی کر سکتا۔ خود بیدردی سے مار ڈالا گیا۔ گجرات میں علاءالدین کی موت تک بڑی افراتفری رہی چتوڑ میں بھی بغاوتیں پھوٹ پڑیں جہاں سلطان کٹھ پتلی مالدیو کو سسودیہ حکمراں ہمیر نے مسلسل تنگ کر رکھا تھا۔ دکن میں رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے دیوگیری میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بہت سی شاہی محافظ چوکیوں کو تباہ کر دیا۔ ان بغاوتوں کی خبر قریب المرگ سلطان کے جسم کو غصے سے مشتعل کر دیتی تھی۔ اس کی زندگی بھر کا کام برباد ہوتا معلوم ہوتا تھا۔ جو کچھ اس نے فتح کیا تھا وہ ہاتھ سے جاتا نظر آتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا اس سے بہت دور گوالیار میں تھا، اس کی محبوب بیوی اس سے جدا رکھی گئی تھی اور وہ ملک کو اس سے زیادہ منتشر و پراگندہ چھوڑ رہا تھا جتنا کہ اس کو اس نے پایا تھا۔ اس نے ایک انتہائی مشغول اور تھکا دینے والی زندگی گزاری تھی اور استسقا کے مرض اور غالباً اس زہر کے مہلک اثرات کی بنا پر جو ملک کافور نے[20] دیا تھا علاءالدین نے ۲ جنوری ۱۳۱۶ء (۷ رشوال ۷۱۵ھ) کو ایک خاموش موت میں پناہ پائی۔[21]

---

۱۹۔ فتوح، ص ۳۳-۳۳۲

۲۰۔ برنی، ص ۳۶۹

۲۱۔ یہ امیر خسرو کی تاریخ ہے (دیول رانی، ص ۲۵۹)۔ عصامی کہتا ہے ۱۱ رشوال (فتوح ص ۳۳۶) حاجی الدبیر ۶ رشوال تاریخ ظفر الوالہ، ص ۸۲۸) کہتا ہے لیکن وہ سن غلط بتاتا ہے جس کو وہ ۷۱۶ھ کہتا ہے۔ برنی (ص ۳۶۹) ارشوال ذکر کرتا ہے، مگر وہ سن نہیں دیتا۔ وصاف (ص ۶۲۴) علاءالدین کی موت کا ۷۱۶ھ بتاتا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی اور خسرو کی بقیہ نعتیہ میں ۸ رشوال ہے۔ نیز ملاحظہ ہو تھامس، کرونیکلز ص ۱۵۸ حاشیہ

باب 16

# علاء الدین کی ترقی پر تبصرہ

علاء الدین کے عہد کا مطالعہ ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ بحیثیت انسان اس کی زندگی اور بحیثیت ایک شہنشاہ اس کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے۔ تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہونے کے بعد وہ بے نظیر صلاحیت، سمجھی بوجھی تدبیر اور بے مثال قوت کی وجہ سے پینتالیس سال کی عمر میں اقتدار کی انتہا کو پہنچ گیا۔ ناچیز درجے سے ترقی کر کے وہ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے ایک ہوگیا۔ ایک مضبوط اور تربیت یافتہ فوج کی مدد سے اس نے ملکی حکمرانوں کو اکھاڑ پھینکا اور ملک سے بغاوت فنا کر دی۔ محاصل کی ایک منظم حکمتِ عملی کے ذریعہ اس نے ہر آن بدلنے والے بازار کو منضبط کیا اور ایک مستعد انتظامی مشین کے ذریعہ اس نے ملک پر بیس برس تک بہت موثر طریقے سے حکمرانی کی۔

ہمعصر مورخین بادشاہ کے ذاتی خد و خال کے بارے میں بہت کم لکھتے ہیں لیکن اس کے کردار اور اوصاف پر وہ کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ سلطان کو کتابی تعلیم تقریباً نہیں ملی تھی اگرچہ اپنے بعد کے اکبر اور رنجیت سنگھ کی طرح اس نے ٹینی سن کے اس اصول پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی "کہ صرف وہ لوگ جو پڑھ نہیں سکتے حکومت کر سکتے ہیں۔"[1] لیکن اگرچہ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا تاہم علاء الدین

---

1۔ ضیاء الدین کا بیان ہے کہ سلطان کسی قسم کی تعلیم سے بالکل محروم تھا وہ نہ پڑھ سکتا تھا اور نہ لکھ سکتا تھا (برنی ص ۲۹۲)۔
فرشتہ کا بیان کہ علاء الدین اپنے آخری برسوں میں خفیہ نویسوں کی رپورٹیں خود پڑھ لیا کرتا تھا مشکوک ہے کیونکہ وہ ان کا ذاتی طور پر مطالعہ کرنے کے بجائے کسی اور سے پڑھوا سکتا تھا۔

کافی عقلِ سلیم، تجربہ اور ذہانت کا مالک تھا یہ اوصاف عمر کے ساتھ بڑھتے رہے ہوں امیر ارسلان کلاہی جیسے قابل مورخین، علاء الملک جیسے مخلص امرا، اور قاضی مغیث الدین جیسے قدامت پرست علما، اہم معاملات پر اس کو مشورہ دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ آزمودہ کار ملک علاء الملک سے علاء الدین کے ابتدائی تعلق نے بھی جس نے اس کی تختِ شاہی کی طرف رہنمائی کی تھی اس کی دنیاوی فہم و فراست کے ذخیرے میں یقیناً کافی اضافہ کیا ہوگا جس کا وافر حصہ علاء الدین کو ملا تھا۔ علاء الدین اپنے مشیر اور جنرل الپ خان، نصرت خان الغ خان اور ظفر خاں پر بڑا ناز کرتا تھا۔ اپنے آخری برسوں میں وہ کافور کی مضر ذہنی افتاد سے متاثر ہو گیا تھا۔ بہر کیف یہ سوچنے کا کوئی سبب نہیں کہ سلطان ان میں سے کسی ایک کے زیر اثر تھا۔ علاء الدین کی سوانح حیات بتاتی ہے کہ وہ ایک خودرائے آدمی تھا اور جب کسی بات کا تہیہ کر لیتا تو وہ کسی کا مشورہ نہیں سنتا تھا، تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ وہ پیچیدہ مسائل پر اپنے امیروں سے مشورہ کیا کرتا تھا اور ان کی تجاویز پر کافی غور و فکر اور دھیان دیتا تھا۔

**علم کی کمی**

ہو سکتا ہے کہ علم سے لگاؤ کی کمی علاء الدین کی فطرت اس درشتی اور بے رحمی کے لیے ذمہ دار رہی ہو کیونکہ تعلیم آدمی کو انسانیت اور مہربانی کے عناصر عطا کرتی ہے۔ جب مملکت کو نقصان پہنچانے والا کوئی کام کیا جاتا تھا تو شہنشاہ کے دل میں نرمی اور بردباری کا ہر جذبہ ختم ہو جاتا تھا۔ جالور میں باغیوں کے اہل خاندان کو اس کی سزاؤں نے برنی جیسے قرونِ وسطیٰ کے مورخ کے دل کو بھی شرم اور نفرت سے بھر دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان اپنی فطری بے رحمی، گھمنڈ اور درشت مزاجی کی وجہ سے بدنام زمانہ فراعنہ کے انداز میں ظالمانہ سزائیں دیا کرتا تھا اور نہ تو خون کے رشتے اور نہ قریبی رشتہ داری کے تعلقات ہی اس کو سخت ترین سزاؤں کو دینے سے باز رکھتے تھے۔[۲] تاجروں کو اس کی بہیمانہ سزائیں، دہلی کے عوام پر نصرت خاں کے مظالم اور سلطان کی اپنے ہی عزیزوں قریبوں کو قتل کرنے کی شقاوت انتہائی نفرت انگیز تھے۔ جلال الدین عمر خاں اور منگو خاں کے قتل، اور الغ خاں کی خطیہ زہر خورانی بادشاہ کی تقریباً غیر انسانی فطرت کی شاہد ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مال داروں کی بار بار بغاوتیں اور سرکاری افسروں کی شیطنت اس کے سخت ہونے کا کافی جواز فراہم کرتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی سزائیں بربریت کی حد تک پہونچ گئی تھیں۔

---

۲۔ برنی ص، ۳۲ - ۳۳۵

سلطان کی فطرت منتقمانہ تھی۔ اگر وہ ایک بار کسی شخص سے بدظن ہو جاتا تو اس کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ کسی شخص کو ایک دفعہ قید کر دیتا تو اس کو رہا کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا تھا اور معصوم لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو محض اس لیے سزا دی جایا کرتی تھی کہ بادشاہ ان کو مجرم سمجھتا تھا۔[۳] جلالی امرا نے اپنے آقا کے قتل کے بعد ابھرتے ستارے کے پرچم کے زیر سایہ اپنی حفاظت چاہی تھی۔ ان کی سزاؤں سے زیادہ کوئی چیز بدحواس کرنے والی نہیں ہو سکتی۔ جب تک علاء الدین کو ان کی مدد کی ضرورت رہی اس نے ان کی فرمانبرداری کی وجہ سے ان کی ناز برداری کی، ان کی عزت افزائی کی اور ان کو منصب دیے اور ان میں دولت تقسیم کی۔ لیکن جب وہ تخت پر محفوظ ہو چکا تو اس نے ان کی زمینیں ضبط کیں، بعض کو قید کیا اور بعض کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی فطرت کی کثافت نے ضمیر کے معمولی ترین وسوسے کے بغیر اس کو ایسے نفرت انگیز کاموں پر اکسایا تھا۔

لیک ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ازدواجی محبت کے تمام جذبات سے عاری ہو۔ اس کی داستانِ حیات اس امر کی صاف گواہی دیتی ہے کہ وہ رومانی نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی متعدد بیویاں تھیں مثلاً دختر جلال الدین، الپ خان کی بہن، بادشاہ بیگم، معز الدین کیقباد کی ایک بیٹی جو ملکہ ماہک کے نام سے بھی معروف تھی اور جو قطب الدین مبارک شاہ کی ماں تھی، کملا دیوی اور رام دیو کی بیٹی تاہم یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی وقت بھی وہ نسائی اثر کے تحت رہا ہو۔ علاء الدین جلال الدین کی بیٹی کے ساتھ نباہ نہیں کر سکا اور ماہرو نے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ علاء الدین نے اپنے چچا کی بیٹی کو چھوڑ دیا تھا، بحیثیت ایک قیدی دردناک تنہائی میں اپنے آخری ایام بسر کیے۔ سلطان کی دوسری تمام بیویاں محض برائے نام تھیں جو سلطان کی سوانح حیات میں ذکر کیے جانے کے لائق بھی نہیں۔ قرون وسطیٰ میں جب عورت، شراب اور موسیقی زمانہ کا چلن بن چکی تھی، علاء الدین نے بے لگام عیاشی سے ایک آزاد زندگی بسر کی۔[۴] اگرچہ اس کے عہد حکومت کے بیان کے دوران ہم شاہی محل میں شراب نوشی

---

۳۔ برنی، ص ۳۳۸۔

۴۔ لیک رزمیہ بعنوان چھتائی درت، جس میں رام دیو کی بیٹی چھتائی (فارسی مورخین کی جھاتیہ پلی) کے ساتھ علاء الدین کے محبت کے واقعات کا بیان ہے اس میں سلطان علاء الدین کو ایک بہت ہی رومانی شخص ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ علاء الدین نے چتوڑ پر پدمنی کو حاصل کرنے کے لیے حملہ کیا تھا۔ اس کو بطور ایک شہادت

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی مجلسوں کے بارے میں نیز کافور ہزار دیناری سے سلطان کی فریفتگی کے بارے میں بھی سنتے ہیں لیکن سلطان کی عیاشی معز الدین کیقباد، قطب الدین مبارک حتیٰ کہ جلال الدین خلجی کی عیاشیوں کے مقابلہ میں صفر کے برابر رہ جاتی ہے۔ علاالدین اپنے ابتدائی زمانہ میں شراب پیتا تھا لیکن بعد میں اس نے نہ صرف شراب خود ترک کر دی بلکہ دوسروں کے لیے بھی اس کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ شراب خوری، زنا اور جسم فروشی کے خلاف علاء الدین کے احکامات شہنشاہ کے ذہنی رجحان کی طرف بصراحت اشارہ کرتے ہیں۔

## مذہب کا احترام لیکن تعصب نہیں

برنی کی تاریخ کا سرسری مطالعہ قاری کے ذہن پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ علاالدین اگر بے دین نہیں تھا تو کم از کم دین سے بے تعلق تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ اس نے قرآن نہیں پڑھا تھا کیونکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھا اور اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ نماز پنجگانہ اور رمضان کے روزوں کا بھی پابند نہیں تھا اور غالباً وہ اکیلا دہلی کا سلطان تھا جو کبھی نماز جمعہ پڑھنے نہیں گیا اور مملکت کے نظم و نسق میں مذہبی پاس و لحاظ کو کبھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دی تاہم وہ ایک سچا مسلمان تھا۔ اس کو اپنے مذہب پر پختہ عقیدہ تھا اور وہ کسی غیر مذہبی بات کے کہے جاتے یا سنے جانے کو برداشت نہیں کرتا تھا۔[5]

---

(باقی گزشتہ صفحہ) بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر دشرتھ شرما نے ایک مضمون میں جو انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۶۱ء کے ۲۴ ویں اجلاس (ص ۷۷۔ ۱۷۶) میں پڑھا گیا۔ کہتے ہیں کہ چونکہ چھتائی وحت ۱۵۲۶ء میں جائسی کی پدماوت سے چودہ برس قبل لکھا گیا تھا اس لیے "پدمنی جائسی کے ذہن کی اختراع نہیں تھی" اور یہ کہ "سولہویں صدی کے ہندوؤں کا یقین تھا کہ وہ عورتوں کے لیے علاء الدین کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے اس نے رنتھنبور، چتوڑ اور دیوگیری پر حملہ کیا تھا۔"

ڈاکٹر شرما کے دونوں بیانات تنقیدی تجزیے پر کھرے نہیں اترتے۔ رزمیہ کی تکمیل کی ان کی تاریخ کو چیف ایڈیٹر جناب رد رکشکیہ شہزادے سے اپنے حرم کی ایک لڑکی سے شادی کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ (ملاحظہ ہو گزشتہ ص ۱۱۷) اور دوسری وہ جس میں اس کو چھتائی کو اس کے عاشق کے حوالے کرتا دکھایا گیا ہے۔ ان کا دور بھی سچ سے تعلق ہے تو وہ صرف یہی ظاہر کرتی ہے کہ علاء الدین ایک انتہائی فراخ دل شخص تھا۔ چہ جائیکہ ایک ایسا آدمی جو عورتوں کے لیے فاسقانہ جذبہ رکھتا ہو۔

۵۔ برنی، ص ۳۳۹

علاء الدین ہمعصر بزرگوں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اگرچہ اس نے ذاتی طور پر شیخ نظام الدین اولیاء سے ملاقات نہیں کی لیکن وہ شیخ کی روحانی قوتوں پر بہت اعتقاد رکھتا تھا اور اپنے امراء کے ذریعہ ان کی دعائیں حاصل کرتا تھا۔ اپنے آخری دنوں میں وہ شیخ نظام الدین کا بہت ہی عقیدتمند ہوگیا تھا۔ شاہی خاندان کے تقریباً تمام افراد شیخ کے مرید تھے۔ جب علاء الدین کو بغیر ملاقات کیے مولانا شمس الدین ترک کے واپس چلے جانے کی خبر ملی تو اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔[1] ضیاء الدین کے مطابق سلطان نے الغ خان کی موت پر ایک کثیر رقم خیرات کی تھی۔ ایک طرف یہ منافقانہ فعل بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جیسا اوپر ذکر کیا گیا الغ خان سلطان کے شکوک کا شکار رہا تھا۔ جو ہو سو ہو مذکورہ بالا واقعات بصراحت یہ بتاتے ہیں کہ اپنی نجی زندگی میں سلطان کا رویّہ ایک اچھے مسلمان کا تھا۔ قدامت پسند اور متعصب مؤرخ ضیاالدین اس معیار تک نہیں پہنچ سکا تو یہ اس کی خامی نہیں تھی۔ لیکن امیر خسرو عصامی اور شمس الدین ترک اور وصاف جیسے غیر ملکیوں کے نزدیک علاء الدین ایک سچا مسلمان تھا۔ عصامی تو یہاں تک دعویٰ کرتا ہے کہ سلطان شریعت کے اصولوں پر عمل کرتا تھا اور اپنے اعمال و افعال میں اسلام کا مظاہرہ کرتا تھا۔[2] محمد بن تغلق کے ساتھ علاء الدین کا موازنہ کرتے ہوئے عصامی کہتا ہے کہ علاء الدین کے زمانے میں سلطنت اس کے عدل و انصاف کی بنا پر محفوظ ہوگئی تھی، عوام بادشاہ کے وفادار تھے اور سلطنت میں خوشحالی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن کا محمد تغلق کے عہد حکومت میں فقدان تھا۔[3] اگر علاء الدین نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا تھا تو ایسا کرنے کے کافی اسباب تھے۔ ہندوستان کے اکثر کامیاب مسلمان حکمرانوں نے مذہب کو سیاست سے الگ رکھا۔

یہاں علاء الدین کے خلاف بگاڑے جانے والے الزام کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ سلطان کے کردار کا پورا مطالعہ وضاحت سے یہ بتاتا ہے کہ مذہبی رجحانات نے اس کو کسی طرح ہندوؤں پر ظلم کرنے کے لیے نہیں اکسایا۔ اس کے سخت نظم و نسق میں سازشی امراء، منافع خور تاجر اور شوریدہ پشت زمیندارن کو سخت نقصان پہونچا اگرچہ متوسط درجہ کے بیوپاری اور غریب کسان بھی اس کے جابرانہ قوانین کے

---

۱۔ برنی، ص ۲۹۹

۲۔ فتوح، ص ۵۷۹

۳۔ ایضاً، ص ۵۷۰۔ ۵۷۹

اثرات کی بنا پر پیدا ہونے والی تنگ دستی سے نہ بچ سکے۔ اگر دیہات کی اکثر آبادی نیز اکثر کاشتکار اور زمیندار ہندو تھے تو بالکل فطری بات تھی کہ اس کے محاصل اور گرانی کے ضوابط و قوانین سے زیادہ تر ہندوؤں کو نقصان پہنچا تھا۔ اگر وہ سلطنتیں جن پر علاء الدین نے حملہ کیا ہندو راجاؤں کی تھیں، اگر جنگ کے دوران ہندو رعایا کو تکلیف پہونچی اور اگر وہ تاوان جنگ جو شکست خوردہ ہندو حکمراں سے وصول کیا گیا سرکاری اصطلاح میں یہ جزیہ کہلایا تو ہرگز اس کی بنیاد اس حقیقت پر نہیں تھی کہ علاء الدین ایک متعصب حکمران تھا۔ کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جو یہ بتا سکے کہ علاء الدین نے کچھ لوگوں پر محض اس لیے ظلم کیا کہ وہ ہندو تھے اور کچھ دوسروں سے لطف و عنایت کا سلوک محض اس لیے کیا کہ وہ مسلمان تھے۔ اگر تاجروں کو نقصان پہونچا تو محض یہی نہیں کہ ہندو تاجروں کو نقصان پہونچا ہو اگر مال گزاری کے ضوابط عوام کے لیے ظالمانہ تھے تو ان کو صرف ہندوؤں کے خلاف نہیں نافذ کیا گیا تھا۔ اور اگر امراء کی سرکوبی کی گئی تو صرف ہندو ایسروں کو نہیں دیا گیا تھا۔ دراصل امراء کے ساتھ علاء الدین کا برتاؤ غالباً سب سے زیادہ سخت تھا۔ اس کے زمانے میں اگر ہندو امراء تھے بھی تو بہت کم تھے۔ بہرحال یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلم حکومت کے ابتدائی زمانے میں سلاطین کو اپنی طاقت اور حکومت ایک ایسی قوم پر قائم کرنی تھی جو ان سے مذہب، سماج اور تمدن کے اعتبار سے مختلف تھی۔ لہذا یہ فطری بات تھی کہ وہ ان کو اعلیٰ انتظامی مناصب نہیں دے سکتے تھے۔ مزید برآں خود سلاطین قابل لوگوں یعنی مولویوں اور ملاؤں سے وقتاً فوقتاً مشورے طلب کرتے تھے۔ جو عام طور سے قدامت پسند اور اکثر و بیشتر متعصب ہوتے تھے۔ بلاشبہ فوجی اور سیاسی نوعیت کی مسلسل جنگیں ہندو راجاؤں کے ساتھ لڑی گئی تھیں اور ترک حکمراں طبقے جو سلطان اور اس کے عمال پر مشتمل تھا اور محکوم لوگوں کے درمیان عداوت کا ایک غیر شعوری جذبہ موجود تھا۔ ان حالات میں التمش، بلبن اور علاء الدین جیسے ابتدائی ترک سلاطین سے یہ توقع کرنا کچھ زیادہ تھا کہ وہ مقامی آبادی کے لیے فراخ دل ہوں گے اور تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے عہدوں کے دروازے کھول دیں گے۔ یہی سبب ہے کہ متعدد باصلاحیت ہندو افسروں کو اگر وہ باصلاحیت تھے بھی ہم بمشکل علاء الدین کے عہد میں اعلیٰ انتظامی مناصب پر سرفراز پاتے ہیں۔ مغل عہد میں حالات مختلف تھے۔ اکبر اور اس کے جانشینوں کے عہد میں تقریباً پورا ہندوستان مسلم حکومت کے تحت آچکا تھا اور ہندوؤں پر اعلیٰ عہدوں کے لیے بآسانی بھروسہ کیا جا سکتا تھا اور ان سے مسلمانوں کے برابر سلوک کیا جا سکتا تھا۔ اگر بلبن اور

علاءالدین ہندوؤں کو بغاوت کے مواقع نہ دینے کا رجحان رکھتے تھے تو بالکل فطری امر تھا۔ لیکن اس کے واسطے کوئی ثبوت نہیں کہ علاءالدین نے ہندوؤں پر محض ان کے مذہب کے سبب ظلم کیا۔

**ایک سماجی مصلح**

اس کے برعکس اس کے بہت سے اقدامات بصراحت بتاتے ہیں کہ اس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں بہت دلچسپی لی۔ شراب بندی کے سلسلے میں اس کے ضوابط سچ مچ قابل تعریف ہیں۔ اس نے خود شراب ترک کر دی اور دوسروں کو بھی شراب نوشی ترک کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ شراب اور دوسری منشیات کے امتناع کا مقصد یہ تھا کہ ان مجالس عیش و نشاط پر پابندی لگائی جائے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان میں سیاسی سازشیں کی جاتی تھیں تاہم عصامی اس سلسلے میں ایک انتہائی دلچسپ کہانی سناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دن جب سلطان ملک قرابیگ، ملک قیران وغیرہ جیسے اپنے بے تکلف مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا وہاں موجود امراء میں سے ایک نے مؤدبانہ اس کی خدمت میں عرض کیا کہ قحط کے سبب اس سال عوام پریشان حال ہیں اور بادشاہ عیش و عشرت میں مصروف ہے۔ سلطان اس فقرہ سے بہت متاثر ہوا اور اس دن سے اس نے شراب ترک کر دی، لوگوں کے لیے ممنوع قرار دی اور دوسری مختلف اصلاحات نافذ کیں[9]

اسی طرح اس نے محرمات کے ساتھ مباشرت اور زنا دوسری برائیوں پر پابندی عائد کی۔ اسے پتہ چلا کہ قرامطہ اور اسماعیلیوں جیسے بعض شیعہ فرقے عام عیاشی اور محرمات کے ساتھ مباشرت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ فرشتہ کے مطابق ایسے فرقے بعض ممالک مثلاً شام میں پائے جاتے تھے لیکن ان کے بارے میں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ہندوستان میں موجود تھے۔ جونہی علاءالدین کو ان ذلیل لوگوں کے بارے میں پتہ چلا اس نے حکم دیا کہ ان کو سخت سزائیں دی جائیں۔ قصبوں اور شہروں میں ان کو تلاش کرنے کے بعد سزا کے "آرے" نے ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ محرمات کے ساتھ مباشرت کرنے والے قبائل بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گئے[10]

جسم فروشی بھی ختم کر دی گئی اور شہر کی تمام پیشہ ور عورتوں کو ایک مقررہ میعاد میں شادی کرنے

---

۹۔ فتوح، ص ۳۰۴ ـ ۳۰۵

۱۰۔ برنی (ص ۳۳۶) ان کو اباحتیہ اور بادھکان کہتا ہے اور ان کی سزادہی کے واقعہ کو علاءالدین کے آخری سالوں کا بتاتا ہے۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۱۳

پر مجبور کر دیا گیا۔[12] اس اخلاق سوز تجارت کا خاتمہ علاءالدین کے اہم ترین اقدامات میں سے ایک تھا کیونکہ اس سے عوام کے اخلاق کا تحفظ ہوتا تھا۔ اسی طرح سلطان نے زنا پر ایک قانون کے ذریعہ پابندی لگا دی تھی جس کے تحت زانیہ کو سنگسار کر دیا جاتا تھا اور زانی کو خصی بنا دیا جاتا تھا۔[13]

عطائی پن کی بھی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی اور اس پر سزا دی جاتی تھی۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ "خون آشام جادوگروں کو "پتھروں سے سنگسار کرنے کی سخت سزا دی جاتی تھی"[14] اگرچہ برنی جادوگروں اور ساحروں کے خلاف کسی قدم کا ذکر نہیں کرتا ہے تاہم اس کا یہ بیان اہم ہے کہ علاءالدین کے عہد میں کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ "کیمیا یا جادو" کے علم کا سلطان کے خوف سے اظہار کر سکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ضعیف الاعتقادی اور جادوگری میں عالمگیر عقیدہ کے زمانے میں بعض جادوگر اور ساحر لوگوں کو خوفزدہ کرتے رہے ہوں لیکن علاءالدین نے ان کی نفرت انگیز تجارت کا خاتمہ کر دیا۔

شراب بندی کے سوا جو ایک سیاسی مقصد کی بنا پر نافذ کی گئی تھی علاءالدین کی دوسری اصلاحات یقیناً عام طور سے لوگوں کے فائدے اور ملک کے امن و امان کے لیے جاری کی گئی تھیں یہ امر کہ سلطان نے سماج پر شراب خوری، زناکاری، جسم فروشی اور جادوگری کے مضر اثرات کا ادراک کیا تھا اور ان کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے تھے یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک عظیم سماجی مصلح تھا۔

**[...]ا کی حوصلہ مندی** لیکن سلطان پر سب سے حاوی جذبہ اس کی حوصلہ مندی تھی۔ وہ حیات جاودانی چاہتا تھا، سکندر کی فتوحات سے آگے بڑھ جانا اور ایک مذہب کو جاری کرنا جو اس کے نام کو انسانی تاریخ میں مرنے نہ دیں ـــــ اس کی روح کی وہ

۱۲۔ خزائن، الہ آباد یونیورسٹی، مخطوط، ورق ۱۲ الف؛ ترجمۂ حبیب، ص ۱۱
برنی طوائفوں کی جبری شادیوں کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ فرشتہ کا یہ بیان جو عین الدین بیجاپوری کی طبقات پر مبنی ہے کہ سلطان نے طوائفوں کو تین طبقوں میں بانٹ دیا تھا اور ان کے معاوضے مقرر کر دیے تھے مسترد کر دینا چاہیے کیونکہ خسرو جو ہمعصر ہیں حتمی طور پر کہتے ہیں کہ علاءالدین نے جسم فروشی کی حوصلہ شکنی کی تھی۔

۱۳۔ برنی، ص ۲۸۶

۱۴۔ خزائن، ترجمۂ حبیب، ص ۱۲

زبردست خواہشیں تھیں۔ اس کے ناممکن خیالات میں شراب کے نشے، دوستوں کی خوشامد اور وہ عظیم اقبال مندی جو اس کے تمام اقدامات میں شامل حال رہی اس نے اور بھی شدت پیدا کر دی تھی لیکن خوش قسمتی سے علاء الدین تقریباً پاگل پن کے منصوبوں پر وفادار مشیر ملک عطاء الملک نے لگام دی۔ اس امیر کے پند و نصائح کے بعد سلطان نے منگولوں کو شکست دینے اور ہندوستان کی آزاد حکومتوں کو فتح کرنے پر اپنی پوری توجہ مبذول کر دی۔ لیکن ایک بات یقینی ہے۔ وہ چاہے علاء الدین کی فتوحات ہوں یا اس کے تعمیری شاہکار یا اس کی معاشی اصلاحات سلطان کے ہر کام میں اس کی غیر محدود حوصلہ مندی جھلکتی ہے اور کوئی بے مثال کام کرنے اور اپنا نام زندہ جاوید بنا دینے کی خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔

قدرت نے بہرحال علاء الدین میں عمل کا ایک عنصر ودیعت کیا تھا۔ اس کے حوصلہ نے اس کی آنکھیں حقائق کی جانب سے کبھی بند نہیں ہونے دیں اور اس کو ایک آزمودہ کار سیاس بنا دیا اور وہ بھی کوئی اقدام کرنے سے قبل اس کی مکمل تیاریاں کرتا تھا۔ اس کی وہ احتیاطی تدابیر کہ و بوگیری پر اس کے حملے کی خبر شاہی دربار تک نہ پہونچے تعریف کے قابل ہیں۔ خواہ وہ مقامی حکمرانوں سے نبرد آزما ہوتا۔ خواہ منگول حملہ آوروں سے برسرپیکار وہ ہمیشہ ثابت قدمی کے ساتھ احتیاط کا مظاہرہ کرتا تھا۔ علاء الدین نے ایک سلطنت خود تعمیر کی اس نے ایسے وراثت میں نہیں پایا اور اپنی تمام عمر میں اس کو حیات کی شیرینی اور ترشی دونوں کے مزے چکھنے پڑے۔ تجربہ نے اس کو ٹھنڈے اور محتاط غور و فکر کے بعد ہر کام کو کرنا سکھا دیا تھا۔

**اس کی فنِ جنگ میں مہارت**

اس کی احتیاط بہرحال کسی خوف کا نتیجہ نہیں تھی۔[۱۵] دراصل علاء الدین ایک بار جب کوئی کام کا تہیہ کر لیتا تھا تو اس کو انجام تک پہنچانے کی قوت اور جذبہ رکھتا تھا۔ وہ خون کا دریا پار کر کے تخت تک پہونچا تھا، مگر جن حالات نے اسے تخت حاصل کرنے کا حوصلہ بخشا تھا وہ بلاشک و شبہ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ ایک ابھرتا ہوا جنرل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خود علاء الدین کوئی بڑا جنرل نہیں تھا بلکہ اس کی فتوحات

۱۵۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ علاء الدین پر اکت خاں کے حملہ کے بعد سے اس نے گھوڑے کی پشت پر سواری نہیں کی "ظاہر ہے کہ اس قسم کی دوسری کوششوں کے خوف سے وہ نماز جمعہ کے لیے سوار ہو کر نہیں جاتا تھا نہ عید کی نماز کے لیے اور نہ ہی دوسرے مقاصد کے لیے"۔ (ترجمہ مہدی حسین ص۱۴۳) دوسرے کسی مورخ نے ایسا نہیں کہا ہے اور یہ ناقابل یقین ہے کہ علاء الدین نے پوری طرح سے گھوڑے کی سواری کرنا یا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

الپ خان اور نائب کافور جیسے قابل سالاروں کی مرہونِ منت تھیں۔ لیکن یہ خیال بالکل صحیح نہیں جب علاء الدین محض ایک غیر معروف شخص تھا اس نے ملک چھجو کے خلاف جنگ میں اور دیوگیر پر اپنے حملہ میں جوہر دکھلائے تھے۔ اس کے بعد دیوگیری کی طاقت ور مرہٹہ فوج کے خلاف اس کی حیرت انگیز کامیابی نے بحیثیت ایک فوجی سالار اس کی شہرت مستحکم کردی۔ تخت نشین ہونے کے بعد تحفظ مملکت کی بنا پر علاء الدین راجدھانی اس زمانے میں نہیں چھوڑ سکا۔ اسی لیے اس نے الغ خان اور نصرت خاں کو ملتان پر قبضہ کرنے اور گجرات فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ لیکن سنہ ۱۲۹۹ء میں اس نے قتلغ خواجہ کو کامیابی کے ساتھ شکست دی اور سنہ ۱۳۰۳ء میں اس نے طرغی کی قیادت میں منگولوں کا غالباً سب سے زیادہ خطرناک حملہ پسپا کردیا۔ اس نے منگولوں کے مقابلہ میں پیش قدمی کرنے سے پہلے ملک علاء الملک سے جس انداز میں گفتگو کی وہ بادشاہ کی شجاعت اور معقول پسندی کے جذبہ کی عکاس ہے۔ طرغی کے حملے کے دوران منگولوں کے حملے کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے لیے علاء الدین نے جو خندق تعمیر کرائی تھی وہ فنِ حرب کے ایک ماہر کی حیثیت سے اس کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔
سب سے زیادہ خطرناک جنگیں یا تو منگولوں کے خلاف یا راجپوتانہ میں لڑی گئی تھیں اور ان میں سے اکثر میں وہ بنفسِ نفیس موجود رہا تھا اور وہاں اس نے اپنی تنظیمی صلاحیت، اپنی حکمت عملی اور اپنی فوجی مہارت کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ رنتھمبور کے محاصرہ کے دوران جب الغ خان کو پسپا ہونے پر مجبور ہونا پڑا تو علاء الدین نے خود پیش قدمی کی اور محض اپنے پیہم حملوں اور بہتر فوجی ذہانت کی بدولت اس قلعہ کو فتح کرلیا۔ سنہ ۱۳۰۳ء میں علاء الدین چتوڑ فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس پر پہلے کسی سلطان نے قبضہ نہیں کیا تھا اور جس نے اکبر جیسے طاقتور شہنشاہ کے بھی دانت کھٹے کردیے تھے۔ چتوڑ کی فتح کے بعد منگولوں سے موت اور زندگی کی ایک زبردست کشمکش ہوئی اس میں بھی حیرت انگیز کامیابی نے بادشاہ کے قدم چومے۔ سنہ ۱۳۰۵ء اور اس کے بعد کے زمانہ میں علاء الدین نے بعض انتظامی اصلاحات کیں اور پایۂ تخت سے باہر نہیں جاسکا۔ لیکن فتح کا کام عین الملک ملتانی اور نائب کافور جیسے جنرلوں کے ہاتھوں جاری رہا۔ سنہ ۱۳۰۸ء میں کافور نے جنوب کی سمت اور خود علاء الدین نے سوانا کی طرف کوچ کیا۔ اس طرح سنہ ۱۲۹۶ء سے سنہ ۱۳۱۶ء تک علاء الدین پیہم سرگرم رہا اور فتح نے ہمیشہ اس کے قدم چومے جب کافور نے جنوب میں اپنی شاندار زندگی کا آغاز کیا تو سلطان کو لشکرگاہ کی زندگی سے آرام لینے حسین و جمیل اور شاندار عمارات کی تعمیر کا کافی موقع ملا۔ علاء الدین کی فوجی عبقریت کا وہاں بھی

مظاہرہ ہوتا ہے جہاں اس نے اپنے سالاروں کے احکامات کی فرمانبرداری سے تعمیل کرنے اور ان کے لیے فتوحات کرنے پر مجبور کیا۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کشاکش اور بغاوت کا دَور دورہ تھا اور ایک فوجی سالار تقریباً ہمیشہ تخت کا متمنی ہوتا تھا۔ الغ خان، نصرت خاں، ملک کافور اور غازی ملک جیسے عظیم سالاروں نے بادشاہ سے غیر متزلزل وفاداری کا نمونہ پیش کیا ایسے لوگوں کو اپنے نام پر فتوحات حاصل کرنے کے لیے آمادہ کرنا ہی علاء الدین کی فوجی صلاحیتوں اس کی خداداد فوجی قیادت اور اس حقیقت کا کہ وہ جنرلوں کا جنرل تھا اظہار کرتا ہے۔ بلاشبہ اس کی فتوحات اتنی شاندار تھیں کہ اس کے معاصرین اس کے کارناموں پر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ جودھپور کے ایک کتبہ میں جو اسی عہد کا ہے ہندو مصنف علاء الدین کی قصیدہ خوانی کرتا ہے کہ "اس کی دیوتاؤں جیسی بہادری کے سبب زمین تمام ظلم و ستم سے پاک ہوگئی تھی۔"[16] اسی طرح کی مدح نابھی نندنا جنود ھار پربندھ کا مصنف کاکاسوری نے بھی کی ہے جو کہتا ہے کہ "طاقت میں اندر سے مشابہ علاء الدین نے زمین کو چاروں طرف سے سمندر کی طرح ڈھک لیا تھا۔ کون ان مستحکم قلعوں کو گن سکتا ہے جن پر اس نے قبضہ کیا۔"[17] اگرچہ سنسکرت کے قصیدہ خواں کی روایتی زبان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علاء الدین کی شجاعت اور اس کے فوجی کارناموں نے اس کے معاصرین کے تمام طبقات کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

**شکار کا شوقین**

علاء الدین کی فوجی زندگی کی مشقت کو اس کا شکار کا مسلسل شوق کچھ ہلکا کر دیتا تھا۔ بادشاہ شیر کے شکار کا بہت شوقین تھا۔ شکار نیز کبوتر بازی اور شکرہ بازی میں اس کی دلچسپی اتنی مشہور تھی کہ اس کو اس وقت قتل کرنے کے لیے حملوں کے منصوبے بنائے گئے تھے جب وہ اپنی دلچسپیوں میں منہمک ہوتا۔ سلطان شکروں کو اڑانے کا بہت شوقین تھا اور ان پرندوں کی ایک کثیر تعداد اور ان کو اڑانے والے چند غلام لڑکوں کی کفالت مملکت کرتی تھی۔ سلطان اپنے خالی اوقات بے تکلف مصاحبوں کی صحبت میں بھی گزارتا تھا۔ اپنے ابتدائی زمانے میں وہ بہت پیتا تھا لیکن سیاسی صورتِ حال کے سنگین حقائق نیز ملک علاء الملک کے مخلصانہ نصائح نے اس کی کثرتِ شراب نوشی پر پابندی لگادی۔ شاہی شراب کے ذخائر خالی کر دیے گیے اور پینے کے جام ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اس کے باوجود بادشاہ شراب نوشی بالکل ترک نہیں

---

۱۶۔ ایپی گرافی انڈکا، جلد ہفتم ص ۲۳

۱۷۔ انڈین ہسٹری کانگریس روئداد، ۱۹۵۴ء، ص ۲۳۔ ۲۴۰

کرسکا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ سنجیدگی کی طرف مائل ہوتا گیا۔ وہ بہت کم پیتا تھا اور نشہ کو کبھی اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنے درشت مزاج کے باوجود وہ تاج الدین عراقی خداوندزادہ چاشنی گیر، رکن الدین دبیر، اعزاز الدین بیان اور نورخان جیسے مصاحبوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ وہ ان کی برجستہ گوئی اور مزاح سے کبھی نہیں اکتاتا تھا۔ عورت شراب اور موسیقی کے معاملے میں علاء الدین نہ تو ایک بے لچک معلمِ اخلاق تھا اور نہ خواہشات کا غلام۔

**انتظامی عبقری** سیدھی سادی خوشیوں کا سلطان کا شوق مملکت کے معاملات پر اس کی نگرانی کو کمزور نہیں ہونے دیتا تھا۔ تمام اہم کاغذات اس کے سامنے پیش کیے جاتے تھے اور اس کی چوکس نگاہیں حکومت کے مختلف شعبوں پر اونچی نگرانی رکھتی تھی۔ نظم و نسق کے پیشِ نظر علاء الدین بحیثیت ایک منتظم اپنے عہد سلطنت میں اپنے پیشروؤں یا جانشینوں پر ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کی انتظامی عبقریت کا بہترین مظاہرہ ان مختلف نئے طریقوں اور منصوبوں میں ہوتا ہے جو اس نے اپنی خواہشات کے مطابق ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے بنائے تھے۔ سپاہیوں کی براہ راست اجازت گھوڑوں کو داغنے کا دستور، اور سپاہیوں کو نقد تنخواہوں کی ادائیگی، مارکیٹ کنٹرول، راشن کا نظم اور سلطنتی نامّوں کا اجرا، تاجروں کا اندراج اور درجن بھر دوسرے ضوابط سلطان کے ذہن کے اختراع کے وصف کو شک و شبہ سے بالا ثابت کرتے ہیں۔ علاء الدین اعلیٰ درجے کا منتظم تھا، اس کے ذہن میں اچھوتے خیالات آتے رہتے تھے۔ وہ نئی راہیں نکالتا تھا۔ وہ محمد بن تغلق کی طرح نہیں تھا۔ محمد تغلق اپنے بیشتر تجربات میں ناکام رہا علاء الدین اپنے تمام نئے منصوبوں میں کامیاب ثابت ہوا۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اس کے مشیر کار مثلاً ظفر خان، نصرت خان، الغ خان اور غالباً علاء الملک بھی سب کے سب ۷۰۳ھ سے قبل مر چکے تھے جبکہ الپ خان بہت دور گجرات میں ۷۱۵ھ تک مقیم رہا اور وہ یقیناً علاء الدین کی اختراعی ذہانت تھی جس نے مذکورہ بالا نئے اقدامات کے تصور کا ادراک کیا تھا۔ علاء الدین نے پہلی بار زمین کی پیمائش کرائی، مقامی حکومت اور مال گزاری کی وصولیابی کے متعلق قوانین جاری کیے۔ اگرچہ وہ خود بے پڑھا تھا لیکن وہ متعدد ذرائع سے بازار کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور مجرموں اور قصورواروں کو سزا دیتا تھا۔ انتہائی شاندار انتظامی لیاقت کے لیے اس کی خوش تدبیری کا مظاہرہ اس کے چھوٹے بچوں کو بادشاہ بنانے سے ہوتا ہے۔ ان سے

---

۱۸۔ برنی، ص ۵۸-۳۵۷

دوکانداروں کو ذرا بھی شبہ نہ ہوتا اور تاجروں کی دیانت داری اور ایمانداری کی پرکھ ہو جاتی تھی۔

نہ صرف شہری نظم و نسق کے معاملات میں بلکہ فوجی میدان پر بھی علاء الدین اپنی بے حد بہادری کے مقابلہ میں اپنے دماغ سے زیادہ کام لیتا تھا۔ منگولوں کے ساتھ سلطان کی مختلف جنگوں کے بیان واضح طور پر اس کی دفاع کو منظم کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر مواقع پر اس نے دشمن کو چکر میں ڈال دیا یا اس کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ علاء الدین فن حرب میں پوری گرفت رکھتا تھا۔

علاء الدین سراپا شہنشاہیت پسند تھا لیکن پیہم فتوحات اور اپنی مملکت کی توسیع کی خواہش کے باوجود وہ بے سوچی سمجھی توسیع پسندی کے خطرات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ رنتھمبور، چتوڑ اور سیوانا کا الحاق اپنے جلو میں بے شمار دقتیں لایا تھا اور علاء الدین اتنا ذہین تھا کہ اس نے دکن میں ان طاقتوں کو نہیں دبایا۔ اس نے دکن کے حکمرانوں کو شکست دی، ان سے کثیر خراج وصول کیا لیکن ساتھ ہی ان کے مقبوضات ان کے لیے چھوڑ دیے۔ اپنی اس حکمت عملی سے اس نے دشمنوں کو دوست بنا لیا۔ جس انداز سے اس نے دیوگیری اور دوارسمدر کے حکمرانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان کی تعظیم کی اور خطابات سے نوازا اور ان کو ان کے علاقوں کا مالک رہنے دیا وہ ہندوستان میں اس زمانے کی سیاسی صورت حال پر علاء الدین کی گرفت کو ثابت کرتا ہے۔ محمد بن تغلق کے جنوب کے الحاق کے بعد ناقابل تسخیر مشکلات آ کھڑی ہوئی تھیں۔ علاء الدین کی حکمت عملی اس کی سیاسی فراست کی برتری ظاہر کرتی ہے۔ اس نے صاف دیکھ لیا تھا کہ اس علاقوں کے الحاق سے کوئی فائدہ نہیں جنھیں مستحکم نہ کیا جا سکے۔ اس کی حکمت عملی نے دکن میں متعدد وفادار حلیف رہنے دیے جو نہ صرف اس کے فرمانبردار و تابع رہے بلکہ کئی فوجی مہموں میں اس کے مددگار بھی ثابت ہوئے۔ شمال میں بہر حال مالوہ اور گجرات جیسی سلطنتوں کو جہاں علاء الدین کی فتح سے قبل ہی مسلم اثرات پہنچ چکے تھے الحاق کرنے اور اپنے شہنشاہیت پسند حوصلوں کو انجام تک پہنچانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔

**اکبر سے موازنہ**

اپنی فتوحات میں دشمنوں کو دوست بنانے میں اور انتظامی اصلاحات میں علاء الدین کا موازنہ ہندوستان کے عظیم ترین شہنشاہوں میں اکبر سے کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک علاقائی توسیع پسندی کی حکمت عملی کا تعلق ہے علاء الدین اور اکبر دونوں اس

اصول پر یقین رکھتے تھے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس اکبر کی طرح علاء الدین کا بھی پکا عقیدہ تھا کہ "بادشاہ کو ہمیشہ فتوحات کا پرچم لہراتے رہنا چاہیے ورنہ اس کے پڑوسی اس کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑے ہو جائیں گے۔"[19] اس کے علاوہ ایک چالاک مدبر کی طرح علاء الدین نے دشمنوں کو دوست بنانے کی حکمت عملی پر اسی طرح عمل کیا جیسے اکبر نے راجپوتوں کے معاملے میں کیا۔ بعض راجپوت ریاستیں جو ہندوستان میں مسلم حکمرانوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہیں اکبر کی بہترین مددگار بن گئیں اسی طرح بعض دکنی بادشاہ جن کے ملکوں میں علاء الدین کے جنرلوں نے تباہی پھیلائی تھی اس کے وفادار معاون بن گئے۔ غالباً علاء الدین پہلا مسلم حکمران تھا جس نے ہندو بادشاہوں کو ان کے ملکوں میں بحال رکھا اس شرط کے ساتھ کہ وہ خراج ادا کریں۔ بعض دوسرے شعبوں میں بھی اس نے بڑی ذہنی اپج کا ثبوت دیا۔ اس کے بعض فوجی اور مالگزاری کی اصلاحات پر اس کے بعد ممتاز بادشاہوں نے عمل کیا۔ شیر شاہ نے علاء الدین کی بیشتر فوجی اصلاحات اپنائیں جیسے براہِ راست بھرتی گھوڑوں کو داغنا اور نقد تنخواہیں دینا۔ زمین کی پیمائش اور اس کی بنیاد پر لگان کا تعین علاء الدین نے جاری کی تھیں وہ شیر شاہ اور اکبر کے عہد میں ٹوڈرمل کے نظام میں پائی جاتی ہیں۔ علاء الدین کے نظم و نسق میں تنہا قابلِ اعتراض یہ بات ہے کہ اس کا پورا انحصار طاقت پر تھا۔ جب کہ شیر شاہ اور اکبر کی مختلف مالگذاری کی انتظامی اور معاشی اصلاحات عوام کے فائدہ کے غرض سے کی گئی تھیں، علاء الدین نے سخت ترین اقدامات محض ملک کے دفاع کے نام پر اور اپنی شہرت و ناموری کے لیے کیے تھے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ علاء الدین نے بھی ایک نیا مذہب جاری کرنے میں سوچا جیسے کہ دو صدیوں بعد اکبر نے سچ مچ کر دکھایا۔ لیکن علاء الدین اتنا متمدن نہیں تھا جتنا اکبر تھا۔ اس کا جذبہ اس شوق کے تقاضے پر مبنی تھا کہ مذہب کا اجرا اس کو زندۂ جاوید بنا دے۔ اس لیے نہیں کہ ایک پرچم کے نیچے مختلف متصادم طبقات، ذاتوں اور عقائد کو متحد کرے۔ دینِ الٰہی کو جاری کرنے میں اکبر کے مقاصد انسانیت پر مبنی اور بے غرضانہ تھے جبکہ علاء الدین کے محض خود غرضانہ اور خود پرستانہ۔

**خلاصۂ کلام** اس بادشاہ نے اپنے بیس برس کے عہد حکومت میں ہندوستان کی ترک سلطنت کے لیے کیا حاصل کیا؟ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ علاء الدین نے کوئی مستقل

۱۹۔ آئین اکبری، ص: ۳۹

چیز نہیں چھوڑی ۔ ہمعصر شیخ بشیر دیوان کے مطابق علاء الدین کی حکومت کسی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہوئی تھی اور علائی حکومت میں موجود کمزوریوں کے سبب خلجی خاندان کی جگہ دوسرے خاندان نے لے لی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علاء الدین کے انتظامی نظام میں کچھ خامیاں تھیں ۔ اس کی حکومت ایک آدمی کی حکمرانی تھی ۔ جیسے کہ جادو ناتھ سرکار بجا طور پر کہتے ہیں کہ " ذاتی فیصلہ کے ذریعہ کی جانے والی حکومت محض اپنی بنیاد کے لحاظ سے غیر یقینی ہوتی ہے "[20] علاء الدین کی حکومت طاقت پر مبنی تھی لوگوں کی مرضی پر نہیں ۔ بادشاہ سے صرف خوف کھایا جاتا تھا اور اس کی اطاعت کی جاتی تھی لیکن اس سے محبت یا احترام نہیں کیا جاتا تھا ۔ سلطان نے مملکت کی معاشی خوشحالی کو نظر انداز کر دیا تھا اور صرف اپنی فوجی (اور اس کے طفیل میں کچھ غیر فوجی) آبادی کو فائدہ پہنچانے کے لیے اس نے کاروبار اور تجارت کے ہر محرک کا گلا گھونٹ دیا تھا ۔ اس کے ضوابط کے تحت تاجروں کو نہ تو آمد و رفت کی آزادی تھی اور نہ نفع کی امید ۔ اس نے کاشتکاروں کو انتہائی دشواریوں سے دوچار کر دیا ۔ اس کے زبردست جاسوسی کے نظام نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی اور امرا کی سرکوبی نے بادشاہ کی آنکھیں بند ہونے کے وقت حکومت کو ایک مفلوج حالت میں چھوڑا ۔ لیکن جب اس کے ٹھوس کارناموں کا ایک محتاط اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے تو تمام الزامات میں کوئی جان نہیں دکھائی دیتی ۔ علاء الدین نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ اس کی شہنشاہیت پسند حکمت عملی نے ایک چھوٹی سی بادشاہت کو جیسی کہ دہلی کی سلطنت تھی ایک ایسی سلطنت میں بدل دیا جو تقریباً پورے ہندوستان پر حاوی تھی ۔ وہ پہلا حکمراں تھا جس کا سیاسی اقتدار دکنی جزیرہ نما تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس نے منگولوں کی توسیع پسندانہ حکمت عملی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو نہ صرف ترک افواج کی توسیع کی راہ میں حائل تھا بلکہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے وجود کے لیے بھی خطرہ تھا ۔ علاء الدین کی فتح کردہ سلطنتوں میں بعض اس کی موت کے وقت آزاد ہو گئی تھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ علاء الدین کے کارنامے ہلکے تھے ۔ اس نے انتہائی جنوب میں ہندو راجاؤں کی طاقت سلب کر لی تھی اس علاقہ میں اس کی کامیابی نہ ہوتی تو قطب الدین جیسا عیاش اس پر زیادہ دنوں تک قابض نہ رہ سکتا ۔ علاء الدین کا کام کم از کم مستقل نتائج کا حامل تھا اگرچہ اس کی فتوحات پائیدار نہیں تھیں ۔ وہ علاء الدین ہی تھا جس نے اپنے جانشینوں کو وندھیاچل کے پرے واقع ریاستوں کی کمزوری سے آگاہ کیا تھا ۔ اس کے نظم و نسق

20 ۔ سرکار ، شیواجی ، ص 391

کے ڈھانچے نے اس کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ بیس برس تک کامیابی کے ساتھ ملک پر حکومت کر سکے۔ اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ اس کی بیشتر انتظامی اصلاحات نے بعد کے بادشاہوں کے لیے نمونے کا کام دیا۔ برنی بجا طور پر ان عظیم الشان خصوصیات کو گناتا ہے جو علاء الدین کے عہد کے ساتھ مخصوص تھیں اور جو کسی دوسرے بادشاہ کی حکومت میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ علاء الدین کے زمانے کی پہلی خصوصیت زندگی کی اشیاء ضروری کی ارزانی اور افراط اور زمی کے زمانے میں غلہ کے متعینہ نرخ۔ دوسری خصوصیت وہ مسلسل فتوحات ہیں جو بادشاہ اور اس کے سالاروں نے حاصل کیں کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فوجی مہم سے قبل ہی فتح وجود میں آجاتی تھی۔ تیسری خصوصیت منگولوں کی پوری سرکوبی ہے چوتھی یہ ہے کہ ایک بڑی فوج کم تنخواہ پر مطمئن اور پر سکون رہی۔ پانچویں یہ کہ سرکش زمینداروں کو دبا دیا گیا۔ چھٹی یہ کہ سڑکیں اور شاہراہیں محفوظ ہوگئیں اور جو راہزن تھے ان کو راہ کا محافظ بننا پڑا، ساتویں یہ کہ تاجروں کو دیانتدار بننے پر مجبور کیا گیا۔ آٹھویں مضبوط عمارتوں کی کثرت، نویں یہ کہ ہندوؤں کو اطاعت پر مجبور کیا گیا اور مسلمان سچے، پرہیزگار اور انصاف پسند ہوگئے۔ اور دسویں یہ کہ ہنرمندوں اور عالموں کا مجمع ہوا جو دوسرے کسی عہد حکومت میں کبھی نہیں پایا گیا تھا۔"[21]

۲۱۔ برنی، ص ۳۴۱ - ۳۴۰

## باب 17

# قطب الدین مبارک شاہ

### تخت شاہی کے خالی رہنے کا زمانہ

علاء الدین کی موت کے بعد حالات نے کافور کو مختارِ کل بنا دیا۔ مگرمچھ کے کچھ آنسو بہانے کے بعد[1] اس نے شہنشاہ کے مردہ جسم کو اس مقبرہ میں دفن کیا جس کو خود سلطان نے جامع مسجد (مسجد قوۃ الاسلام) کے سامنے تعمیر کرایا تھا۔[2] دوسرے دن اس نے مملکت کے امرا اور افسران کو بلا بھیجا اور ان کو علاء الدین کی وصیت دکھائی جس میں شہاب الدین عمر کو تخت کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ عصامی لکھتا ہے کہ جب علاء الدین کی حالت دگرگوں ہو گئی تو ملک نائب نے اس کو خضر خان کے حقوق ختم کرنے اور عمر خاں کو تخت کا جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ انتہائی نقاہت اور حواس بجا نہ ہونے کی وجہ سے سلطان کوئی جواب نہیں دے سکا اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے اس کی خاموشی کو اس کی مرضی سے تعبیر کیا گیا اور شہزادہ عمر خاں ولیعہد سلطنت قرار پایا۔[3] امرا نے دستاویز کے احکام کے آگے سر جھکا دیا جس پر مرحوم بادشاہ کی مہر ثبت تھی اور ایک چھ سالہ بچے کو سلطان شہاب الدین عمر خلجی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا گیا۔[4]

کافور کے لیے شہاب الدین سب سے زیادہ پسندیدہ کٹھ پتلی تھا۔ خواجہ سرا ہونے کے باوجود نائب نے

---

۱۔ فتوح، ص ۳۲۱

۲۔ برنی، ص ۳۶۹۔ مقبرہ کے مقام کے لیے ملاحظہ ہو اکیسواں باب

۳۔ فتوح، ص ۳۲ ۔ ۳۲۵

۴۔ برنی، ص ۳۷۲، فتوح، ص ۳۲۵۔

ننھے بادشاہ کی ماں سے جو رام دیو کی بیٹی تھی شادی کرلی ۵ اور شہاب کے نام پر حکومت کرنے لگا۔ ملک نائب کی عظیم الشان جنگی صلاحیتوں نے اس کو بحیثیت ایک عظیم فاتح ممتاز بنا دیا تھا لیکن وہ یقیناً ریاست کا کاروبار چلانے کا اہل نہیں تھا۔ اپنی طاقت مستحکم کیے بغیر وہ ابتدا ہی سے ایک بادشاہ کی طرح سختی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ وہ اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ علاء الدین کے تمام امرا اس کے ساتھ ہیں اور ان کو خوش تدبیری سے اپنا دوست بنانے کی بجائے اس نے اپنی ظالمانہ اور ناجائز حرکتوں سے ان کو بیگانہ بنا لیا۔

اقتدار حاصل کرتے ہی اسی دن کافور نے سنبل نامی ایک شخص کو خضر خاں کو اندھا کرنے کے لیے گوالیار بھیجا ۶ تاکہ اس کو ہمیشہ کے لیے تخت کے لیے نااہل بنا دے اس نے سنبل کو اس کام میں آسانی پیدا کرنے کے لیے علاء الدین کی انگوٹھی دی جو مرحوم بادشاہ کی انگلی سے اتاری گئی تھی ۷ اس نے اس نفرت انگیز جرم کے ارتکاب کے انعام میں دربار کی بار بیگی کا وعدہ کیا تھا ۸ سنبل فوراً ہی گوالیار پہنچا۔ شاہی نشانی کی وجہ سے وہ اپنے شکار تک بلا دقت پہونچ گیا ۹ وہ آنسو بڑے تکلیف دہ تھے جو شہزادے کے رخساروں پر بہ نکلے جب وہ اپنی آنکھوں کی روشنی سے محروم کیے جانے کے لیے بیٹھا۔ "امیر خسرو کہتے ہیں کہ "جو آنکھیں سرمہ کا لمس نہیں برداشت کر سکتی تھیں اب ان کو اندھا کرنے والی سلائی کی تکلیف سہنی پڑی"۔

جس دن سنبل کو گوالیار بھیجا گیا، خضر خاں کے ایک بھائی شادی خاں کو اسی دن کوشک سیری میں نابینا کر دیا گیا۔ اس کی آنکھیں "خربوزے کی قاشوں کی طرح ۱۰ ان کے خانوں سے نکال لی گئیں" خضر خاں کی والدہ کو بھی ایک قیدی کی حیثیت میں گوالیار بھیج دیا گیا اور اس کو اس کے زیورات اور قیمتی اشیاء سے محروم کر دیا گیا۔ ۱۱ مرحوم بادشاہ کے تمام دوسرے لڑکے یعنی فرید خاں، عثمان خان، محمد خاں اور ابوبکر

---

۵۔ فتوح، ص ۳۳۵، ص ۳۴۴؛ ظفر الوالہ، ص ۸۳۷

۶۔ فتوح، ص ۳۸-۳۳۷؛ دیول رانی، ص ۲۶۱

۷۔ فتوح، ص ۳۴۱

۸۔ برنی، ص ۳۷۳

۹۔ فتوح، ص ۳۳۸

۱۰۔ دیول رانی، ص ۲۴۳

۱۱۔ علاء الدین کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے ہی وہ زیر حراست تھی۔ اب وہ گوالیار بھیجدی گئی۔ وہ گوالیار میں اپنے بیٹے خضر خاں کے ساتھ تھی جب ۱۳۱۸ء میں وہ قتل کیا گیا۔

ڈھال نائب کے ہاتھوں میں پڑ گئے۔[۱۲]

شاہی خاندان کے تمام شہزادوں کو راہ سے ہٹا کر جن کو اس نے یا تو قید میں ڈال دیا تھا یا اندھا کر دیا تھا کافور تحفظ کے احساس کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ وہ ننھے بادشاہ کو ہزار ستون کے چھجے پر بطورِ نمائش تخت پر بٹھاتا تھا اور علاء الدین کے انداز میں امرا اور افسران کو خطاب کرتا تھا اور تمام اعلیٰ افسران اور امرا کو اپنے سامنے کھڑا رکھتا تھا۔ دن میں وہ حکومت کا کاروبار چلاتا تھا اور رات میں اپنے دوستوں کی صحبت میں جوا کھیلتا اور قمار بازی کرتا تھا۔[۱۳] جب وہ اپنے معتمد مصاحبوں کے ساتھ تخلیہ میں ہوتا تھا تو وہ علاء الدین کے خاندان کے نوخیز ارکان اور افسروں کو راہ سے ہٹانے کے طریقوں اور ذریعوں پر بحث کیا کرتا تھا۔ وہ اس سے بے خبر تھا کہ جن لوگوں کی تباہی کا وہ سامان کر رہا تھا وہ اس کی حرکات و سکنات کا پتہ لگاتے رہتے تھے۔

صورت حال اس وقت بحران کی شکل اختیار کر گئی جب نائب ملک نے مبارک خان جس کو اس نے پہلے سے قید میں ڈال رکھا تھا اندھا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے شہزادے کو اندھا کرنے کے لیے کچھ پیادوں (پایک) کو کرایہ پر حاصل کیا تھا لیکن جب وہ مبارک کے پاس پہونچے تو اس نے اپنی گردن سے جواہرات سے مزین ایک ہار نکالا اور ان کے سامنے پھینکتے ہوئے ان کو اس فرض کی یاددہانی کرائی جو مرحوم بادشاہ کے بیٹوں کے لیے ان پر واجب تھا۔ مبارک کی نصیحت سے متاثر ہو کر انھوں نے اس کو نہ صرف ہاتھ نہیں لگایا[۱۴] بلکہ غدار کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کام کو انجام دینے میں ان کو اعلیٰ فوجی افسروں کی حمایت بھی حاصل تھی جو نائب ملک کو ساری

---

۱۲۔ فتوح، ص ۳۲ – ۳۴۱

۱۳۔ ایک متوازی عبارت میں نظام الدین احمد اور فرشتہ کہتے ہیں کہ وہ چوپڑ کھیلتا تھا۔ پروفیسر ہودی والا ص ۸۴ – ۲۸۳ کہتے ہیں کہ وہ پچیسی ہو سکتی ہے۔ اول تو اس لیے کہ پچیسی ایک قدیم مقبول عام کھیل تھا اور دوسرے اس لیے کہ چوپڑ میں کوڑی کا کوئی استعمال نہیں ہوتا جب کہ اول الذکر کھیل میں اس کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ لیکن کوڑی باختن سے مراد جوا اور قمار بازی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اصطلاح ہندوستان میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

۱۴۔ فرشتہ، ص ۱۲۴

رات چند دروازوں کے پیچھے خفیہ طور پر مشورے کرتے دیکھتے تھے۔ چار پایک جن کے نام مبشر، بشیر، صالح اور منیر[15] دیے گئے ہیں ایک دن کافور کے محل میں گئے اور اس کو اس کے اقتدار پر غاصبانہ قبضے کے صرف پینتیس دن بعد قتل کر دیا۔[16]

ملک نائب کے قتل کے بعد مبارک خان کو قید خانے سے نکالا گیا اور اس کو شہاب الدین کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اس نے جلد ہی امراء کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور نیابت ملک اختیار کرنے کے دو ماہ بعد[17] جب اس کی طاقت پوری طرح مستحکم ہو چکی تھی اس نے شہاب الدین کو اندھا کر کے گوالیار بھیج دیا اور خود تخت شاہی پر رونق افروز ہوا۔ اس نے ان پائیکوں کی طاقت بھی کچل دی جنھوں نے ملک نائب کو قتل کیا تھا اور اس بنا پر وہ مغرور و متکبر ہو گئے تھے۔ وہ ملک کافور کی موت اور قطب الدین کی تخت نشینی کا باعث بننے پر علانیہ فخر کرتے تھے اور اس لیے وہ بادشاہ اور امراء سے ترجیحی سلوک کی توقع رکھتے تھے۔ قطب الدین نے مبشر اور بشیر کے قتل کا حکم دیا۔ دوسرے سرکش پائیکوں کو بھی دوسرے مقامات پر لے جایا گیا اور ان کے سر قلم کر دیے گئے۔

**قطب الدین کی تخت نشینی**

مبارک خان سترہ یا اٹھارہ سال کی کچی عمر میں ۱۴ اپریل ۱۳۱۶ء (۲۰ محرم ۷۱۶ھ) کو تخت نشین ہوا۔[18] جیسا کہ دستور تھا اس کی تخت نشینی پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور مملکت کے سربرآوردہ اشخاص پر خطابات اور انعام و اکرام کی بارش کی گئی۔ ظفر خان کا لقب شحنۂ پیل (ہاتھیوں کے محافظ) ملک دینار کو عطا کیا گیا۔ سلطان

---

۱۵۔ فتوح، ص ۳۴۳ - ۳۴۲۔ فرشتہ صرف دو نام مبشر اور بشیر دیتا ہے۔

۱۶۔ برنی اور عصامی ۳۵ دن کہتے ہیں، فرشتہ صرف ۲۵ دن بتاتا ہے۔ چونکہ علاء الدین نے ۲ جنوری ۱۳۱۶ء (۷ شوال) کو وفات پائی تھی اور کافور کو اس کی موت کے پینتیس دن بعد قتل کر دیا گیا لہٰذا وہ ۸ فروری ۱۳۱۶ء (۱۲ ذی قعدہ ۷۱۵ھ) کو یا اس کے لگ بھگ مارا گیا ہوگا۔

۱۷۔ برنی، ص ۳۷۷

۱۸۔ یہ تاریخ مبارک شاہی میں دی گئی تاریخ ہے۔ خسرو، نہ سپہر میں ۷۱۶ھ کہتے ہیں، عصامی بھی ۷۱۶ھ بتاتا ہے۔ برنی غلطی سے ۷۱۸ھ بیان کرتا ہے اور اس غلطی کو نظام الدین، بداؤنی اور فرشتہ دہراتے ہیں۔ سکوں کی شہادت ۷۱۶ھ کی صحیح تاریخ ثابت کرتی ہے کیونکہ قطب الدین کے سب سے پہلے سکے ۷۱۶ھ میں ڈھالے گئے تھے۔

کا ایک چچا محمد شیر خاں بن تگین غازی ملک آخور کے فرزند فخر الدین جونا کو جو امیر (گھوڑوں کا افسر اعلیٰ) بنایا گیا۔ مولانا بہاء الدین خطاط[19] کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین کو جو مبارک شاہ کا خطاطی کا استاد تھا صدر جہاں کا منصب اور قاضی خاں کا خطاب عطا کیا گیا اور سونے اور جواہرات کے کام سے مرصع ایک خنجر اس کو تحفہ میں دیا گیا۔ ملک قرا بیگ کو متعدد ذمہ دارانہ عہدے تفویض کیے گئے[20]۔ سلطان نے اپنے مصاحبوں اور غلاموں کو اعلیٰ عہدے دیے اور ان کو جاگیریں عنایت کیں۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز ترقی گجرات کے ایک گمنام غلام حسن کی ہوئی جس پر سلطان نے خاص انعام و اکرام کیے۔ اس کو خسرو خان کا خطاب اور ملک نائب کے اقطاع کی آمدنی عطا کی گئی اور کچھ دنوں بعد اپنی حکومت کے پہلے ہی برس میں قطب الدین نے اس کو وزیر کے عہدے پر سرفراز کیا۔

**رجعت پسندی کا ایک دور**

وقت گزرنے کے ساتھ ایک مستحکم حکومت نے رفتہ رفتہ ان پراگندہ حالات کو ختم کر دیا جو علاء الدین کی موت کے بعد پیدا ہو گئے تھے۔ لوگوں میں اطمینان و سکون ظاہر ہونے لگا۔ نیا بادشاہ فطری طور پر آسائش پسند اور فیاض تھا اس کی قید اور ابتدائی عسرت نے اس کو اور بھی نرم دل بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد حکومت کے آغاز نے ایک آزاد خیال عہد کو جنم دیا۔ اپنی تخت نشینی کے دن اس نے سترہ اٹھارہ ہزار قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مختلف جرائم کی پاداش میں جن لوگوں کو جلا وطن کیا گیا تھا ان کو گھر واپس آنے کی اجازت دے دی۔ سپاہیوں کو چھ ماہ کی تنخواہ انعام دی گئی۔ علماء اور افسران کے معاوضے اور وظیفے بڑھا دیے گئے اور ایک بار پھر لوگوں کی جیبوں میں ٹنکے اور جیتل بجنے لگے[21]۔ بڑی تعداد میں جاگیریں جو علاء الدین نے خالصہ میں شامل کر دی تھیں واپس کر دی گئیں۔ بھاری جرمانے اور محاصل ختم کر دیے گئے اور مال گزاری کے شعبے میں جابرانہ تدابیر مثلاً شکنجہ کسنا اور قید کرنا ممنوع کر دی گئیں۔ سلطان نے حکم صادر کیا کہ حرم کے طالبوں کی درخواستیں اس کی خدمت میں پیش کی جایا کریں۔ یہ ایک ایسا دستور تھا جو کچھ مدت سے متروک ہو چکا تھا۔ وہ بہ نفس نفیس درخواستوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ان پر احکامات صادر کرتا تھا[22]۔

---

۱۹۔ فرشتہ شہاب الدین بتاتا ہے۔

۲۰۔ برنی ص، ۳۸۱۔ کچھ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ قرا بیگ چودہ اہم عہدوں پر فائز تھا، ص ۳۹۶۔

۲۱۔ برنی، ص ۳۸۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۸۲

مختصر یہ کہ نئے بادشاہ نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ علاءالدین کے بیشتر ضوابط متروک ہو گئے۔ لوگوں کی روش پر سخت نگرانی ختم کر دی گئی۔ وہ کسی پاداش کے بغیر دولتمند ہو سکتے تھے۔ قدرتی طور پر انھوں نے دولت اکٹھا کرنی شروع کر دی۔ بازار کے ضوابط کا نفاذ ختم ہوا۔ جاسوسوں کا مسلسل خوف، پاسداری یا رحم حاصل کرنے کا ناممکن ہونا۔ اور بہیمانہ سزاؤں کا خوف اب عوام کے ذہنوں کو بھوت کی طرح نہیں ستاتا تھا۔ جلد ہی ان کے ذہنوں سے بادشاہ کی فرمانروائی کا خوف نکل گیا اور وہ بے لگام عیش و عشرت کے پیچھے بھاگنے لگے۔ چونکہ نوخیز بادشاہ ہمیشہ عیش و نشاط اور عیاشی میں مبتلا رہتا تھا اس لیے لوگ بھی عام طور سے اس کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ برنی کہتا ہے کہ خوبصورت لڑکیوں اور بے ریش لڑکوں کی طلب نے ان کو نایاب شے بنا دیا تھا۔ ان کی قیمتیں پانچ سو اور بعض اوقات تو دو ہزار تنکہ تک پہونچ گئیں[۲۳]۔ اس حقیقت کے باوجود کہ قطب الدین نے مشروبات پر پابندی نرم نہیں کی تھی۔ شراب کی غیر قانونی تجارت بلا خوف و خطر ہوئی کھلم کھلا کشید کی جاتی اور علانیہ پی جاتی تھی۔ غلہ اور کپڑے کی قیمتیں چڑھ گئیں اور ملتانی تاجروں نے علاءالدین کی موت پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے جلوس نکالا[۲۴]۔ وہ اب ان نرخوں پر اشیاء فروخت کرتے تھے جو ان کے لیے انتہائی نفع بخش تھے۔ وہ عوام کو ہر طرح سے ٹھگتے تھے۔ رشوت خوری اور بدعنوانی بھی عام تھی اور کلرک اور منشیوں کے لیے وہ عیش کا دن تھا جب کہ مزدوروں کی اجرت چارگنی ہو گئی تھی[۲۵]۔ لگان کی شرح میں کمی سے زمینداروں اور کاشتکاروں کی حالت خود بخود بہتر ہو گئی۔ علاءالدین کے زمانے کے مقابلہ میں وہ اب بہتر کھانا کھاتے اور بہتر کپڑے پہنتے تھے[۲۶]۔ خلاصہ یہ کہ بادشاہ کی نرمی اور فراخدلی نیز اس کی اپنی آسائش پسند عادتوں نے لوگوں کو مسرور بنا دیا اور علاءالدین کے زمانے کا خوف ان کے ذہنوں سے

---

۲۳۔ برنی، ص ۳۸۴

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۸۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۸۵

۲۶۔ برنی، ص ۳۸۷

۲۷۔ برنی کاشتکاروں کے لیے ہندو کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ان کی خوشحالی قدامت پسند مولانا کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اور اس کو یہ لکھتے ہوئے تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ ہندو جو علاءالدین کے عہد میں کھانے اور کپڑے سے محتاج ہو گئے تھے اب عمدہ ململ کے کپڑے پہنتے تھے اور گھوڑوں کی سواری کرتے تھے۔

رفع ہونے لگا۔

**گجرات پر فوج کشی** ہم دیکھ چکے ہیں کہ الپ خاں کے قتل نے گجرات کے عوام کو بغاوت پر کس طرح مشتعل کر دیا تھا۔ اپنے قائدین حیدر اور وزیرک کی قیادت میں گجراتیوں نے شاہی سالار کمال الدین گرگ کو مار ڈالا تھا اور اس کے بعد سے صوبہ نے شاہی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ فتوح السلاطین کے مصنف کے بقول ملک نائب نے اپنی نیابت کے زمانے میں گجرات پر شاہی اقتدار پھر سے قائم کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ اس نے عین الملک ملتانی کو گجرات پر حملہ کرنے کے لیے دکن سے طلب کیا تھا اور جبکہ وہ شمال کی سمت میں بڑھ رہا تھا اس نے نائب ملک کی موت کی خبر سنی اور وہ راجپوتانہ میں رک گیا[28] لہٰذا یہ قطب الدین کے لیے مہم رہ گئی کہ وہ صوبہ کو پھر سے فتح کرے۔

اپنی تخت نشینی ہی کے سال میں مبارک شاہ نے ملک تغلق کی قیادت میں ایک لشکر جرار عین الملک کی افواج کے ساتھ چتوڑ میں جا ملے اور گجرات پر حملہ آور ہونے کے لیے بھیجی[29] وہ گجرات پہونچے لیکن باغی سردار شاہی افواج کی آمد پر ذرا نہ گھبرائے اور انھوں نے اپنی افواج کی نہروالہ کے باہر صف بندی کی[30] عین الملک نہ صرف ایک تجربہ کار جنرل تھا بلکہ ایک عظیم مدبر بھی تھا۔ اس نے باغی فوج کے چھوٹے افسروں کو خط لکھے جن میں ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے سالاروں حیدر اور وزیرک کو قتل کر ڈالیں اور سلطان کی اطاعت کریں۔ عین الملک نے لکھا تھا کہ ایک ہی مذہب پر عقیدہ رکھنے والی فوجوں کے درمیان جنگ کا کوئی جواز نہیں[31]۔ آخر میں بڑی تاکید کے ساتھ کہا گیا تھا کہ پایان کار باغی سردار ضرور مارے جائیں گے۔ لیکن اگر گجرات کی سپاہ ان کا ساتھ چھوڑ دے تو بہت سی معصوم جانوں کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور جوں ہی متحارب افواج ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئیں بہت سے گجراتی افسر شاہی افواج سے آکر مل گئے۔ حیدر اور وزیرک بڑی بہادری سے لڑے لیکن فوجی افسروں کے ساتھ چھوڑ دینے سے ان کی طاقت بری طرح متاثر ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ ان کا مسلسل تعاقب

۲۸۔ فتوح، ص ۳۳۹-۴۰

۲۹۔ فتوح، ص ۳۴۹

۳۰۔ فتوح، ص ۳۵۰

۳۱۔ فتوح، ص ۳۵۰

کیا گیا لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے[32] اور دور دراز صوبوں میں بعض ہندو سرداروں کے پاس انھوں نے پناہ لے لی[33]

گجرات فتح کرنے کے بعد عین الملک دہلی لوٹا اسے بہت زیادہ انعام واکرام سے نوازا گیا۔[34] ملک دینار کو جس کو ظفر خاں کا خطاب دیا گیا تھا اور جس کی لڑکی کی شادی سلطان سے ہوئی تھی گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس قابل اور دانشمند امیر کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت پورا صوبہ مکمل طور پر اختیار میں آگیا۔ اس نے علاقے پر اس قدر اچھی حکومت کی کہ اس کی آمد کے تین چار ماہ کے اندر لوگ الپ خاں کے اچھے پرانے زمانے کو بھول گئے۔ ظفر خاں نے مضافات کے سرداروں اور زمینداروں سے ایک کثیر رقم وصول کی اور اس کو دہلی بھیج دیا۔[35]

بہرحال گجرات کی قسمت میں نہ تھا کہ وہ امن وامان کے ایک لمبے عرصے سے لطف اندوز ہوتا۔ سلطان کی زندگی کے خلاف اس سازش نے جبکہ وہ دکن میں ایک مہم پر گیا ہوا تھا اس کی روح تک کو لرزا دیا اور وہاں سے وہ اپنی واپسی پر انتہائی بے رحم اور ناعاقبت اندیش ہو گیا۔ اس نے اپنے خسر گجرات کے گورنر ظفر خاں کو برسرعام قتل کر دیا۔ جس کی وفاداری پر بلا وجہ اس کو شک ہو گیا تھا۔ گجرات میں شاہی اقتدار کی جان نکال لینے اور کمزور کر دینے کے لیے ظفر خاں کی موت کافی تھی۔ خسرو خاں کے ایک بھائی حسام الدین[36] کو پھر صوبے کی حکومت عطا کی گئی محض اس حقیقت نے کہ سلطان کی اس پر نظر عنایت تھی اس کے دماغ میں سودا سما دیا اور اس ناشکر گزار ذلیل کمینے نے اپنے محسن کے خلاف منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ اس نے اپنے عم زادوں،

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۳۳۔ برنی، ص ۳۸۸

۳۴۔ فتوح، ص ۲۶۲

۳۵۔ طبقات اکبری، ص ۱۷۷؛ فرشتہ، ص ۱۲۵

۳۶۔ برنی، ص ۳۶۹ میں ہے "برادر مادر خسرو خاں" (خسرو خاں کی ماں کا بھائی) بعد میں وہ کہتا ہے "برادر خسرو خاں" (خسرو کا بھائی) طبقات اکبری ایک جگہ اس کو خسرو خاں کا بھائی بتاتا ہے اور دوسری جگہ ماں جایا بھائی۔ فرشتہ بھی کہتا ہے "اس برادر مادری" (ماں جایا بھائی) وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی بھائی نہیں تھا لیکن وہ اس کا ماموں تو قطعاً نہیں تھا جیسا کہ ایلیٹ کا خیال ہے ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم، ص ۲۱۵۔ امیر خسرو بھی کئی جگہ اس کو خسرو خاں کا بھائی کہتے ہیں۔

رشتہ داروں اور حامیوں کو جمع کیا جو گجرات میں خاصے بااثر تھے اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ بہرکیف گجرات کے بعض طاقتور امرا نے اس کو گرفتار کر لیا اور دہلی بھیجدیا۔ لیکن قطب الدین نے اس کو سزا دینے کی بجائے دربار میں اس کو اپنے قریب جگہ دی۔ بادشاہ کی اس روش نے گجرات کے امرا کو خوفزدہ کر دیا اور ان کے دلوں میں تلخی اور نفرت پیدا کر دی۔ حسام الدین کے بعد گجرات کی گورنری ملک وحید الدین قریشی کے حصے میں آئی جس کو صدر الملک کا خطاب ملا تھا۔ وحید الدین ایک بلند با عزت خاندان کا فرد تھا اور سلطنت کے امرا میں سے ایک تھا۔[37] وہ گجرات پہونچا اور اپنی عظیم صلاحیتوں کے سبب اس برے ماحول کو ختم کیا جو حسام الدین کی سازشوں کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ قطب الدین اس کی انتظامی صلاحیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور دیوگیری میں ملک یک لکھی کی بغاوت کے بعد اس نے وحید الدین کو دہلی بلا یا اور اس کو تاج الملک کا خطاب عطا کیا۔[38]

**دیوگیری کی مہم** ملک نائب کافور کی موت کے بعد دیوگیری سلطنت دہلی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور رام دیو کا داماد ہرپال دیو نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ یحییٰ کے مطابق قطب الدین نے ۱۳۱۷ء میں دیوگیری پر پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے امرا نے اس کو تخت نشینی کے فوراً بعد اتنے دور دراز علاقے کی طرف جانے سے باز رکھا۔[39] ۱۳۱۸ء میں وہ بہرکیف ایک لشکر جرار کے ساتھ دیوگیری کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پہلے تو وہ دیوگیری کی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرے گا اور پھر بلائے تلنگانہ اور دوسرے دکنی حکمرانوں سے خراج وصول کرے گا۔ اس حقیقت کو قطعی نظر انداز کر کے کہ ہنگامی حالات میں پایۂ تخت میں ایک تجربہ کار اور طاقتور شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ سلطان نے شاہین کو جو گمنام اور معمولی قابلیت کا آدمی اور بادشاہ کا خسر تھا وفا ملک کا خطاب دے کر اپنی عدم موجودگی میں اس کو دہلی کا نائب سلطان مقرر کیا۔

---

۳۷۔ برنی، ص ۳۹۷

۳۸۔ جالور سے مبارک خلجی کا ایک کتبہ جو طغرا طرز میں کھودا گیا ہے۔ گجرات کے گورنر تاج الملک کے نام ظاہر کرتا ہے۔ کتبہ میں تاریخ ۵ محرم ۷۱۸ھ (۹ مارچ ۱۳۱۸ء) ہے۔ ایپی گرافیا انڈو مسلیکا ۱۹۲۷-۲۸ء، ص ۴۹-۵۰

۳۹۔ تاریخ مبارک شاہی، ص ۸۳

۴۰۔ فتوح، ص ۳۵۲-۳۵۳

جنوب کی سمت میں سفر میں بہت کم دقتیں پیش آئیں۔ اس سے پہلے کئی مہمیں بھیجی جا چکی تھیں اور دیوگیری کا راستہ بخوبی معلوم تھا۔ پہلی منزل تلپٹ میں ہوئی جہاں اور زیادہ سپاہی سلطان سے آکر ملے۔ وہاں سے قطب الدین نے پوری شان و شوکت کے ساتھ سفر شروع کیا اور کوچ بر کوچ کرتا ہوا دو مہینوں کی مدت کے اندر ہی وہ دیوگیری کے قریب پہونچ گیا۔[41]

جب شاہی افواج اس کی سلطنت کی حدود پر پہنچ گئیں تو ہرپال دیو اور آنجہانی راجہ رام دیو کا وزیر راگھو پہاڑوں میں فرار ہو گئے۔ وہاں راگھو نے دس ہزار کی بڑی زبردست فوج اکٹھا کی قطب الدین نے اک دم دیوگیری پر پیش قدمی کی اور کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے اس نے خسرو خاں کو ایک طاقتور لشکر کے ساتھ بھگوڑے بادشاہ اور اس کے وزیر کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ خسرو کی افواج کا ایک افسر قتلغ خاں راگھو کے بعض جاسوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا جن سے وہ راگھو کی فوج کی طاقت اور اس کے صحیح پتہ سے باخبر ہو سکا۔ خسرو خاں نے ایک پہاڑی میں مرہٹہ وزیر پر حملہ کیا اور اس کی افواج کو شکست فاش دی۔ وہ ہندو جنھوں نے آزادی کا اظہار کیا تھا یا تو مار ڈالے گئے، گرفتار ہوئے یا فرار پر مجبور ہوئے۔ راگھو جو اگرچہ شدید طور پر زخمی ہو گیا تھا گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ اس شاندار فتح کے بعد خسرو خاں بڑی سرعت سے دیوگیری کی طرف واپس ہوا کیونکہ بادشاہ نے اس کو فوراً طلب کیا تھا۔ اپنی واپسی کے سفر میں بہرحال وہ خوش قسمت تھا کہ راناہرپال دیو سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک شدید معرکے کے بعد اس نے اسے ہرا دیا۔ ہرپال دیو بہت زخمی ہو گیا تھا۔ اس کو گرفتار کر لیا۔ قطب الدین اپنے محبوب جنرل کی اس شاندار فتح پر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اس کا ایک سو خوشنما اعزازات کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ باغیوں کو سخت سزا دی گئی۔ ہرپال دیو کی زندہ کھال کھینچ لی گئی اور اس کی لاش دیوگیری کے دروازوں پر لٹکا دی گئی۔[42] سلطان نے کچھ مدت دیوگیری میں قیام کیا اسی دوران میں وہ مرہٹہ علاقے کو اپنے زیر نگیں لایا۔[43] اس نے گلبرگہ، اور دوار سمدر اور دوسرے مقامات[44] پر فوجی چوکیاں قائم کیں[45] اور ان میں موزوں افسر مقرر کیے۔

---

۴۱۔ فتوح، ص ۳۵۳

۴۲۔ نہ سپہر، ایلیٹ اور ڈاؤسن جلد سوم، ص ۵۹-۵۵۸

۴۳۔ برنی ص ۳۹۰

۴۴۔ قطب الدین نے دیوگیری میں ایک مسجد تعمیر کی جو فرشتہ کے زمانہ میں موجود تھی۔ فرشتہ ص ۱۲۵

۴۵۔ فرشتہ، ص ۱۲۵

## اسدالدین کی بغاوت

جب شاکرہ (ستمبر ۱۳۱۸ء) کے آغاز تک برسات کا موسم ختم ہوگیا اور خسرو خاں کو سلطنت تلنگانہ میں ایک فوج لے جانے کا حکم دیا گیا۔[۴۶] ملک یک لکھی کو جس نے علاءالدین کے عہد میں مدت تک نائب برید ممالک کے عہدہ پر کام کیا تھا۔ دیوگیری کا گورنر مقرر کرنے کے بعد خود سلطان دہلی کی طرف واپس ہوا۔ اس کا حرم اس کے ساتھ تھا اور جیسی کہ اس کی عادت تھی وہ موسیقی اور عیش و طرب میں سدا غرق رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے حال ہی میں ممتاز عہدے اپنے مصاحبوں کو دیے تھے جس پر اعلیٰ امرا ناراض ہو گئے۔ سلطان کی زندگی ختم کرنے کی ایک سازش کی گئی۔ اسدالدین جو ملک خاموش یغرش کا فرزند اور علاءالدین کا عم زاد تھا اس سازش کا سرغنہ تھا۔ اسد ایک بہادر، جوڑ توڑ والا اور با اثر شخص تھا۔[۴۷] اس نے بعض ہمت والے بدمعاشوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور انھوں نے وعدہ کیا کہ جب سلطان ساکون کی گھاٹی عبور کرے گا تو وہ اس کو قتل کر دیں گے اور اسدالدین کو تخت پر بٹھا دیں گے۔ قطب الدین کی خوش قسمتی سے جب وہ ساکون کی گھاٹی کی طرف آ رہا تھا تو خرم کھاجوری کے فرزند آدام شاہ نے جو جلال الدین کے زمانے سے وکیل در تھا۔ اس سازش سے سلطان کو باخبر کر دیا۔[۴۸] قطب الدین نے فوراً اسدالدین، اس کے اعزّہ اور دوسرے تمام سازشیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ تحقیقات ہوئی گرفتار شدگان مجرم پائے گئے اور فوراً قتل کر دیے گئے۔ اپنے باپ کے طرز عمل کے مطابق قطب الدین نے دہلی حکم بھیجا کہ یغرش کے خاندان کے تمام افراد جو تعداد میں انتیس تھے اور جو سب کے سب غالباً سازش کا کوئی علم نہیں رکھتے تھے اور بعض تو ان میں محض شیر خوار تھے قتل کر دیا جائے۔ یغرش کی دولت اور آمدنی بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور اس کے خاندان کی لڑکیوں اور خواتین کو سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔[۴۹] قطب الدین کا غصہ اس سفاکانہ قتل عام سے بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور اس نے ان تمام لوگوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا جن کا شاہی خاندان سے ذرا بھی تعلق ہو اور جو تخت کے ممکن دعویدار بن سکیں۔ جب وہ جھائن کے قریب پہنچا تو اس نے شادی کھتہ کو گوالیار بھیجا تاکہ وہ خضر خاں اور دوسرے شہزادوں کو جو وہاں

---

۴۶۔ عصامی، ص ۳۰۷

۴۷۔ فرشتہ، ص ۱۲۵

۴۸۔ تاریخ مبارک شاہی، ص ۸۴

۴۹۔ برنی، ص ۳۹۳

مقید تھے قتل کردے۔ بعد میں دارالخلافہ میں اپنی واپسی کے فوراً بعد اس نے اپنے خسر اور گجرات کے گورنر ظفر خاں کے قتل کا بھی حکم صادر کر دیا۔ قطب الدین کے ظالمانہ انتقام کا دوسرا شکار وفا ملک شاہین تھا جو دکن میں بادشاہ کی مہم کی وجہ سے دہلی میں اس کی عدم موجودگی کے زمانے میں نائب سلطان مقرر کیا گیا تھا۔

اگرچہ جو سرزنشیں دی گئیں وہ سخت اور بلا امتیاز تھیں لیکن کسی شمس الدین محمود شاہ کے نام پر ۷۱۸ھ میں ڈھالے گئے کرنسی سکوں کی دریافت یہ صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ بغاوت واقعی کافی خطرناک نوعیت کی تھی۔ دوگیری میں نہ صرف اسدالدین بلکہ دہلی کے لوگ بھی اس میں ملوث تھے۔ یہ سکے اس طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ دہلی میں ایک چھوٹا آدمی موجود تھا جس کے نام پر سکے ڈھالے گئے تھے اور یہ چھوٹا آدمی کون تھا۔ اسدالدین، شاہین، یا خضر خاں کا ایک بیٹا، جس کی تخت نشینی ابن بطوطہ کے مطابق سازش کا مقصد تھا؟ ؟[51] اس بغاوت کو بیان کرتے ہوئے ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ بعض امراء (وہ اسدالدین کا نام نہیں لیتا ہے) نے سلطان قطب الدین کے خلاف بغاوت کرنے اور خضر خاں کے دس سالہ بیٹے کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی[52] اس حقیقت کی کہ دیول دیوی سے خضر خاں کا ایک بیٹا تھا حاجی الدبیر[53] بھی تصدیق کرتے ہیں لیکن کوئی اور معاصر مورخ تائید نہیں کرتا۔ برنی کے مطابق خضر خاں تقریباً اسی عمر کا تھا جس عمر کا مبارک خلجی تھا[54] اس نے دیول رانی سے ۷۱۵ھ یا ۱۳۱۴ء میں شادی کی تھی۔ لیکن تصور کی کسی اڑان کے مطابق بھی ۷۱۸ھ میں اس کا دس سالہ بیٹا نہیں ہو سکتا تھا۔ مزید برآں خضر خاں اپنی آنکھوں کی روشنی سے محروم کر دیا گیا تھا اور قلعہ گوالیار کے ایک قید خانہ میں تنہائی کی زندگی گزا

---

۵۰۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۰ء، ص ۶۰۔ ۵۲۲ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۸۸۲ء ص ۵۷۔ ۱۷۳ راجرس (Rogers) کیٹلاگ آف دی کوئنس ان گورنمنٹ میوزیم لاہور، جلد دوم، ص ۱۰۔ ۱۰۹

۵۱۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، ص ۱۲۳

۵۲۔ ابن بطوطہ، جلد سوم، ص ۱۹۲

۵۳۔ ظفر الوالہ، ص ۸۴۱

۵۴۔ برنی، ص ۳۲۳

رہا تھا جہاں "صرف کھانا اور کپڑا ملتا تھا۔"[۵۵] ان حالات میں یقین کرنا مشکل ہے کہ خضر خاں یا اس کے بیٹے نے اگر کوئی اس کا بیٹا تھا بھی اس سازش میں کوئی حصہ لیا ہوگا۔ امیر خسرو کے بیانات ان کی لافانی مثنوی دیول رانی و خضر خاں میں بھی اسی نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ لہٰذا سکے پر کندہ خطاب جس کا اوپر ذکر آچکا ہے یقیناً یا تو اسد الدین کا رہا ہوگا یا وفا بیگ کا۔ اس قطب الدین کے ساتھ دکن میں تھا وہاں اس کو قتل کر دیا گیا تھا۔ چونکہ سکے دہلی میں ڈھالے گئے تھے لہٰذا وہ یقیناً ملک شاہین کے نام سے ہوں گے جو دہلی میں تھا اور جس کو بادشاہ نے وہاں اپنی آمد کے فوراً بعد قتل کروا دیا تھا۔

## خضر خان کی شہادت

سر سلحدار[۵۶] شادی کھتہ جھائن سے گوالیار پہونچا۔ اس کو علاء الدین کے تین بیٹوں خضر خاں، شادی خاں اور شہاب الدین کو قتل کرنے اور ان کے اصلی خاندان کو دہلی لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۵۷] ان شہزادوں کو پہلے ہی اندھا کر دیا گیا تھا اور ان کو صرف معمولی غذا ملتی تھی۔ امیر خسرو کے مطابق جو اسد الدین کی بغاوت کے بارے میں خبر لب ہیں سلطان نے خضر خان کے پاس ایک پیغام بھیجا جس کے تعلق میں ایک بیہودہ تہدید تھی لیکن آخر میں ایک بیہودہ درخواست تھی۔ قطب الدین نے لکھا کہ "تم نے آنکھوں کی روشنی اور جسم کی صحت کھو دی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ لیکن اب ظالم (ملک نائب) مر چکا ہے۔ اگر تم قید میں ڈال دیے گئے تھے تو اب تمھاری رہائی کا وقت آگیا ہے میں تم کو ایک صوبہ کا گورنر بنا دوں گا۔ اس عزت کے تم بالکل سزاوار ہو۔ بہر کیف تم کو دیول رانی کے عشق میں نہیں جلنا چاہیے۔ جو تمھاری بہر حال کنیز ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اتنی عزت حاصل کر لی ہے کہ تم اس کے قدموں پر اپنا سر رکھتے ہو۔ اگر وہ چاند کی طرح بھی خوبصورت ہو تب بھی وہ تمھاری پرستش کے لائق نہیں ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس کو تمھارے پاس نہ چھوڑا جائے۔ چونکہ وہ تم کو بادشاہ کی جانب سے مرحمت کی گئی تھی لہٰذا یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کو ہمارے پاس واپس بھیج دیا جائے۔ جب تمھارا پاگل پن (عشق) کم ہو جائے گا تو وہ تمھارے پاس پھر واپس بھیج دی جائے گی تاکہ وہ ایک کنیز کی

۵۵۔ ایضاً، ص ۳۹۲

۵۶۔ برنی، ص ۳۹۲؛ دیول رانی، ص ۲۷۵ (دیول رانی، ص ۲۷۷) میں ایک اور جگہ پر خسرو کہتے ہیں کہ وہ ایک پنج ہندو تھا۔ نیز فرشتہ ص ۱۲۵

۵۷۔ برنی، ص ۳۹۳

طرح تمہاری خدمت کرے؟"[58]

اس مطالبے نے بیکس شہزادے کی آنکھوں کو آنسوؤں سے اور دل کو غم و غصہ سے بھر دیا۔ اس نے یہ حجت پیش کی اس نے اپنی محبوبہ کے سوا اور ہر چیز کھو دی ہے لہٰذا یہ بادشاہ پر لازم ہے کہ وہ کم از کم دیول رانی کو اسی کے پاس رہنے دے۔ آخر میں خضر خاں نے کہا تھا کہ وہ اس کی جدائی پر موت کو ترجیح دے گا۔[59]

مختصر یہ کہ بادشاہ نے جس کو اپنے سوتیلے بھائی کو قتل کرنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش تھی۔ خضر خاں کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ قلعۂ گوالیار میں اس وقت دہشت اور بے چینی سی چھا گئی جب شادی کھتہ کی آمد کی خبر پھیلی۔ خضر خاں نے اپنی محبوب بیوی کو دل گداز الوداع کہی اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ امیر خسرو اور ابن بطوطہ شہزادوں کے قتل کا بہت دردناک بیان دیتے ہیں۔ مراکشی سیاح نے اس کے بارے میں گوالیار کے قاضی زین الدین مبارک سے مکّہ میں سنا تھا جو کہ قتل کے عینی شاہد تھے۔[60] قاضی کے مطابق خضر خاں کی ماں کو جو قلعہ میں موجود تھی ایک کمرے میں مقفل کر دیا گیا۔ قتل کے وقت خضر خاں کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے بآواز بلند رونا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی جلاد نے اس کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ اس بے رحمانہ قتل پر شادی خاں غصہ میں آگ بگولا ہو گیا۔ غصہ میں اس نے قاتل پر چھلانگ لگائی اور اس کو زمین پر گرا دیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ جلد ہی اس نے اور شہاب نے یہی جام پیا۔ ہر ایک کو اس کی باری پر قتل کر دیا گیا۔[61] شاہی خواتین کے رونے اور ماتم کرنے نے موقع کی نزاکت میں اضافہ کر دیا۔ قلعہ کے اس برج میں جو وجے مندر کے نام سے معروف ہے مردوں کو دفن کر دیا گیا۔ بالکل اسی طرح

---

۵۸۔ دیول رانی، ص ۲۷۳۔۷۵، حسام خاں کی سند پر حاجی الدبیر لکھتے ہیں کہ جب دیول رانی کے لڑکا پیدا ہوا تو خضر خاں سے اس کو طلاق دینے کو کہا گیا کیونکہ یہ دستور تھا کہ جب کسی شہزادی کے لڑکا ہوتا تھا تو اس کو اس کے شوہر سے جدا کر دیا جاتا تھا۔ خضر خاں دیول رانی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے اس کو الگ کرنے سے انکار کر دیا۔ دیول رانی کے لیے قطب الدین کے مطالبہ کا یہ سبب کسی اور مورخ نے نہیں دیا ہے اور وہ لچر معلوم ہوتا ہے۔ ظفر الوالہ، ص ۴۲ - ۸۴۱

۵۹۔ دیول رانی، ص ۲۷۵

۶۰۔ ابن بطوطہ، جلد سوم، ص ۹۳ - ۱۹۲  ۶۱۔ دیول رانی۔ ص ۸۵۔ ۲۸۴

جیسے ہیرے پتھروں میں چھپائے جاتے ہیں۔[61]

بدنصیب دیول کے بارے میں یہ ہے کہ اس کے شوہر کی موت کے بعد اس کی زندگی حیرت انگیز طور پر گمنام ہے۔ برنی صرف اتنا کہتا ہے کہ گوالیار میں مقیم تمام خواتین کو دہلی لایا گیا۔[62] وہ نہیں بتاتا کہ دیول دیوی کا کیا ہوا اور نہ خسرو بتاتے ہیں۔ حاجی الدبیر کا بہرحال بیان ہے کہ قطب الدین نے اس سے مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ ہر شخص نے اس کے اس فعل کی مذمت کی۔[63] فرشتہ بھی حتمی طور پر بیان کرتا ہے کہ قطب الدین نے خضر خان کی منکوحہ بیوی دیول دیوی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔[64] یہ ناممکن نہیں۔ قطب الدین بہت کم اخلاقی اصولوں کو مانتا تھا اور حکمران بادشاہ کا مردہ شہزادوں کی بیویوں پر قبضہ کر لینا اس زمانے کا عام دستور تھا۔ چند برسوں کے بعد خسرو خان کے ہاتھوں قطب الدین کا قتل ہوا۔ اس کے ساتھ دہلی کے معاملات انتشار کا شکار ہو گئے۔ برنی کے مطابق خسرو خان نے قطب الدین کی بیوی سے شادی کر لی۔[65] وہ یہ نہیں کہتا کہ وہ دیول دیوی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مبارک شاہ کی ملکہ خاص ہو گی۔ بعض بعد کے فارسی مصنفین اور چند جدید مورخین کا بہرحال یہ خیال ہے کہ وہ بدنصیب دیول دیوی تھی غالباً اس لیے کہ یہ المیہ اس کے نام سے وابستہ ہے۔ لیکن ان کے نتیجہ کی تصدیق کسی معاصر شہادت سے نہیں ہوتی ہے۔ دراصل اس شہزادی کے انجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں قسمت جس کی جان بوجھ کر دشمن بن گئی تھی۔

**قطب الدین اور نظام الدین اولیاء**

سلطان کی فطرت اتنی منتقمانہ تھی کہ چونکہ نظام الدین اولیاء خضر خان کے پیر تھے قطب الدین نے ان کی طرف سے اپنے دل میں عداوت کے جذبات پالنا شروع کر دیے۔[66] نظام الدین اولیاء ایک بہت ہی متقی بزرگ تھے۔ وہ اپنے تقدس اور دنیاوی علائق سے بیزاری کے لیے مشہور تھے۔ وہ علاء الدین خلجی سے کبھی نہیں ملے لیکن وہ ہمیشہ ان کی دعاؤں کا طالب رہا۔ اور ان کے خلاف اس نے کبھی ایک

---

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۸۷۔ خضر خان کی ماں اس کی موت کے بعد بہت طویل عرصے تک زندہ رہی اور ابن بطوطہ نے اس سے ۷۲۸ھ (۱۳۲۸ء) میں مکہ میں ملاقات کی۔ ابن بطوطہ، جلد سوم، ص ۱۹۴

۶۲۔ برنی، ص ۹۴ - ۳۹۳

۶۳۔ ظفر الوالہ، ص ۴۴ - ۸۴۱

۶۴۔ فرشتہ، ص ۱۲۵

۶۵۔ برنی، ص ۱۱ - ۴۱۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۹۶

لفظاً منہ سے نہیں نکالا۔[68] لیکن قطب الدین نے اپنے گھمنڈ میں ان کو علانیہ برا بھلا کہا اور اپنے امرا کو ان کی خدمت میں حاضری دینے سے منع کر دیا۔ انتہائی بدباطنی سے اس نے ایک ہزار تنکہ کا انعام اس شخص کو دینے کا اعلان کیا جو شیخ کا سر کاٹ لائے۔[69] اس نے شیخ نظام الدین کے سلام کا جواب دینے تک سے انکار کر دیا جب اتفاقاً شیخ ضیاء الدین رومی کے مقبرہ پر ان دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ اس نے شیخ زادہ جام کی جو مدتوں سے نظام الدین اولیا کے مخالف تھے سرپرستی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ نظام الدین کی مقبولیت ختم کرنے کے لیے اس نے شیخ الاسلام رکن الدین کو ملتان سے بلایا۔

اس طرح دیوگیری کی مہم کے بعد فیاضی اور فراخ دلی کی تمام خوبیاں جو قطب الدین کی اس کے عہد کے ابتدائی زمانے کی خصوصیات تھیں ختم ہو گئیں۔ درشت مزاجی نے اس کے دل ودماغ پر قبضہ کر لیا۔ گجرات اور دکن زیرنگیں ہو چکے تھے اور ملک میں کوئی آزاد سردار یا بادشاہ اتنا طاقتور نہ تھا کہ اس کے اقتدار کو للکار سکے۔ ملک کے اندرونی وبیرونی تحفظ نے اس کو مغرور بنا دیا۔ اسد خان کی ناکام سازش نے اس بے رحمی کا اضافہ کیا۔ اب نہ وہ کوئی مشورہ سنتا اور نہ کسی پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سازش ہی اس کو بے رحم اور بے اصول بنانے کے لیے ذمہ دار ہوتی تھی لیکن اس کی وقار کے منافی عادتیں خود اس سازش کے لیے ذمہ دار تھیں۔ اگرچہ اس نے مجرم اور معصوم دونوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا مگر اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ اس کے برخلاف اس کی عیاشی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ روم کے عیاش الاگیبلس (تیسری صدی عیسوی) کی مانند سلطان کی شہوت کنیزوں کے ایک طویل سلسلے[71] سے یا بے ریش غلاموں کی کثیر تعداد سے کبھی نہیں بجھتی تھی۔ وہ خود عورتوں کے کپڑوں کو پہننے کو ترجیح دیتا جو گوٹے کناری سے کڑھے اور ہیرے جواہرات سے آراستہ ہوتے تھے اور وقتاً فوقتاً وہ امرا کے گھروں میں رقص کرتا ہوا جاتا تھا۔ وہ نوخیز خواجہ سراؤں اور بے باک عورتوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا اور آوارہ عورتیں برہنہ دربار میں آتی تھیں اور اعلیٰ امرا مثلاً عین الملک ملتانی اور قرابیگ کے ساتھ فحش مذاق کرتی تھیں۔ گجرات کا ایک مسخرہ تو برسرعام امرا کو گالیاں دیتا تھا اور گندے

۶۸۔ ایضاً، ص ۳۳۲

۶۹۔ ایضاً ص ۳۹۶

۷۰۔ برنی، ص ۳۹۶

۷۱۔ گبن، رومی سلطنت کا زوال وسقوط، جلد اول، ص ۱۲۸

اور فحش مذاق سے ان کی بے عزتی کرتا تھا۔[72] مختصر یہ کہ قطب الدین کا دربار انتہائی بربریت اور شہوت رانی اور فحاشی کا منظر پیش کرتا تھا۔ یہ اس کی انتہائی خوش قسمتی تھی کہ منگولوں نے ہندستان کے دروازوں پر دستک نہیں دی اور سلطنت کے خلاف بغاوتیں سرعت سے دبا دی گئیں۔

**ملک یک لکھی کی بغاوت**

تقریباً جس وقت قطب الدین نے ملک وحید الدین قریشی کو گجرات کا گورنر بنا کر بھیجا اسی وقت یہ خبر آئی کہ ملک یک لکھی نے دیوگیری میں بغاوت کر دی ہے اور بادشاہت کے سارے لوازم اختیار کر لیے ہیں۔[73] سلطان غضبناک ہو گیا۔ اور فوراً ممتاز امراء کو حکم دیا کہ وہ دیوگیری پر فوج کشی کریں، یک لکھی کو گرفتار کریں اور اسے دہلی بھیج دیں۔ اس کے مطابق ایک بڑا لشکر افسروں مثلاً ملک تلبغا یغدا، شادی ستیلہ، تغلغ امیر شکار، ملک تاج الملک اور خواجہ حاجی کی قیادت میں بغاوت فرو کرنے کے لیے جنوب کی سمت سے روانہ ہوا۔[74]

ملک یک لکھی بے انتہا مغرور ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی طاقت مستحکم کرنے سے غفلت برتی۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کی فوج اس کی وفادار نہیں ہے اور جن افسروں اور سپاہیوں کو اس نے اپنی بغاوت کے دوران قید کر دیا تھا وہ اس کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ چنانچہ جب تقریباً دو ماہ بعد شاہی فوج دیوگیری پہونچی تو اس کے بہت سے افسر اور سپاہی شاہی لشکرگاہ میں آ گئے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ناگور ملک تلبغا، ملک نصیر الدین اور ملک شمس نے جن کو یک لکھی اپنا معاون تصور کرتا تھا ایک دن اس کو اور اس کے ہمنواؤں کو جو بری طرح نشہ میں دھت تھے گرفتار کر لیا۔[75] پھر انھوں نے یک لکھی اور اس کے ساتھیوں کو پابجولاں دہلی بھیج دیا۔ یہاں اس کی ناک کان کاٹ لیے گئے۔[76] اور اس کے ساتھیوں کو سخت سزا دی گئی۔ دیوگیری کی گورنری ملک

---

۷۲۔ برنی ص ۳۹۶

۷۳۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۸۴

۷۴۔ عصامی اور یحییٰ کے مطابق خسرو خاں کو یک لکھی کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن یہ غلط ہے۔ فرشتہ اور برنی دونوں صرف یہ کہتے ہیں کہ بعض ممتاز افسروں کو بھیجا گیا تھا۔ خسرو خاں پہلے ہی سے جنوب میں موجود تھا جو ورنگل کو فتح اور معبر کے شہروں کو تاراج کر رہا تھا۔ فتوح، ص ۴-۳۵۳؛ برنی، ص ۳۹۸

۷۵۔ فتوح، ص ۳۵۶

۷۶۔ ایضاً، ص ۵۷-۳۵۸

عین الملک ملتانی کو اور نائب گورنر کا عہدہ ملک مجیر الدین ابو رجا کو تفویض کیا گیا[۷۸] خواجہ علاء دبیر کے فرزند ملک تاج الملک کو اس کا دبیر مقرر کیا گیا۔ مختصر ہی مدت میں انھوں نے علاقہ بھر میں پوری طرح اقتدار بحال کر دیا[۷۹]

**خسرو خاں انتہائی جنوب میں**

اس بات کا بیان پہلے ہو چکا ہے کہ جب قطب الدین نے ہرپال دیو کی سرکوبی کے بعد دیوگیری کو چھوڑا تو اس نے جنوب کی دو دیگر سلطنتوں کے خلاف مہم جوئی کے لیے خسرو خاں کو نامزد کیا تھا۔ ان سلطنتوں نے سلطان علاء الدین کی موت کے بعد خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ اس کے مطابق خسرو خاں نے تلنگانہ پر فوج کشی کی۔ برنی جو جنگوں کے بیان میں ہمیشہ ناقص رہا ہے ان معرکوں کے بارے میں قطعی مہر بلب ہے جو خسرو خاں نے کاکتیا سلطنت میں لڑی تھیں۔ لیکن امیر خسرو خان کے کارناموں کا ایک شاندار اور بعض مقامات پر مبالغہ آمیز ذکر کرتے ہیں۔ شاہی فوج کی پیش قدمی کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوؤں اور ترک سپاہیوں نے برابر کی غارت گری پھیلائی تھی۔ راستے میں ہر آباد حصے کو ویران بنا دیا گیا۔ جب فوج وارنگل میں پہونچی تو ہندو باشندے افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاہی افواج شہر سے تین تیروں کے نشانے کے فاصلے پر خیمہ زن ہوئیں۔ خسرو خاں ایک بلندی پر چڑھا جہاں سے اس نے قلعہ کا جائزہ لیا۔ رائے کے سوار دس ہزار سے زیادہ تھے اور پیادوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ اپنی عددی برتری کے باوجود جنوب والے جنگ میں ایک چھوٹی سی مسلم سوار فوج سے مغلوب ہو گئے[۸۰] سونے اور ہیرے پر مشتمل کچھ مال غنیمت شاہی فوج کے ہاتھ لگا جس نے قلعے کے دروازوں تک دشمن کا تعاقب کیا اور تمام باغوں اور چمنوں کو جلا دیا چنانچہ بت پرستوں کی جنت جہنم کی مانند ہو گئی۔ دوسری صبح خسرو خاں نے قلعہ کی باہری فصیلوں پر حملہ کیا۔ جن میں شگاف پڑ گئے۔ ہندوؤں کی بڑی تعداد قتل کر دی گئی اور دوسرے بہت سے قیدی بنا لیے گئے۔ قلعہ کا خاص کمانڈر انیل مہتہ اس معرکہ میں کھیت رہا۔ بیرونی فصیلوں پر قبضہ کرنے کے بعد خسرو نے اندرونی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے مختلف مقامات پر دستوں کو تعینات کیا، خندقیں کھودیں اور بارود بچھائی۔ ان تیاریوں نے پرتاپ رودر دیو کو خوف زدہ

---

۷۹۔ برنی، ص ۳۹۸۔

۸۰۔ نہ سپہر، ایلیٹ اور ڈاؤسن، جلد سوم، ص ۵۶۰۔ مسلم سوار فوج کی تعداد تین سو بتایا ہے۔ فوجوں کی طاقت میں اتنا بڑا فرق ناقابل یقین ہے۔

کر دیا اور اس نے صلح کرنے کے لیے پیغامبروں کو بھیجا۔ وہ پانچ اضلاع حوالے کرنے پر تیار ہوگیا اور سو ہاتھیوں[۸۰] بارہ ہزار گھوڑوں اور بے شمار سونے، ہیرے اور جواہرات پر مشتمل کثیر خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ فتح کے نشہ میں سرشار شاہی جرنل نے راجہ کی بڑی اہانت کی۔ لیکن آخر میں اس نے دیے گئے اور فتح شدہ بیشتر علاقے واپس کر دیے سوائے بدرکوٹ کے قلعے کے جس کے مطالبہ میں خان کا ایک مقصد پوشیدہ تھا"۔

راجہ وارنگل کو شکست دینے کے بعد خسرو خاں نے معبر کی جانب پیش قدمی کی۔ برنی اور عصامی دونوں کے مطابق اس نے سوولی پٹم (مسلم مورخین کا پٹن جو موتو پلے کے قریب کرشنا کے دہانے پر واقع تھا) پر حملہ کیا اور وہاں خواجہ تقی نامی ایک دولتمند تاجر کو لوٹ لیا[۸۲] سراج تقی ایک بہت مالدار آدمی تھا۔ یہ سن کر کہ ایک مسلم فوج آرہی ہے وہ نہیں بھاگا تھا۔ خسرو نے اس کے ہیرے اور دولت لوٹ لی اور اس کو مار ڈالا۔ عصامی کا بیان ہے کہ خسرو خاں نے سراج تقی سے اس کی لڑکی کو اپنی خواہشات کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کیا تھا،[۸۳] لیکن بوڑھے مسلمان نے ایسی بے عزتی پر موت کو ترجیح دیتے ہوئے خودکشی کر لی۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

خسرو خاں نے اپنی پیش قدمی دریائے کرشنا کے دہانے تک جاری رکھی اور متھلی (موٹو پلے) پر حملہ کیا گیا[۸۴] بیس ہاتھی اور چھ درہم وزنی ایک قیمتی ہیرا اس کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعد جلد ہی وہ معبر کے علاقہ میں داخل ہوا[۸۵] لیکن سخت بارش اس کی راہ میں حائل ہوئی۔ اب اس کے پاس کثیر فوج اور وصول شدہ مال غنیمت کی خاصی مقدار تھی۔ اس نے اپنے آقا کے خلاف بڑے منصوبے باندھنا شروع کر دیے۔ جیسے کہ علاءالدین کے معاملے میں ہوا تھا دکن کی دولت نے اس کے حوصلے کو مہمیز لگائی تھی۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب خسرو خاں کاکتیا راجہ کے ساتھ معاہدہ کی شرائط طے کر رہا تھا تو اس نے "بدرکوٹ" کے قبضہ پر اصرار کیا تھا جو آسمان کی طرح بلند تھا اور جس کو خان نے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔[۸۶] اس نے منصوبہ بنایا تھا کہ ان تمام

۸۱۔ برنی، ص ۳۹۸ میں سو ہاتھی اور بعض مال غنیمت ہے۔

۸۲۔ برنی، ص ۹۹ - ۳۹۸؛ فتوح ص ۶۰ - ۳۵۹

۸۳۔ فتوح، ص ۳۵۹۔

۸۴۔ تاریخ مبارک شاہی، ص ۸۵

۸۵۔ ایضاً، ص ۸۵؛ بدایونی، رینکنگ، جلد اول، ص ۲۸۷

امراء کو قتل کر دے گا جن کا اعتماد اسے حاصل نہیں اور اپنی افواج کی مدد سے معبر پر حکومت کریگا۔ لیکن خسرو کے منصوبوں کا مملکت کے بہت سے خیر خواہ لوگوں کو علم ہوگیا اور ملک تمر مقطع چندیری ملک مل کرہ کے افغان، ملک بلیتا یغدا، ملک تغین اور ملک حاجی نائب عرض نے ایک دن خسرو سے علانیہ دہلی واپس چلنے کو کہا قبل اس سے کہ اس کے ارتقاء منصوبوں کا علم بادشاہ کو ہو۔ چونکہ یہ امرا اپنے زیر کمان بڑے بڑے دستے رکھتے تھے۔ خسرو خان نے ان کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کی اور واپسی کے لیے تیاری کرنے لگا۔ جب بادشاہ کو خسرو کے برے منصوبوں کی خبر دی گئی تو اس نے حکم صادر کیا کہ خسرو خاں کو فوراً دہلی واپس بھیج دیا جائے۔ دیوگیری سے خسرو کو ایک پالکی میں دہلی لے جایا گیا جہاں وہ ایک ہفتہ کی مدت میں پہونچ گیا۔ اس طرح عارضی طور پر شکوہ منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔

دہلی میں سلطان اس کو دیکھ کر انتہا سے زیادہ خوش ہوا اور کچھ سونے اور جواہرات اور سو ہاتھیوں کے مال غنیمت کو کافی بڑا مالِ غنیمت جانا۔ مایوس وزیر نے جب سلطان کو اس کے کارناموں پر اس قدر مسرور دیکھا تو اس نے ملک تمر اور ملک تلبغا کے خلاف جو دکن میں اس کے منصوبوں کی راہ میں روڑا بن کر کھڑے ہو گئے تھے شکایتیں کرنا اور الزامات لگانا شروع کر دیا۔ سلطان نے جو خسرو کی فریفتگی میں اندھا ہو رہا تھا مملکت کے ان بہی خواہوں کو ان کے کچھ کہنے سننے کا موقعہ دیے بغیر سخت سزائیں دیں۔ ملک تمر کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور اس کی جاگیریں خسرو کو دے دی گئیں۔ ملک تلبغا کی جس نے وزیر کا پردہ ذرا علانیہ فاش کیا تھا کھلے عام بے عزتی کی گئی اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی، اور اس کو قید کر دیا گیا۔ اس برملا بے انصافی کے افعال کے درباریوں کو بدظن کر دیا اور ان میں سے بہت سوں نے اپنے امتیازات اور عہدوں سے کسی نہ کسی بہانے سے استعفا دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کی سزاؤں کے خوف سے اس کے بعد کسی نے سلطان کو خسرو کی سازشوں سے آگاہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔

**قطب الدین کا قتل** اپنے دشمنوں کے اتنی تیزی سے زوال کے بعد وزیر کا کام آسان ہوگیا ملک تمر اور ملک تلبغا کے ساتھ کیے گئے بیرحمانہ سلوک اور درخواست قبول کر لی گئی اور خسرو کے گجراتی دوستوں اور رشتے داروں کی ایک بڑی تعداد دہلی پہونچ گئی۔ اس نے ان کو اپنے اعتماد میں لیا اور ان کو گھوڑے اور خلعتیں اور دولت دی۔ اس طرح فرشتے کے بقول وہ چالیس ہزار برواریوں کی ایک فوج جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ

سب کے سب اس کے وفادار اور حامی تھے ۔ وہ اپنی متوقع بغاوت کے سلسلے میں ان برودیوں کے سرداروں اور بعض دوسرے معتمد ساتھیوں مثلاً یوسف صوفی اور قیرط کے صاحبزادوں سے مشورے کیا کرتا تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں سلطان سرسوا گیا[91] اور برودیوں نے اس کو اس وقت قتل کرنے کا فیصلہ کیا کہ جب وہ شکار میں مشغول ہو۔ لیکن یوسف صوفی وغیرہ نے خسرو کو خبردار کیا کہ اگر انھوں نے سلطان پر اتنے کھلے عام حملہ کیا تو شاہی فوج اُن پر آ پڑے گی اور گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دے گی ۔ اس کے برخلاف اگر سلطان کو اس کے اپنے محل میں قتل کیا جائے اور امراء کو قید کر لیا جائے تو تخت کا راستہ بالکل صاف ہو جائے گا ۔ آخر کار یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ سلطان کو قصر ہزار ستون[92] میں ختم کیا جائے ۔ اس اثنا میں سلطان سرسوا سے لوٹ آیا اور مکار وزیر نے اس سے ایک اور رعایت مانگی ۔ اس نے کہا کہ وہ ہر رات محل اتنی رات گئے چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے ان رشتہ داروں کی صحبت سے محروم رہتا ہے جنھوں نے صرف اس کی خاطر اپنا وطنِ مالوف چھوڑا ہے ۔ لہٰذا اگر ان کو رات میں محل میں آنے کی اجازت مل جائے تو وہ وہیں آجایا کریں گے اور اس سے مل لیا کریں گے ۔ قطب الدین نے حکم دیا کہ محل کے دروازوں کی چابیاں خسرو کے آدمیوں کے پاس چھوڑ دی جایا کریں تاکہ وہ جس وقت چاہیں محل میں داخل ہو سکیں ۔ یہ برنی کا بیان ہے ۔ بہرکیف ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی ہندو اسلام قبول کرتا تو بادشاہ اس کو تحفے میں ایک خلعت اور ایک سونے کا زیور دیا کرتا تھا ۔ اس کے بیان کے مطابق خسرو خان نے سلطان سے گزارش کی کہ اس کے کچھ رشتہ دار اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن دن میں وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے شرماتے ہیں ۔ سلطان نے ان کو رات میں آنے اور آداب بجالانے کی اجازت مرحمت کر دی[93] ۔ جو بھی بہانہ ہو خسرو اپنے آدمیوں کے لیے رات کے وقت محل میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔

---

۹۰- فرشتہ ، ص ۱۲۷

۹۱- ۱۵۰ اترپردیش کے سہارنپور ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ۔

۹۲- ص ، ۳ - ۴۰۲

۹۳- ابن بطوطہ ، جلد سوم ، ص ۹۸ - ۱۹۷

محل کے دروازوں کی کنجیاں حوالے کر کے سلطان نے اپنی موت کا پروانہ برودریوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہر رات جب سونا پڑجاتا تو تقریباً تین سو پوری طرح مسلح برودری محل میں داخل ہوا کرتے تھے اور ادھر ادھر گھوما پھرا کرتے تھے۔ لوگ ان مسلح غنڈوں کو رات کی تاریکی میں آزادانہ محل میں داخل ہوتے دیکھتے تھے۔ لیکن ان کی حرکات و سکنات سے سلطان کو مطلع کرنے کی اس کے غصے کے خوف سے جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن سمجھ دار لوگ سب کچھ سمجھتے تھے اور خسرو خاں کی متوقع بغاوت کے بارے میں سرگوشیاں محل بھر میں ہو رہی تھیں۔ قاضی ضیاء الدین وکیل در سے نہ رہا گیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے یہ صورت حال بلا روک ٹوک جاری رہے۔ وہ سلطان کا خطاطی کا استاد رہ چکا تھا اور اس سے نسبتاً صاف صاف گفتگو کر سکتا تھا۔ ایک دن اس نے سلطان کو علانیہ خبردار کیا کہ محل میں کیا ہو رہا ہے۔ آزمودہ کار افسر نے گفتگو کا آغاز کیا کہ "مجھے عالی جاہ کے ترحمِ خسروانہ پر بھروسہ ہے اور میں وہ عرض کروں گا جو میں روزانہ دیکھتا ہوں۔ برودری محل میں روزانہ داخل ہوتے ہیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے ارادے ناپاک ہیں۔ عالیجاہ کی زندگی خطرہ میں ہے۔ مرحوم سلطان علاء الدین کے زمانے میں اگر کوئی شخص معمول سے زیادہ پانی بھی پیتا تھا تو سلطان کو اس کی خبر کی جاتی تھی۔ یہ بلاشبہ عجیب بات ہے کہ جب محل میں اس وقت عظیم شور و غل ہوتا ہے اور آپ کی زندگی بھی خطرہ میں ہے تو عالیجاہ اس قدر بے پروا ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ معاملے کی تحقیق فرمائیں۔ اگر کوئی گڑبڑ نظر آئے تو آپ فتنہ پردازوں کو سزا دینے کے لیے قدم اٹھائیں۔ اگر آپ کو الزامات بے بنیاد نظر آئیں تو خسرو کے لیے آپ کی محبت میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔"[94] اس پر سلطان مشتعل ہو گیا اور اس نے قاضی کو نازیبا الفاظ میں برا بھلا کہا۔ بجائے تحقیق و تفتیش کرنے کے اس نے اپنے محبوب درباری سے وہ سب کہہ دیا جو قاضی نے کہا تھا۔ خسرو فوراً مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا۔ اس نے کہا کہ "چونکہ عالیجاہ مجھ پر مراحمِ خسروانہ فرماتے ہیں اعلیٰ امرا حسد کی وجہ سے میری موت کے خواہاں بن گئے ہیں۔" قطب الدین نے مکار وزیر کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہی ایک تنہا شخص ہے جس پر سلطان کو پورا پورا بھروسہ ہے۔

اسی رات کافی دیر میں جب قاضی ضیاء الدین رات کے محافظوں کا افسرِ اعلیٰ دیکھ بھال

---

۹۴۔ برنی، ص ۴۰۷

کر دیا تھا اور بہت کم لوگ محل میں رہ گئے تھے۔ خسرو خان کا ایک رشتہ دار[95] رندھول چند برددیوں کے ساتھ محل میں داخل ہوا اور اس سے گفتگو کرنے لگا۔ اس نے قاضی کو ایک پان پیش کیا۔ وہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک دوسرے بروری جاہر یہ نے قاضی کے تیر مارا اور اس کو اسی جگہ ہلاک کر دیا۔ اس سفاکانہ قتل نے ہزار ستون میں دہشت پھیلا دی جو اب برددیوں سے بھرا ہوا تھا۔ قطب الدین نے اپنی خوابگاہ سے شور و غل سنا اور خسرو خاں سے کہا کہ وہ باہر جائے اور دیکھے کہ کیا معاملہ ہے۔ چالاک سازشی چھت پر نکل کر آیا زور سے چند الفاظ یہ دکھانے کے لیے کہے کہ گویا وہ کسی کو ڈانٹ رہا ہے۔ پھر وہ سلطان کی خدمت میں واپس آیا اور کہا کہ چند گھوڑے کھل گئے ہیں اور لوگ ان کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔[96] ٹھیک اسی وقت جاہر یہ سلطان کے نجی آرام گاہ کی طرف تیزی سے بڑھا اور اس کے محافظ ابراہیم اور اسحاق کو مار ڈالا۔[97] اب کہیں قطب الدین نے صورت حال کا احساس کیا اور بھاگ کر حرم میں جانے کی کوشش کی۔ لیکن خسرو خاں اتنا ہوشیار تھا کہ اس کو اس موقع پر نہیں چھوڑ سکتا تھا اس نے اس کو بالوں سے پکڑ لیا۔ سلطان نے اس رات بہت شراب پی تھی اور اپنے نشہ اور اپنی جسمانی طاقت کی وجہ سے اس نے غدار کو آسانی سے زمین پر گرا لیا اور اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا جاہر یہ وہیں پر پہونچ گیا اس کی نشان دہی اس کو خسرو کی چیخ پکار نے کر دی تھی جو سلطان کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔[98] اس نے قطب الدین کا سر قلم کر دیا اور اس کو محل کے صحن میں پھینک دیا۔ بادشاہ کے کچھ خدام بھی جو پہلی منزل پر رہ گئے تھے ہندوؤں کے خنجروں کا نشانہ بن گئے۔ تاریخ مبارک شاہی کے مصنف کے مطابق قطب الدین ۲۶ اپریل ۱۳۲۰ء (۵ ربیع الاول ۷۲۰ھ) کی رات میں قتل کیا گیا۔[99]

---

۹۵۔ برنی، ص ۴۰۹ میں ہے "نیای خسرو خاں" نیای کا مطلب ہے دادا نیز ماموں

۹۶۔ برنی، ص ۴۰۹

۹۷۔ برنی، ص ۴۰۷؛ فرشتہ، ص ۱۲۸

۹۸۔ برنی، ص ۴۰۸-۴۰۷؛ فتوح، ص ۳۹۳

۹۹۔ امیر خسرو اس کی تاریخ جمادی الثانی ۷۲۰ھ (جولائی ۱۳۲۰ء) دیتے ہیں۔ تاریخ مبارک شاہی کا متن ص ۸۶ ۷۲۱ھ غلط ہے لیکن مترجم کے مخطوطے میں ۷۲۰ھ کا صحیح سن ہے (تاریخ مبارک شاہی ترجمہ ص ۸۶) فرشتہ کی بھی تاریخ ۷۲۱ھ غلط ہے۔ نظام الدین اور بدایونی ۷۲۰ھ دیتے ہیں۔
(باقی اگلے صفحہ پر)

**مبارک شاہ کا جائزہ** جس طریقے سے قطب الدین کی موت واقع ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتنا ناعاقبت اندیش اور احمق تھا۔ فیاضی اور فرخدلی اوصاف جو اس کی ابتدائی تکالیف کا انعام تھے اس کے مطلق العنان اقتدار کے پاتے ہی رخصت ہو گئے اس کو بہت کم تعلیم ملی تھی اور تھوڑا بہت زندگی کا تجربہ جو اسے تھا اس نے اس تجربے سے یہ سیکھنے سے انکار کر دیا تھا کہ بے لگام عیاشی آخر کار تباہی کے غار کی طرف لے جاتی ہے۔ اس شخص کی خواہشات نفسانی نے اس کے وجود پر قبضہ کر لیا تھا اور اس نے ہر اس برائی پر عمل کیا تھا جو انسانی فطرت کو مسخ کر دیتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بادشاہ نہ نماز پنجگانہ ادا کرتا تھا اور نہ رمضان کے روزے رکھتا تھا۔

قطب الدین کی خودسری کی کوئی حد نہیں تھی۔ اپنے گھمنڈ میں وہ وحشیانہ سزائیں دیتا تھا اور وہ مظالم جو ہرپال دیو اور یغرش کے رشتہ داروں پر کیے گئے تھے اس کی مسخ شدہ ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں وہ اتنا خودسر اور کینہ پرور تھا کہ اس نے شیخ نظام الدین اولیا جیسے بزرگ کے سلام کا جواب دینے سے باز رہا۔ اور جب کہ علاء الدین جیسے عظیم حکمرانوں نے اپنے آپ کو صرف "یمین الخلافہ" (خلافت کا داہنا ہاتھ) یا "ناصر امیر المومنین" (مسلمانوں کا محافظ) سے مخاطب کروایا۔ قطب الدین نے اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اپنے آپ کو الامام الاعظم، خلیفہ رب العالمین، خلیفہ اللہ اور امیر المومنین کہلوایا۔[۱۰۱]

اس کو نہ صرف پرشکوہ خطابات اختیار کرنے کا شوق تھا بلکہ در اصل اس کو نئی اور خوبصورت چیزوں سے عشق تھا۔ اس کے سکے اور کتبات اپنی تحریروں کی وضاحت اور ڈیزائن کے تنوع کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ اس کے سکے گول اور چوکور ہیں اور وہ سونے، چاندی، اور سونے چاندی کی سلاخوں اور تانبے کے ہیں۔ چوکور سکے اس نے پہلی بار ۱۳۱۸ء میں جاری کیے۔[۱۰۲] اس کے کتبات

---

(بقیہ گزشتہ) بعد کے واقعات ہم کو اس نتیجہ تک لیجاتے ہیں کہ تاریخ مبارک شاہی کی تاریخ خسرو کی نہ سپہر کی تاریخ پر مرجح ہے۔ نیز ملاحظہ ہو اگلے باب کا آخری حاشیہ۔

۱۰۰۔ نیلسن رائٹ، مذکورہ بالا، ص ۸۵ - ۸۸؛ روجرس، کیٹلاگ آف کوائنس، ص ۴۷

۱۰۱۔ نیلسن رائٹ، ص ۹ - ۱۰۷؛ تھامس، کرونیکلز، ص ۱۷۸-۱۷۹؛ لین پول، محمڈن اسٹیٹس، ص ۴۸ - ۴۴

۱۰۲۔ نیلسن رائٹ، ص ۱۰۷

پراگندہ عبارتیں "اپنی قسم کے مزین نقش" خطِ ثلث میں اور "پیچیدہ انداز" کے طغریٰ میں ہیں۔[۱۰۳] اس نے علم کی سرپرستی کی، موسیقی کا شوقین تھا اور خود بھی اشعار موزوں کرتا تھا۔[۱۰۴] لیکن یہ حقیقت کہ بادشاہ کا رعب بالکل ختم ہوگیا تھا اور سلطنتِ دہلی کا وقار اس کے عہد میں خاک میں مل گیا تھا یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک نالائق بادشاہ تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جب تک اس نے حکومت کی کسی منگول حملے نے ملک کے امن و امان کو خطرے میں نہیں ڈالا، کسی قحط نے زمین تباہ و برباد نہیں کی، فوجی مہمات کامیاب رہیں اور بغاوتیں تیزی سے دبا دی گئیں۔ تاہم اس کے طریقوں نے امرا کو بدگمان کر دیا اور بغاوتوں کی حوصلہ افزائی کی — قطب الدین اس انجام کا بالکل سزاوار تھا جو اسے نصیب ہوا۔

---

۱۰۳۔ ایپی گرافیا انڈو مسلمیکا، ۱۹۱۴-۱۹۱۳، ص ۳۹-۳۸

ایضاً، ۲۸-۱۹۲۱، ص ۱۷۸، ایضاً، ۱۹۳۷، ص ۵۰-۴۹

۱۰۴۔ برنی، ص ۳۸۲؛ طبقاتِ اکبری، ص ۴۷۔

# باب 18

# ناصر الدین اور خسرو شاہ

## نسل اور حسب نسب

قطب الدین کے قتل نے خسرو خاں کو تخت شاہی پر رونق افروز ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ خسرو خلجی نہیں تھا۔ وہ گجرات کی برواری یا پرواری[1] ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ ضیاء الدین جو ایک نو مسلم کے تخت نشین ہونے کے خیال ہی سے متنفر ہے بادشاہ اور اس کے قبیلے پر ہر قسم کی لعن طعن کرتا ہے چونکہ اس کا مختصر عہد حکومت فتنہ و فساد سے بھرا ہوا تھا مورخ کی سب و شتم اور بھی زہریلی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ خسرو کو "نا فرمانبردار اور مکار، ناہنجار اور بد اصل" قرار دیتا ہے۔[2] "ایک بد ذات کینہ" اور اسی قسم کی لعن طعن برنی کے بیان میں بار بار آتی ہے۔[3] لیکن خسرو پر یہ محض ذاتی الزامات

---

۱۔ اس لفظ کے مختلف تلفظ قرون وسطیٰ کے مورخین نے دیے ہیں۔ برنی لکھتا ہے "برواد" اور "برواران" بدایونی بھی "براود" لکھتا ہے۔ خسرو "براود" کہتے ہیں، عصامی "پراڈ" اور کبھی "براوُ" کہتے ہیں۔ نظام الدین اور فرشتہ "بیدار" کہتے ہیں اور حاجی الدبیر کا املا "راؤ" ہے

۲۔ برنی، ص ۳۹۰

۳۔ ایضاً، ص ۳۹۱ ابن بطوطہ جو ایک غیر ملکی تھا اور مولانا ضیاء الدین برنی یا قاضی ضیاء الدین خاں کی نچلے طبقے کی نفرت کا فلسفہ اس نے نہیں سیکھا تھا، نہ تو خسرو کو برا بھلا کہتا ہے نہ اس کی ذات کو سب و شتم کا نشانہ بناتا ہے۔ بلاشبہ وہ خسرو کی یہ کہہ کر تعریف کرتا ہے کہ "خدائے قہار و جبار نے اس کے سلطان قطب الدین کے خلاف اس خاص خادم اس کے امرا میں اہم اور سب سے زیادہ طاقتور امیر کو ناصر الدین خسرو خاں کو کھڑا کر دیا۔" ایک دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ خسرو خاں قطب الدین کے مخصوص امرا میں

ہیں اس کے قبیلہ یا ذات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے جس سے اس کا تعلق تھا۔ برنی پر انحصار کرتے ہوئے عصامی، یحییٰ، نظام الدین اور دوسرے بعد کے فارسی مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ خسرو خاں گجرات کی ایک نیچی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے بیانات کو تسلیم کرتے ہوئے یوروپی علما، مثلاً برگس اور تھامس کا خیال ہے کہ پرواری بھنگیوں سے بھی بدتر تھے۔ برگس کہتا ہے کہ "پرواری ایک ہندو ذات سے خارج لوگ تھے جو ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے اور اتنے ناپاک تصور کیے جاتے تھے کہ شہر میں ان کو مکان بنانے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔"[۴] چونکہ برگس نے پروار اور پرواری کو ایک ہی خیال کیا ہے لہٰذا مولس ورتھ (Molesworth) نے پرواریوں کو نچلے طبقے کے افراد مانا ہے جو "خاص طور سے بطور چوکیدار و دربان، حال کے لازم رکھے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ڈھیڈا اور مہار کے مترادف تھے۔"[۵] لہٰذا تھامس نے برگس کی رائے سے اتفاق کرنا پسند کیا[۶]۔ ڈبلیو ہیگ نے بھی اپنے پیشروؤں سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ چالیس ہزار برواریوں کا دستہ جو خسرو خاں نے ترتیب دیا تھا اور جس کے بارے میں فرشتہ نے ذکر کیا ہے" وہ زیادہ تر اس کے اپنے ذلیل قبیلہ پر مشتمل اور پوری طرح سے اسی کے افراد کے زیر کمان تھا۔"[۷]

اس کے برعکس بعض یوروپی علما نے خسرو خاں کا تعلق راجپوتوں کی اعلیٰ ذات سے بتاتا ہے۔ چنانچہ جیمس برڈ اور بیلے (Bayley)[۹] کا خیال ہے کہ "بردولا" اور "پروار" پرمار

---

(بقیہ حاشیہ) سے تھا، وہ طاقتور اور خوبصورت تھا اور اس نے چندیری اور معبر کے علاقوں کو فتح کیا تھا جو ہندوستان کے ذخیرترین خطوں میں سے تھے۔" (ابن بطوطہ، ترجمہ مہدی حسین، ص ۴۵)

خسرو کے لیے قاضی ضیاء الدین خاں کی ناپسندیدگی اس بنا پر تھی کہ وہ ایک نو مسلم ہندو تھا۔ ملاحظہ ہو ابن بطوطہ۔ ص ۴۶

۴۔ برگس، فرشتہ، جلد اول، ص ۳۸۷

۵۔ مولس ورتھ، مراٹھی انگلش ڈکشنری، طبع دوم، ص ۴۹۲؛ اسٹینگاس، پرشین انگلش ڈکشنری، ص ۱۶۹، براؤن اس کے معنی دیتے ہیں سڑکوں پر جھاڑو دینے والا، خاکروب

۶۔ تھامس، کرونیکلز، ص ۱۸۲، حاشیہ

۷۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، ص ۱۲۳

۸۔ ہسٹری آف گجرات، ترجمہ مراۃ احمدی، ص ۱۶۷

۹۔ لوکل محمڈن ڈائنیسٹیز، گجرات، ص ۱۰۷، حاشیہ

(راجپوت) کے سوا اور کچھ نہیں اور وہ پروار کو پرمار سے گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔

اب یورپی مصنفین کے اخذ کردہ نتائج میں سے کوئی بھی قابل یقین نہیں ہے۔ کسی معصر مورّخ نے خسرو خاں کی صحیح ذات یا قبیلہ کو بصراحت نہیں بیان کیا۔ برنی اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بعد کے بعض مورخین بار بار خسرو کو برا بھلا کہتے ہیں اور اپنے ذاتی لعن طعن کے دوران وہ نیچ ذات کے الزام بھی لگاتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض ایسے واقعات ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ برواری بڑے دم خم اور آزاد طبیعت کے لوگ تھے۔ ایک معصر مصنّف امیر خسرو برواریوں کی ان کی بہادری اور قربانی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ شجاع اور بہادر تھے اور ان کو بطور محافظ دستوں کے ہندوستان کے راجہ ملازم رکھتے تھے جن کے لیے وہ جان دے دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔[10] برنی بھی محمد تغلق کے عہد میں گجرات میں تغی طاغی کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے "جان نثار کر دینے کے لیے تیار رہنے" کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کدی پٹن کے قریب تقریباً ایک سو باغوں نے سلطان کے محافظ دستے پر "بہادر فدائی برواریوں کی مانند جو اپنی زندگی اپنی ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں" حملہ کر دیا۔[11] برنی کے مطابق حسام الدین نے قطب الدین مبارک کے خلاف گجرات کے تمام ممتاز برواریوں کی مدد سے بغاوت کا منصوبہ بنایا تھا۔[12] "ممتاز بروار" نیچ ذات کے نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ہندو سماج میں نیچ ذات کبھی ممتاز نہیں ہو سکتی۔ فرشتہ کئی مقامات پر کہتا ہے کہ خسرو خاں گجرات کے پہلوانوں کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔[13] ابن بطوطہ بھی برواروں کی تعریف کرتا

---

۱۰۔ تغلق نامہ، ص ۱۹ اشعار ص ۳۹ - ۳۳۸

براده وصف ہندو لیست سباز + کہ ہم سر باز باشد ہم سرانداز

بود ایں طائفہ در پیش رایان + کہ جا بازند بر فرمانروایان

(برادہ ہندوؤں (کے ایک طبقہ) کی قسم ہے کہ جو اپنے سروں سے کھیلتے ہیں۔ وہ اپنے سروں سے کھیلتے ہیں اور دوسروں کے سر (زمین پر) گرا دیتے ہیں۔ یہ طبقہ راجاؤں کے آگے آگے پیش قدمی کرتا ہے یہ لوگ اپنی جان اپنے آقاؤں پر (ان کی ملازمت میں) دے دیتے ہیں)۔

۱۱۔ برنی، ص ۵۱۹ میں ہے: "برطریق فدائیان برواران جان را برکف دست نہادہ"

(وفادار برواریوں کی طرح وہ اپنی جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں)

۱۲۔ برنی، ص ۳۷۹: "بروا... نام گرفتہ" (ممتاز برواری)

۱۳۔ فرشتہ ص ۱۲۴، ص ۱۲۶۔

ہے اور کہتا ہے کہ "خسرو خاں نے ہندوستانیوں کی ایک فوج اکٹھا کی تھی جو بہادر ترین اور عظیم ترین سپاہیوں سے منتخب کی گئی تھی۔ اس کا بھائی خان خاناں ان میں سے ایک تھا"[۱۴] ان حالات میں یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ وہ ڈھیڈ اور ہیار کی نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ جنوبی ہند میں خسرو خاں کی فتوحات اور غازی تغلق کے خلاف اپنے رشتے داروں کے ساتھ اس کے سخت معرکے بصراحت ثابت کرتے ہیں کہ وہ کسی نچلے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔

لیکن اگر مذکورہ بالا نتیجہ صحیح ہے تو بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بروار پرمار جیسے اعلیٰ ذات کے تھے۔ کوئی معاصر یا بعد کا مورخ ایسا نہیں کہتا۔ حاجی الدبیر جس نے گجرات میں لکھا اور جس کو ملک کے اس حصے کی تاریخ کا خاص علم تھا۔ برنی کا ساتھ دے کر خسرو خاں کو نچلی ذات کا فرد بتاتا ہے۔ پروفیسر ہودی والا کی رائے صحیح ہے کہ "جس قبیلے یا ذات سے خسرو کا تعلق تھا اس کے صحیح نام کو متعین نہیں کیا جاسکتا"[۱۵] جو کچھ معلوم ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اور اس کے برواری ساتھی بہادر اور حوصلہ مند، چالاک اور بیباک تھے۔[۱۶]

معلوم ہوتا ہے کہ خسرو خاں بچپن میں مسلمان ہوگیا تھا اور اس کا نام حسن رکھا گیا تھا جب ۱۳۰۵ء میں عین الملک ملتانی نے مالوہ فتح کیا تو حسن اور اس کا بھائی اس کے ہاتھوں میں پڑگئے۔ شاہی دربار میں حسن سلطان علاء الدین کے نجی غلاموں کے دستہ کے لیے منتخب کیا گیا۔ اور ایک امیر ملک شادی کے سپرد کر دیا گیا۔ اسی کی نگرانی میں وہ پلا بڑھا۔[۱۷] جب قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہوا تو وہ نوخیز حسن کا بہت ہی گرویدہ ہوگیا اور اس نے اپنے عہد حکومت کے پہلے ہی سال خسرو خاں کا خطاب، وزیر کا عہدہ اور ملک کافور کے تمام امتیازات اور جاگیریں اس کو عطا کر دیں۔ خسرو خاں کو ترقی دینے میں قطب الدین نے علاء الدین کے تجربہ سے کچھ نہیں سیکھا

۱۴۔ ابن بطوطہ، جلد سوم، ص ۱۹۸

۱۵۔ ہودی والا، ص ۲۶۹

۱۶۔ برداریوں کی ذات پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو ہودی والا، ص ۷۱۔ ۳۶۹

۱۷۔ برنی، ص ۳۸۱

۱۸۔ "تاریخ محمدی (تکمیل شدہ ۱۴۳۸ء) کا مصنف لکھتا ہے کہ خسرو خاں کی تربیت علاء الدین کے دربار کے ملک شادی نے کی تھی۔ تاریخ محمدی، الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ۔ ورق، ص ۱۲۶

جس نے اپنے محبوب مصاحب ملک کافور کو غیر معمولی اعزازات سے نوازا تھا۔ جیسا کہ اوپر دیکھا جا چکا خسرو خاں قطبی حکومت کے لیے اسی طرح لعنت ثابت ہوا جس طرح ملک کافور علائی عہد حکومت کے لیے ثابت ہوا تھا

**تخت نشینی** قطب الدین کے قتل کے بعد خسرو خاں نے مملکت کے تمام بڑے عہدہ داروں مثلاً ملک عین الملک ملتانی جو اس وقت دیوگیری سے پہونچا تھا[19] ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جونا، ملک بہاء الدین دبیر اور قرا بیگ کے صاحبزادوں کو بلا بھیجا۔ اس نے اس رات ان کو نیم قید میں رکھا اور ان کو مجبور کیا کہ وہ اس سے وفاداری و اطاعت کا وعدہ کریں۔ جب وہ اس طرح اپنی طاقت مستحکم کر رہا تھا تو رندھول، حسام الدین جاہر اور خسرو خاں کے دوسرے حامی شاہی حرم میں داخل ہوئے اور خوفناک جرائم کا ارتکاب کرنے لگے۔ شروع میں انھوں نے مشعلوں کی مدد سے پوری خانہ تلاشی لینے کے بعد تخت کے ممکن دعویداروں کو یکے بعد دیگرے ختم کر دیا۔[20] فرید خاں، ابو بکر خاں اور علاء الدین تین کم عمر بیٹے تھے جن کے نام تھے علی بہار اور عثمان سفاکی سے قتل کر دیے گئے۔ قطب الدین اور شہاب الدین کی مائیں بھی قتل کر دی گئیں، اور حرم کی بہت سی پردہ نشینوں کی عصمت دری کی گئی۔ ضیا برنی کہتا ہے کہ ایسی وحشیانہ سزائیں معصوموں کو دی گئیں۔ دار حرب میں بھی کوئی کافر ان کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔[21]

کسی طرح کی مزاحمت کا سامنا نہ ہونے کی وجہ سے شاہ کش تخت پر رونق افروز ہوا۔ اس نے سلطان ناصر الدین خسرو شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے لوگوں کو خطابات اور اعزازات سے نوازا۔ اپنے بہت سے کاسہ لیسوں کو اور ان کو جنھوں نے اس کو تخت حاصل کرنے میں مدد دی تھی اعلیٰ منصب دیے۔ اس کے علاوہ اس نے بعض امراء کے قتل کے احکام صادر کیے جنھوں نے قطب الدین کے عہد حکومت میں عروج پایا تھا۔ رندھول کو رائے رایاں کا خطاب اور قاضی خاں کا گھر اور جائداد عطا کی گئی۔ قاضی کے بیوی بچوں نے ایک رات قبل فرار ہو کر اپنی جان بچا لی تھی۔ سلطان کے ایک بھائی حسام الدین کی شادی علاء الدین کی ایک دختر سے کر دی

۱۹۔ فرشتہ ص ۱۲۸

۲۰۔ تغلق نامہ، ص ۲۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۲ ~~۔ ۳۳~~

۲۲۔ برنی، ص ۴۰۸

گئی[۲۳] اور اس کو خان خاناں کا خطاب عطا ہوا۔ بہاءالدین دبیر کو اعظم الملک کا اور قیرط قمار کے فرزند کو شائستہ خاں کا خطاب ملا۔ دوسرے لوگ جن کو خطابات ملے ان میں تھے یوسف صوفی جو صوفی خاں ہوگیا، اختیارالدین سنبل تھا جو حاتم خاں بن گیا اور ملک کمال الدین صوفی جو وکیل در بنایا گیا۔ خسروان لوگوں کی بھی دلجوئی کرنا نہیں بھولا جو اس کے مخالف تھے چنانچہ عین الملک ملتانی کو عالم خاں بنایا گیا اور ملک فخرالدین جونا کو آخوربیگ مقرر کیا گیا۔ وزارت وحیدالدین قریشی کے سپرد کی گئی اور ملک قرابیگ کے عہدے اس کے صاحبزادوں کو تفویض کیے گئے۔ ہر شخص نے خوشی یا ناخوشی نئی حکومت کی اطاعت کر لی اور نئے بادشاہ کا مساجد کے منبروں سے بطور امیرالمومنین (مسلمانوں کا سردار) اعلان کیا گیا۔

**اسلام خطرہ میں؟**

قدامت پسند مولانا ضیاء الدین کے مطابق خسرو کی تخت نشینی نے "اچھے مسلمانوں" کے لیے ناقابل بیان مصیبت کے عہد کا آغاز کیا۔ وہ کہتا ہے کہ خسرو کی تخت نشینی کے پانچویں دن محل کے اندر بت پرستی شروع ہوگئی۔ خسرو شاہ نے قطب الدین کی (خاص) ملکہ پر قبضہ کر لیا اور برواریوں نے مسلمان لڑکیوں پر۔ قرآن کے نسخوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروالے گئے۔ ان پر وہ بت رکھے گئے جو مسجدوں کی محرابوں میں رکھے گئے تھے۔ مختصر یہ کہ کفر کا بول بالا تھا۔ مسلمانوں کو ایسی ذلتوں کا نشانہ بنایا گیا جن کی نظیر سلطنت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ سلطان نے ہندوؤں کی قوت اور وقار بڑھانے کا ارادہ کیا جن کی کثیر تعداد اس کے گرد جمع کر دی گئی۔[۲۴] خزانوں کے منہ کھول دیے گئے اور ان میں آزادی سے رقوم تقسیم کی گئیں۔ یہ سب مؤرخ ایک ایسے کٹر مسلمان کے جذبے سے لکھتا ہے جو کسی نومسلم کے تخت نشین ہونے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اس نے اس کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ مسلمان عورتوں اور بچوں پر سخت مظالم ڈھائے گئے ہوں۔

لیکن برنی کا بیان انتہائی مبالغہ آمیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض برواریوں نے محل میں بتوں کی پوجا کی اور قرآن کے نسخے پھاڑ ڈالے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان فاتحوں نے مندروں کو توڑا اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو جلایا تھا۔ جیسی صورت حال یہ تھی برواری مسلمانوں کو جیسے کا تیسا بدلہ دے رہے تھے۔ تخت حاصل کرنے میں ان کی مدد کا احسانمند ہونے کے سبب

---

۲۳۔ صبح صادق، بانکی پور مخطوطہ، ورق ص ۱۶۷۳

۲۴۔ برنی، ص ۴۱۱

جو کچھ انھوں نے کیا سلطان نے اس میں دخل نہیں دیا۔ یحییٰ کا یہ بیانِ بالکل صحیح ہے کہ "ہندوؤں (بلکہ برواریوں) نے ناصرالدین خسرو شاہ کے رشتہ دار ہونے کے زعم میں مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ ۔ ۔ ۔" ابن بطوطہ کی ایک صریح شکایت یہ ہے کہ خسرو خاں نے "ہندوؤں کے دستور کے مطابق گائے کی قربانی ممنوع کردی۔ کیونکہ ...... وہ گائے کی بڑی عزت کرتے ہیں۔" ۲۵ برنی کا یہ دعویٰ کہ خسرو شاہ نے ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی بالکل غلط ہے۔ خسرو نے اس وقت مذہب تبدیل کیا تھا جب وہ محض ایک لڑکا تھا۔ چنانچہ اس کا ہندو نام بھی ہم تک نہیں پہونچا۔ دکن میں اس نے جو جنگیں لڑیں ان میں وہ ہندو بادشاہوں اور باشندوں کے لیے اتنا ہی ظالم تھا۔ جتنا کہ کوئی مسلمان فاتح۔ وہاں اس نے ہندو مندر توڑے اور امیر خسرو اس ذلت و رسوائی کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جس کا نشانہ اس نے تلنگانہ کے راجہ کو بنایا تھا۔ نہ صرف خسرو نے بلکہ اس کے بھائی حسام الدین اور رشتہ داروں کی ایک تعداد نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ حقائق صاف ثابت کرتے ہیں کہ خسرو نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلمان تصور کیا۔ اس نے بغاوت اور قطب الدین کا قتل اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ "ہندو راج" قائم کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ سلطان سے اس کی انتہائی شہوت پرستی کے سبب نفرت کرتا تھا۔ ۲۶ اور اس لیے بھی کہ ملک کافور کی مثال سے حوصلہ پاکر وہ سیاسی طاقت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ بلاشبہ کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جو یہ ثابت کرسکے کہ اس کی روش یا رجحان اسلام دشمن تھا۔ برنی کسی جگہ یہ نہیں کہتا کہ ناصرالدین نے مسلمانوں پر مذہبی وجوہ کی بنا پر مظالم کیے تھے۔ دوسری طرف وہ تسلیم کرتا ہے کہ جب تک اس نے حکومت کی اس کا خطبہ مساجد کے منبروں پر پڑھایا جاتا رہا اور اس کے سکوں پر امیرالمومنین کا لقب کندہ کیا جاتا رہا۔ ۲۷ نئے مقرر کردہ افسروں کی فہرست سے بھی یہ صاف پتہ لگتا ہے کہ ان میں سے تقریباً بیشتر اس

۲۵۔ تاریخ مبارک شاہی، ص ۸۷؛ ابن بطوطہ، مہدی حسین، ص ۴۷

ناصرالدین کے نام نہاد مظالم کو بعد کے مورخین نے اور بھی مبالغہ آمیز بنا دیا ہے۔ نظام الدین کہتا ہے کہ خسرو نے مساجد کو برباد کرنے کا حکم دیا تھا (طبقات اکبری، ص ۱۸۷) یہ عجیب ہے کہ یہ "ظلم" اگر سچ مچ ہوا تھا تو برنی، عصامی اور امیر خسرو کی نگاہ سے کیونکر بچ گیا۔

۲۶۔ برنی، صفحہ ۳۹۱

۲۷۔ نیلسن رائٹ، مذکورہ بالا، ص ۱۰۴

کے پیشرو کے عہد حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے۔ بیشک ان میں سے بعض کو محض اس لیے ترقی دی گئی تھی کہ وہ خسرو کے حلیف تھے لیکن ایک چیز واضح ہے کہ رندھول اور ایک کے سوا بقیہ تمام برداری ناصر الدین کی تخت نشینی کے بعد پس منظر میں چلے گئے۔ نئے بادشاہ نے دہلی کے معتمد امرا پر بھروسہ کیا تھا اور ان کی خیر خواہی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اس قدر خواہاں تھا کہ اس نے اس کی مدد حاصل کرنے کے لیے شخصی انقلاب کی طرف بھی رجوع کیا تھا۔ راجدھانی میں اس نے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہونچانے والا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ صوبوں میں بھی اس نے مسلمان گورنروں کو بلا مداخلت کے رکھا تھا۔ اور جیسا کہ بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر اس انقلاب سے قطعی مطمئن تھے جو دہلی میں برپا ہوا تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ ملتان، سامانہ اور اجمیر کے گورنروں نے غازی تغلق کے خلاف جس نے اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ ہندو راج قائم کرنے میں خسرو شاہ کی مدد کی ہوگی۔ مزید برآں دہلی کی فوج نے خسرو شاہ کی جانب سے غازی ملک کے خلاف کبھی جنگ نہ لڑی ہوتی اگر انھوں نے خسرو کو ذرا بھی مسلمانوں کا دشمن سمجھا ہوتا۔ اگر عین جنگ کے دوران شاہی فوج کا کوئی حصہ تغلقوں سے جا ملا تو یہ صرف اس بنا پر ہوا کہ ناصر الدین کے مقصد کو ناکام ہونا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ ہندو مذہب کے علمبردار کو چھوڑ کر اسلام کے ایک علمبردار کی طرف چلے گئے تھے۔[۲۸] لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ وہ ناصر الدین کسی طرح مسلمانوں کے خلاف متعصب نہیں تھا اور برنی کا یہ الزام کہ اس کے عہد حکومت میں نہ مسلمانوں کا مذہب محفوظ تھا اور نہ ان کی عزت بالکل غلط ہے۔

## غازی تغلق کی مخالفت

ناصر الدین نے قطب الدین کو قتل اور شاہی خاندان کے شہزادوں کو شہید کر کے تخت حاصل کیا تھا۔ یہ بات فطری تھی کہ اس کے اس رویّہ نے رعایا کو اس کا مخالف بنا دیا ہو۔ اس جذبہ کا فائدہ بعض خواہشمند امرا نے اٹھایا جو مشکلات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان میں ملک فخر الدین جونا ممتاز تھا جو دہلی سے فرار ہونے اور اپنے والد غازی دیپالپور میں سرحدی چوکیوں کے محافظ سے جا ملنے کے برابر موقع

۲۸ - مزید ملاحظہ ہو اس سلسلے میں چوتھائی صدی قبل دہلی کے امرا کی علاء الدین کے ساتھ وابستگی۔ انھوں نے جلال الدین کے فرزندوں کا ساتھ اس لیے نہیں چھوڑا تھا کہ وہ علاء الدین کے مقابلے میں بے مسلمان تھے بلکہ اس لیے کہ ان کی تباہی کا مقدر ہو چکا تھا۔

کی تلاش میں تھا تاکہ غاصب کا تختہ الٹ سکے۔

امیر خسرو کے مطابق جنھوں نے متعدد بادشاہوں کی مدح سرائی کی تھی۔ غازی تغلق ان مظالم پر سخت ناراض تھا جو سلطان علاء الدین کے اہل خاندان پر ڈھائے گئے تھے اور خسرو شاہ سے انتقام لینے کے لیے وہ "سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا" لیکن وہ اس کے خلاف علانیہ علم بغاوت اس وقت تک نہیں بلند کر سکتا تھا جب تک اس کا نور چشم ملک جونا، راجدھانی میں تھا۔ ۲۹ فخر الدین دہلی کے حالات کے بارے میں اپنے باپ کو لکھتا رہتا تھا اور علی بغدی نامی ایک شخص کے ذریعہ دونوں کے درمیان پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ غازی تغلق نے اپنے بیٹے کو دیو پالپور پہنچنے کی نصیحت کی جہاں سے وہ بادشاہ کے خلاف مزاحمت منظم کرے گا۔ ملک جونا نے ایک دن اپنے چیدہ حامیوں کے ساتھ دیو پالپور کا رخ کر کے دربار کو حیرت میں ڈال دیا۔۳۰ اپنے فرار میں وہ اپنے ساتھ بہرام ایبہ کے لڑکے کو ساتھ لانا نہیں بھولا تھا۔ خسرو نے مفرور کے تعاقب میں قیرط قمار کے فرزند کی قیادت میں فوراً ایک لشکر بھیجا لیکن وہ تعاقب کرنے والوں کی نظر سے بچ کر بہ حفاظت سرسوتی (موجودہ سرسہ) پہنچ گیا۔ اپنی آمد پر اس نے دیکھا کہ اس کے باپ نے ملک سر تبہ کو وہاں پہلے ہی سے بھیج کر قلعہ بندی کر لی ہے۔

جب غیاث الدین کو اپنے بیٹے کے بارے میں تشویش دور ہو گئی تو اس نے اپنے جانی دشمن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے کام کا آغاز کیا۔ اس نے مختلف صوبوں کے گورنروں کے پاس خطوط بھیجے جن میں ان سے درخواست کی تھی کہ وہ خسرو کو تخت سے اتارنے میں اس کی مدد کریں کیونکہ وہ کافر ہونے کے ساتھ اپنے آقا کا نمک حرام مجرم ہے۔ یہ درخواست مسلمانوں سے کی گئی تھی کیونکہ تغلق کے خیال میں اسلام کا مفاد خطرے میں معلوم ہو رہا تھا۔" مذہب کے لیے بدلہ لینے کا نعرہ مسلمانوں کی تاریخ میں بہت عام ہے تاہم اتنا ہی مؤثر رہا ہے اب پھر سے شروع

۲۹۔ تغلق نامہ، ص ۶۴۔ ۶۲

۳۰۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ ملک جونا کو ناصر الدین کی طرف سے بہت انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر وہ کسی وجہ سے غیر مطمئن ہو گیا اور موقع پا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ان کے اس بیان کی تصدیق یحییٰ سے ہوتی ہے۔

تغلق نامہ، ص ۴۰، تاریخ مبارک شاہی، ص ۸۸

کیا گیا ۔[۳۱] بعض مقامات پر اس کی تائید ہوئی لیکن دوسرے مقامات پر شک و شبہ رہا ہے۔ علی الکاؤس امیر دیوپالپور اور بہرام ایبہ گورنر اچھ اس سے بہ رضا و رغبت آکر مل گئے۔ دو کھوکھر سردار گلچندا اور سہج رائے بھی تغلق کے پرچم کے نیچے آگئے ۔[۳۲] لیکن ملتان کے گورنر ملک مغلطی نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مدبر غازی نے ملتان کے عوام کو اس گورنر کے خلاف بغاوت کے لیے اکسا دیا اور مغلطی اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا ۔[۳۳] اسی طرح امیر سیوستان محمد شاہ نے جس کو اس کے اپنے امرا نے قید کر رکھا تھا غازی کے خط میں "اپنی رہائی کا تعویذ" پایا اور اس نے تغلق کے مفاد میں کام کا آغاز کیا ۔[۳۴] اجمیر کے گورنر ملک ہوشنگ نے حقیقی تعاون کے آثار دکھائے لیکن اس کے "عزم مصمم کے پیر موم کے تھے"۔ مالوہ، دھار اور اجین کے گورنر عین الملک نے کافی تامل کے بعد غازی کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ۔[۳۵] اور ملک یک لکھی تو صاف انکار کرنے سے مطمئن نہیں ہوا تو غازی کے خلاف اس نے پیش قدمی کی لیکن اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا ۔[۳۶]

اس طرح غازی ملک نے اپنے مددگاروں کا خیر مقدم کرنے اور اپنے دشمنوں کو راہ سے ہٹا لے کے بعد تخت کے لیے آخری آویزش کی تیاریاں کیں۔ برنی کے مطالعہ کی بنیاد پر ناصر الدین کو تخت سے اتارنے کی غازی ملک کی کوشش کو ان اسباب سے منسوب کرنا ممکن نہیں ہے اور اس کا جنگ کو ایک مذہبی رنگ دینا بھی قابل یقین نہیں ہے۔

اس مقدس مقصد میں مدد کرنے کی اس کی پرجوش درخواستوں پر ملتان سیوستان اور سامانہ کے گورنروں اور دہلی کے متعدد امیروں نے واضح طور پر انکار کر دیا تھا۔ ان کے رویہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ غازی ملک کے بلند بانگ دعوے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ مزید برآں غازی نے درخواستوں کے جواب خطوط صرف مغربی صوبوں کے گورنروں کو بھیجے تھے۔ اگر اس نے تمام ہندوستانی صوبوں کے گورنروں سے درخواست کی ہوتی تو اس کو بھی زیادہ مایوسی ہوتی؛ وہ صرف

---

۳۱۔ ترپاٹھی، سم آسپکٹس آف مسلم ایڈمنسٹریشن، ص ۵۶

۳۲۔ فتوح، ص ۳۶۹، ص ۳۷۲، ص ۳۷۵

۳۳۔ تغلق نامہ، ص ۶۳۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۶۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۶۔ تغلق نامہ، ص ۶۸۔ ۷۰

بہرام ایبہ تھا جس نے پوری دل جمعی کے ساتھ غازی کی تائید کی تھی اور اس کی نیت کا پتہ لگانا مشکل نہیں جب یہ یاد رکھا جائے کہ اس کا بیٹا ملک جونا کے قبضے میں تھا۔ غیاث الدین اسلام کا محافظ ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا تھا جب زیادہ تر گورنروں اور شمالی ہند کے لوگوں اور زمانہ کے سب سے بڑے مسلمان شیخ نظام الدین اولیا تک نے اس کا یہ دعویٰ کبھی تسلیم نہیں کیا؟ اصل یہ ہے کہ اپنے پرزور دعووں کے باوجود تخت کی خاطر لڑنے کے لیے ملک تغلق کے مقاصد دنیاوی تھے۔ اس نے ناصر الدین کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب اس کے بیٹے نے دہلی میں پائے جانے والے انتشار کے بارے میں پوری اطلاعات بھیجدی تھیں اور وہ اس سے بچ بچ دیو پالپور میں آ ملا تھا۔

دہلی میں بھی واقعات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ بالکل شروع سے خسرو کو غیاث الدین کی جانب سے بڑے خدشات لاحق تھے۔ صرف اس کو خوش کرنے کے لیے اس نے آخور بیگ کا اعلیٰ منصب اس کے بیٹے ملک جونا کو دیا تھا ۳۷۔ جب سے ملک جونا دربار سے فرار ہوا تھا التغلقوں کے اصل ارادے اور بھی طشت ازبام ہوگئے تھے اور مستقبل کے ہنگامی حالات کے لیے ناصر الدین نے اپنی افواج کو منظم کرنا شروع کردیا تھا۔ غازی ملک کی حکمت عملی کے سبب مختلف صوبوں میں پیدا ہونے والے واقعات کی خبر اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور ملک مغلطی اور ملک یک لکھی کی موتوں نے اس کو کافی ہوشیار کردیا تھا۔ اگرچہ خسرو نے دکن میں کئی جنگیں لڑی تھیں تاہم وہ آزمودہ کار سپاہی غازی کا جس نے منگول حملہ آوروں کے دلوں میں دہشت پیدا کردی تھی، مدمقابل نہیں تھا۔ خسرو شاہ نے اپنی فوج کی قیادت صوفی خان کو سونپی۔ اپنی ان فوجوں کے ساتھ جو اس کے پاس پہلے سے تھیں اور کچھ دوسری جن کو سونے کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ اس نے تغلق کے ساتھ لڑنے میں قسمت آزمائی کرنے کی تیاری کی۔ اس کی فوج کے ایک حصہ نے جو تقریباً چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا اس کے بھائی خان خاناں کی قیادت میں غازی ملک کو ابتدائی مرحلے ہی میں روکنے کے لیے پیش قدمی کی۔ انھوں نے سرستی پر فوج کشی کی لیکن اس پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔ پھر وہ دیو پالپور کی جانب بڑھ کر

---

۳۷۔ ظفر الوالہ، ص ۸۴۸

ابن بطوطہ کہتا ہے کہ خسرو شاہ کی تخت نشینی کے وقت "سب نے اس کی اطاعت کرلی اور اس کو تسلیم کرلیا سوائے تغلق شاہ کے . . . وہ اس وقت دیو پالپور میں ایک امیر تھا . . . . . جب خسرو کا خلعت اس کے پاس پہنچا تو اس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور اس پر بیٹھ گیا۔" ابن بطوطہ، مہدی حسین، ص ۴۷

غیاث الدین سے وہیں جنگ کریں۔ حریف فوجوں کا تصادم دبھالی یا دیلی کے قریب جو اس زمانے میں سرسوتی اور دیپالپور کے درمیان ایک گاؤں تھا، ایک کھلے میدان میں ہوا۔ ایک معمولی جھڑپ کے بعد شاہی افواج کے پیر اکھڑ گئے اور وہ افراتفری کے عالم میں فرار ہو گئے۔ ان کا نوجوان کمانڈر اپنے پیچھے ہاتھی، گھوڑے اور خزانے چھوڑ بھاگا۔ ان پر فاتحوں نے قبضہ کر لیا۔ شکست خوردہ سپاہ کی ایک بڑی تعداد قیدی بنا لی گئی۔ اس زبردست المیہ کی خبر سلطان کو دی گئی۔ اس نے اس کی ہمت توڑ دی اور اس کے حامیوں کو خوفزدہ کر دیا۔

اس جنگ کے اختتام پر غازی تغلق نے اپنی افواج کو آخری معرکہ کے لیے پھر سے منظم کیا۔ اب اس کے مالی وسائل کافی اطمینان بخش ہو گئے تھے۔ جب وہ دیپالپور میں تھا اس کو گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کے ایک کاروان کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ سلطان دہلی کے لیے جا رہا تھا، اس نے اسے راستے ہی میں لوٹ لیا تھا۔[۳۸] اس کے علاوہ سرسوتی کے قریب لڑی جانے والی جنگ میں اس کو کافی مال غنیمت ملا۔ جہاں تک اس کی جنگجو افواج کا تعلق تھا وہ شمال مغرب کے بہادر سورماؤں پر مشتمل تھی وہ اس کی ملازمت میں گزشتہ کئی برسوں سے تھے اور وہ ان کی وفاداری پر کامل اعتماد کر سکتا تھا۔ اس کی افواج کا میمنہ اس کی بہن کے بیٹے بہاؤالدین کے زیر کمان تھا اور اس نوجوان جنرل کی مدد کے لیے اچھ کے بہرام ایبہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ میسرہ ملک جونا کے ماتحت تھا اور اس کے ساتھ دو دوسرے مشہور جنگی سورما شہاب غوری اور میر شادی تعینات کیے گئے تھے۔ قلب کی کمان خود بہادر تغلق کے ہاتھ میں تھی۔ اپنی افواج کی اس طرح ترتیب دے کر غازی تغلق کوچ پر کوچ کرتا ہوا دہلی کے قریب پہنچا اور اندرپت میں رضیہ کے مقبرے کے قریب خیمہ زن ہوا۔

خسرو شاہ بھی اپنی جانب سے تخت یا تختہ کے لیے تیار ہو گیا ــــــ غازی تغلق کی مال غنیمت کی محبت سے واقف ہو چکے تھے۔ برنی کئی مقامات پر دعویٰ کرتا ہے کہ وہ لالچی تھا۔[۳۹] فطری طور پر خسرو خاں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دہلی کی دولت اس کے ہاتھ لگے۔ وہ تمام خزانے دہلی اور کیلوگھڑی سے نکال لایا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو فراخدلی ہو کر انعامات دیے اور

۳۸۔ تغلق نامہ، ص ۷۷

۳۹۔ برنی، ص ۴۱۷، ص ۴۱۸۔ ص ۴۴۰

قلعہ میں ایک پیسہ نہیں چھوڑا اور پھر اس نے شاہی خزانہ کے تمام حسابات کے کاغذات اور دستاویزیں ضائع کر دیں۔[۳۹] اس نے اپنے سپاہیوں کو ڈھائی ماہ کی تنخواہ بطور بھتہ دی اور ان میں کسی طرح کی بے اطمینانی کو پھیلنے سے روکنے کے لیے تمام ذرائع اختیار کیے۔ لیکن غازی کی فتح کے بارے میں لوگ اتنے پر اعتماد تھے کہ بہت سے سپاہی جنھوں نے خسرو کا سونا قبول کر لیا تھا لڑنے کا خیال ترک کر کے گھروں کو چلے گئے۔ بلاشبہ دہلی کی پست ہمت فوج ان قوی ہیکل اور مضبوط سپاہیوں کا مدمقابل نہیں تھی جو ملک کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور جن کے نزدیک موجودہ جنگ ایک قسم کا جہاد تھی۔[۴۰] اسی انتہائی مصیبت کے وقت ناصرالدین نے ایک جنگی مجلس مشاورت منعقد کی اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دوسرا کوئی باعزت طریقہ نہیں تھا لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ آخری دم تک لڑا جائے۔

سلطان اپنے امرا اور حامیوں کے ساتھ سیری سے باہر نکلا اور حوض علائی کے قریب خیمہ زن ہوا۔ عصامی خسرو کی فوج کی صف بندی اور ترتیب کی تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ سلطان خان خاناں اور مالدیو،[۴۲] راجہ چتوڑ نے قلب میں مختلف مقامات سنبھال لیے۔ سنبل جس نے حاتم خاں کا خطاب اور امیر حاجب کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ میمنہ کی قیادت پر متعین ہوا۔ صوفی خاں اس کا نائب بنایا گیا۔ میسرہ شایستہ خاں، بلغا تاگوری اور رندھول کے زیر کمان تھا۔[۴۳] اس طرح اپنی افواج کو مرتب کر کے ناصرالدین نے ایک بہت مفید جگہ پا لی تھی جو اندرپت سے جہاں غازی خیمہ زن تھا۔ زیادہ دور نہیں تھی۔ اس کی پشت پر دہلی کا دیو ہیکل قلعہ تھا جس پر وہ ہنگامی حالت میں سامان رسد کے لیے تکیہ کر سکتا تھا اور اس کے سامنے بہت جھاڑیاں اور باغ تھے جو اس کو شدید حملے سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ لیکن اس کی جائے قیام کا فائدہ عین الملک کی غداری سے خاک میں مل گیا جس نے جنگ سے ایک رات پہلے دھارا اور اجین کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ چھوڑ جانے سے خسرو کا دل ٹوٹ گیا اب اس کو اپنے اردگرد تباہی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔

---

۴۰۔ ایضاً۔ ص ۴۱۸

۴۱۔ ایشوری پرشاد، قرونہ ترکس، جلد اول، ص ۱۳

۴۲۔ عصامی اس کا نام نہیں ذکر کرتا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ وہ مالدیو تھا جس کو علاء الدین نے خضر خاں کے چلے آنے کے بعد چتوڑ میں گدی نشین کیا تھا۔ مالدیو کا انتقال ۱۳۲۱ء میں ہوا۔

۴۳۔ فتوح، ص ۲۵ - ۳۶۳

## خسرو کی شکست اور موت

جمعہ کا دن تھا جب دونوں فوجوں کے درمیان لہراوت کے میدان میں رن پڑا یہ ایک گاؤں تھا اور اب ناقابل تعین ہے لیکن اس زمانے میں یقیناً وہ دہلی اور حوض خاص کے درمیان ہوگا۔ خسرو شاہ نے "بذات خود" اپنی افواج کی قیادت کی۔ جنگ کا آغاز ایک سخت معرکہ سے ہوا جس میں شاہی افواج نے غازی ملک کی افواج کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ ابن بطوطہ کے مطابق غازی تغلق کے لیے یہ بدترین لمحہ تھا جب اس کے پاس صرف تین سو سپاہی رہ گئے تھے۔ لیکن اس موقعہ پر خسرو خاں کے سپاہیوں نے تغلق کے لشکرگاہ کو لوٹنا شروع کر دیا۔ سلطان کے پاس "چند آدمیوں کے سوا کوئی اور نہیں رہ گیا" اس معرکہ میں ناصرالدین کے پکے ساتھیوں میں سے ایک ملک تلبغا ناگوری مارا گیا اور شائستہ خان قرط قماز کا لو کا میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ اگرچہ اپنے فرار کے دوران وہ غازی کے لشکرگاہ کو لوٹنا نہیں بھولا۔ ان نقصانات کے باوجود خسرو خاں شام تک جما رہا اور بہادری جانبازی کے ساتھ لڑتا رہا۔ اس کی زبردست مدافعت نے غازی ملک کو ایک جلد فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے اکسایا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا اور ان کو بھرپور طاقت سے حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس کی پرجوش ترغیب کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اس کے تقریباً تین سو وفادار اور چیدہ سوار اپنے حریفوں پر باز کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اس حملہ کی شدت نے ناصرالدین کی صفوں میں ناقابل تلافی شگاف پیدا کر دیا۔ دہلی کی فوج کو کمر توڑ شکست ہوئی اور وہ افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑی ہوئی۔

خسرو شاہ نے جنگ ہار دی تھی۔ یہ احساس کر سب کچھ ختم ہو گیا اس نے میدان جنگ چھوڑا اور تلپت کی طرف نکل گیا۔ پورے ایک دن کی جنگ نے اس کو تھکا مارا تھا اور وہ آرام کا طالب تھا۔ جب رات آئی تو وہ اپنے بچپن کے سرپرست ملک شادی کے باغ میں چھپ گیا۔ رات بھر وہ وہاں چھپا رہا لیکن دوسرے دن انھوں نے اس کو پکڑ لیا اور اس کا سر قلم کر دیا۔ یہ برنی کا بیان ہے۔ امیر خسرو بھی اسی طرح کا بیان دیتے ہیں۔ لیکن ابن بطوطہ کا بیان ذرا مختلف اور زیادہ مفصل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خسرو نے کامیابی سے اپنے آپ کو ملک شادی کے باغ میں چھپا لیا تھا۔ لیکن جب وہ بھوک کی شدت برداشت نہ کر سکا تو اس نے کچھ کھانا لانے کے لیے مالی کو اپنی انگوٹھی دی۔ انگوٹھی نے مالک کا نام و نشان بتا دیا اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ غازی ملک نے پہلے خسرو کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا لیکن بعد میں حکم دیا کہ اس کو اسی جگہ قتل کیا جائے جہاں

اس نے قطب الدین کو مروایا تھا اور اس کی لاش محل کے صحن میں اسی طرح پھینک دی جائے جیسے اس نے مبارک شاہ کے مردہ جسم کو پھینکا تھا۔ امیر خسرو کے مطابق ناصرالدین سنیچر ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء یکم شعبان ۷۲۰ھ کو قتل کیا گیا۔[۴۵]

اس طرح چار ماہ اور کچھ دنوں کی بے چینی کی حکومت کے بعد ناصرالدین خسرو مر گیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز کی زندگی گزاری تھی۔ مالوہ کی فتح کے دوران گرفتار کیے جانے کے بعد اس نے اپنی زندگی ایک غلام کی حیثیت سے شروع کی۔ اس ادنیٰ حیثیت سے وہ جانبداری اپنی چالاکی، عیاری اور صلاحیت کے سبب ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ پر ترقی کرتا رہا۔ اور آخر کار بادشاہ کے بلند ترین مقام پر پہنچ گیا۔ قدامت پسند برنی جس کے نزدیک نیچ ذات کافر زمین پر شیطان سے کم نہ تھا، خسرو شاہ ہر قسم کی لعن طعن کرتا ہے۔ لیکن دوسرے مؤرخین جیسے امیر خسرو، یحییٰ حتیٰ کہ قدامت پسند بدایونی اس کی مناسب تعریف کرتے ہیں۔ اس نے تخت ان عیارانہ مگر قابل تعریف ذرائع سے حاصل کیا تھا جو اس کی منصوبہ بندی، ذہانت اور طباعی کے لیے ہماری تعریف کے مستحق ہیں۔ ایک بار جب اس نے تاج حاصل کر لیا تو اس نے اس کو اپنے بس بھر طاقت سے برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی غلطی نہیں تھی کہ اس کا عہد حکومت اتنا مختصر تھا ــــ اس کی تنہا غلطی بس یہ تھی کہ اس نے ایک ایسے طبقۂ امراء اور فوج پر بھروسہ کیا تھا جو چڑھتے سورج کی پوجا کرنے اور ایک کمزور داعیہ کا ساتھ چھوڑ جانے کی عادت تھی۔ اپنے مددگاروں کی طرف سے دھوکہ دیے جانے اور اپنے سپاہیوں کے چھوڑ دیے جانے کے

---

۴۵۔ امیر خسرو کی بیان کردہ تاریخ بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ سکوں کی شہادت ظاہر کرتی ہے کہ غیاث الدین تغلق ۷۲۰ھ میں تخت نشین ہوا ۷۲۱ھ میں نہیں جیسا کہ یحییٰ اور فرشتہ کہتے ہیں۔

نیلسن رائٹ، مذکورہ بالا، ص ۱۵-۱۱۲

تھامس، کرونیکلز، ص ۱۵۸، ص ۸۲-۷۶

برنی کے مطابق ناصرالدین نے چار ماہ بعد پندرہ دن حکومت کی۔ چنانچہ شعبان کی ابتدا میں چار ماہ اور پندرہ دن پورے کرنے کے لیے وہ ربیع الاول میں کسی وقت تخت نشین ہوا ہوگا۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ یحییٰ کی بیان کردہ ناصرالدین کی تخت نشینی کی تاریخ ۵ ربیع الاول ۷۲۰ھ / ۱۵ اپریل ۱۳۲۰ء) اور اس کی موت کی امیر خسرو کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۰ھ / ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء) سب سے زیادہ صحت کے قریب ہیں۔

باوجود وہ میدانِ جنگ میں لڑائی کے آخری لمحہ تک ڈٹا رہا اور ایک ایسے صبر و اطمینان کے ساتھ اپنی بقیہ فوج کی قیادت کی جو ہماری تعریف کی سزاوار ہے۔ خسرو کے آخری ایام اس کی ابتدائی زندگی کو معاف کر دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ اس نے بڑی ذلت و رسوائی کی زندگی گذاری تھی۔ لیکن موت اک سپاہی کی پائی۔

# باب 19

# خلجیوں کے عہد میں تہذیبی سرگرمی

گزشتہ صفحات میں خلجی خاندان کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا گیا ہے جو تیس سال کی مختصر مگر واقعات سے بھرپور مدت پر مشتمل ہے۔ اس پورے زمانے پر علاءالدین کی شخصیت چھائی رہی۔ جنگ میں اس کی بہادری نظم و نسق کے میدان میں اس کی ہمت کی ہم پلہ تھی۔ وہ اشخاص اور فرسودہ روایات کا احترام کرنے والا نہیں تھا اور اس کی عملی ذہانت نے اچھے اور کارگزار حکومت کی راہ سے ان دشواریوں کو ہٹا دیا تھا جن کو تنگ نظر ذہنیت حائل کرنا چاہتی تھی۔ خلجیوں کے دورِ حکومت میں تقریباً پورا ہندوستان دہلی کی فرمانروائی کے زیرِ نگین آ گیا تھا اور ہندوستان کا سیاسی آدرش جس کو پہلی بار موریہ حکمرانوں نے عملی جامہ پہنایا تھا دوسری بار پھر حاصل کیا گیا۔ ہندوستان کو منگولوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ کر لیا گیا جو سیلاب کی مانند ایشیا اور یورپ میں اپنے آگے کی تمام رکاوٹوں کو توڑتا چلا جاتا تھا۔

اسی طرح خلجی خاندان کے سیاسی کارنامے بلاشبہ عظیم تھے۔ لیکن فن اور تہذیب کے میدان میں بھی اس کے کارنامے کچھ عظیم نہیں تھے۔ بلاشبہ اسی عہد میں ان کوششوں کی بنیاد ڈالی گئی تھی جنھوں نے سماج اور تہذیب پر گہرے اور پائیدار اثرات ڈالے۔ خلجیوں کے عہدِ حکومت کی تہذیبی سرگرمیوں کے مطالعہ سے اس کی کافی تصدیق ہو جائے گی۔

**فنِ تعمیر**

اسلام کی آمد نے ہندوستانی تہذیب میں ایک نئے طبقہ کو روشناس کرایا تھا۔ جب فوجی تصادم ختم ہوا تو سیاسی اور سماجی تقاضوں نے دوستی اور تعاون کی

ایک نئی فضا پیدا کردی۔ رفتہ رفتہ ایک نیا امتزاج پیدا ہوا جس نے ہند اسلامی تہذیب کو جنم دیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ سماجی ہو یا ذہنی، عادات و رسوم ہوں یا فن اور ادب، فاتحوں اور مفتوحوں نے ناگزیر طور پر ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ اور تیرھویں صدی کے اختتام اور چودھویں صدی کے آغاز تک ہندوستان اپنے تہذیبی نظریہ میں تبدیلی کا مشاہدہ کرنے لگا۔

پر خوں ریز جنگوں اور ہندو اور جین مندروں کی تباہی میں ترک حکمرانوں کی ایک تعمیری خواہش بھی مضمر تھی جو ان کی تعمیر کردہ عظیم عمارتوں میں بہت ممتاز طریقے سے رونما ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے اپنا تعمیری سامان ہندو مندروں سے حاصل کیا لیکن بعد میں جب مسلم اقتدار مستحکم طور پر قائم ہوگیا تو انھوں نے اپنے خاکے بنائے اور نقشے تیار کیے اور آزادی سے تعمیرات کیں۔ خود ہندوستان میں فن تعمیر کافی ترقی یافتہ تھا البیرونی جو بغداد کی تعمیرانہ شان و شوکت دیکھ چکا تھا ہندوستانی کاریگروں کے تفوق پر بہت زیادہ حیرت زدہ ہوگیا تھا۔ وہ ہندوستان کے مندروں اور عمارتوں کے بارے میں کہتا ہے کہ "اس کی قوم کے لوگ ان کو بیان بھی نہیں کرسکتے۔ چہ جائیکہ ان جیسی کوئی چیز تعمیر کرسکیں"۔ ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہنرمند معماروں اور فن عمارت کے ماہرین کی کمی نہیں تھی۔ ابتدائی مسلم سلاطین نے ان کو آزادانہ ملازم رکھا۔ وہ عمارتیں جن کو زیادہ ہندو کاریگروں نے اپنے مسلمان مربیوں کے مذاق کے مطابق بنایا تھا فن تعمیر کے ہندو اور مسلم دونوں طرزوں کی چھاپ رکھتی ہیں، "جو بعض مقامات پر بھدے طریقے سے گڈ مڈ ہیں اور دوسرے مقامات پر ان میں حسین امتزاج ہے"[1] ہیول (Havell) جیسے علماء کا خیال ہے کہ ہند و اسلامی فن تعمیر ہندو طرز تعمیر کی بدلی ہوئی شکل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فرگوسن (Fergusson)، جے، اے، پیج (J. A Page) اور بعض دوسروں کا اس کے برعکس یہ رجحان ہے کہ اس میں اسلامی اثر کا کافی حصہ ہے۔

ہند مسلم فن تعمیر کی تاریخ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے قطب الدین کو ہندوستان میں مسلم اقتدار قائم کرنا تھا اور اس کو عمارتیں اتنی تیزی سے تعمیر کرنی تھیں جتنی

---

۱۔ قطب مینار پر ایک کتبہ میں تحریر ہے کہ عمارت کی مرمت ۱۴۲۶ سمبت (۱۳۶۹ء) میں ہوا، لوبا اور رکشمن نے کی ہے، اے، پیج، اے ہسٹاریکل میموائر آف دی قطب، آرکیالوجکل سروے میموائر، نمبر ۲۲، ۴۴

یہ امر کہ فیروز تغلق جیسے قدامت پسند حکمراں نے ہندو ماہرین تعمیر سے کام لیا تھا۔ صاف بتاتا ہے کہ ناگزیر تھے

جلد ممکن ہو سکے تاکہ ان نئی مفتوحہ رعایا پر اثر ڈالنے میں کوئی وقت ضائع نہ ہو۔[۲] لیکن چونکہ حاصل شدہ سامان ہندو مندروں کے ملبہ سے حاصل ہوا تھا بعض کندہ ستون اور شہتیر تو بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کر لیے گئے تھے۔ اور چونکہ زیادہ تر معمار ہندو تھے اس لیے اس کی مسجد قوۃ الاسلام ایک ایسی خوبصورتی ظاہر کرتی ہے جو فنِ تعمیر کے ہندو طرز سے مخصوص ہے۔

مارشل کے مطابق التمش کی عمارتوں میں زیادہ تر اسلامی اثر پایا جاتا ہے۔[۳] اس کے عہد کے فنِ عمارت کا عروج اس کے مقبرہ میں نمایاں ہوتا ہے جو ۱۲۳۵ء سے قبل کسی وقت بنایا گیا تھا۔ اندرونی بڑے کمرہ کے پہلو بڑی دیدہ ریزی سے تراشے گئے ہیں تاکہ آراستگی کی لطافت میں بعض ہندو مندروں کے ہم پلہ بن سکیں۔ اس عمارت میں سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز وہ اصول ہے جس کو اس کی چھت کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا اور جو "غالباً کم گہرے گنبد کی کوئی شکل تھی"۔[۴] التمش کے مقبرے میں استعمال ہونے والے گنبد کی شکل غالباً اس ذات کی ترقی یافتہ شکل تھی جو مربع بنیاد کے اندرونی زاویے پر بالائی ہشت پہلو عمارت کے سہارے کے لیے بنی ہوتی ہے۔

التمش کی موت کے بعد فنِ تعمیر میں بہت کم کام ہوا یا یوں سمجھئے کہ بہت کم باقی بچا ہے۔ ۱۲۸۰ء کے قریب بلبن نے رائے پتھورا کے قلعہ کے جنوب مشرق میں ایک محل تعمیر کیا جس کے اب صرف چند آثار باقی ہیں۔ لیکن اس محل کے کھنڈرات بھی اس طرز کی ترقی میں ایک نمایاں قدم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پہلی بار اس عمارت میں ہم ایک واقعی محراب سے روشناس ہوتے ہیں جو پچر کی شکل کے پتھروں کی کونیں ڈالنے کے طریقے سے بنائی گئی ہے۔ توڑوں کے ذریعہ نہیں۔[۵]

علاء الدین کی تخت نشینی کے ساتھ تعمیرات کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ پھر سے شروع ہو گیا۔ علاء الدین نہ صرف ایک فاتح یا ایک منتظم کی حیثیت ہی سے بلکہ ایک عظیم ماہرِ تعمیرات

---

۲۔ گورڈن سنڈرسن (GARDON SANDERSON): "آرکیالوجی ایٹ دی قطب" آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۱۲-۱۹۱۱ء، ص ۱۲۰، ص ۱۳۱

۳۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، ص ۵۷۷

۴۔ پرسی براؤن (PERCY BROWN)، انڈین آرکیٹکچر (اسلامک پیریڈ)، ص ۱۲
نیز کار اسٹیفن (CARR STEPHEN) Archaeology Monumental Remains of Delhi.

۵۔ پرسی براؤن، مذکورہ بالا، ص ۱۳

کے اعتبار سے بھی قرونِ وسطیٰ کے ہند کی تاریخ میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کی عمارات اس کے پیشروؤں یعنی نام نہاد "غلام بادشاہوں" کی عمارتوں پر ایک واضح برتری کی طرف نشان دہی کرتی ہیں اور اس کے جانشینوں یعنی تغلقوں کی عمارتوں سے جنھوں نے ایک قدامت پسندانہ اور سادہ طرز اختیار کی تھی۔ زیادہ شاندار ہیں۔ علاء الدین نے اپنی تخت نشینی کے وقت سے اپنی وفات کے دن تک تعمیر جاری رکھی۔ اس نے مسجد قوۃ الاسلام میں توسیع کی۔ اس کے داخلے پر ایک عظیم الشان دروازہ تعمیر کیا، حوض، محلات اور مساجد تعمیر کیں اور ایک نیا شہر آباد کیا۔

پہلی عمارت جو علاء الدین نے اپنی تخت نشینی کے برس (۱۲۹۶ء) میں تعمیر کی وہ حوض خاص یا حوض علائی تھا۔ وہ شاندار حوض تقریباً ستر ایکڑ کے قطعہ پر محیط تھا اور پتھروں اور اینٹوں کی ایک دیوار سے محصور تھا۔ فیروز تغلق کے عہد تک وہ کیچڑ سے بھر گیا تھا جس کو اس نے تقریباً ۱۳۵۴ء میں صاف کرایا تھا اور اس کے قریب ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا۔ تیمور اپنی تزک میں اس حوض کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حوض شہر دہلی کو سال بھر پانی فراہم کرتا ہے۔[۶]

۱۳۱۱ء میں علاء الدین نے حوض شمسی جس کو ۱۲۲۹ء میں شمس الدین التمش نے کھدوایا تھا کی مرمت کرائی تھی۔ وہ حوض جو ایک سو ایکڑ پر محیط تھا وقتاً فوقتاً خشک ہو جاتا تھا یہاں تک کہ علاء الدین نے اس کی گاد نکلوائی تھی اور اس نے اس کے وسط میں ایک گنبد بھی تعمیر کرایا۔[۷]

سلاطین دہلی کا یہ دستور تھا کہ وہ خود اپنے نئے شہر اور محلات تعمیر کرتے تھے۔ معز الدین کیقباد نے شہر کیلوکھری تعمیر کیا۔ جلال الدین نے کوشک لعل بنایا اور اس کا نام شہر نو رکھا، اسی طرح علاء الدین نے سیری آباد کیا اور اس کے جانشین تغلق شاہ نے تغلق آباد (۱۳۲۱ء) میں تعمیر کیا۔

سیری ۱۳۰۳ء میں اسی نام کے ایک گاؤں پر تعمیر کیا گیا۔ وہ قطب مینار سے شمال مشرق میں تین میل کے فاصلے پر واقع مشرق میں تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اور مارشل کے مطابق وہ مضافات کی روز افزوں آبادی کے تحفظ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔[۸] شہر کا احاطہ کرنے والی فصیلیں گارے میں اینٹ پتھر کے ... سے استعمال کر کے تعمیر کی گئیں تھیں لیکن پتھروں اور چونے کے

۶۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن سوم، ص ۱۴۱ ۔ نیز سید احمد خان، آثار الصنادید، جز سوم، ص ۲۷
اور کار اسٹیفن، مذکورہ بالا، ص ۸۳۔

۷۔ خزائن، ترجمہ حبیب، ص ۲۰-۱۹

۸۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۵۸۵

پلاسٹر کا کام بھی آثار میں پایا گیا ہے۔[9] قلعہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ان کو پوری شکست دی گئی اور ان میں سے آٹھ ہزار آدمیوں کے سر اس کی دیواروں کی تعمیر میں اینٹوں کی جگہ استعمال کیے گئے۔ تیمور نے سیری کا حال مفصل بیان کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کے سات دروازے تھے۔ سنہ ۱۵۴۸ء میں شیر شاہ نے علاء الدین کے اس شہر کو تباہ کر دیا اور اس میں سے کچھ نہیں بچا بجز احاطہ کرنے والی فصیلوں کے بعض حصوں کے جو گزرتی ہیں قطب جاتے وقت سڑک کے بائیں طرف سیری کے بعض شکستہ کھنڈر نظر آتے ہیں شہر کے اصل جائے مقام کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ لیکن جنرل کننگھم (Cunningham) اس کو شاہ پور کے موجودہ گاؤں سے شناخت کرتے ہیں اور کار اسٹیفن اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اگر شاہ پور کا گاؤں قدیم سیری کی جگہ کا تعین نہیں کرتا تو اس کی جگہ کی شناخت کرنے کی تمام کوششیں ترک کر دینی چاہئیں۔"[10]

سنہ ۱۳۰۳ء میں علاء الدین نے منگول حملہ آور طرغی سے نبرد آزما ہونے کے لیے دہلی کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اسی فتح کے بعد سلطان نے اپنے لشکر گاہ کے مقام پر ایک شاہی محل تعمیر کیا، جس کا نام قصر ہزار ستون تھا۔ یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کی تعمیر میں بہت بڑی تعداد میں ستون استعمال کیے گئے تھے۔ وہ قصر علاء الدین کی دوسری عمارات کی طرح پرشکوہ اور خوبصورت ہوگا لیکن بدقسمتی سے اس کی مکمل تباہی کی وجہ سے اس کی جگہ کی شناخت کسی یقینی عنصر کے ساتھ مشکل ہے۔[11]

لال محل جو چونسٹھ کھمبا کے شمال میں تقریباً پچاس گز پر واقع ہے۔ سید احمد کے مطابق بلبن نے اور کیمپل (Campbell) کے مطابق علاء الدین نے تعمیر کیا تھا۔ کار اسٹیفن کیمپل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "دندانے دار برج نما قلعہ کی فصیلوں اور دیوار کی کارنس کے آرائشی حاشیہ کی سجاوٹ کا طرز علاء الدین دروازے کی سجاوٹ سے" اتنا زیادہ ملتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عمارتوں کی نقشہ سازی اور تعمیر ایک ہی وقت میں کی گئی تھی" اور اس طرح ہمارے پاس لال محل کو علاء الدین کی تعمیر کہنے کی کافی شہادت موجود ہے۔[12] دیکھ بھال

۹۔ آرکیالوجکل سروے آف انڈیا رپورٹ ۳۷-۱۹۳۶ء، ص ۴۱

۱۰۔ کار اسٹیفن، مذکورہ بالا، ص ۸۵-۸۴

۱۱۔ ظفر حسین، سیری، اے سٹی کا ڈنڈ بائی علاء الدین، آرکیالوجکل سروے آف انڈیا رپورٹ، ۲۶-۱۹۲۵ء ص ۴۳-۱۴۲

نہ ہونے کی وجہ سے ان عمارتوں کو غارت گر دیہاتیوں کے ہاتھوں بہت نقصان پہنچا ہے جنہوں نے سرخ پتھر نکال لیے ہیں اور اس کی شکل بگاڑ دی ہے۔

علائی دروازہ علاء الدین کی غالباً سب سے زیادہ شاندار عمارت ہے۔ یہ مسجد قوۃ الاسلام کا جنوبی دروازہ ہے جو ۱۳۱۱ء میں مکمل ہوا تھا۔[13] دروازے کی عمارت ایک بڑے چوکور کمرے پر مشتمل ہے جو اندر سے ۳۴½ فٹ اور باہر سے ۵۶½ فٹ ہے۔ دیواریں گیارہ انچ موٹی ہیں اور اندرونی فرش سے گنبد والی چھت تک وہ تقریباً ۴۷ فٹ اونچی ہیں۔ دروازے کے ہر جانب ایک اونچا دروازہ ہے۔ تین بیرونی حصے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور اس فن تعمیر کے اصولوں کے مطابق تعمیر کیے گئے ہیں لیکن اندرونی حصہ زیادہ تر دیسی ساخت کا ہے اس کی محراب نیم دائرہ کی شکل کی ہے اور نوکیلی نہیں ہے۔ بیرونی نکاس کے راستوں پر گھوڑے کی نعل کی شکل کی نوکیلی محرابیں ہیں۔ جنوبی سمت میں تقریباً دس فٹ اونچی بنیاد ہے اس میں اندرونی حصہ کے بلند تر فرش کی طرف جانے والی سات سیڑھیاں ہیں۔ بنیاد کے عمودی پہلو مختلف نوع کی شبیوں میں خوبصورتی سے تراشے گئے ہیں۔ جب کہ اوپر کی دیوار کی سطح طغرائی شکل کی گلکاری اور کتابت سے مزین ہے اور عمارت کے سرخ پتھروں کے درمیان جا بجا سنگ مرمر کی پچی کاری کی گئی ہے۔ نکاس کے دروازے کے ہر جانب دو کھڑکیاں ہیں جو اس کے سائز کی تقریباً ایک تہائی ہیں اور ان میں سوراخوں کی باریک جالی کا کام ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں دونوں نیز بیرونی دیواریں خوب اچھی طرح مزین ہیں۔

اندرونی حصہ بھی اتنا ہی خوبصورت ہے جس انداز میں دائرہ کی شکل والا گنبد ایک ہشت پہل پر قائم ہے اور پھر خود ہشت پہل کو جس طرح ایک چوکور سے سہارا دیا گیا ہے اور اس طرح گنبد کے بوجھ کا بتدریج مگر پوری طرح زمین کی جانب رخ کیا گیا ہے وہ شاندار بھی ہے اور موزوں بھی۔ محرابوں کی تعمیر میں ایک پاٹ دار ڈاٹ پر مبنی محراب تیز برچھے کی شکل کے پتھر عمارت کے تمام حصوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔[14] اس پوری عمارت کا سب سے بنیادی تصور اس کی مکمل موزونیت اور تناسب ہے۔

علائی دروازہ نہ صرف خوبصورت ہے بلکہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہ صرف وہ نفاست سے ہراتی ہوئی قرآنی آیات یا حاشیوں کی کندہ کاری کی وجہ سے جو دوسری ہندو مسلم عمارتوں میں

۱۳۔ عمارت پر ایک کتبہ اس کی تعمیر کی تاریخ ۱۵ شوال ۷۱۰ھ (۷ مارچ ۱۳۱۱ء) دیتا ہے۔

بھی عام اسلامی فن تعمیر کے انتہائی قیمتی ہیروں میں سے ایک ہے۔ بلکہ گھوڑوں کی نعل یا پیاز کے پھندے کی طرح کی محراب جو خلجیوں کی عمارتوں کے بعد کسی عمارت میں نہیں پائی جاتی ہے[14] گنبد کے ابھرے ہوئے بالائی حصے جو بھی ان خانوں کو پر کرتے تھے جو اب موجودہ "محرابوں کے نقطۂ اتصال پر پائے جاتے ہیں" اور محرابوں کے باہر نکلے ہوئے پھول کی شکل کے پتھر بھی اس کو بے مثال بناتے ہیں۔ فرگسن کہتا ہے کہ "اتنی کامل کوئی چیز پہلے نہیں بنائی گئی اور نہ اتنی مزین اور مرصع کسی نے اس کے بعد کبھی بنائی" یہ عمارت بلاشبہ خلجیوں کے عہد میں اسلامی مرصع کاری کے ارتقاء کا نقطۂ عروج ہے۔

اس عمارت کی تعمیر میں پرسی براؤن اناطولیہ (روم کے سلاجقہ کی راجدھانی) کے فن تعمیر کے بعض ماہرین کی مدد بھی شامل سمجھتا ہے۔ پتھروں کی کاریگری کے طرز اور عمارت کے غیر معمولی خوشنما انداز میں وہی روح کارفرما ہے جس نے سلجوقی فن تعمیر میں جان ڈالی تھی[15]۔ وہ کہتا ہے کہ منگول حملوں نے سلجوقی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور وہاں کے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ ان میں سے بعض کو دربارِ دہلی میں بھی پناہ مل گئی۔ ان پناہ گزینوں کے ساتھ فن تعمیر کا سلجوقی طرز بھی ہندوستان میں در آیا جس کی بعض اہم خصوصیات علائی دروازے میں نظر آتی ہیں۔ کوئی معاصر مؤرخ کسی بڑے پیمانے پر نقل آبادی کا ذکر نہیں کرتا۔ لیکن امیر خسرو جیسے مصنفین ان علماء کا حوالہ دیتے ہیں جو ترکستان اور بعض وسط ایشیائی ممالک سے آئے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض سلجوقی ماہرین تعمیرات نے علائی دروازے کی تعمیر میں مدد دی ہو لیکن جیسا کہ پرسی براؤن خود تسلیم کرتا ہے کہ عمارت اپنی بدیسی فطرت کے باوجود "خالص دیسی خصوصیات" کی حامل ہے۔ پوری عمارت میں "ہندوستانی انداز موجود ہے" اور یہ ہندوستانی اور غیر ملکی طرزوں کا امتزاج ہی ہے جس نے اس عمارت کو فن کا ایک شاندار نمونہ بنا دیا ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے مستقبل کے ماہرین تعمیرات نے اس سے فیض حاصل کیا۔ لودی عہد کا بڑا گنبد اور پندرھویں صدی کے بہت سے گنبد علائی دروازے کے نمونے پر بنائے گئے تھے۔ یہ ابتدائی نمونہ اسی عمارت نے ان کے لیے فراہم کیا تھا[16]۔

---

۱۴۔ پرسی براؤن، مذکورہ بالا، ص ۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵-۱۳

۱۶۔ لال، سلطنت کی شام ([illegible])، ص ۲۳۱

علائی دروازے کا تحفظ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اگرچہ وہ سیری کی دیواروں یا کوشک ہزار ستون کی طرح کھنڈر نہیں بنا ہے تاہم بہت سے پتھر جن پر کتبے کندہ تھے گر گئے اور بعض شورہ کی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں۔ وقت کی ان تباہ کاریوں کے باوجود عمارت کی خوبصورتی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کا نفیس تناسب اور سادہ بناوٹ اور۔ ۔ ۔ ۔ اس کی خوبصورتی کا ٹھیک اندازہ لگانا ہو تو شام کے وقت افق کی سرخی میں اسے خاکے کی شکل میں دیکھیے ۱۷؎

امیر خسرو کہتے ہیں کہ علائی دروازے کی تعمیر کے بعد علاء الدین نے مسجد قوۃ الاسلام جس کو قطب الدین ایبک نے تعمیر کیا تھا کی توسیع شروع کی۔ مسجد میں اس کا اضافہ التمش کی شمالی توسیع سے پرے تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں اس کا نامکمل مینار بھی شامل تھا۔ توسیع سات سو فٹ لمبی اور چار سو فٹ چوڑی تھی اور اس میں نو دروازے تھے۔ اس طرح التمش کی توسیع کے بعد علاء الدین نے مسجد کا سائز تقریباً دوگنا کر دیا۔ ۱۳۱۱ء میں عمارت زیر تعمیر تھی لیکن وہ نامکمل رہی ۱۸؎

توسیع کے فن تعمیر کی ترتیب صاف طور پر بتاتی ہے کہ التمش کے عبادت کے دالانوں نے علاء الدین کے دالانوں کے لیے نمونہ کا کام دیا تھا پھر بھی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو خلجیوں کے عہد میں طرز تعمیر کے ارتقا کو ظاہر کرتی ہیں۔ التمش کی توسیع میں کھڑکیوں کو سردلوں سے ڈھکا گیا ہے جو توڑوں پر ٹکے ہوئے ہیں جب کہ علاء الدین کے زمانے میں مکمل محرابیں ہیں جن میں پچر کی شکل کے پتھروں کی کونین دیوار کی پوری موٹائی میں آر پار ہیں۔ یہ فرق بھی وضاحت سے بتاتا ہے کہ قطب الدین اور التمش تعمیر کی تزئین و آرائش میں ہندو کاریگروں پر انحصار کرتے تھے۔ علاء الدین ان سے آزاد تھا۔ اس کے دور میں اسلامی طرز تعمیر نے زیادہ قوی کردار اختیار کیا ۱۹؎

بادشاہ نے قطب کے دگنے سائز کا ایک مینار تعمیر کر کے اپنے پیشروؤں کے فن تعمیر کے کارناموں کو بالکل حقیر بنانا چاہا۔ یہ مینار اپنے ابتدائی نمونہ کی شکل مغرب میں چار سو ستر فٹ کے فاصلے پر ۱۳۱۱ء میں شروع کیا گیا۔ اس کا محیط ۲۵۴ فٹ اور مرکزی ستون کا قطر ۲۶ فٹ کا ہے۔ ادہ

---

۱۷۔ جے اے، پیج، مذکورہ بالا، ص ۱۴

۱۸۔ آثار الصنادید، جز سوم ص ۲۱

۱۹۔ کار اسٹیفن، مذکورہ بالا، ص ۵۴۔ ۵۲ اور جے اے، پیج، ص ۱۷۔ ۱۶

۱۴۴ فٹ کی بنیاد سے ۵۲ فٹ کی بلندی تک اوپر لے جایا گیا تھا۔ لیکن اس کی تعمیر غالباً سلطان کی وفات کی وجہ سے ترک کر دی گئی۔ مینار آٹھ آٹھ فٹ کے ۳۲ پہلوؤں میں منقسم ہے اور زاویہ دار کمر کے نقش و نگار کی عجیب وضع قطع بہت نمایاں ہے۔ جیسے کہ چھپلے گھومے ہوئے طاقوں کی ساخت نمایاں ہے۔ چنانچہ پورے ستون کو کننگھم نے بجا طور پر "ایک دیو ہیکل دندانے دار پہیے سے بالکل مشابہ" بتایا ہے۔ ہر مربع پر دیواریں بنی ہوئی ہیں حلقے میں لینے والی کھڑکیوں کی اضافی بلندی یہ ظاہر کرتی ہے کہ مینار کے اندر اوپر چڑھنے کا ذریعہ ایک بہت ہی تدریجی ڈھلان تھی یعنی سیڑھیاں نہیں تھیں جیسی کہ قطب میں ہیں[20]۔ مینار کے بیرونی پتھر غائب ہو چکے ہیں اور اینٹوں اور چونے کا محض ایک کھنڈر رہ گیا ہے جو علاء الدین کے نامکمل منصوبہ کی ایک یادگار کے طور پر کھڑا ہے۔

اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ جو علاء الدین کے مدرسے کے نام سے مشہور ہے یقینی طور پر معلوم نہیں۔ اس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس کو التمش نے تعمیر کرایا تھا۔ لیکن اونچے چبوترہ والے گنبد اور باہر کو نکلی ہوئی توڑوں والی گول تکونیں بتاتی ہیں کہ اس کو علاء الدین نے تعمیر کرایا تھا۔ مدرسہ مسجد قوۃ الاسلام کے جنوب مغرب میں بالکل قریب واقع ہے اور ایک مربع صحن کے چاروں طرف بنایا گیا ہے۔

اس صحن کے جنوبی سمت میں ایک بڑی عمارت ہے جو چار سو فٹ لمبی اور دو سو فٹ چوڑی ہے بنیادی طور پر یہ ایک گنبد سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جو اب گر چکا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علاء الدین خلجی کا مقبرہ ہے۔ اس میں ہر جانب سے داخلہ ہو سکتا ہے اور مغربی داخلہ کا آراستہ پتھر اور گچ کا کام کا ایک پٹھان دروازہ ہے جس میں ایک ۱۴ فٹ اونچی اور گیارہ فٹ چوڑی محراب ہے[21]۔ خود مقبرہ تقریباً پچاس فٹ لمبا اور ۲۲ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے ہر جانب ایک گزرگاہ ہے جو اس کو کنارے کے کمروں سے جو اب بغیر گنبد کے ہیں الگ کرتی ہے[22]۔ عمارت کی نمایاں خصوصیت توڑے دار تکونیں ہیں جو تعمیری وقت کے خوشگوار حل کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔ پوری عمارت اب شکستہ حال ہے۔

---

۲۰۔ جے اے پیج، ص ۱۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۲۔ کار اسٹیفن، ص ۸۹۔۸۸

علاءالدین کا انتقال ۱۳۱۶ء میں ہوا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مقبرہ کی تعمیر ایک یا دو سال بعد اس کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے کی۔ فیروز تغلق نے اس کی مرمت کی اور صندل کی لکڑی کی ایک جالی لگوائی جواب موجود نہیں ہے حتیٰ کہ قبر بھی بالکل ڈھے گئی ہے اور چونے اور گارے کا صرف ایک ڈھیر باقی ہے[۲۳]۔

اس عہد کی ایک اور اہم عمارت شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں جماعت خانہ مسجد ہے۔ وہ بستی نظام الدین میں واقع ہے اور نئی دلی سے پانچ میل کے اندر ہے۔ عمارت میں داخلہ ایک نیچے دروازہ سے ہوتا ہے، جو پتھروں سے پٹے ہوئے احاطہ میں لے جاتا ہے یہ تقریباً ۶۰ فٹ مربع ہے اس کی مغربی سمت میں ایک کمرہ ہے جواب ایک مدرسہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے داہنی جانب امیر خسرو کا مقبرہ ہے۔ اس صحن کے شمال میں ایک اور احاطہ ہے، جو مشہور شیخ کے مقبرہ پر مشتمل ہے۔ مقبرہ تقریباً ۴۸½ فٹ لمبا اور ۱۹½ فٹ چوڑا اور اس کی دیواروں کے اندر جہاں آرا بیگم، محمد شاہ اور مرزا جہانگیر کی قبریں مسجد اور جماعت خانہ بھی ہے۔ نظام الدین کا مقبرہ تقریباً تیس مربع فٹ ہے جس میں پانچ محراب دار در ہیں ہیں جو سنگ مرمر کے بیس ستونوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ وہ ایک سفید سنگ مرمر کے گنبد سے گھرا ہوا ہے جو سیاہ سنگ مرمر کے عمودی پٹیوں سے مزین ہے۔

مسجد تقریباً ۹۴ فٹ لمبی، ۴۴ فٹ چوڑی اور ۵۴ فٹ اونچی ہے اور وہ پوری کی پوری سرخ نرم پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ مسجد کی اصل عمارت تین کمروں پر مشتمل ہے بیچ کا کمرہ ۴۵ فٹ لمبا ۴۴ فٹ چوڑا ہے۔ اور دونوں طرف کے کمرے ۴۵ فٹ لمبے اور ۲۰ فٹ چوڑے ہیں۔ وسطی کمرہ ایک گنبد سے ڈھکا ہوا ہے جس کا قطر ۴۵ فٹ ہے اور باقی دونوں کمرے دو دو گنبدوں سے ڈھکے گئے ہیں گنبد رتیلے پتھروں اور گچ کے بنے ہوئے ہیں۔ وسطی کمرہ میں داخلہ محراب دار دروازے سے ہوتا ہے جو تقریباً ۱۵ فٹ بلند ہے اور محرابوں کے گرد پٹیاں قرآنی کتبات سے آراستہ ہیں، دیواروں میں سرخ نرم پتھروں کی جالی کا کام ہے[۲۴]۔

مختلف مورخین کے متضاد بیانات اس عمارت کے بانی کو متعین کرنا مشکل بناتے ہیں۔ فرشتہ کے مطابق اس کو علاءالدین کے فرزند اکبر اور شیخ کے ایک مرید خضر خان نے تعمیر کرایا تھا۔ سید احمد

---

۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو آثار الصنادید، جز دوم، ص ۲۸۔۲۷

۲۴۔ ان عمارات کے رقبہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کار اسٹیفن، مذکورہ بالا، ص ۵۔۱۰۴، ص ۱۳۔۱۵

خان کا خیال ہے کہ شہزادہ نے صرف وسطی عمارت تعمیر کرائی تھی اور باقی دو پہلو کی عمارتیں محمد تغلق نے اضافہ کی تھیں۔ فیروز شاہ تغلق فتوحات فیروز شاہی میں دعویٰ کرتا ہے کہ اس عمارت کی تعمیر اس نے کی تھی۔ ثمرۃ القدس کے مصنف کا بیان ہے کہ شیخ نے خود ہی مسجد تعمیر کرائی تھی[25]

جس کسی نے بھی مسجد تعمیر کرائی ہو وہ پٹھان تعمیر کے سادہ طرز کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ ایک ایسی مسجد کا سب سے پہلا نمونہ تھی جو پوری طرح اسلامی اصولوں کے مطابق اور اس ساز و سامان سے تعمیر کی گئی تھی جو خاص طور سے اس مقصد سے حاصل کیا گیا تھا۔ علائی دروازہ کی طرح وہ سنگ سرخ سے بنائی گئی ہے اور انھیں اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ ایک لحاظ سے وہ علائی دروازہ پر کچھ فوقیت بھی رکھتی ہے۔ کیونکہ ایک درمیانی منزل یا غلام گردش بڑے کمرہ کی دیواروں اور گنبد کی بنیاد کے درمیان بنائی گئی ہے۔ دوسرے اعتبار سے اس میں دیسی کاریگری کے آثار زیادہ نظر آتے ہیں۔ محراب میں گھوڑے کی نعل کا اندازہ کم نمایاں ہے بلکہ تاج کی کلغی جو کہ دیسی اثر کا ایک نشان ہے زیادہ نمایاں ہے۔ پوری عمارت میں جابجا قرآنی کتبات کی جال جیسی پٹیاں تراشی گئی ہیں۔ کتبات بہت خوبصورتی سے کندہ کیے گئے ہیں اور نیگلر ([illegible]) نے ان کو "دہلی میں سب سے زیادہ خوبصورت" بیان کیا ہے۔

دارالسلطنت کے باہر علاء الدین کی عمارتوں میں متھرا میں واقع مسجد (۲۶) اور شیخ فرید سنہ [illegible] کے لگ بھگ تعمیر کروائی گئی مقبرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو غالباً ایک تبدیل شدہ ہندو یا جین مندر ہے ایک اور مسجد اسی زمانہ میں بڑودچ میں بنائی گئی تھی۔ وہ بھی ایک تبدیل شدہ جین مندر ہے سنہ [illegible] میں الپ خان علاء الدین کے سالے اور گورنر گجرات نے پٹن میں مسجد آدینہ بنوائی۔ اس مسجد کے احاطہ کا سائز ۴۰۰/۳۲۰ فٹ ہے اور اس میں ایک ہزار پچاس ستون ہیں[27] مرآۃ سکندری میں علی محمد خان نے اس مسجد کی خوبصورتی بیان کی ہے۔ وہ سفید سنگ مرمر کی بنی ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں جینوں کا ایک مندر تھا جس کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا لیکن وہ ۔ ۔ ۔ ایک شاندار اور عمدہ عمارت ہے۔ آدینہ مسجد اب موجود نہیں ہے۔

---

۲۵۔ ظفر حسین، اے گائیڈ ٹو نظام الدین، میموائرز، ص ۱۰، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص ۱۴

۲۶۔ ایپی گرافیا انڈو مسلمیکا، [illegible]، ص ۵۹

۲۷۔ پرسی براؤن، مذکورہ بالا، ص ۵۲

۱۳۰۳ء میں چتوڑ کی فتح کے بعد علاء الدین نے دریائے گمبھیری پر ایک پل تعمیر کرایا تھا۔ اس کی فنِ تعمیر کی اہم خصوصیات دروازے اور مینار غائب ہو گئے ہیں لیکن بھورے چونے کے پتھروں کی دیوہیکل محرابیں قابل ہندسوں، انجینیروں کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جنھوں نے اس کو تعمیر کیا تھا۔[28] خلجی عہد کے فنِ تعمیر کا ایک نمونہ بیانا میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کو قطب الدین مبارک شاہ نے تعمیر کیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی کے طرز کا صوبائی انداز ہے۔

علاء الدین نے جو کچھ تعمیر کرایا وہ اتنے خوبصورت انداز میں اور اتنے وسیع پیمانے پر کیسے تعمیر کرا سکا؟ اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں ہے۔ فنِ تعمیر کے منصوبے کثیر دولت چاہتے ہیں اور سلطان کی جنوبی مہموں نیز اس کے مالگزاری کے ضوابط نے اس کو بہت دولت فراہم کر دی تھی۔ مزید برآں علاء الدین نے منگول حملہ کا مکمل سدِّباب کر دیا تھا جس نے سلطنت کے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔[29] اس کے فنِ تعمیر کے بہترین شاہکار ۱۳۱۱ء کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اس وقت تک منگولوں کو پوری طرح دریائے سندھ کے پار دھکیل دیا گیا تھا اور دکن سے کثیر دولت لائی جا چکی تھی۔ سلطان کے پاس معماروں اور ماہرین فن کی تقریباً پوری ایک فوج تھی اور برنی کے مطابق ان کی تعداد ستر ہزار کے چکرا دینے والے عدد تک پہونچ گئی تھی۔ بعض عظیم کاریگر غیر ملکی تھے جو باہر سے اس کے پایۂ تخت میں آکر جمع ہو گئے تھے۔ انھیں نے ان عمارتوں کو ایک بدیسی رنگ دیا لیکن چونکہ اس کی تکمیل دیسی نگرانوں اور ماہرین تعمیرات کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنے پیدائشی سرزمین کی ایک اَن مِٹ چھاپ چھوڑی ہے۔

اس زمانے میں ہندو مندروں کی تعمیر کے بارے میں مشکل ہی سے کچھ زیادہ معلوم ہے وہ وقت کی تباہ کاریوں اور فاتحوں کی بت شکنی کے جوش کا شکار ہو گئے۔ مسلم مورخین ان کا بہت کم تذکرہ کرتے ہیں[30] سوائے اس کے کہ وہ حسن و جمال سے بھرپور اور دولت سے معمور تھے اور

---

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۹۔ برنی، ص ۳۴۱

۳۰۔ میں نے دانستہ جنوبی ہند کے ہندو فنِ تعمیر پر بحث کرنے سے گریز کیا ہے کیونکہ وہ بجائے خود ایک الگ مطالعہ ہے۔

مسلمانوں نے ان کو مسمار کر ڈالا۔ بہر حال جین طرزِ تعمیر کی ایک کتاب بعنوان "وستو سارا" اب بھی دستیاب ہے۔ اس کو ٹھاکر پھیرو نے ۱۳۱۵ء میں علاء الدین کے عہد میں لکھا تھا[31]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں وہ جین مندروں کے ماہرینِ تعمیر کے ایک دستور العمل کا کام دیتی تھی۔ فنِ تعمیر کی اصطلاحات اور نقشے ظاہر کرتے ہیں کہ مندروں کا طرزِ تعمیر جینیوں دونوں کے یکساں تھے۔ یہ کتاب اصطلاحی الفاظ کی ایک طویل فہرست دیتی ہے جو اس وقت ہندو مندروں کے معمار میں رائج تھے۔ مندروں کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں اگر ان کے ضمنی شکلوں کی تعداد ہی کا حوالہ دیا جائے تو ان کی پچیس قسمیں ہیں۔ ٹھاکر پھیرو نے ایک اور کتاب "پرسیاد منڈن" کے نام سے تحریر کی ہے جو کہ فنِ تعمیر پر ایک رسالے کی شکل میں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ساتھ ساتھ ہندو فنِ تعمیر بھی ترقی کر رہا تھا۔ اس کو سلاطین سے کوئی امدادی رقم نہیں ملتی تھی لیکن ہندو راجہ اور دولتمند تاجر ہندو مندروں کی تعمیر میں فراخدلی سے حصہ لیتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے مندروں کے کھنڈر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ دیو ہیکل اور شاندار عمارتیں تھیں جن میں بے انتہا خوبصورت نقاشی کی آرائشیں تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی مندروں کی ایک بہت ہی نمایاں خصوصیت مختلف اندازوں میں اداکاری رقص کرتے ہوئے نسوانی مجسموں کی نمائش تھی۔[32]

## موسیقی اور مصوری

اجنتا کی آبی تصاویر قدیم زمانے کے ہندوؤں کے جمالیاتی کارناموں کی ایک زندہ مثال ہیں۔ لیکن سلاطینِ دہلی کے عہد میں ہندوستانی فنِ مصوری کی تاریخ ایک سادہ پتر سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ابتدائی ترک سلاطین کسی بڑے پیمانے پر مصوری کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے کے مقابلے میں زیادہ ملکوں کو فتح کرنے اور مضبوط عمارتیں بنانے میں مشغول تھے۔ بعد کے سلاطین بھی اس میں زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے علاوہ چونکہ اسلام تمام جاندار شکلوں کی تصویر کشی ممنوع قرار دیتا ہے لہٰذا وہ اس فن پر ایک پابندی سی عائد کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود انسان کی جمالیاتی فطرت کی بنا پر خلجیوں کے عہد میں فنِ مصوری عظمت کے بلند درجہ تک پہنچ گیا تھا۔

---

۳۱۔ دی۔ ایس۔ اگروال "A Note on Medieval Hindu Temple Architecture" جرنل آف یوپی ہسٹاریکل سوسائٹی جلد اول ۱۹۴۳ء ص ۱۱۹۔۱۱۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۱۵

ابن بطوطہ نے قصرِ ہزار ستون کی "بے انتہا خوبصورت تصویر کشی اور گچ کاری" کی تعریف کی تھی۔[۲۳] یہ امر کہ یہ فن ترقی پر تھا اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ فیروز تغلق نے اپنی مذہبی قدامت پسندی کی وجہ سے تصاویر سے دیواروں کی تزئین ممنوع قرار دے دی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصویریں ان دنوں میں رائج ہوں گی۔ لیکن چونکہ اب علاء الدین کی تعمیر کی عمارتیں تک شکستہ ہیں لہذا کاغذ یا پلاسٹر پر اس زمانے کی تصویر کی تلاش فضول ہے۔

قدیم ہندو بادشاہوں کے عہد میں فنِ موسیقی بلا روک ٹوک ترقی کرتا رہا۔ ان میں سے بیشتر اس فن کے زبردست مربی تھے بعض مثلاً راجہ بھوج خود بھی عظیم موسیقار تھے۔ اعداد کو علامات سے ظاہر کرنے کا ہندوستانی نظام غالباً سب سے زیادہ قدیم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ گیارھویں صدی عیسوی میں یورپ لے جایا گیا۔[۲۴] ابتدائی قرونِ وسطیٰ میں بہت سی قسموں کے موسیقی کے آلات جیسے وینا، جھانجھ، بانسری اور مردنگ رائج تھے۔[۲۵] دہلی کے ترک سلاطین موسیقی کے شوق میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد امیر خسرو کا سرپرست تھا جو ہندوستان کے اس وقت کے مشہور موسیقاروں میں سے ایک تھے۔ کیقباد کے رندمشن زمانے میں موسیقی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔[۲۶] امیر خسرو اپنی تصنیف "قران السعدین" نامی میں شاہی موسیقی کی محفلوں کا حال صراحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں اس سے صاف طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ موسیقی اس عہد میں مقبول ترین فنون میں سے ایک تھی۔ سلطان جلال الدین کی موسیقی سے شیفتگی کی تصدیق برنی اور امیر خسرو دونوں کے بیان سے ہوتی ہے۔ برنی جلال الدین کے دربار کی خوبصورت اور دلربا موسیقاروں کو یاد کر کے کرب سے ایک گہری سانس لیتا ہے۔ وہ محمد شاہ چنگی (چنگ بجانے والا) فتوحہ، دختر قطائی، نصرت خاتون اور مہر افروز جیسے موسیقاروں کے ناموں کا ذکر کرتا ہے۔ جن کا شہنشاہ دربار میں مجمع تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی آواز لطافت سے اتنی میٹھی تھی کہ "چڑیاں (سننے کے لیے) فضا سے

---

۲۳۔ اسلامک کلچر، ۲۴، ۱۹۵۰ء، ص ۲۱۸-۲۵

۲۴۔ اوجھا، مدھیہ کالین بھارتیہ سنسکرتی، ص ۹۴، ۱۹۳۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۲۶۔ برنی، ص ۱۳۰-۱۴۰

نیچے اترآئی تھیں اور جوان کے دلکش نغموں کو سنتے تھے وہ بیہوش ہو جایا کرتے تھے"[۳۶]
خسرو بھی محمد شاہ کا کرتے اور کہتے ہیں کہ ایک دہ (خسرو) فیاض بادشاہ کی تعریف میں نغمہ سرا ہوتے تھے اور دوسری طرف محمد اپنے روح پرور نغموں سے سلطان کو مست بناتا تھا۔

سلطان علاء الدین اپنی فطری درشتی کے باوجود موسیقی کا عاشق تھا۔ اعجاز خسروی میں امیر خسرو نے اس زمانے کے موسیقاروں اور آلات موسیقی کے بارے میں دلچسپ تفصیلات دی ہیں۔ وہ محمد شاہ چنگی، خلیفہ حسینی، اخلاق اور ترمتی خاتون کا ذکر علاء الدین کے عہد کے موسیقاروں میں کرتے ہیں[۳۸] ترمتی خاتون ایک عظیم فن کار تھی، وہ دربار کے تمام ہندوستانی اور ایرانی موسیقاروں کی نگران تھی۔ ہمعصر تصانیف میں مذکور آلات موسیقی میں سے سب سے زیادہ اہم تھے۔ چنگ، چغانہ (ساز نگی)، دف (ڈرم کی ایک قسم)، دستک، دم صیرفی (؟) دہلی عجائب رود، مزامیر، نے (مختلف قسم کی بانسریاں)، رباب (ایک تاروں والا آلہ) شہنائی اور طنبور۔[۳۹] اس زمانے کے بعض موسیقاروں کا خیال ہے کہ ستار امیر خسرو نے ایجاد کیا تھا لیکن اس زمانے کی تصانیف میں اس کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ستار اپنے ابتدائی درجے میں کسی اور نام سے ہو اور اس کا یہ موجودہ نام امیر خسرو نے دیا۔

موسیقی سے علاء الدین خلجی کی محبت دو دلچسپ واقعات سے ظاہر ہوتی ہے۔ پہلا واقعہ ملک کافور کے ہاتھوں سری رنگم کی تباہی سے بحث کرتا ہے جب جنوبی ہند کے موسیقاروں کی ایک جماعت نے شہنشاہ کو اپنے گانے بجانے کے ہنر سے خوش کر کے اس سے سری رنگا ناتھ کا بت حاصل کیا تھا۔[۴۰] دوسرے کا تعلق ایک گوپال نایک سے ہے جو جنوبی ہند کا ایک مشہور موسیقار تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے بارہ سو شاگرد تھے اور اس کے ہنر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ناقابل تقلید تھا۔ گوپال دہلی آیا جہاں اس کے اور امیر خسرو کے درمیان ایک مقابلہ کا انتظام کیا گیا۔ سلطان یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا محبوب موسیقار گوپال سے کمتر ثابت ہو۔ چنانچہ جنوبی

---

۳۷۔ برنی، ص ۲۰۰-۱۹۹

۳۸۔ اعجاز خسروی، رسالہ دوم، ورق ۵۱ الف نیز ملاحظہ ہو میوزک ان انڈیا، اسلامک کلچر ۱۹۳۸ء، ص ۳۳۱-۳۰۳

۳۹۔ امیر خسرو نے ان میں سے بیشتر آلات کا ذکر کیا ہے۔ صوفی ادب کی بھی بہت سی کتابیں آلات موسیقی کے نام دیتی ہیں۔ فوائد الفواد (ص ۲۲۷) میں دف، رباب اور مزامیر جیسے آلات کا ذکر ملتا ہے۔ بعض ناموں کی شناخت مثلاً صیرفی، دوہانیکان (تیر؟) اور تیرہ کی شناخت مشکل ہے۔

۴۰۔ ملاحظہ ہو چودھواں باب

کا استادِ موسیقی جب تک گاتا رہا، علاءالدین نے خسرو کو اپنے تخت کے نیچے چھپائے رکھا۔ اس طرح کہ وہ گوپال کو سن سکتے تھے اور اس کے انداز کو سیکھ سکتے تھے۔ دوسرے دن خسرو نے دکنی فنکار کے انداز میں گایا جو شہنشاہ اور اس کے محبوب موسیقار کی تدبیر سے ناواقف ہونے کے سبب بہت زیادہ متحیر ہوا[41]۔ موسیقی کی ایسی محفلیں جن میں مختلف مقامات کے موسیقار حصہ لیتے تھے، اس زمانے میں عام تھیں۔ رسائل الاعجاز میں امیر خسرو خراسان سے موسیقاروں کی آمد کا ذکر کرتے ہیں اور ان کو ہندوستانی فنکاروں سے مقابلے کی دعوت دیتے ہیں[42]۔ نہ سپہر میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کسی بھی دوسرے ملک کی موسیقی سے افضل تھی اور غیر ملکی ہندوستان میں طویل قیام کے باوجود ایک ہندوستانی دھن بھی پوری کامیابی کے ساتھ نہیں بجا سکتے تھے۔ وہ ہندوستانی موسیقی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو ان کے بقول نہ صرف انسانوں کے لیے کشش رکھتی ہے بلکہ چرند پرند کے لیے بھی۔

امیر خسرو اس عہد کے غالباً سب سے بڑے موسیقار تھے۔ وہ ایک عظیم گلوکار، ایک بڑے شاعر اور بہت سے راگوں اور آلاتِ موسیقی کے موجد تھے۔ راگ درپن[43] میں امیر خسرو کے سر بہت سے نئے نغموں مثلاً یمن یا ایمن، عشاق، موافق، غنام، بجیر، ساز گاری، فرغانہ، سرپردہ اور متعدد دوسروں کی تخلیق کا سہرا باندھا جاتا ہے[44]۔ وہ ہندوستانی اور ایرانی دونوں طرزوں کی خوبصورتی کا امتزاج کا ہیں۔ انھوں نے گانے کا بالکل نیا انداز جو خیال کے نام سے مشہور ہے ایجاد کیا۔ اس وقت جو طرز رائج تھی وہ دھرپد تھی۔ اس میں موسیقی کے ایک نغمہ کو پہلے خاص قسم کے آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ گایا جاتا ہے پھر گت دوگنی ہو جاتی ہے اور اس کے بعد چار گنی ہو جاتی ہے اور اسی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ خسرو کا خیال الاپ پر مشتمل ہے جو راگوں کے سروں میں آہستہ آہستہ گایا جاتا ہے اور خود نغمہ بھی اور پھر تانیں بھی جو کہ تیز تر گتوں کے ساتھ دہرائی جاتی ہیں۔ خیال آج بھی بہت مقبول ہے جبکہ دھرپد کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ خیال کے علاوہ خسرو نے ترانہ بھی ایجاد

---

۴۱۔ غرۃ الکمال، نیز ملاحظہ ہو بیلے (Beale) اورینٹل بایو گرافیکل ڈکشنری، ص ۱۲۵

۴۲۔ اعجاز خسروی، رسالہ دوم، ص ۱۸۰

۴۳۔ ابتدائی سولھویں صدی میں اس کو گوالیار کے راجہ مان سنگھ کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

— نیز ملاحظہ ہو لال، سلطنت کی شام، ص ۲۴۳

۴۴۔ شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۲۷ - ۱۳۵

کیا جو آج بھی مقبول ہے۔ ترانہ سوتی موسیقی میں وہی کام کرتا ہے جو جالاساز کی موسیقی میں۔ اس کو صرف ماضی کے استاد گا سکتے ہیں اور صرف اونچے لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ایسے فنکار کے لیے شاعر بھی ہونا ضروری ہے۔ خسرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے علم موسیقی پر ایک کتاب بھی مرتب کی تھی جو اب نایاب ہے۔ ان کے گیت جو ان کی تصانیف میں کہیں کہیں مقامات پر دیے گئے ہیں بتاتے ہیں کہ وہ بہت پایہ شاعری کرتے تھے۔ وہ فارسی اور ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے اور ایک شعر میں جس کا ذکر دولت شاہ نے تذکرۃ الشعرا میں کیا ہے خسرو دعوی کرتے ہیں کہ اگر ان کے گیت جمع کیے جائیں تو اتنے ضخیم ہوں گے جتنے کہ ان کی شعری تصانیف۔[۴۵]

موسیقی کی سرپرستی نہ صرف شاہی دربار اور امراء کے گھروں میں ہوتی تھی بلکہ جمالیات کا احساس رکھنے والے تمام لوگ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ لوگوں کا ایک اور طبقہ بھی تھا جن کے نزدیک موسیقی یا سماع وہ شعلہ تھا جو روح کو گرماتا تھا اور خدا کے وصال کا سب سے موثر ذریعہ تھا۔ مسلم صوفی بزرگوں کے نزدیک عموماً اور چشتی صوفیوں کے نزدیک خصوصاً موسیقی زندگی کی اصل روح تھی۔ شیخ نصیر الدین چراغ کا کہنا تھا کہ جیسے جسمانی تکلیف کے لیے دوائیں ہوتی ہیں اسی طرح موسیقی دماغی کرب کی دوا ہے۔[۴۶] سماع بالمقابل اسلام کے بارے میں مختلف صوفیوں اور علماء دین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قاضی حمید الدین ناگوری سماع کے بڑے شوقین اور مولانا رکن الدین سمرقندی اس کے سخت خلاف تھے۔[۴۷] شیخ نظام الدین اولیا، موسیقی کے بڑے عاشق تھے اور چونکہ بعض مسلم علماء دین کے مطابق موسیقی ناجائز ہے اس لیے موسیقی کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیا کا تصور خاص توجہ کا مستحق ہے۔ وہ دعوی کرتے ہیں کہ موسیقی چار قسموں کی ہوتی تھی۔ بہترین قسم جو حلال تھی اس سے خدا کی حمد گانا مقصود تھا۔ دوسری قسم جو مباح ہے جس کا رخ تو خدا کی جانب ہوتا ہے لیکن وہ پوری طرح اس کی تعریف کے لیے نہیں ہے۔ [illegible] دو قسموں میں ایک مکروہ ہے جو مجازی (دنیاوی) ہونے کا رجحان رکھتی ہے اور دوسری حرام جو صرف حواس کی لذت کے لیے ہوتی ہے۔ یہ دونوں ناجائز ہیں۔[۴۸]

---

۴۵۔ خزائن، ترجمہ حبیب، پیش لفظ ص

۴۶۔ مفتاح العاشقین، مجلس ہشتم

۴۷۔ فوائد الفواد، ص ۴۰-۲۳۹

۴۸۔ سیرۃ الاولیاء، باب نہم

خواجہ معین الدین چشتی کی آمد کے زمانے ہی سے (تقریباً [illegible]) سماع ہندوستان میں مقبول ہوگیا۔ تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے ملفوظاتی ادب میں قوالوں کے متعدد حوالے پائے جاتے ہیں جو صوفیوں کے سامنے موسیقی کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ بعض صوفیا خود بھی خدا کی تعریف و توصیف گا کر اپنے وجد کے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ برنی دعویٰ کرتا ہے کہ دہلی میں کوئی ایسا محلہ نہیں تھا جہاں اس قسم کی محفلیں ہر دو یا ایک مہینے کے وقفہ سے نہ سجائی جاتی ہوں۔ سماع آلاتِ موسیقی کی حتی کہ نامناسب طور پر تالی بجانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔ مبادا خدا کے لیے مقصود موسیقی حسی لطف اندوزی بن جائے۔ یہ موسیقارانہ زہد تھا۔

علاؤالدین کا بیٹا اور جانشین مبارک خلجی بھی موسیقی کا بڑا عاشق تھا لیکن تغلق شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ردعمل کا آغاز ہوا۔ غازی تغلق مذاق کے اعتبار سے زاہد خشک تھا۔ مزید برآں مبارک کی عیاشی نے نئے حکمرانوں کو اپنے پیش رو کے تمام کاموں سے سخت متنفر بنا دیا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ غیاث الدین تغلق نے اپنے دربار میں موسیقی کی مخالفت کر دی تھی بلکہ شیوخ کے سماع میں بھی دخل اندازی کی تھی۔ فرشتہ کے مطابق بادشاہ نے شیخ نظام الدین اولیاء سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ موسیقی سے اپنی شیفتگی کا جواز پیش کریں اور اس مسئلہ پر علمائے وقت کے ساتھ بحث کریں۔ شیخ سماع کے جواز کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن اس واقعہ سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ نے موسیقی کو ناپسندیدہ ہی سمجھا۔ قدامت پسند فیروز تغلق کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن سیدوں اور لودیوں کے عہد میں موسیقی نے پرانی مقبولیت پھر سے حاصل کر لی۔[illegible] پورے قرون وسطیٰ میں موسیقی بلاشبہ اکثر سلاطین، صوفیا اور عوام کا محبوب مشغلہ تھا۔

**ادب**

خلجی عہد کی ایک خصوصیت علم کے مختلف شعبوں میں کثیر التعداد خالص ادبی تصانیف کی تخلیق ہے۔ برنی کہتا ہے کہ علاء الدین کے عہد میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہر قسم کے علماء اور فضلا کا اجتماع تھا۔ جیسے شعراء، مورخین، سوانح نگار، ماہرین فلکیات اور اطبا، اس عہد میں موجود تھے کسی دوسرے بادشاہ کے عہد میں نہیں ہوئے۔ اس عہد کا زیادہ ادب ہمیں دستیاب نہیں ہوا ہے۔ ہماری آب و ہوا جس نے پتھر کی عمارتیں تک تباہ کر دیں اس سے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ کاغذی تحریروں کو محفوظ رکھے گی۔ ضیاء الدین متعدد تصانیف

---

[illegible]۔ فوائد الفواد، ص ۹۵

[illegible]۔ اقبال، سلطنت کی شام، ص ۲۴۲ - ۲۴۴

کا ذکر کرتا ہے جواب ناپید ہیں لیکن مؤرخ کی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ علاءالدین کے عہد نے بہرحال ادبی سرگرمی کا مشاہدہ کیا تھا۔

تمام فارسی ادبی اصناف میں شاعری قرونِ وسطیٰ میں تمام پڑھے لکھے لوگوں اور متبحر علماء کی غالباً سب سے پسندیدہ صنف تھی۔ ابوالحسن جو اپنے مشہور لقب امیر خسرو سے عام طور پر معروف ہیں بلاشبہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری نے ان کو ان کے تمام معاصرین پر فوقیت عطا کر دی تھی اور وہ بجا طور پر معاصرین اور بعد میں آنے والی نسلوں کی تعریف کے مستحق ہیں وہ ایک شاعر، مؤرخ، موسیقار، فلسفی اور سب سے بڑھ کر ایک صوفی بزرگ تھے[۵۱] ان کی تصانیف ادبی کوششوں کے مختلف شعبوں کی حامل ہیں۔ ان کی شعری تصانیف غزلوں اور مثنویوں پر مشتمل ہیں۔ ان کے اہم دیوان ہیں، تحفۃ الصغار، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ، اور نہایۃ الکمال۔ ان کے علاوہ انھوں نے بعض خمسہ یا پانچ مصرعوں کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ امیر خسرو کی تمام تخلیقات کی خوبیوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا۔[۵۲] برنی یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ خسرو نے فارسی نظم و نثر میں پورا ایک کتب خانہ چھوڑا ہے۔ شاعری پر ان کی مہارت نے ان کو "طوطیِ ہند" کے عرف سے نوازا۔ خسرو پیدائشی شاعر تھے اور بلا کسی انکسار و تواضع کے وہ خود اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں[۵۳]۔ انھیں شاعری کی کسی ایک ہی صنف نہیں بلکہ تمام اصناف مثلاً غزل، مثنوی اور قصیدہ میں کمال حاصل تھا۔ ان کی ذکاوت کا اظہار ان میں اشعار میں ہوتا ہے جن میں ایک مصرعہ فارسی کا ہے اور دوسرا ہندی یا عربی میں۔ ان کی خالق باری اب بھی ہندوستانی مدارس میں مقبولِ عام ہے۔ ان کے بعض اشعار ایک سے زیادہ معانی کے حامل ہیں اور خود خسرو ان اقسام کی ایک مثال کا ذکر غرۃ الکمال کے اپنے دیباچے میں کرتے ہیں[۵۴]۔ انھوں نے حرفِ صنعت، ایہام اور بندش کی لامحدود صنعتوں سے روشناس کرایا۔ بعض مقامات پر وہ قواعد کے خوبصورت جملے تخلیق کرتے ہیں اور حتیٰ کہ روزمرہ کے الفاظ میں بھی ان کے ہاتھوں میں

۵۱۔ برنی ص، ۳۶۱

۵۲۔ متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو حبیب، حضرت امیر خسرو؛ وحید مرزا، لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو اور شبلی، شعر العجم میں خسرو پر باب۔

۵۳۔ دیباچہ، غرۃ الکمال، دہلی متن ص ۲۴

۵۴۔ ایضاً، ص ۸۰-۹۰

پہونچ کر ایک عجیب حسن پیدا ہو جاتا ہے

صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی ان کی تصانیف کی فطری خوبصورتی کی کشش ختم نہیں ہوئی ہے ــــ چھ سو سال قبل جو نظمیں انھوں نے کہی ہیں آج بھی تر و تازہ ہیں۔ اس کے باوجود کہ بعض اوقات ان کا طرزِ تحریر پُر تصنع اور ثقیل ہوتا ہے۔ خسرو ہندوستان کے عظیم ترین شعراء میں سے ایک اور فارسی کے سب سے عظیم ہندوستانی شاعر ہیں۔

حسن سجزی جو زندۂ جاوید خسرو کے جگری دوست تھے شاعری میں ان کی صلاحیتوں کے ہم پلہ ہیں۔ وہ اپنے معاصرین میں "سعدی ہند" کے نام سے معروف تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں لکھا اور دونوں میں ممتاز رہے۔ ان کا طرزِ نگارش سادہ اور سلیس اور قابلِ فہم ہے۔ ان کی نظمیں جو فی البدیہہ ہیں، بڑی سلاست رکھتی ہیں۔ برنی ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کی یادداشت غضب کی اور وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔[55] اس مورخ کو جو لطف حسن کی صحبت میں آتا تھا، وہ کہیں اور نہیں ملتا تھا۔ غزلوں کا ایک دیوان، بعض مثنویاں اور کچھ نثری تصانیف ان کی تخلیق پر مشتمل ہیں۔ ان کی تمام تخلیقات میں سب سے اہم الفوائد ہے جس کا ابھی تذکرہ آئے گا۔

اس عہد کے کم اہم شعرا میں صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا عارف عبید حکیم، شہاب انصاری اور صدر بستی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا طرزِ بندش اور اندازِ بیان تھا۔ ان تمام شعرا کو مملکت سے وظائف ملتے تھے۔ نثر نگاروں میں عین الملک ملتانی، فاتح مالوہ کا نام خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس کی انشائے ماہرو شستہ نثر میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔

شعرا کی طرح بہت سے مورخین نے بھی خلجی عہد میں نشو و نما پائی۔ برنی اس عہد کے دو عظیم مورخین امیر ارسلان کلاہی اور کبیر الدین فرزند تاج الدین عراقی کا ذکر کرتا ہے۔ اول الذکر کا حافظہ قوی تھا اور وہ کتابیں دیکھے بغیر علاء الدین کو تاریخی معلومات سے آگاہ کرتا تھا۔ موخر الذکر عربی اور فارسی کا جید عالم تھا اور اس نے علاء الدین کے کارناموں اور فتوحات پر ضخیم دفاتر تحریر کیے تھے۔ علاء الدین کے عہد کی تاریخ پر اس کی تصانیف حرفِ آخر تھیں۔ لیکن چونکہ وہ لشکر میں میر داد تھا اور اس نے شاہی سرپرستی کے تحت لکھا تھا۔ لہٰذا وہ بادشاہ کی تعریف کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتا تھا۔[56] یہی وجہ ہے کہ اس نے "اس ظالم بادشاہ" کی تعریف میں قصیدے میں زمین و آسمان کے

---

۵۵ - برنی، ص ۳۶۰

۵۶ - یہاں پر برنی کی زبان ناقص ہے، ص ۳۶۱

قلابے ملائے ہیں یہ فتحنامہ برنی کے مطابق شہنشاہ کی نگرانی میں تحریر کیا گیا تھا۔ ضیاء الدین تسلیم کرتا ہے کہ اس نے اپنی تاریخ فیروز شاہی بنیاد کبیر الدین کے فتحنامہ پر رکھی ہے۔ امیر از سلان اور کبیر الدین کے علاوہ ضیاء الدین اور امیر خسرو بھی علاء الدین کے معاصرین میں بڑے مؤرخین تھے۔ تاریخ ادب میں ان کے حصے کا مطالعہ بعد میں کیا جائے گا۔ تاریخ فیروز شاہی کے سوا ضیاء الدین کے سر کچھ اور تصانیف کے خالق ہونے کا سہرا باندھا جاتا ہے جیسے صلوات کبیر (بڑی عبادات)؛ ثنائے محمدی (پیغمبر کی تعریف) حسرت نامہ (غالباً اس کی خود نوشت سوانح حیات)؛ عنایت نامۂ الٰہی (خدا کے انعامات کی کتاب)؛ مآثر سعادت (سادات کے آثار گرامی) اور برامکہ کی ایک تاریخ۔ فتاویٰ جہانداری (نظریۂ حکومت کی کتاب) کے نام سے معروف اس کی ایک اور تصنیف تاریخ فیروز شاہی کا ضمیمہ معلوم ہوتی ہے، اور اخلاقی اور سیاسی اصولوں پر مشتمل ہے جن پر مسلمان بادشاہ کو مذہبی مؤرخ کے خیال کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

ہندی اور سنسکرت میں معاصر تاریخی کتب ابھی بڑی تعداد میں روشنی میں نہیں آئی ہیں لیکن مغنی شعرا کی تصانیف مثلاً سارنگ دھر کی ہمیر راسا (چودھویں صدی) اور ملا داؤد کی نظمیں جو انھوں نے تیرھویں صدی کے اختتام پر لکھیں اس زمانہ پر کافی روشنی ڈالتی ہیں جن میں وہ لکھی گئی تھیں۔ بہرکیف ان میں بہت سا مواد ہے "فرضی اور ناقابل اعتماد تاریخ ہے"

زمانۂ قرون وسطیٰ کی ادبی تصانیف کی ایک اہم خصوصیت ملفوظاتی ادب کی کثرت ہے مختلف صوفیوں کے مرید متعدد جانشینوں (جانشین کی جمع) کے متعدد باسول کی طرح تھے۔ ایک مرید اس کو بڑی سعادت اور فخر کی بات تصور کرتا تھا کہ جو کچھ اس کے پیر اور اس کے درمیان گزرا ہے اس کو بڑی ایمانداری سے ضبط تحریر میں لے آئے۔ چونکہ ایسی تصانیف مذہبی اعتبار سے مقدس سمجھی جاتی ہیں اس لیے ان کی بڑی قدر و قیمت کی جاتی تھی۔ برنی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حسن سجزی کی فوائد الفوائد اپنے زمانے کی سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں سے ایک تھی۔ اس طرح کی تصانیف میں یہاں صرف اس زمانے کی سب سے زیادہ اہم کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ راحۃ القلوب شیخ فرید الدین گنج شکر اور ان کے خلیفہ نظام الدین اولیا کے درمیان گفتگو کا مجموعہ ہے۔ موخرالذکر کی تحریر کردہ ہے۔ نظام الدین کے خلفا، امیر خسرو حسن علاء الدین سجزی اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے بالترتیب افضل الفوائد، فوائد الفوائد اور مفتاح العاشقین کتابیں لکھی ہیں۔ امیر خسرو کی افضل الفوائد دو مجموعوں افضل الفوائد اور راحۃ المحبین پر مشتمل

ہے۔ پہلی شیخ نظام الدین سے ان کی ۷۱۳ھ سے ۷۱۵ھ تک گفتگو پر مشتمل ہے اور دوسری ۷۱۹ھ سے بعد کے کچھ برسوں تک کی گفتگو پر۔ فوائد الفوائد شیخ نظام الدین اولیا اور حسن سجزی کے درمیان ۷۰۷ھ سے ۷۲۲ھ تک کی گفتگو کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب اسی سال پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ معاصر مصنفین کے مطابق یہ کتاب اس زمانہ میں اتنی مقبول تھی کہ امیر خسرو تک اس کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اس کی خوبی کے قائل تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ جو شیخ کے جانشین بنے ان کی کتاب مفتاح العاشقین غالب گمان یہ ہے کہ نظام الدین کی وفات کے بعد تحریر ہوئی تھی۔ نصیر الدین چراغ کی ایک اور کتاب خیر المجالس (مصنفہ ۱۳۵۲ء) ہے۔ محمد حسین کی تربیت الاولیا تقریباً اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ لیکن نظام الدین کی سب سے مستند سوانح حیات سیر الاولیاء (نامی کتاب) امیر خورد نے، جو حضرت کے ایک شاگرد تھے، ان کی وفات کے بہت بعد تصنیف کی۔

یہ ملفوظات پر مبنی تصانیف پیروں اور ان کے ان مریدوں سے بحث کرتی ہیں جو سماج کے مختلف طبقات پر مشتمل تھے، جو مختلف خیالات کی نمائندگی اور جو اپنے پیروں سے روزمرہ کے واقعات پر گفتگو کرتے تھے۔ وہ مختلف زمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ پر بیش بہا اور مستند معلومات کے ماخذ ہیں۔

چودھویں صدی کی چند تصانیف نظم و نثر کی سنسکرت تخلیقات نیز مختلف ہندستانی سلطنتوں اور صوبوں کے مقامی ادب اور مستند اول روایات پر مشتمل ہیں۔ سارنگ دھر نے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چند بردائی مصنف پرتھوی راج راسو کی اولاد میں سے تھا، چودھویں صدی میں نشو و نما پائی۔ وہ دو مشہور کاویوں (۱۵۰۰ء) ہمیر کاویہ اور ہمیر راسو کا مشہور مصنف تھا جو علاء الدین کے رنتھمبور پر حملے کے وقت ہمیر کی شجاعانہ مدافعت اور جان نثارانہ انجام کو بیان کرتے ہیں۔ اس نے سنسکرت نظموں کی ایک بیاض بھی مرتب کی جو سارنگ دھر پدھتی" کے نام سے معروف ہے اور ۱۳۴۲ء میں شائع ہوئی[57]۔ تیرھویں صدی کے اواخر کا ایک اور شاعر بھودیتی تھا۔ چودھویں صدی کے کچھ اور شعرا ہیں۔ مثلاً نگھ اور ملا داؤد[58]۔ امیر خسرو کے بارے میں یہ خیال ہے کہ انھوں نے بھی ہندی میں شاعری کی۔ لیکن اس میں شک ہے کہ آجکل جو کثیر تعداد میں ادب ان کے نام سے موجود ہے وہ سچ مچ ان ہی کی تخلیق ہے۔ اس کے باوجود وہ ہندی شاعری کے پیشرو

---

۵۷۔ کے (۱۹۷۰ء)، اے ہسٹری آف ہندی لٹریچر، ص ۱۷

۵۸۔ ایضاً ص، ۱۸

ہیں جس نے کبیر سے لے کر ملک محمد جائسی تک بھگتی کے شعراء کے ہاتھوں زبردست ترقی پائی

چودھویں صدی میں گجرات کا ادب گجراتی متداول روایات کی شکل میں بہت زیادہ مقدار میں ہے۔ جناب کے ایم منشی کے مطابق "ستھولی بھدر پھاگ" جو سب سے قدیم دستیاب پھاگ (ہولی) ۱۳۳۴ء میں تحریر ہوا۔ اس مقبولِ عام طرز کے علاوہ محبت کے گیت بھی عوام کی دھنوں میں تخلیق کیے گئے تھے۔ اس طرز کی ایک عظیم نظم "وسنت ولاس" کے بارے میں خیال ہے کہ وہ چودھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں لکھی گئی تھی۔ اسی جیسی ایک اور نظم "نیمی ناتھ کتھا چتیشک" ؟ تھی جو ۱۳۶۹ء میں لکھی گئی۔[59] گجراتی میں دوسری تصانیف جو اس عہد سے متعلق ہیں یہ ہیں: "پربھا چندر کی" "پربھاوکا چرت" (اور میری تنگا کی پرا دیا منا (تحریر شدہ ۱۳۰۷ء) اور "پربندھ چنتامنی" (مصنفہ ۱۳۰۴ء) ان تصانیف میں فرضی قصوں کے طویل سلسلے ہیں۔ "پربندھ چنتامنی" جو کہ علاء الدین کے عہد میں لکھی گئی۔ ان تینوں میں اپنے انداز طرزِ بیان اور تاریخی مواد کی دولت کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔[60]

اسی طرح اس عہد میں بنگال میں ادبی سرگرمی زیادہ تر متداول روایات تک محدود معلوم ہوتی ہے جس نے بنگال کو ایک علاقائی زبان کی حیثیت سے نشوونما پانے کا موقع دیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ تیرھویں صدی میں بنگال کی ترک فتح کے وقت سے بنگال کے سلاطین اور گورنروں نے بنگالی سیکھنے اور وہاں کے لکھوکھا عوام کے ساتھ میل جول بڑھانے کی کوشش کی۔ وہ دقیق سنسکرت کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتے تھے اس لیے انھوں نے اس زبان کی اہم تصانیف کے مقامی زبان میں ترجمے کرائے۔ مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ (ناصر شاہ (۱۳۴۲ء) کے حکم سے کیا گیا یہ بنگالی زبان کا ایک بڑا محسن تھا۔[61] ایک صدی بعد بنگال نے چنڈی داس اور ودیاپتی جیسے عظیم شاعر پیدا کیے۔

اگرچہ جنوبی ہند اور دوسرے علاقوں میں جہاں مسلم اثرات کے پہونچنے میں وقت لگا سنسکرت تصانیف بڑے پیمانے پر لیکن صرف سوتروں اور تفسیر وغیرہ کی عام شکل میں تصنیف ہوتی ہیں

۵۹۔ کے ایم منشی، گجرات اینڈ اٹس لٹریچر، ص ۸۸۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۹۷

۶۱ ڈی سی سین، اے ہسٹری آف بنگال لینگویج اینڈ لٹریچر، مقدمہ اور ص ص ۹، ۱۲، ۱۳، ۱۳۸۔

اس انداز کی بعض کتابیں ہیں۔ ودیادھر کی ایکاولی اور رودیاناتھ کی "پرتاپ ردریشوبھوشن"
جو دونوں ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ ایک اڑیسہ کے نرسمہا کے لیے اور دوسری وارنگل کے پرتاپ
ردر کے لیے لکھی گئیں۔ جن کی شہرت کا ذکر ڈرامے میں کیا گیا ہے۔ اسے بھی اس کتاب میں شامل
کر لیا گیا ہے، تاکہ فنِ تمثیل کے اصولوں کو بیان کیا جائے۔[۶۲] شاستر دیپکا، کریما ساپر ایک کتاب جو
غالباً علاء الدین کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ خاص طور پر ذکر کی مستحق ہے۔ وہ پارتھا سارتھی مصرا کی
تصنیف ہے جس نے تقریباً ۱۳۰۰ء میں فروغ پایا۔ فرکوہر (Farquhar) کے مطابق وہ مقبول
عام جدید طرز میں لکھی گئی ہے اور اس کا مصنف اپنا نداز سے کمارل کی پیروی کرتا ہے۔[۶۳]

لیکن جب کہ ایسی تصانیف کی تخلیق جاری تھی مشکل ہی سے اس میں شک کیا جا سکتا ہے۔
ترک فتوحات نے سنسکرت ادب کی ترقی و ارتقا کو بہت متاثر کیا تھا۔ مسلم فاتحوں اور حکمرانوں
نے عام طور سے فارسی اور مقامی زبانوں کی سرپرستی کی۔ مزید برآں یہ۔ دستان کے مختلف حصوں
پر ان کے حملوں نے لوگوں کی زندگی درہم برہم کر دی اور ان کے ان پرامن مشغلوں کو ختم کر دیا۔ مسٹر
منشی جنھوں نے گجرات کے ادب کا عمیق مطالعہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ ۱۲۹۹ء میں الغ خاں کی سلطنت
پر حملے کے بعد ایک سو سال تک سوائے متداول روایاتی ادب کے کوئی اور تصنیف وجود میں
نہیں آئی۔ اپ بھرنشس ادب موجود تھا اور "پربندھ چنتامنی" اگرچہ خاص طور سے سنسکرت نثر
کی ایک کتاب ہے تاہم اس میں اپ بھرنشس ادب کے کچھ دلچسپ اقتباسات شامل ہیں۔[۶۴]
مجموعی لحاظ سے چودھویں صدی میں سنسکرت رفتہ رفتہ اہمیت کھو رہی تھی۔ لیکن سنسکرت کا نقصان
کی علاقائی زبانوں اور مقامی ادب کے فوائد سے جو ملک کے تمام حصوں میں تشکیل پا رہے تھے۔
تلافی ہو گئی۔

**ایک عام نظر** جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے ملک کی تہذیبی
تاریخ میں خلجی عہد بڑے دوررس نتائج کا حامل تھا۔ جنوب سے پھر سے
رابطہ قائم ہو جانا ایک عظیم واقعہ تھا۔ سیاسی نتائج کے علاوہ اس نے جنوب میں ایک نام دیو

---

۶۲۔ کیتھ (Keith)، ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر، ص ۳۹۵

۶۳۔ فرکوہر، این آؤٹ لائن آف ریلیجس لٹریچر آف انڈیا، ص ۲۱ ۔ ۱۲۰

۶۴۔ کے، ایم، منشی، مذکورہ بالا، ص ۹۷

اور شمال میں ایک رام ناتھ پیدا کیا۔ فرقہ بندی اور علاقائی عصبیت جو کہ شمال اور جنوب میں اور ان دونوں کے درمیان باہمی تلخی اور کبھی نہ ختم ہونے والے جھگڑوں کے اسباب کا سدِّباب ہوا۔ نظم ونسق میں نئے خیالات کے لیے زمین ہموار ہوئی جو مغل سلطنت کے عہد میں بارآور ہوئے۔ سماج اور مذہب میں وہ اس تحریک میں پھلے پھولے جو بھگتی تحریک کے نام سے مشہور ہے اور تمدن میں انھوں نے پرانی بولیوں کو جدید ہندوستانی زبانوں میں تبدیل کیا جنھوں نے ادب کی نئی اصناف کی تخلیق کی طرف رہنمائی کی۔

# ضمیمہ الف

## علاءالدین اور نیپال

شری درگا پرشاد نے چاندی کا ایک سکہ[1] جو علاءالدین کے زمانے میں نیپال میں ڈھالا گیا تھا شائع کیا ہے۔ ان کو وہ پہلی صدی عیسوی کے لچھوی خاندان کے نیپال کے اور ایک اور سکے کے ساتھ وارانسی (بنارس) میں ملا تھا۔

سکے کا وزن ۱۵۱ داتے ہے علاءالدین کے چاندی کے ایک تنکہ کے وزن سے تقریباً چھ دانے کم۔ وہ سائز میں ۱،۱۵ انچ ہے۔ چہرہ کے رخ پر حاشیہ پر عربی میں عبارت ہے "سکندر الثانی ناصر الامیر المومنین یمین الخلافۃ" اور وسط میں ایک چھوٹے سے اشت کون یا ہشت پہل میں نیپالی انداز کا پروں والا ایک چھوٹا سا شیر بنا ہوا ہے۔ الٹے رُخ پر ایک تہرے دائرے میں عربی عبارت ہے الاعظم السلطان ابو المظفر محمد شاہ علاء الدنیا والدین" اور حاشیہ پر ایک چھوٹا سا سنکھ بنا ہوا ہے۔ وسط میں ایک چھوٹے سے حلقہ میں الفاظ "سری سری" جن میں سے ہر ایک کے اوپر دو ہلال اور نیچے پھولوں کا ایک نمونہ بنا ہے۔ تیرھویں صدی کے ناگری رسم الخط میں کندہ ہیں۔ عبارت کا عربی رسم الخط نسبتاً بھونڈا ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھپہ بنانے والے نے اگرچہ عبارت کو سلطان کے کسی اصل سکے سے نقل کیا تاہم عربی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے عربی حروف کو کندہ کرتے وقت اس نے کئی غلطیاں کی ہیں۔

---

۱۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، سکوں کا ضمیمہ، ۱۱ - x، ۱۹۲۹ء، ص ۳۸ - ۳۷

سری سری کا خطاب اور دوہلال مع چھوٹے چھوٹے صفروں کے جو تین لسخوں کی نمائندگی کرتے ہیں، شنکھ اور دانوں کا حلقہ بالکل اسی انداز میں نیپال کے پرتھوی نارائن شاہ دیو اور شری گردن یادھو وکرم شاہ دیو کے بعد کے نقرئی سکوں میں پائے جاتے ہیں۔ درگا پرساد مزید کہتے ہیں کہ تانترک اشٹ کون اور دم اٹھائے ہوئے پروں والا شیر نیپال کے سکوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس سکے کی نیپال میں ڈھلائی کو ثابت کرتے ہیں۔

وہ سکہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ وہی ایک شہادت ہے جو نیپال سے علاءالدین کے تعلق کا حوالہ دیتی ہے۔ ہمعصر فارسی تاریخوں میں اس ملک پر سلطان کی فتح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بہرحال ہندو بیانات علاءالدین کے زمانہ میں کرناٹکا خاندان کے ہرسمہا دیو متھلا کے ہندو راجہ کی نیپال پر فتح کا ذکر کرتے ہیں۔ متھلا جو موجودہ بہار کے شمال اور شمال مغرب پر مشتمل تھا۔ ابتدائی تیرھویں صدی کے مسلمان حملہ آوروں سے متاثر نہیں ہوا تھا جنھوں نے جنوبی بہار کے راستے بنگال پر فوج کشی کی تھی اور گنگا کے شمال کے علاقے کو جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ علاءالدین کے ایک ہمعصر ہرسمہا دیو کا عہد حکومت کافی طویل تھا اور اس کے عہد میں قابل وزیروں، مثلاً دیودمس اس کا بیٹا دیرپشو رٹھاکر اور اس کا پوتا چندیشور ٹھاکر نے وزارت کی خدمت انجام دی تھی۔ چندیشور ایک متبحر عالم تھا جس نے سنسکرت میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی خاص تصانیف تھیں: کرتیہ رتناکر، دان رتناکر، ودا رتناکر، سدھو رتناکر، گرہست رتناکر، اور پوجا رتناکر، کرتیہ، ڈان، اور ودا رتناکروں میں چندیشور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنے آقا کے لیے نیپال فتح کیا۔ ودا رتناکر میں وہ بیان کرتا ہے کہ اس عظیم فتح کے بعد اس نے تلاپرسا یا معطی کے وزن کے برابر برہمنوں کو سونا دینے کی مذہبی خیرات وغیرہ کی رسم ۱۲۳۵ء سا کا سنہ ۱۲۳۶ء میں کیے انجام دی۔

रसगुणभुत-चन्द्रैः सम्मिते शाकवर्षे
सहसि धवल पक्षे वागमती सिन्धुतीरे।
अदिल तुलित मुच्चै राजना स्वर्णराशि
निचित रिवल गुणानामुत्तरः सोमनाथः॥

---

۲۔ دوارتناکر، ص ۷۱ - ۷۰

(۱۳۱۳ء ساکا کے پوس ماہ کے چاندوا ے پندرھواڑے میں سونا تھا جو تمام عمدہ اوصاف سے بھرا ہوا ایک سمندر تھا نے اپنے وزن کے برابر سونا دریائے باگ متی کے کناروں پر خیرات میں تقسیم کیا۔)

لہٰذا مذکورہ بالا فتح ۱۳۱۲ء سے قبل کسی وقت ہوئی ہوگی جب تلا پرسا کی رسم انجام دی گئی تھی: بہرحال راجدھانی نیپال کے حدود پر سمرم پور (موجودہ سمراؤں) میں تھی یہ ناممکن نہیں ہے کہ چندر یشور نے جو کہ امن و جنگ کا وزیر ( [illegible] ) تھا نیپالی علاقے میں ایک کامیاب فوج کشی کی ہو اور نیپال کا کچھ علاقہ چھین لیا ہو۔ لیکن سنسکرت مصنفین فارسی مصنفین کی طرح اپنی معمولی کامیابی کو بہت مبالغہ سے بیان کرتے ہیں اور بالکل ممکن ہے کہ چندر یشور کی نیپال پر فتح اس ملک پر ایک معمولی سا حملہ ہو۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علاء الدین کے زمانے میں ایک ہندوستانی فوج نے نیپال کے علاقہ پر فوج کشی کی تھی۔

دان رتناکر چندر یشور کے بارے میں بیان کرتی ہے کہ اس نے زمین کو جو ملیچھوں سے بھر گئی تھی پاک کیا۔ لیکن متھلا پر چودھویں صدی کی پہلی دہائی میں مسلمانوں نے کب حملہ کیا تھا اس کی تاریخ نہیں معلوم ہے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ۱۳۲۴ء میں جب غیاث الدین تغلق نے بنگال پر فوج کشی کی تھی تو وہ ترہت ہو کر گیا تھا اور اس وقت تک مسلمانوں نے متھلا پر طاقت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس کا یقین کر لینے کا کوئی سبب نہیں کہ متھلا پر علاء الدین نے حملہ کیا تھا اور اس کے راجہ نے سلطان کی فرمانروائی تسلیم کر لی تھی اور اس کے نام کے سکے ڈھالے تھے۔ چنانچہ جب راجہ نے نیپال فتح کیا تو اس کے نام نیز سلطان دہلی کے نام سکے میں ڈھالے گئے۔

مذکورہ بالا قسم کے صرف ایک سکہ کی دریافت ہم کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کی جانب رہنمائی نہیں کر سکتی کہ علاء الدین نے نیپال کے دور دراز ملک میں کوئی فوج بھیجی تھی اور وہاں کے حکمراں راجہ کو اپنی فرمانروائی تسلیم کرنے اور اپنے نام کے سکے ڈھالنے پر مجبور کیا تھا۔ نہ سلطنت دہلی اور سلطنت نیپال کے درمیان تجارتی تعلقات کی موجودگی کا کوئی ذکر ملتا ہے

---

۳۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۹۰۳ء جز اول، ص ۱۴

۴۔ ایضاً " " " ۱۹۱۵ء، ص ۳۳ - ۴۰۵

کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ سکہ بہت سے ان سکوں میں سے ہو سکتا ہے جو تبادلے کی غرض سے استعمال کیے جاتے تھے۔ بلاشبہ ایک ایسے سکے کی دریافت دلچسپی سے بھرپور ہے لیکن جب تک کچھ مزید معلومات نہ حاصل ہوں اس پیچیدہ مسئلے پر کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

# ضمیمہ ب

## کیا ملک کافور نے رامیشور پر حملہ کیا تھا؟

امیر خسرو کے مطابق کافور نے برہت پوری کے مندر پر حملہ کیا۔ اس کو پروفیسر آئنگر نے چدمبرم سے شناخت کیا ہے اوّل تو اس لیے کہ چدمبرم میں چھت سونے کی ہے دوم اس لیے کہ وہ برہم پوری کے نام سے معروف تھا۔ پروفیسر آئنگر کا بہرکیف یہ خیال ہے کہ اس کو رامیشورم سے بھی شناخت کیا جاسکتا ہے کیونکہ امیر خسرو دیول رانی میں (اس خاص مہم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ فوج نے معبر کی جانب پیش قدمی کی اور لنکا کے سمندر کے ساحل کی طرف اس بادشاہ کے خلاف جس کو وہ پانڈیہ گرو کہتے ہیں۔[1]

دیول رانی کے متن کا میرا مطالعہ پروفیسر آئنگر کے پہلے مفروضہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اوّل تو اس لیے کہ جس مقام پر حملہ کیا گیا تھا اس کو خسرو نے برہت پوری کہا ہے اور دوسرے اس لیے کہ پانڈیہ گرو نام کا کوئی راجہ رامیشور پر حکومت نہیں کرتا تھا۔ مزید برآں فوج کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اس نے کئی دریاؤں کے کناروں پر (لب دریا سواحل برسواحل) پیش قدمی کی تھی لیکن اس نے سمندر کو کبھی [illegible] عبور کیا تھا۔ دیول رانی کا متن (ص ۷۰) یہ ہے۔

لب دریا سواحل برسواحل — بجوشش آمد دہ دشہر درماحل

دلاں حد نیزرائے بود والا — بتاج ہندوان لولوے لالا

---

۱۔ خزائن الفتوح کے ترجمۂ حبیب کا مقدمہ، ص ۳۳

برآب وخاک فرمان تمامش — برہمن بیر پنڈیا کردہ نامش
بے شہرش نجشکی و تری ہم — پٹن خویشش کردہ ومرہت پوری ہم
پٹن را ساختہ منزل گہہ خویش — بت وبت خانہ ومرہت پوری پیش

(لب دریا کنارے کوچ پر کوچ کرتے وہ گاؤں، شہروں اور گھاٹوں (منزلوں) پر پہنچے۔ سرحد پر ایک مشہور رائے تھا۔ ہندوؤں کا تاج (ہندو راجہ) ہیروں سے جڑا تھا۔ وہ بحروبر کا تمام علاقہ کا حکمراں تھا۔ برہمن اس کو بیر (دیر) پانڈیہ سے پکارتے تھے۔ اس کے متعدد شہر زمین پر تھے اور بہت سے دوسرے پانی پر۔ اس نے پٹن اور مرہت پوری جیسے شہر آباد کیے تھے۔ پٹن کو اس نے اپنی راجدھانی بنایا تھا اور مرہت پوری میں اس نے بت اور بت خانے کھڑے کیے تھے)۔

لہذا مرہت پوری کیا ہے؟ دیول رانی (ص ۷۰) علی گڑھ متن میں ایک حاشیہ ملتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی مخطوطہ میں مرمت پوری ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ میں بھی برمت پوری ہے (ورق ۷۷، ب) چنانچہ مرہت پوری یا برہت پوری چدمبرم ہی کا دوسرا نام تھا۔ جہاں تک خسرو کا تعلق ہے وہ رامیشورم پر کسی حملہ کا ذکر نہیں کرتے۔ بہرکیف ہم یہ جانتے ہیں کہ کافور نے دیر پانڈیہ کی تلاش میں بہت تیز حملے کیے۔ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا، کہ سری رنگم اس مقام سے جس پر کافور نے حملہ کیا تھا، دریائے کاویری اور ایک یا دو معاون دریا چدمبرم کی جانب بہتے ہیں، جہاں وہ سمندر گر جاتے ہیں۔ فطری بات تھی کہ جب کافور نے سری رنگم سے پیش قدمی کی تو اس نے چدمبرم پہنچنے کے لیے دریا کے کنارے (لب دریا) سفر کیا جو ساحل سمندر کے قریب اگر خود ساحل پر نہ سہی واقع ہے۔ ساحل سمندر پر ہی کاویری پٹنم اور دیگا پٹن جیسے پٹن بھی واقع ہیں جن کا امیر خسرو نے حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ جہاں تک خزائن اور دیول رانی میں خسرو کے بیان کا تعلق ہے رامیشورم پر کسی حملے کا ذرا سا بھی حوالہ نہیں موجود ہے۔

بہرحال سترھویں صدی میں لکھتے ہوئے فرشتہ ایک بہت اہم بیان دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک "مسجد علائی" رامیشورم میں اس وقت موجود تھی جب وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا[2]

"تا این خامہ عنبرین شمامہ در تحریر ایں وقائع ست آں مسجد در نواحی سیت بند رامیسر موجود ست و مسجد علائی مشہور ست"

---

۲۔ فرشتہ، ص ۲۰ - ۱۱۹

(جب کہ عنبر کی خوشبو والا۔ یہ قلم ان واقعات کو لکھنے میں مشغول ہے یہ مسجد سیت بند رامیسر کے نواحی میں موجود اور مسجد علائی کے نام سے مشہور ہے)

فرشتہ کا بیان صاف بتاتا ہے کہ مندر کی تباہی کے بعد کافور کی تعمیر کردہ مسجد رامیشورم کے قریب (در نواحی) کسی جگہ واقع تھی۔ خسرو اور برنی علاءالدین کے زمانے میں رامیشورم میں کسی مسجد کی تعمیر کا ذکر نہیں کرتے۔ مدورائی کے مندر کی تباہی کے سلسلے میں خسرو کا بیان ہے کہ مندر کو اس کی بنیادوں سے اکھاڑ پھینکا گیا تھا۔ لیکن رامیشورم کے مشہور مندر فن تعمیر کی اپنی پوری شان و شوکت، حسن و جمال اور العلاثلاثہ کے ساتھ اب بھی موجود ہے، جو کہ امپیریل گزیٹر میں بیان کیے گئے ہیں۔[۳]

نہ صرف فرشتہ بلکہ حاجی الدبیر کے پاس بھی اس حملہ کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں بتانے کے لیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دوار سمدر سے کافور نے سرندیپ (سیلون) کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں لنگ مہادیو کو توڑ ڈالا۔[۴] یہ بیانات صرف یہ دکھاتے ہیں کہ جنوبی ہند میں شیو طبقہ کے ایک مندر پر کافور کا حملہ اپنی نوعیت کی مخصوص مہم تھی اور بعد کے مورخین جو دکن کے جغرافیائی حالات سے ناواقف تھے لیکن اس فوجی کارنامہ کے بارے میں کچھ کہنے کے خواہاں تھے، چدمبرم کو رامیشورم اور حتیٰ کہ سیلون سمجھنے لگے۔ خلاصہ یہ کہ جس مندر پر حملہ کیا گیا تھا وہ چدمبرم تھا اور رامیشورم نہیں کیونکہ:

ا۔ کسی ہمعصر مصنف نے رامیشورم کا نام بیان نہیں کیا۔ خسرو مرہت پوری کا ذکر کرتے ہیں جو جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا، چدمبرم کا ایک اور نام ہے

۲۔ رامیشورم مدورا سے بہت دور واقع ہے جو جنوب میں کافور کی فوج کشی کی آخری حد معلوم ہوتی ہے اور امیر خسرو کے بتائے ہوئے وہ تمام مقامات جہاں جہاں کافور گیا تھا اس کے قریب ہی واقع ہیں۔

۳۔ رامیشورم ایک جزیرہ ہے۔ امیر خسرو جو اس مہم کے بارے میں دقیق سی دقیق تفصیلات فراہم کرتے ہیں، کشتیوں وغیرہ پر سمندر کو عبور کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔

---

۳۔ انڈکس جلد، ص ۱۹ ۔ ۸۱۸

۴۔ ظفر الوالہ، ص ۱۵۷

۵۔ انڈکا ایکنی کیوٹری سال ۱۹۹۱ ص ۴۴ ۔ ۱۳۱

۴۔ حتیٰ کہ فرشتہ جو علاء الدین کی مسجد کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اس کا جائے وقوع رامیشورم کے قریب کسی جگہ (در نواحی سیت بند رامیسر) بتاتا ہے اور اس شہر میں نہیں بتاتا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتہ جس مسجد کا ذکر کرتا ہے وہ حقیقت میں علاء الدین نے نہ بنوائی ہو بلکہ صرف اس کے نام سے منسوب ہے یا کسی اور علاء الدین کے نام سے منسوب ہو۔

مزید برآں اس زمانے کے بعض مصنفین نے تو مدورا تک کافور کی فوج کشی ہی کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا ہے چہ جائیکہ رامیشورم وہ اپنے دلائل کی بنیاد "کوئی لوہا" کی شہادت پر رکھتے ہیں جس کے مطابق سنہ ۱۳۲۴ء سے قبل جنوب میں مدورا تک مسلمانوں کا داخلہ نہیں ہوا تھا۔ مذکورہ بالا حقائق کی بنیاد پر میں کہنے کی یہ جرأت کرتا ہوں کہ ملک کافور نے رامیشورم کے مشہور مندر پر حملہ نہیں کیا۔

# ضمیمہ ج

## خلجی خاندان کا شجرۂ نسب

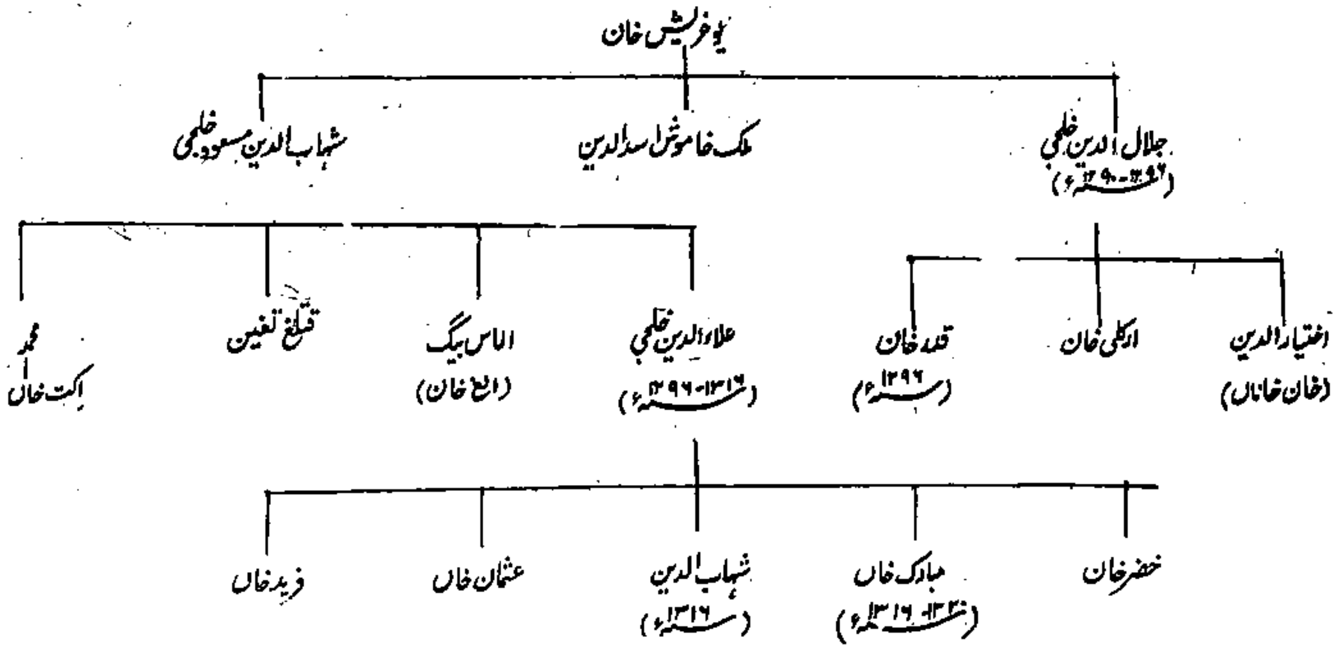

# ضمیمہ د

# مستند مصنفین

خلجی خاندان کی تاریخ اس زمانے میں مؤرخین کی کمی کے سبب ناقص رہ جاتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کبیرالدین فرزند تاج الدین عراقی علاءالدین کا درباری مؤرخ تھا اور اس نے اس کے عہد کی تاریخ کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ اس تصنیف کا نام تھا فتح نامہ۔ اس کی اس تصنیف کا اب کوئی نشان نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ علاءالدین کے عہد حکومت کا ایک بہت ہی اہم ماخذ ضائع ہو گیا۔ بہرکیف برنی اور امیر خسرو اور دوسرے معاصر اور بعد کے مؤرخین کی تصانیف خلجیوں کے بارے میں کافی معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ آئندہ صفحات میں مختلف کتابوں کا جو زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ اس موضوع پر ہمیں دستیاب ہیں۔ ایک تاریخی جائزہ لیا جائے گا۔ کتابیات میں ان تصانیف میں سے بیشتر کی فہرست جن سے اس کتاب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔

**ہمعصر ماخذ** ہمارے زمانے کی ہمعصر تاریخی تصانیف میں سب سے زیادہ بیش بہا مولانا ضیاءالدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" ہے۔ وہ ۱۳۵۹ء میں مبارک خلجی کی موت کے تقریباً چالیس سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ برنی ۱۲۸۵ء میں پیدا ہوا۔ وہ پانچ سال کا تھا جب جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا اور مبارک خلجی کے انتقال کے وقت اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ اس طرح وہ تمام خلجی سلاطین کے عہد حکومت کے واقعات خاص طور سے علاءالدین اور مبارک کے عہد کا جن میں اس نے اپنی نوجوانی کا زمانہ گزارا، عینی شاہد تھا۔ برنی نے اپنی تعلیم دہلی میں حاصل کی جہاں ایشیا کے تمام حصوں سے عظیم علما اور اساتذہ آکر جمع ہو گئے تھے۔ اس کی تاریخ پر تبحر علمی کی واضح چھاپ

موجود ہے۔ ضیاء الدین ایک طویل مقدمہ میں تاریخ کے استعمال اس کے طرز نگارش اور انسانی
کی تعلیم میں اس کے مقام کو شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔ وہ علم تاریخ کو حدیث، فقہ اور ملفوظاتی
ادب کے علم سے کسی طرح کم اہم نہیں تصور کرتا بیکن کی طرح اس کا خیال تھا کہ تاریخ انسانوں کو
عقلمند بناتی ہے اور وہ ماضی کے لوگوں کے تجربہ سے سبق سیکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مورّخ کو صادق
دیانت دار اور بےخوف ہونا چاہیے۔ اگر وہ کسی سبب سے حقائق پر علانیہ قلم نہ اٹھا سکے تو اس کو
اپنے خیالات اشاروں و کنایوں میں ضرور ظاہر کر دینے چاہئیں[2]۔ ایک سے زیادہ مقامات پر
وہ دعویٰ کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا وہ سچ ہے[3]۔ لیکن اپنے بارے میں اس کی یہ رائے مبالغہ
آمیز ہے۔ ضیاء الدین نے زندگی کی تلخی و شیرینی دونوں کا مزہ چکھنے کے بعد پکی عمر میں وفات پائی۔
خوشگوار حالات میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے اور سلطان محمد بن تغلق کی سرپرستی کے بعد
برنی کے آخری ایام بڑے اندوہناک تھے۔ مفلوک الحالی اور افلاس میں اس کا انتقال ہوا۔

ضیاء الدین تاریخ کا سررشتہ اس مقام سے جوڑتا ہے جہاں منہاج سراج نے چھوڑا تھا
تاریخ فیروز شاہی بلبن کے عہد حکومت کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے اور فیروز تغلق کے دور حکومت
کے پہلے چھ برسوں پر ختم ہوتی ہے۔ اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو تغلقوں کی تاریخ کے مقابلے
میں خلجیوں کی تاریخ بہتر طور پر بیان کی گئی ہے۔ خلجیوں کے بیان میں واقعات کے ترتیب وار
سلسلے خاصے صحیح طریقہ پر برقرار رکھا گیا ہے اگرچہ تاریخی واقعہ نگاری اپنی جگہ کافی اطمینان
بخش نہیں ہے۔

اس کے باپ مؤید الملک اور اس کے چچا علاء الملک کی خلجیوں کے عہد میں سرکاری حیثیت نیز
امیر خسرو، حسن علاء سجزی اور دوسرے سرکاری افسروں سے اس کے اپنے روابط نے تاریخی واقعات
کو جمع کرنے اور چھاننے پھٹکنے کے کافی مواقع فراہم کر دیے تھے۔ وہ اکثر اپنی معلومات کے آخذ کا
حوالہ دیتا ہے جن میں خواجہ ذکی، جو کہ حسن بصری کا بھتیجہ اور بلبن کا وزیر تھا،[4] قرابیگ
امیر خسرو اور امیر حسن کے نام ہیں[5]۔ اس نے خسرو کے دواوین کا بھی مطالعہ کیا تھا جن کے اقتباسات

---

۱۔ برنی، ص ۹
۲۔ برنی، ص ۱۲۔ ۱۳
۳۔ حا. E. ص ۲۳۷
۴ برنی، ص ۹۷، ص ۱۱۴، ص ۲۲۹۔

وہ جابجا دیتا ہے ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تاریخ مختلف اوقات میں لکھی تھی ایک بار میں نہیں اور اس نے اپنی تاریخ کی تیاری میں ہمعصر تصانیف سے بھی پورا استفادہ نہیں کیا ۔ اگر اس نے خسرو کی مفتاح الفتوح ، خزائن الفتوح اور دیول رانی اور کبیر الدین کے فتحنامہ کے مطالعہ کے بعد اپنی کتاب کے مسودوں کو اور بہتر بنا لیا ہوتا تو وہ چتوڑ ، رنتھمبور ، مالوہ اور دکن میں علاء الدین کی جنگوں کے بارے میں یقیناً اور زیادہ معلومات بہم پہونچا تیں ۔ وہ دیول رانی کے واقعہ کا بالکل ذکر نہیں کرتا اور ملک کافور کے دکن کی مہموں پر اس کا بیان انتہائی ناقص ہے ۔ مزید برآں ایک بار جب وہ دکن کے بارے میں لکھنا شروع کرتا ہے تو وہ شمال کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے ۔ مثال کے طور پر وہ ۱۳۰۸ء سے ۱۳۱۲ء تک کے شمالی ہند کے واقعات کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم کرتا ہے ۔ خاص طور سے جالور اور سوانا کی جنگوں کے بارے میں بہرکیف یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ضیا ء نے اپنی تصنیف چوہتر سال کی پکی عمر میں جب اس کی حالت بہت شکستہ تھی مکمل کی ۔ اس کی مالی مشکلات نے اس کو تلخ او ر آزردہ خاطر بنا دیا تھا ۔ اور اس وجہ سے وہ تحریروں اور مسودوں کی معلومات کو بہتر بنانے سے زیادہ اپنی روح کے کرب کا اظہار کرنے کی طرف راغب تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ فیروز شاہی کہیں کہیں جلدی میں لکھی گئیں متعدد تحریروں کو بے پروائی سے ایک عبارت میں پرو دینے کی علامتیں ظاہر کرتی ہے ۔

بجز مقدمہ کے جو انتہائی مرصع زبان میں لکھا گیا ہے مؤرخ ایک سادہ ، صاف اور واضح طرز نگارش پر جا رہتا ہے ۔ اس کی زبان اس وقت کے مروجہ انتہائی پر تصنع اسلوب کا مظاہرہ کرنے کے بجائے ۔ بولی جانے والی ہندوستانی کا فارسی میں آورد پر مبنی ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۔ ضیاء الدین ہندوستانی الفاظ جیسے بدلہ ، کھبئی ، جاکر ، چرائی ، چوترہ ، چوکی ، چھپر ، ڈھکہ ، ڈھو منڈی ، موڑھا ، ٹھاہہ (مٹی کا جگہ ) پونڈا (گنا ) پلک وغیرہ اپنی عبارت میں کثرت سے استعمال کرتا ہے ۔ بعض جگہوں پر اس کی زبان اتنی ٹوٹی پھوٹی ہے کہ صاف مطلب نہیں نکلتا ۔ مزید برآں وہ متضاد بیانات دینے کا عادی ہے ۔ معاصر واقعات کا ایک مؤرخ ہونے کے سبب اس نے کسی خاص شے کے مختلف پہلو دیکھے اور ان کو بے ربطی سے بیان کرتا ہے ۔ بعض

---

۵ ۔ ایضاً ، ص ۳۷ ۔ ۱۱۸

مقامات پر وہ علاء الدین کی تعریف میں رطب اللسان ہے، اور بعض جگہ وہ اس کو فرعون سے مشابہ بتاتا ہے۔ اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ علاء الدین ایک محسن تھا یا ظالم۔ بہر صورت مورخ کا قلم بہت رواں ہے اور وہ سیدھے سادے انداز میں لکھتا ہے۔ برنی واقعات کو بیان کرنے کا اپنا مخصوص انداز رکھتا ہے اور وہ اس کو قابلِ یقین بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ اس کا اظہارِ بیان کے قاضی مغیث الدین کے ساتھ علاء الدین کی گفتگو اور قطب الدین کے اپنے محبوب وزیر خسرو خاں سے شیفتگی کے بیان میں ہوتا ہے۔ علاء الدین کے ساتھ قاضی مغیث کی گفتگو کے وقت کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ لیکن مورخ قاضی اور سلطان کے درمیان کہے جانے والے ہر لفظ کو لکھتا ہے۔ اس قسم کے واقعات میں برنی دوسرے لوگوں کے منہ میں خود اپنے خیالات رکھ دینے کا خوش آیند موقع پاتا ہے۔ ایک اور جگہ وہ قطب الدین کے قتل کی واقعات سے بھرپور رات کی اتنی زبردست تصویر کشی کرتا ہے اور وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جیسے وہ ایک روزن سے اس کمرہ میں جھانک رہا تھا جس میں قطب الدین اور اس کا محبوب وزیر سو رہے تھے۔ ایسے واضح بیانات عوام کے ذہنوں کو تو متاثر کرتے ہیں۔ لیکن تاریخی صداقت کی خواہش کی تسکین نہیں کر سکتے"۔[۲]

---

۲۔ ڈاکٹر پیٹر ہارڈی "ہسٹورینس آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز"، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱-۱۲۱
میں ان مکالمات کو جیسا کہ برنی نے بیان کیا صحیح تسلیم نہیں کرتے کیونکہ وہ ہارڈی کے بقول نہ تو "ٹیپ ریکارڈ" تھا اور نہ کابینہ سکریٹری۔
یہ صحیح ہے کہ اپنے بیان میں کئی مقامات پر برنی مکالمات اور طویل طویل تقاریر داخل کر دیتا ہے لیکن یہی امیر خسرو عصامی اور ابن بطوطہ بھی کرتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں بظاہر یہی طرزِ نگارش رائج تھا کیونکہ مصنفین یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے ان کا بیان موثر اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اس لیے برنی کے ہر مکالمہ یا تقریر کو مسترد کر دینا کیونکہ وہ ایک "ٹیپ ریکارڈ" یا کابینہ سکریٹری نہیں تھا احمقانہ جرأت ہوگی۔ اگر ہارڈی کی یہی کسوٹی ہے تو قرون وسطیٰ کا کوئی مورخ اعتماد کے قابل نہیں رہے گا۔

برنی متعدد باثر امرا کا بے تکلف دوست اور سلطان محمد تغلق کا سترہ سال تک ندیم رہا تھا۔ لہٰذا اس کی معلومات کے ماخذ متعدد اور مختلف تھے اور کم و بیش قابل اعتماد تھے۔ اگرچہ وہ مبارک خلجی کے نجی کمرے میں ہونے والی گفتگو کی تفصیلات کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتا تھا تاہم کیلی کی جنگ سے قبل کے

برنی کا طنز بہت چبھتا ہوا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا زہرخند مذاق چند الفاظ میں اس کے خیالات کا خلاصہ بیان کر دینے میں معین ہوتے ہیں۔ اس کا یہ تبصرہ کہ علاءالدین کے زمانہ میں "ایک اونٹ ایک دانگ میں مل سکتا تھا۔ لیکن دانگ کہاں؟" بدیعی طور یہ ظاہر کرتا ہے کہ علاءالدین کی اصلاحات نے اشیا ارزاں کر دی تھیں لیکن عوام کو غریب بنا دیا تھا۔ پھر ہمارے مورخ کے مطابق مالگزاری کے افسروں کے ساتھ علاءالدین کے سخت اقدامات نے ان کو اتنا غیر مقبول بنا دیا تھا کہ مالگزاری کے شعبہ میں ملازمت طاعون سے بدتر تصور کی جاتی تھی اور کوئی شخص "اپنی لڑکی کی شادی مال گزاری کے کارکن سے نہیں کرتا تھا اور شحنہ کا عہدہ صرف وہ شخص قبول کرتا جس کے نزدیک زندگی کا احترام نہ تھا۔ کاشتکاروں کی غمناک پریشانی ایسے حالات کو پہنچ گئی تھی کہ لگان ادا کرنے کے لیے کسانوں نے "اپنی بیوی بچوں کو فروخت کر دیا"۔ مالگزار زمینداروں (خوط اور مقدموں) کی بیویاں مسلمانوں کے گھروں میں کام کر کے مزدوری پاتی تھیں اور ہمارے مورخ کے نزدیک بازار کے لوگ "کرۂ ارض پر بسنے والے لوگوں کے بہتر طبقوں میں سے سب سے بدتر تھے"۔[9]

---

(گزشتہ سے پیوستہ) واقعات یا وہ دلائل جو علاءالدین کے تاریخی اعلان کا سبب بنے کہ وہ صرف اس کا حکم دیتا ہے جس کو وہ مملکت کے لیے فائدہ مند تصور کرتا ہے اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز۔ عظیم عوامی اہمیت کے معاملات تھے اور امرا اور سربرآوردہ اشخاص میں وہ یقیناً گفتگو اور بحث کا اہم موضوع بن گئے ہوں گے اور برنی کے اپنی تاریخ میں شامل کردہ مکالمات میں سے کم از کم چند کے بارے میں ضرور یقین رہا ہوگا۔ اس کی تصنیف کے معمولی تنقیدی مطالعہ سے ایک شخص بھوسے کو دانے سے الگ کر سکتا ہے لیکن برنی جو کچھ قوسین میں لکھتا ہے اس کو ناقابل اعتماد سمجھنا اور اس کو مسترد کر دینا مشکل ہی سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ضیاءالدین برنی کے اپنے تعصبات اس کی اپنی کمزوریاں اور خامیاں ہیں (لیکن) کم از کم خلجی عہد کی برنی کی تاریخ نہ صرف قابلِ اعتماد ہے بلکہ کم و بیش صحیح ہے۔"

کے ایس، لال، اسٹڈیز ان میڈیول انڈین ہسٹری، ص ۱۰۹؛ نیز ص ۱۰۹ - ۱۰۷

۷۔ برنی، ص ۲۸۹

۸۔ برنی، ص ۳۴۰

۹۔ ایضاً، ص ۳۴۳

تمام انسانوں کی طرح برنی کی بھی پسند اور ناپسند تھی۔ وہ جنگوں کے بیان میں کسی خاص معرکہ میں اختیار کی جانے والی تدابیر اور اسی قسم کے دوسرے فوجی حکمتِ عملی کے نکات میں دلچسپی نہیں لیتا۔ جہاں بھی اسے اس قسم کے واقعات بیان کرنے پڑتے ہیں وہ بلا استثنا اختصاراً سے کام لیتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ کسی کام، کسی کردار یا مقصد کی تعریف کرنے کے لیے ٹھہرتا ہے جب وہ کسی کی تعریف کرتا ہے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیتا ہے جب کسی کی مذمت کرتا ہے تو اپنے قلم کو تیزاب میں ڈبو لیتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے شخصی خاکے بہت خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ وہ فلسفی مورّخ ہے اور ہمیشہ ثقہ مورّخ نہیں رہتا۔

تاریخ فیروز شاہی کو اس کے کاتبوں کے ہاتھوں بہت کچھ نقصان پہونچا ہے۔ کتاب کے بعض عبارات بالکل قابلِ فہم نہیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ بعض مقامات پر سزا کے ڈر سے برنی نے واقعات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی جرأت نہ کی ہو جیسے کہ غیاث الدین تغلق کی موت والی عبارت میں۔ لیکن وہ دوسرے بہت سے مقامات پر جہاں اس پر سچائی کو چھپانے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا مثال کے طور پر علاؤالدین کے عہد میں سپاہیوں کی تنخواہوں کا بیان[1] یا محمد تغلق کا لگان میں اضافہ وہاں غلطی غالباً بعد کے کاتبوں کی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن چند خامیاں برنی کی تاریخ کی غیر معمولی قدر و قیمت پر پانی نہیں پھیر سکتیں۔ وہ نہ صرف بادشاہوں، درباروں اور مہموں کے بارے میں لکھتا ہے جیسے کہ قرونِ وسطیٰ کے اکثر مورّخین لکھتے ہیں بلکہ وہ حکمرانوں کی معاشرتی اور معاشی اصلاحات، بازار میں پائے جانے والے نرخ، سرکاری ملازمین، لگان کی تعیین اور وصولیابی، شعرا و مورّخین اور اطبا۔ غرضکہ ہر اس چیز کے بارے میں لکھتا ہے کہ جسے کوئی جدید مورّخ لکھنا پسند کرے گا وہ علما، صوفیہ، فلسفہ، مورّخین، شعرا، اطبا اور ماہرین فلکیات کی ایک طویل فہرست دیتا ہے۔ کپڑوں، پھلوں اور مٹھائیوں اور اس عہد کی دوسری عام اشیاء کے بارے میں اس کے حوالے چودھویں صدی کے معاشرتی اور معاشی حالات پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ علاؤالدین کے مارکیٹ کنٹرول اور سلطان کے مال گزاری کے ضوابط کے بارے میں برنی کے بیانات صاف بتاتے ہیں کہ وہ محض ایک تذکرہ نویس نہیں بلکہ صحیح معنوں میں مورّخ ہے۔ برنی اپنے معاصرین کی خامیوں سے واقف تھا اور وہ کہتا ہے کہ کبیرالدین اور دوسرے مورّخین نے اپنی تصانیف کو صرف بادشاہوں، دربارو

---

[1]۔ ایضاً، ص ۳۰۳

اور فتوحات تک محدود رکھا ہے ۔ وہ اپنی تصنیف کا آغاز تاریخ نگاری اور تاریخی مطالعہ کے فوائد پر ایک طویل بحث کرتا ہے[11] ۔ وہ ایک بادشاہ کے فرائض تفصیل سے بیان کرتا ہے ۔ ایک مورخ کی حیثیت سے وہ ان اسباب وعوامل کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے جو جلال الدین علاء الدین اور مجموعی طور پر خلجی حکومت کے زوال کا باعث بنے ۔ ضیاء الدین تاریخی ادب میں اپنے حصہ کا احساس رکھتا ہے اور ذرا بھی انکسار کے بغیر دعویٰ کرتا ہے کہ گزشتہ ہزار سال میں "تاریخ فیروز شاہی جیسی کتاب تخلیق نہیں کی گئی"[12]

برنی کی تصنیف بلاشبہ بہت بیش بہا ہے ۔ بعد کے مورخین نے معلومات نیز حصول فیضان کے لیے اس پر بہت زیادہ تکیہ کیا ہے ۔ نظام الدین احمد، بدایونی، فرشتہ، حاجی الدبیر سولھویں اور سترھویں صدی کے تقریباً تمام اہم مورخین نے برنی پر اس کے بیان کردہ زمانے کی تاریخ کے لیے انحصار کیا ہے ۔ خاص طور سے نظام الدین بہت زیادہ اس کے اقتباسات دیتا ہے[13] بعض مقامات پر تو وہ برنی کو نقل کر دیتا ہے اور بعض دوسرے مقامات پر اس کے چھوڑے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ چنانچہ وہ خلجیوں کی اصل کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہتا کہ وہ ترک نہیں تھے ۔ فرشتہ بھی اس عبارت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں برنی علاء الدین کی سپاہیوں کے لیے تنخواہوں کو بیان کرتا ہے ۔ حاجی الدبیر بعض پیچیدہ سوالات پر نئی روشنی ڈالتا ہے جن کی مناسب تشریح برنی نے نہیں کی ۔ مثلاً علاء الدین کی عمر اور علاء الدین اور جلال الدین کے خاندان کے درمیان مستقل جھگڑوں کے پیچھے پوشیدہ عوامل ۔ عبدالحق دہلوی مصنف اخبار الاخیار، نظام الدین اولیا اور اس کے عہد کے دوسرے صوفیہ کے سوانحی خاکوں کے لیے تقریباً مکمل طور سے برنی پر انحصار کرتے ہیں :

تاریخ کے علاوہ ضیاء الدین نے فتاوائے جہانداری اور متعدد دوسری کتابیں لکھیں جن پر پہلے بحث کی جا چکی ہے ۔ بہرصورت برنی کی سب سے اہم کتاب اس کی تاریخ ہے جو اس کے

---

۱۱۔ برنی ، ص ۱۲۔۱۰ ۔

۱۲۔ ایضاً ، ص ۴۴۔۱۴

۱۳۔ ایضاً ، ص ۱۲۲۔۱۲۳

علمی تبحر اور علمیت کی زندۂ جاوید یادگار ہے۔ میں نے برنی کی تاریخ کے بیلوتھکا انڈکا متن سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی نے براہِ کرم مجھ کو اس متن کی نقل مستعار دی جس کا انھوں نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطات سے موازنہ کیا تھا۔

ابوالحسن جو اپنے عرف امیر خسرو کے نام سے عام طور پر معروف ہیں۔ ہمارے عہد کے ایک اور معاصر مستند مصنف ہیں۔ ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں وہ پیدا ہوئے اور انھوں نے بلبن، جلال الدین، علاء الدین اور محمد تغلق کا زمانۂ حکومت پایا۔ ان کی بیشتر تصانیف علاء الدین اور اس کے بیٹے مبارک خلجی کے زمانے میں لکھی گئیں۔ بحیثیت شاعر ان کی عظیم صلاحیت کا اس سے پہلے مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ قران السعدین، مفتاح الفتوح، عاشقہ، نہ سپہر اور تغلق نامہ ان کی تاریخی مثنویاں ہیں۔ قران السعدین بغرا خان اور اس کے بیٹے کیقباد کی یادگار ملاقات سے متعلق ہے۔ اس تصنیف میں خسرو کینہ توزی سے منگولوں کے خد و خال کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جن کی سخت ناگوار قید میں ایک بار وہ پھنس گئے تھے۔ مفتاح الفتوح جو دیوان غرۃ الکمال تقریباً (۶۹۰ھ) کا ایک حصہ ہے۔ جلال الدین خلجی کی فتوحات بیان کرتی ہے۔ عاشقہ یا عشقیہ ۷۱۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور وہ دیول رانی سے خضر خاں کے عشق کے قصوں اور شادی سے متعلق ہے۔ خسرو اس مثنوی کا آغاز علاء الدین اور اس کے پیشروں کے فوجی کارناموں کی ایک مختصر تاریخ سے کرتے ہیں اور ان غیر یقینی حالات کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں جو علاء الدین کی موت سے قبل اور بعد پیش آئے تھے۔ یہ نظم خضر خاں کی متعدد مصیبتوں اور اس کی المناک موت کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔ نہ سپہر یا نو افلاک جمادی الاول ۷۱۸ھ کو مکمل ہوئی جب شاعر ۶۸ سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکا تھا۔ یہ مثنوی مبارک شاہ کی فتوحات سے بحث کرتی ہے۔ لیکن تیسرے سپہر میں شاعر ہندوستانی آب و ہوا، پھلوں، زبانوں، فلسفہ، جادو وغیرہ کے بارے میں مفصل ذکر کرتا ہے۔ وہ اس زمانے کے سماجی حالات کا ایک بہت ہی دلچسپ نیز مستند خاکہ پیش کرتے ہیں۔ آخری مثنوی تغلق نامہ مصنف کی آخری عمر میں لکھی گئی۔ وہ خسرو شاہ پر غیاث الدین تغلق کی فتح اور تغلق کے عہد حکومت کے ابتدائی برسوں کے چند اور واقعات سے بحث کرتی ہے۔ وہ علاء الدین کے مختلف بیٹوں اور اخلاف کی زبوں حالی کو بھی تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

خزائن الفتوح یا "فتوحات کے خزانے" دکن میں سلطان علاء الدین کی فتوحات کے ایک

مفصل بیان پر مشتمل ہے۔ یہ ایک نثری تصنیف ہے جو مرصع اور ثقیل طویل طرز میں لکھی گئی ہے۔ چونکہ خسرو نے اس کو حکمراں شہنشاہ کے لیے لکھا تھا اس لیے وہ جنوب میں ملک کافور کے کارناموں کی تقریباً سرکاری دستاویز ہے۔ ۶۹۵ھ میں علاءالدین کی تخت نشینی کے واقعات سے لیکر اس کی تکمیل کی تاریخ ۷۱۱ھ تک کے واقعات بیان کرتی ہے۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے سلسلے میں مشکل ہی سے کوئی مبالغہ ہو سکتا ہے کیونکہ تکنیکی لحاظ سے یہی علاءالدین کے عہد کی ایک ہمعصر تاریخ ہے کیونکہ برنی نے بھی بادشاہ کی موت کے بہت بعد میں لکھا تھا۔ دکن کی مہمات کے علاوہ جن پر جامع لحاظ سے بحث کی گئی ہے خسرو نے اس تصنیف میں علاءالدین کی تعمیر کی ہوئی عمارات، گجرات، چتوڑ، مالوہ اور سوانا میں اس کی فتوحات نیز اس کے انتظامی اقدامات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کی متعدد جغرافیائی تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کی مہموں کے سلسلے میں بیان کردہ مناظر میں سے مصنف کم از کم چند کا چشم دید گواہ تھا۔ بدایونی کے مطابق وہ کافور کے ساتھ جنوب گئے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں خزائن الفتوح کا ایک مخطوطہ ہے اس کتاب کا ترجمہ پروفیسر حبیب نے کیا اور انھوں نے اپنے فاضلانہ حاشیہ کا بھی اس میں اضافہ کر دیا ہے۔

خسرو کی اعجاز خسروی، افضل الفوائد، اور راحۃ المحبین کا بھی جو ان کے آخری عمر کی تصانیف ہیں ذکر کرنا چاہیے۔ اعجاز خسروی انشا پردازی پر ایک ضخیم تصنیف ہے اور عام دلچسپی کے مختلف مضامین پر بحث کرتی ہے اور آخری دو کتابیں ان کی اپنے پیر شیخ نظام الدین اولیا کے ساتھ گفتگو کے مجموعے ہیں۔ یہ تمام کتابیں اس عہد کی سماجی زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ خسرو کی دوسری مثنویاں مثلاً مطلع الانوار اس زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی حالات کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔

خسرو کی تصانیف زبردست تاریخی استناد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ سرکاری افسر اور درباری تھے۔ وہ سرکاری دستاویزات اور ایسے لوگوں تک رسائی رکھتے تھے جن سے وہ مملکت کے معاملات کے بارے میں صحیح اطلاعات حاصل کر سکتے تھے۔ حسن علاء سجزی اور ضیاءالدین برنی ان کے جگری دوست تھے اور ان سے تعلقات اس زمانہ کے حقائق کی تعین کا ایک اور مستند ذریعہ تھا۔ خسرو کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت تاریخوں کی کثرت ہے جو مجموعی طور پر قابل اعتماد ہیں اور تاریخی ترتیب کے سلسلے میں ان پر برنی سے زیادہ بھروسہ کیا جا

سکتا ہے۔ لیکن خسرو کے ذوق نیزان کی سرگرمیاں مختلف شعبوں پر حاوی تھیں۔ لہذا وہ برنی کی طرح اچھے مؤرخ نہیں تھے۔ مفتاح الفتوح میں وہ لکھتے ہیں کہ بعض اوقات ان کو ترغیب ہوتی تھی کہ وہ غلط باتیں بھی شامل کر دیں لیکن وہ ہمیشہ حق پر جمے رہے کیونکہ "صداقت ایک قابل تعریف چیز ہے"[14] بلا شبہ خسرو کی تصانیف کو اگر طرز بیان کے شکوہ، الفاظ کی بازیگری اور شاعرانہ مبالغہ آرائی سے صاف کر دیا جائے تو اس زمانے کی جس میں وہ رہ رہے تھے سیاسی اور سماجی تاریخ کی ایک صحیح تصویر پیش کرتی ہیں۔

**تقریباً ہمعصر مآخذ**

قریب قریب معاصر مآخذ میں سب سے بیش بہا تصنیف فتوح السلاطین ہے وہ ایک غیر معروف شاعر خواجہ عبداللہ ملک عصامی کے نوک قلم کی صدا تھی، جو تقریباً 1311ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا مورث اعلیٰ فخر ملک عصامی التمش کے عہد میں بغداد سے ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت سے اس کے خاندان نے مختلف سلاطین دہلی کے ہاں ملازمت کی تھی۔ عصامی کا دادا عز الدین بلبن کا میر لشکر تھا۔ 1327ء میں جب کہ مصنف سولہ سال کا تھا اس کو دولت آباد جانے پر مجبور کیا گیا جہاں محمد بن تغلق نے سلطنت کا پایۂ تخت منتقل کر دیا تھا۔ وہ چالیس سال کی عمر تک وہاں اقامت گزیں رہا۔ لیکن اس تبدیلی سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر سکا۔ اس نے ہندوستان سے مکہ جانے کا فیصلہ کیا لیکن "عالی ظرف ذہن کی آخری کمزوری" نے اس کو اپنے بعد کوئی پائیدار چیز چھوڑ جانے کا تقاضہ کیا۔ وہ غیر شادی شدہ اور بے اولاد تھا۔ اس نے سوچا کہ بہترین چیز جو وہ چھوڑ سکتا ہے تاریخی دلچسپی کی ایک شعری تخلیق ہے۔ لہذا اس نے فتوح السلاطین یا (ہندوستان کے) سلاطین کی فتوحات، تصنیف کی۔ کتاب کا آغاز ۱۰ دسمبر 1349ء کو ہوا اور ۱۴ مئی 1350ء کو چھ ماہ سے کچھ کم مدت کی جہد مسلسل کے بعد تمام ہوئی۔

یہ کتاب جو برنی کی تاریخ فیروز شاہی سے آٹھ نو سال قبل لکھی گئی محمود غزنوی کے زمانہ سے محمد بن تغلق کے عہد تک کے واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اگرچہ شاعر نے جلدی میں لکھی لیکن اس کی یہ کتاب نہ تو تاریخی غلط بیانیوں کی وجہ سے ناقص ہے۔ نہ شاعرانہ قیمت کے لحاظ سے۔ اس کا طرز سادہ اور سلیس اور رزمیہ ایک چھوٹی رواں بحر میں لکھی گئی ہے۔

---

۱۴۔ وحید مرزا، لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، ص ۱۷۷

عصامی نہ تو خسرو کا خطیبانہ طرزِ بیان اختیار کرتا ہے نہ بدر چاچ کی پیچیدگی۔ کتاب کے مرتب کے بقول عصامی کو اپنے عہد کا بہترین رزمیہ شاعر کہا جا سکتا ہے۔"[15] شاعر اپنے ماٰخذ کا حوالہ نہیں دیتا لیکن اس کا بیان صاف بتاتا ہے کہ اس نے یقیناً قابلِ اعتماد تاریخی تصانیف سے استفادہ کیا ہوگا۔ اس نے قابلِ تعریف احتیاط کے ساتھ لکھا ہے۔ جہاں تک علاءالدین کے عہد کا تعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے بہت سے لوگوں سے ملا ہوگا جو اس عہد کے عینی شاہد تھے۔ کئی مقامات پر وہ کہتا ہے کہ اس نے وہی لکھا جو اس کو بوڑھے اور تجربے کار لوگوں سے معلوم ہوا۔[16] اس کے علاوہ اس نے متعدد مستند دستاویزات سے بھی رجوع کیا تھا۔ علاءالدین کی ۱۳۰۶ء کی دکنی مہم پر اس کا بیان سب سے زیادہ مفصل معلومات فراہم کرتا ہے۔ چونکہ یہ کتاب خود دیوگیری میں لکھی گئی تھی جہاں اس وقت حملہ کے بہت سے عینی شاہد زندہ ہوں گے اس لیے عصامی برنی اور خسرو کے مقابلہ میں بھی اس مخصوص واقعہ کی تفصیلات کو جاننے کا اسے بہتر موقع ملا ہوگا۔ دیول رانی اور خضر خاں کی محبت کے بیان کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ عصامی نے امیر خسرو کی عاشقہ پر پوری طرح تکیہ کیا تھا۔ ان کے عشق کے قصوں کے سلسلے میں اس کا بیان خسرو کے قصہ کا محض خلاصہ ہے۔ فتوح السلاطین تاریخ نگاری کے لحاظ سے بڑی حد تک صحیح ہے اور اس نے بڑی احتیاط سے واقعات کی ترتیب قائم رکھی ہے۔ کئی مقامات پر عصامی برنی کی تائید کرتا ہے اور اس کے بیانات میں اضافہ کرتا ہے۔ منگول حملوں کے بارے میں خاص طور سے وہ بہت سے نئے حقائق دیتا ہے اور

---

۱۵۔ مہدی حسین، انگریزی پیش لفظ، ص ۴۔

۱۶۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے ص ۲۴۰

شنیدم ز افسانہ گوئے کہن ، کہ از زیرکی برُد گوئے سخن

(میں نے پرانے قصّہ گو لوگوں سے سنا ہے جنھوں نے ذہانت میں زبان کے فن میں سب پر بالاتری حاصل کرلی تھی)

ص ۲۴۱: شنیدم ز پیرانِ دیرینہ سال

(میں نے پختہ عمر کے (بوڑھے) لوگوں سے سنا ہے)

ص ۱۹۹: شنیدم ز افسانہ سنجانِ پاک (میں نے سچے قصہ کہنے والے لوگوں سے سنا ہے)

ان حملوں پر اس کا بیان غالباً سب سے زیادہ مفصّل ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ عصامی کی کتاب کا موضوع جنگوں اور فتوحات کے سوا حکومت کے کسی اور پہلو سے بحث کرنا نہیں تھا۔ علاءالدین کی انتظامی اور معاشی اصلاحات جن کو برنی نے نمایاں تفصیلات کے ساتھ دیا ہے ان کو عصامی نے پوری طرح سے ہاتھ سے نہیں لگایا ہے۔ ہاں ان کی طرف سے کہیں کہیں اتفاقی طور پر حوالہ دیا ہے۔ لیکن جنگوں اور محاصروں پر اس کا واضح بیان اس کی کتاب کو عظیم تاریخی اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے۔ عصامی علاءالدین کے رنتھمبور کے محاصرہ کا حال تفصیل سے بیان کرتا ہے اور منگول کے ساتھ شہنشاہ کے مختلف معرکوں پر ایک نئی روشنی ڈالتا ہے۔

بہرحال عصامی اپنے عہد کے تعصّبات کو نظرانداز نہیں کر سکا۔ اس کی کتاب بعض مقامات پر مبالغہ سے بھرپور ہے اور ذاتی عداوت و بغض کی وجہ سے اس کا درجہ گر جاتا ہے۔ چوں کہ اس کو محمد بن تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی کی وجہ سے بہت مصائب برداشت کرنے پڑے تھے وہ اس بادشاہ کی بے رحمی سے مذمت کرتا ہے۔ وہ محمد بن تغلق کا موازنہ علاءالدین سے کرتا ہے۔ ایک طرف وہ علاءالدین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا اور اس کو عظیم اوصاف کا حامل بتاتا ہے تو دوسری طرف وہ محمد تغلق کو سخت تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔

اگرچہ وہ ہمعصر تھے لیکن عصامی اور برنی کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ برنی اپنی تاریخ میں کہیں بھی عصامی کا ذکر نہیں کرتا لیکن یہ حیرت انگیز نہیں کیونکہ برنی شاذ و نادر ہی کسی کی سند کا حوالہ دیتا ہے۔ نظام الدین احمد اور فرشتہ فتوح السلاطین کا ذکر کرتے ہیں اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ یہ کتاب عظیم تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہے ایک تاریخی رومانی کتاب کہہ کر اسے مسترد کیا جا سکتا ہے جیسا کہ برگس کا رجحان معلوم ہوتا ہے[17]۔

ابن بطوطہ (۱۳۰۴–۱۳۷۷ء) کا سفرنامہ بھی عہد کے بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ابوعبداللہ جس کا معروف نام محمد ابن بطوطہ تنجیر، مراکش کا ایک باشندہ تھا۔ بچپن سے ہی اس کو سیاحت کا شوق تھا اور ۱۳۲۵ء سے ۱۳۴۹ء تک پورے چوبیس سال اس نے شمالی افریقہ، عرب، ایران اور ہندوستان میں سفر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مشرق میں چین تک گیا تھا۔

۱۷۔ برگس، جلد اول، ص ۴۰۶

ابن بطوطہ ہندوستان میں ۱۳۳۳ء میں پہونچا اور حکمران سلطان محمد بن تغلق نے اُس کو اس کی علمیت اور غیر ملکی نسل سے ہونے کی وجہ سے دہلی کا قاضی مقرر کر دیا۔ ہندوستان میں ابن بطوطہ مولانا بدر الدین کے نام سے معروف تھا وہ سلطان کے انعام و اکرام کا سزاوار رہا لیکن تقریباً آٹھ سال تک عہدہ پر برقرار رہنے کے بعد اس کو برطرف کر دیا گیا کیونکہ اس نے سلطان کی ناراضگی مول لے لی تھی۔ وہ قید کیا گیا لیکن بعد میں رہا کر دیا گیا اور بطور سفیر چین روانہ کیا گیا۔ راستہ میں اس کا جہاز تباہ ہو گیا۔ وہ سلطان کے خوف سے جزائر مالدیپ میں مقیم رہا۔ ایک سال بعد وہ جنوبی ہند آیا اور کچھ عرصہ رہ کر چٹاگانگ گیا جہاں سے وہ ایک کشتی میں چین گیا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کبھی چین پہونچا۔ کبھی نہ تھکنے والے سیاح نے مکہ میں فریضہ حج ادا کیا اور پھر اپنے وطن لوٹ گیا۔

بہت زیادہ سفر کرنے والا یہ شخص مشاہدہ کرنے والی آنکھ اور تیز ذہانت کا مالک تھا۔ لوگوں اور چیزوں میں اس کی دلچسپی اتنی زیادہ تھی کہ اپنے سفروں میں اس کو جو چیز بھی اچھی لگی اس کے بارے میں اس نے جلدی سے کچھ نہ کچھ لکھ لیا۔ بدقسمتی سے اس کی اصلی تحریریں اس کے کسی سفر میں گم ہو گئیں اور اس کے سفروں کا جو بیان اب ہمیں دستیاب ہے وہ صرف ابن جزی کو دیے گئے اپنے تجربات کے بیانات کی صرف تلخیص ہے جس نے اس کو مرتب کیا اور کتابی شکل دی۔ کتاب کا نام ہے "تحفۃ الانظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار"

ابن بطوطہ ہندوستان میں علاء الدین کی وفات کے سترہ سال بعد پہنچا اس وقت تک اس کے عہدِ حکومت کے بہت سے لوگ یقیناً زندہ ہوں گے۔ اس لیے علاء الدین پر اس کا بیان غالباً ان معلومات پر مبنی ہے جو اس کو اس کے عہد کے عینی مشاہدوں سے حاصل ہوئے۔ ابن بطوطہ محمد بن تغلق سے پہلے کے سلاطین دہلی کی ایک مختصر تاریخ بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان کا جب ہمعصر مورخین کے بیانات سے موازنہ کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ وہ سچا تھا۔ اس زمانہ کے سیاسی اور سماجی اداروں کے سلسلے میں اس کا بیان معلومات کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ وہ سلطان محمد کے دربار اور عام طور سے لوگوں کے اخلاق و عادات، رسوم و رواج، طریقوں اور اداروں کا ایک حقیقت پر مبنی بیان دیتا ہے۔ ابن بطوطہ ایک آزاد مصنف ہے اور وہ ان مورخین سے زیادہ قابل اعتماد ہے جو شہنشاہوں کے انعام و اکرام یا غصہ و ناراضگی کی پروا کرتے تھے۔ سیاح بعض مقامات پر برنی کی تصدیق اور بعض مقامات پر اس میں

اضافے کرتا ہے ۔ لیکن اس کی تاریخ میں بھی خامیاں ہیں ۔ وہ ایک غیر ملکی تھا۔ وہ اچھی طرح فارسی نہیں جانتا تھا اور ہندی سے بالکل ناواقف تھا ۔ بیشتر وہ افواہوں اور گپوں کو باور کر لیتا۔ اکثر افسانہ اور حقیقت کو گڈ مڈ کر دیتا ہے ۔ وہ واقعات کی تاریخی ترتیب اور اسی طرح جغرافیائی صحت کی بہت کم پروا کرتا ہے ۔ ان خامیوں کے باوجود ابن بطوطہ کی "رحلہ" چودھویں صدی کی ہندوستانی تاریخ کا ایک بیش بہا ماخذ ہے

میں نے ( C. Defremery ) اور B.R Sanguinath کے مرتب کردہ ابن بطوطہ کے سیاحت نامہ کے فرانسیسی ایڈیشن سے استفادہ کیا ہے ۔ ہندوستان سے متعلق حصوں کو ڈاکٹر مہدی حسین نے بھی انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے اور اپنے ترجمہ میں انھوں نے قیمتی حاشیوں کا اضافہ کیا ہے ۔

اہمیت میں ابن بطوطہ کے برابر وینس کا سیاح مارکو پولو ہے جس نے تیرھویں صدی کے اختتام کے قریب جنوبی ہند کی سیاحت کی ۔ یہ سچ مچ بدقسمتی تھی کہ مارکو پولو نے شمالی ہند کی سیاحت نہیں کی اور اس کا بیان صرف دکن کے بارے میں ہے ۔ وہ وارنگل کی مہارانی رودر ما دیوی کی بہت تعریف کرتا ہے ۔ اور معبر کے بادشاہوں کے بارے میں دلچسپ تفصیلات فراہم کرتا ہے ۔ جنوبی ہند میں گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں اس کا بیان وصاف کے بیان سے تفصیلات تک میں ملتا ہے ۔ مارکو پولو نے اس وقت کی تقریباً تمام ہندوستانی بندرگاہوں کی سیاحت کی وہ جنوب میں کافی بحری سرگرمیوں کا ذکر کرتا ہے ۔ وہ دکن کے لوگوں کے عادات و اطوار کو تفصیل سے بیان کرتا ہے اور اس کا بیان معاشرتی تاریخ کے لیے ایک قیمتی ماخذ ہے ۔ کرنل یول نے "مارکو پولو کا سفر نامہ" مرتب کیا ہے اور اس میں فاضلانہ حاشیے کا اضافہ کیا ہے ۔

مذکورہ بالا دو کتابوں کی طرح "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" بھی ایک تصنیف اور ہے ۔ اس کی واحد خرابی یہ ہے کہ اس کا مصنف شہاب الدین احمد جو المراشی کے نام سے بھی معروف ہیں (۱۲۹۷-۱۳۴۸ء) جو دمشق کا باشندہ تھا وہ بذات خود ہندوستان نہیں آیا۔ اس ملک کے سلسلے میں اس کی تاریخ اُن واقعات پر مبنی ہے جو اس نے شیخ مبارک اور خجندی جیسے معتمد اشخاص سے سنے تھے لیکن مجموعی طور پر اس کی معلومات قابل اعتماد ہیں دوسرے معاصر مصنفین سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مسالک ملک کی معاشرتی اور معاشی زندگی نیز ہندوستان

کی حکومت کے ڈھانچے پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میگزین میں شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کے متعلقہ حصوں کا ترجمہ ایلیٹ جلد سوم میں بھی دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مخطوط کا ایک ادلو ٹو گرافی نقل الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے۔

مسالک کی بنیاد پر ایک عرب جغرافیہ داں القلقشندی نے اپنی تصنیف صبح الاعشیٰ میں ہندوستان کے سماجی حالات کا ایک بیان تحریر کیا ہے۔ اوراد ٹو اسپنر ل (Otto Spies) نے ہندوستان سے متعلق کتاب کے حصوں کا انگریزی ترجمہ کر دیا ہے۔ قلقشندی کے پاس کوئی بات کہنے کو نہیں ہے اور وہ مسالک سے بہت کچھ نقل کرتا ہے بسا اوقات تو لفظ بہ لفظ نقل کر دیتا ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ جو ملک کی معاشی اور سماجی زندگی کی معلومات دینے کے لحاظ سے بہت بیش قیمت ہیں کچھ اور کتابیں ہیں جو سیاسی تاریخ پر خلجی عہد سے چند برس قبل یا بعد لکھی گئی تھیں۔ منہاج سراج کی طبقات ناصری ہندوستان کی مسلم فتح اور بلبن کے عہد حکومت کے مابین زمانے کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ ہمارے عہد کے لیے اس کتاب کے سب سے زیادہ اہم حصے وہ ہیں جو منگولوں سے متعلق ہیں۔ میجر ریورٹی جنھوں نے کتاب کا ترجمہ کیا ہے بہت عمدہ اور فاضلانہ تشریحات بھی دی ہیں۔

شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، برنی کی تاریخ کا تکملہ ہے وہ ۱۳۸۸ء تک کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں خاص خاص موقعوں پر علاء الدین کے عہد حکومت کا حوالہ بھی ملتا ہے جو چودھویں صدی میں بہت اہمیت کا حامل تھا۔ عفیف ۱۳۵۰ء میں پیدا ہوا تھا اس نے فیروز تغلق کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔

## غیر ہندوستانی معاصر ماخذ

غیر ہندوستانی معاصر ماخذ میں سب سے اہم "تاریخ وصاف" ہے اس کو عبداللہ بن فضل اللہ وصاف نے ۱۳۱۲ء میں ختم کیا تھا لیکن اس نے لکھنا پھر شروع کیا اور ۱۳۲۸ء تک کے واقعات اس میں قلم بند کیے۔ وصاف کی تاریخ فارسی میں لکھی گئی ہے اس میں عربی الفاظ کی بہت سے مقامات پر آمیزش ہے اس کا طرز نگارش بے انتہا مصنوعی اور طویل نگاری پر مشتمل ہے۔ وہ ایران کے منگولوں کی تاریخ ہے لیکن مصنف ہندوستان کے واقعات کا بھی حوالہ دیتا جاتا ہے۔ جو اس نے سیاحوں اور دوسرے باخبر لوگوں کی زبانی سنے تھے۔ وہ گجرات کی آب و ہوا اور دکن کے سیاسی اور تجارتی حالات کا ذکر کرتا ہے۔ وہ علاء الدین کے زمانے میں منگولوں کے ہندوستان پر حملوں کا بھی ذکر کرتا ہے اور

اس حکمراں کے آخری عمر کی بہت عمدہ تصویرکشی کرتا ہے۔ وصّاف کے علاوہ اور کوئی فارسی مؤرخ علاء الدین کے دربار میں آنے والی ایرانی سفارت کے بارے میں کچھ نہیں کہتا ہے۔ کتاب بمبئی ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

رشید الدین کی "جامع التواریخ" ایک اور غیر ہندوستانی معاصر تصنیف ہے۔ یہ کتاب جو ۱۳۱۰ء میں مکمل ہوئی تھی اس کا بیان تیرھویں صدی کے منگولوں کے بارے میں مستند ہے۔ رشید ہندوستان کے جغرافیہ کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتا ہے۔ میں نے گب یادگاری اور تہران متون سے استفادہ کیا ہے۔

"تاریخ گزیدہ" جو حمد اللہ مستوفی نے ۱۳۲۹ء میں مکمل کی ایک اور بیش قیمت تصنیف ہے جو ایران اور ماوراء النہر کے منگولوں سے متعلق ہے مستوفی کی "نزہتہ القلوب" جو ۱۳۴۰ء میں لکھی گئی تھی ایران کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ "تاریخ گزیدہ" گب میموریل ٹکسٹ سیریز میں چھپ چکی ہے۔

**معاصر ادب**

ہندوستانی اور غیر ملکی معاصر تاریخی تصانیف کے علاوہ معاصر ادب کی وافر مقدار بھی ہے جو اس زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ خسرو اور برنی کی بعض تصانیف اور ان لوگوں کی تصنیفات جن کا خلجی عہد کے عظیم متبحر علماء کی حیثیت سے ذکر کیا جاتا ہے، اب ہمیں دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن جو کچھ باقی بچا ہے وہ اہم پہلوؤں پر مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ملفوظاتی ادب (مذہبی ادب) زیادہ تر صوفی بزرگوں اور ان کے مریدوں کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ یہ مرید سماج کے تمام طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا ان سے اس زمانے کی غذا اور مشروبات، رسم و رواج، عادات و اطوار اور سماج اور تہذیب کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے ترجمے اُردو میں ہو چکے ہیں۔ یہ ترجمے کافی اچھے ہیں۔

چندر پشید ٹھاکر کے دو معاصر سنسکرت تصانیف کرتیہ رتنا کر اور دواز رتنا کر عہد علاء الدین میں متھلا کے ہندو راجہ کے نیپال کے علاقہ پر حملہ کا ذکر کرتی ہیں۔

**ثانوی ماخذ**

اس کتاب کے لکھنے کے دوران غیر معاصر فارسی اور عربی تصانیف و مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کا خصوصی ذکر ضروری ہے۔ یحییٰ بن سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی جو پندرھویں صدی کے تقریباً وسط میں (۸۳۷ھ)

میں لکھی گئی۔ کئی مقامات پر برنی میں اضافہ کرتی ہے۔ اگرچہ وہ خلجی عہد کا بہت مختصر بیان دیتی ہے تاہم اس کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ یہ کثرت سے تاریخیں دیتی ہے اور سادہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ میں نے بیلوتھکا انڈکا کا متن الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کا مخطوطہ استعمال کیا ہے۔

محمد بیجا خان یحییٰ کی معاصر، "تاریخِ محمدی" ۸۴۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ مصنف کا باپ تغلق شاہ اور محمد تغلق دوم فرزند فیروز شاہ کی ملازمت میں تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ کی نقل ہے۔

نظام الدین احمد کی "طبقاتِ اکبری" جو ۱۵۹۳ء میں عہدِ اکبری میں تصنیف ہوئی خلجیوں کے تفصیلی واقعات پر مشتمل ہے۔ نظام الدین احمد نے برنی سے بہت کچھ لیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں اس نے ستائیس کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا ذکر کیا ہے۔ نظام الدین نے خلجی کی تشریح کرنے کی بھی کوشش کی ہے جسے برنی نے بیجا طور پر مشتبہ حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ بیلوتھکا انڈکا کے متن سے فائدہ اٹھایا ہے۔

امین احمد رازی ہفت اقلیم کا مصنف نظام الدین کا معاصر تھا۔ وہ ایک آزاد مصنف ہے اور بعض نکات کے سلسلے میں بڑی بیش قیمت معلومات فراہم کرتا ہے۔ مثلاً بہمنی خاندان کی اصل۔ ہفت اقلیم ایک طرح کی قاموس ہے جو تاریخ، جغرافیہ اور صوفیہ کے تذکروں سے بحث کرتی ہے۔ بانکی پور لائبریری کا مخطوطہ استعمال کیا گیا ہے۔

عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" ۱۵۹۶ء میں مکمل ہوئی۔ وہ برنی یا نظام الدین کے مقابلے میں یحییٰ پر زیادہ انحصار اور اسی کے طرزِ تحریر کی پیروی کرتا ہے۔ بیلوتھکا انڈکا متن اور رینکنگ کے ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

بدایونی سے زیادہ اہم محمد قاسم فرشتہ ہے جس کی تصنیف "گلشنِ ابراہیمی" ۱۶۱۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ وہ خلجیوں اور ان کے معاصر صوفیوں کے سوانح حیات کی مفصل تاریخ بیان کرتی ہے۔ چونکہ کتاب دکن میں لکھی گئی تھی فرشتہ کو ایسے ماخذ حاصل تھے جن سے وہ برنی یا عصامی کے مقابلے میں علاء الدین کی دکن مہموں کا زیادہ تفصیلی بیان دیتا ہے۔ وہ علاء الدین کے مختلف حملوں اور خاص طور سے ۱۲۹۶ء میں دیوگیری پر حملہ میں اس کے حاصل کردہ خزانے کی مفصل فہرست دیتا ہے۔ لیکن اس کے اعداد و شمار مشکوک ہیں۔ کیونکہ ان کی تائید

دوسرے مورخین نے نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے ضخیم کتاب کی تیاری میں پینتیس[۳۵] تصانیف سے استفادہ کیا ہے لیکن پھر بھی اس کی وقائع نگاری خامیوں سے خالی نہیں۔ مزید برآں وہ مختلف فیہ نکات پر کوئی یقینی روشنی نہیں ڈالتا ہے۔

جس طرح فرشتہ دکن میں لکھ رہا تھا اس کا معاصر حاجی الدبیر گجرات میں تصنیف میں مشغول تھا۔ اس کی کتاب کا پورا نام "ظفر الوالہ بمظفر و آلہٗ" ہے اور مصنف کا پورا نام ہے "عبداللہ محمد بن سراج الدین عمر المکی اور عرف "حاجی الدبیر" ہے اس نے ۱۶۰۵ء میں لکھنا شروع کیا۔ اور ۱۶۱۱ء تک اپنی کتاب لکھتا رہا۔ حاجی ایک بیش قیمت کتاب سے بہت استفادہ کرتا ہے جو ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ یہ کتاب حسام خان کی "طبقات بہادر شاہی" ہے جس سے وہ بہت زیادہ اقتباسات لیتا ہے۔ حاجی الدبیر بہت سے پیچیدہ نکات کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتا ہے اور مجموعی طور پر اس کے بیانات قابل اعتماد ہیں۔ وہ تنہا مورخ ہے جو علاء الدین کی عمر بتاتا اور اس کی خاندان کی زندگی کے بارے میں دلچسپ واقعات کا ذکر کرتا ہے غالباً اس وجہ سے کہ اس کو ان ماخذ تک بہ آسانی رسائی حاصل تھی جو اب گم ہو چکے ہیں۔ وہ پدمنی کے واقعہ کے بارے میں بھی مختلف بیانات دیتا ہے۔ تاریخ کے لحاظ سے وہ بہت سے مقامات پر بالکل نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ سر ڈینس راس (Sir Denison Ross) نے کتاب کو ایک فاضلانہ مقدمہ اور بہت ہی جامع اور معلوماتی اشاریہ مرتب کیا ہے۔

**صوبائی تواریخ** تاریخ معصومی جو ۱۵۹۹ء (۱۰۰۸ھ) میں لکھی گئی سندھ کی مسلم فتح کے وقت سے اکبر کے اس کے الحاق تک کی تاریخ ہے۔ میر معصوم کی تصنیف کی فتح جیسلمیر پر جس کا کسی دوسرے فارسی مورخ نے ذکر تک نہیں کیا۔ نئی روشنی ڈالتی ہے۔ البتہ صرف راجپوت بھاٹوں نے اس کا ذکر بہت ہی ناقص انداز میں کیا ہے۔

طاہر محمد کی "تاریخ طاہری" بھی سندھ کی ایک تاریخ ہے جو ۱۶۰۹ء (۱۰۱۸ھ) میں مکمل ہوئی۔ تاریخ طاہری اور "تحفۃ الکرام" اور ٹھٹھہ کے میر علی قانع (۱۷۶۶ء کے لگ بھگ) سندھ کی ایک اور تاریخ ہے۔ اسی کا بہت عمدہ ترجمہ ایلیٹ نے کیا ہے۔ میں نے تاریخ طاہری کا بانکی پور مخطوطہ استعمال کیا ہے۔

بیگ لارنامہ، سندھ کی ایک اور تاریخ ۱۶۰۸ء (۱۰۱۷ھ) میں مکمل ہوئی تھی۔ وہ بنیادی طور پر عہد اکبری میں سندھ کے حکمرانوں سے متعلق ہے لیکن صوبہ کی اگلی تاریخ کے بارے

کے بارے میں چند خاکے دیتی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کا مخطوطہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ کی قلمی نقل ہے۔

گجرات کی تواریخ میں "مرأتِ سکندری" اور "مرأتِ احمدی" سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اول الذکر جس کو سکندر بن محمد نے لکھا تھا سنہ ۱۶۱۱ء (سنہ ۱۰۲۰ھ) میں مکمل ہوئی تھی اور موخرالذکر جو علی محمد خان کی تصنیف ہے (سنہ ۱۷۶۱ء (سنہ ۱۱۷۴ء) میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اگرچہ بعد میں تصنیف ہوئی لیکن "مرأتِ احمدی" علاءالدین کے بارے میں اوّل الذکر سے زیادہ معلومات بہم پہونچاتی ہے۔ حاجی الدبیر بھی "تاریخ گجرات" کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔

ریاض السلاطین کو جو بنگال کی واحد مربوط تاریخ ہے غلام حسین یزدپوری نے سنہ ۱۷۸۸ء (سنہ ۱۲۰۲ھ) میں مکمل کی تھی۔ وہ بنگال کی تاریخ سے بالکل ابتدائی زمانہ سے لے کر اس کے لکھے جانے کے وقت تک بحث کرتی ہے۔ کتاب "غلط بیانیوں اور خامیوں" سے بھری ہوئی ہے اور اسی وجہ سے قابلِ اعتماد نہیں۔ لیکن سکوں اور کتبات کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کرنے سے بنگال کی تاریخ کے بارے میں صحیح حقائق جاننے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندی، اردو، راجستھانی، سنسکرت اور انگریزی میں کثیر تعداد میں کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان کے نام کتابیات کی فہرست میں دیے گئے ہیں۔ ان میں نینسی کی "کھیات" کا خصوصی ذکر کیا جا سکتا ہے جو راجپوت تاریخ کے مطالعہ کے لیے خاص قدر و قیمت کی حامل ہے۔ سنہ ۱۶۵۰-۶۶ء میں وہ ترتیب دی گئی۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں تاریخی تصنیف نہیں ہے۔ لیکن وہ کئی صدیوں کی راجپوت تاریخ پر کافی روشنی ڈالتی ہے اور بہت سے واقعات کی "سند و تعبیر" ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ وہ ڈنگل کی آمیزش کے ساتھ مارواڑی زبان میں لکھی گئی۔ اور بارھویں سے سترھویں صدی تک کے زمانہ پر حاوی ہے۔

آثارِ قدیمہ کی شہادت کے لیے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی رپورٹیں اور میموائرز، "ایپی گرافیا انڈو مسلمکا" اور "ایپی گرافیا کرناٹیکا" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ان رسائل اور جرائد کی بھی ایک فہرست کتابیات کے آخر میں دی گئی ہے جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

# کتابیات

## فارسی مآخذ


عبداللہ — تاریخ داؤدی (بانکی پور مخطوطہ)

عبدالباقی نہاوندی — مآثر رحیمی — بلوتھکا انڈکا (کلکتہ ۱۹۲۴ء)

عبدالحق — ۱۔ اخبار الاخیار — مجتبائی پریس (دہلی ۱۹۱۴ء)

۲۔ تاریخ حقی (مصنفہ ۱۰۰۵ھ) بانکی پور مخطوطہ

عبداللہ وصاف — تجزیۃ الامصار و تجربۃ الآثار معروف بہ تاریخ وصاف ۱۲۶۹ء (بمبئی متن)

عبدالقادر بدایونی — منتخب التواریخ — بلوتھکا انڈکا (کلکتہ ۱۸۶۸ء)

القلقشندی — ملاحظہ ہو ادوا سپیز انگریزی کتب میں

علی محمد خاں — مرأت احمدی، تقریباً ۱۱۷۴ھ فتح الکریم پریس (بمبئی ۱۳۰۷ھ)

امیر خسرو — اعجاز خسروی (لکھنؤ ۱۸۸۴ء)

دیول رانی (علی گڑھ ۱۹۱۷ء)

خزائن الفتوح (علی گڑھ متن ۱۹۲۷ء) اور الٰہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ

قران السعدین (علی گڑھ ۱۹۱۸ء)

تغلق نامہ مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی (اورنگ آباد ۱۹۳۳ء)

مطلع الانوار (لکھنؤ ۱۸۸۴ء)

امین احمد رازی — ہفت اقلیم، تقریباً ۱۵۹۳ء (بانکی پور مخطوطہ)

| | |
|---|---|
| ابو الفداء | تاریخ ابو الفداء (قسطنطنیہ ۱۸۶۹ء) |
| عین الملک | انشائے ماہرو (الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ) |
| علاء الدین جوینی | تاریخ جہاں کشا، ۲ جلد (لندن ۱۹۱۲ء) |
| بختیار خاں | مرآۃ العالم، تقریباً ۱۶۶۷ء (بانکی پور مخطوطہ) |
| — | چچ نامہ، تاریخ سندھ (الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ) |
| — | بحر الامواج، ہندوستان کی عام تاریخ تقریباً ۱۵ویں صدی (بانکی پور مخطوطہ) |
| چراغ دہلوی، شیخ نصیر الدین، | خیر المجالس (پروفیسر حبیب، علی گڑھ کا مخطوطہ) |
| فضل اللہ رشید الدین | جامع التواریخ، تقریباً ۱۳۱۰ء، (تہران) |
| فخر الدین مبارک | تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، تقریباً ۱۲۰۶ء مرتبہ سر ڈینسن راس (لندن ۱۹۲۷ء) |
| غلام علی خاں | حدیقۃ الصفا، ہندوستان کی ایک عمومی تاریخ، تقریباً ۱۷۵۹ء (بانکی پور مخطوطہ) |
| حسن سجزی | فوائد الفواد نول کشور پریس لکھنو |
| حمد اللہ مستوفی | تاریخ گزیدہ تقریباً ۱۳۲۹-۳۰ء اے ڈی گب میموریل (لندن ۱۹۱۳ء) |
| عصامی، عبد اللہ ملک | فتوح السلاطین (آگرہ ۱۹۳۸ء) |
| ابراہیم بن حریری | تاریخ ابراہیمی، تقریباً ۱۶ویں صدی (الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ) |
| خوند میر | حبیب السیر (بمبئی، ۱۸۵۷ء) |
| میر معصوم | تاریخ معصومی، تاریخ سندھ (پونا ۱۹۳۸ء) |
| میر خوند | روضۃ الصفا (تہران، ۱۲۷۴ھ) |
| محمد بن مبارک کرمانی | سیر الاولیا مرتبہ چرنجی لال (دہلی ۱۸۸۵ء) |
| محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ | گلشن ابراہیمی، معروف بہ تاریخ فرشتہ (لکھنؤ ۱۸۷۶ء) |
| محمد صادق | صبح صادق، تقریباً ۱۶۳۸ء (بانکی پور مخطوطہ) |
| محمد بیجا خان | تاریخ محمدی، تقریباً ۸۴۲ھ (الہ آباد یونیورسٹی مخطوطہ) |
| نظام الدین احمد | طبقات اکبری (کلکتہ ۱۹۲۷ء) |

قزوینی — نگارستان، تقریباً ۱۵۶۴ء (بانکی پور مخطوطہ)
شمس سراج عفیف — تاریخ فیروز شاہی، ببلوتھکا انڈکا (کلکتہ ۱۸۹۰ء)
سجان رائے بھنڈاری — خلاصۃ التواریخ مرتبہ ظفر حسین، (دہلی ۱۹۱۸ء)
سلیم، غلام حسین — ریاض السلاطین، تقریباً ۱۷۸۸ء ببلوتھکا انڈکا (کلکتہ ۱۸۹۸ء)
انگریزی ترجمہ از عبدالسلام (کلکتہ ۱۹۰۴ء)
طاہر محمد — تاریخ طاہری (بانکی پور مخطوطہ)
یحییٰ بن احمد بن عبداللہ — تاریخ مبارک شاہی ببلوتھکا انڈکا (کلکتہ ۱۹۳۱ء)
ضیاالدین برنی — تاریخ فیروز شاہی ببلوتھکا انڈکا (کلکتہ ۱۸۶۲ء)
فتاوائے جہانداری ملاحظہ ہو حبیب انگریزی کتب میں

## عربی کتب

دیفرمری اٹ سنگوئیٹ (De Fremery Et Sanguinetti) دو یج ڈی ابن بطوطہ (Voyages De Ibn Batoutah) ۴ جلدیں (پیرس ۱۹۱۴ء)
دمشقی — cosmographie de Chems-ed-din، عربی متن، تقریباً ۷ویں صدی ہجری (لیپزگ ۱۹۲۳ء)
حاجی الدبیر — ظفرالوالہ، گجرات کی عربی تاریخ، مرتبہ سر ڈینیسن راس ۳ جلد، (لندن ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۱ء)
ابن حوقل — اشکال البلاد، اخبار البلاد، Bib Geographum Arabicorum (تقریباً ۳۶۷ھ مطابق ۹۷۷ء)

## سنسکرت کتب

چندر لیشور ٹھاکر — کرتیہ رتناکر (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال)
ودا رتناکر ببلوتھکا انڈیا (کلکتہ ۱۹۳۱ء)
چندر نیائے سوری — ہمیر مہاکاویہ
سکا کا سوری — نابھی۔ نندنا۔ جنودھار، پربندھ، جین گرنتھ مالا جین ودیا سندر احمد آباد

## ہندی کتب


ہندو دیاس — ہمیرائن، مرتبہ بھنور لال نہاٹا مع مقدمہ از ڈاکٹر دشرتھ شرما
سودول راجستھانی ریسرچ سوسائٹی (بیکانیر ۲۰۱۷ سمبت / ۱۹۶۰ء)

بھنور لال نہاٹا — پدمنی چرتر چوپائی، ہیم رتن کی شعری تخلیقات پر مشتمل (۱۶۴۵ وکرم سمبت)
ناہر جتل (وکرم سمبت ۱۶۰۸ء)
لبدھو ادیائے (۱۷۰۷ وکرم سمبت) اور
ڈلپت وجیہ (کوئی تاریخ نہیں)
مرتبہ بھنور لال نہاٹا (بیکانیر ۲۰۱۸ وکرم سمبت / ۱۹۶۰-۶۱ء)

جائسی، ملک محمد — پدماوت مرتبہ آر سی شکلا (انڈین پریس، الہ آباد ۱۹۳۵ء)

نینی — موہنوت نینی کی کھیات، ۲ جلدیں (کاشی ناگری پرچارنی سبھا، ۱۹۸۲ سمبت)

نارائن داس — چھتائی وارتا مرتبہ ڈاکٹر ایم پی گپتا (کاشی، ۲۰۱۵ سمبت)

اوجھا، گوری شنکر — ادے پور کا اتہاس (اجمیر ۱۹۲۸-۳۲ء)
راجپوتانہ کا اتہاس، ۳ جلدیں (اجمیر ۱۹۲۷ء)
مدھیہ کالین بھارتیہ سنسکرتی (ہندوستانی اکیڈمی) الہ آباد ۱۹۲۸ء)

پدمانابھ — کہنڈی پربندھ، مرتبہ پروفیسر جی ابی ویاس،
راجستھانی پوروا تتو مندر (جے پور، ۱۹۲۵ء)
مذکورہ بالا کی ہندی تلخیص از ڈاکٹر دشرتھ شرما شودھ پتریکا، اودے پور
جلد سوم، جز دوئم، دسمبر ۱۹۵۱ء

ریو، بشیشر ناتھ — مارواڑ کا اتہاس (جودھپور ۱۹۳۸ء)

لیپی — کیرتی لتا — دی انڈین پریس الہ آباد

یوسف علی — مدھیہ کالین بھارت کی سماجک دشا، ہندستانی اکیڈمی (الہ آباد ۱۹۲۸ء)


## اُردو کتب


فرشتہ — ترجمہ تاریخ فرشتہ، نول کشور پریس (لکھنو ۱۹۳۳ء) نیز فدا علی کا ترجمہ (حیدر آباد دکن ۱۹۲۶ء)

محمد حسین — سفرنامہ ، ابن بطوطہ کے سفرنامہ کا ترجمہ

شبلی نعمانی — شعر العجم ، ۵ جلدیں (علی گڑھ سنہ ۱۳۲۴ھ)

سید احمد خاں — آثار الصنادید (دہلی سنہ ۱۸۵۴ء)

حسن سجزی کی فوائد الفواد ، امیر خورد کی سیر الاولیا ، امیر خسرو کی راحۃ المحبین ، نظام الدین اولیا کی راحۃ القلوب ، چراغ دہلی کی مفتاح العاشقین ، امیر خسرو کی افضل الفوائد کے تراجم (یہ تمام تراجم اللہ والے کی دکان ، کشمیری گیٹ ، لاہور کے ہیں)


## انگریزی کتب


ابو الفضل — اکبر نامہ ترجمہ بیوریج ، ببلوتھیکا انڈکا (کلکتہ سنہ ۱۸۲۱ء)

آئین اکبری ، ترجمہ ایچ ، بلاخمین (کلکتہ سنہ ۱۸۷۳ء)

آئنگر ، کے ، ایس ، South India and Her Muhammadan Invaders (لندن سنہ ۱۹۲۱ء)

البیرونی — انڈیا ترجمہ ای ، سی ، سخاؤ (E. C. Sachau) ، ۲ جلدیں (لندن سنہ ۱۹۱۰ء)

اشرف ، کے ، ایم ، Life and Conditions of the people of Hindustan (کلکتہ سنہ ۱۹۳۵ء)

احمد ، ایم بشیر — Administration of Justice in Medieval India (علی گڑھ سنہ ۱۹۴۱ء)

اغنیدس ، این ، پی ، Muhammedan Theories (Aghnides N. P.) of Finance (نیویارک سنہ ۱۹۱۶ء)

کوٹلیہ کا ارتھ شاستر ، ترجمہ ایس ، شاستری (میسور سنہ ۱۹۲۳ء)

باسو ، کے ، کے ، تاریخ مبارک شاہی کا ترجمہ ، اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ (بڑودہ سنہ ۱۹۳۲ء)

برگس ، ایچ — History of the Rise of the Muhammedan power ، ۴ جلدیں ، (کلکتہ سنہ ۱۹۱۰ء)

بھنڈارکر ، آر ، جی ، Early History of the Deccan (بمبئی سنہ ۱۸۸۴ء)

بیلے، ای، سی۔ (Bayley, E.C.)
Muhammadan Dynasties (گجرات) لندن ۱۸۸۶ء

بیل، ٹی، ڈبلیو (Beale, T.W.)
Oriental Biographical Dictionary (لندن ۱۸۹۱ء)

براؤن، پی، Indian Architecture (اسلامی عہد)، تاراپور والا (بمبئی، بلا تاریخ)

بلاخمین، ایچ Blochmann آئین اکبری، (کلکتہ ۱۸۷۳ء)

بارتھولڈ، ڈبلیو، Turkistan Down to the Mongol Invasions (لندن ۱۹۲۸ء)

کیرو، سر اولف Caroe, Sir Olaf ، دی پٹھانس، میکملن اینڈ کو (لندن) ۱۹۵۹ء

کمیسریٹ، ایم، ایس (Commissariat, M.S.) ہسٹری آف گجرات، جلد اول (بمبئی ۱۹۳۸ء)

کارپینٹر، جے، ای، Theism in Medieval India (لندن ۱۹۲۱ء)

Croix, Petit De La ہسٹری آف چنگیز خاں (لندن ۱۷۲۲ء)

ڈے، بی، طبقات اکبری، انگریزی ترجمہ (کلکتہ ۱۹۲۷ء)

ایلیٹ اور ڈاؤسن، History of India As Told By Its Own Historians ۸ جلدیں (لندن ۱۸۶۷ء)

ارسکن، ڈبلیو (Erskin, W.) A History of India Under Baber and Humayun ۲ جلدیں (لندن ۱۸۵۴ء)

مؤلف مصنفین، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لزاک اینڈ کو (لندن ۱۹۱۳-۳۶ء)

ایتھے، آر، Catalogue of Persian MSS. in the India Office Library

الیاس اور راس A History of the Moguls of Central Asia (تاریخ رشیدی کا ترجمہ) (لندن ۱۸۹۸ء)

فلیٹ، جے، ایف Dynasties of the Kanarese Districts (بمبئی ۱۸۹۶ء)

فوربیس، اے، کے، (Forbes, A. K.) راس مالا (۱۸۵۶ء) مرتبہ جی، ایچ رالنسن (لندن ۱۹۲۴ء)

فرگسن، جے (Fergusson, J.) History of the Indian and Eastern Architectures ۲ جلدیں (لندن ۱۹۱۰ء)

گریبل، جے، ڈی، Grubble, J.D.B. ہسٹری آف دکن، ۲ جلدیں (لندن

گب، ایچ، اے، آر، Ibn-Batutah's Travels in Asia and Africa (لندن ۱۹۲۹ء)

گبن، ایڈورڈ Decline and Fall of the Roman Empire ایوری مین لائبریری ایڈیشن، بلا تاریخ

حبیب، محمد، Campaigns of Alauddin Khilji ترجمہ خزائن الفتوح (بمبئی ۱۹۳۱ء)

ضیاء برنی کی فتاوائے جہانداری کا ترجمہ از افسر بیگم اور راقم حبیب بعنوان The political Theory of the Sultanate of Delhi کتاب محل، (دہلی، بلا تاریخ)

لائف آف حضرت امیر خسرو (علی گڑھ ۱۹۲۷ء)

حبیب اللہ، اے، بی، ایم، The Foundations of Muslim Rule in India (لاہور ۱۹۴۵ء)

ہودی والا، ایس، ایچ، اسٹڈیز ان انڈو مسلم ہسٹری (بمبئی ۱۹۳۹ء)

ہوورتھ، سر ہنری، ہسٹری آف دی منگولس ۴ جز (لندن ۱۸۷۹ء)

حسین، کے. بی، ظفر، اے گائیڈ ٹو نظام الدین Memoir of the Archaelogical Survey of India No. 10

حسین، مہدی، دی رحلہ آف ابن بطوطہ، اورینٹل انسٹی ٹیوٹ (بڑودہ ۱۹۵۳ء)

حسین، ڈبلیو، Administration of Justice During the Muslim Rule in India (کلکتہ ۱۹۳۴ء)

ہیوز، ٹی، پی (Hughes, T.P.) ڈکشنری آف اسلام (لندن ۱۸۸۵ء)

ہیول، اے بی، A History of the Ancient and Mediaeval Architecture in India (لندن ۱۹۱۸ء)

ہیگ، سر ولزلے (Haig, Sir Wolseley) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد دوم ۱۹۲۸ء

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا

Kincaid, C.A. and Parasnis, D.B.، اے ہسٹری آف دی مراٹھہ پیپل، ۲ جلد آکسفورڈ ۱۹۲۲ء

کیتھ، اے بی، اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر (آکسفورڈ ۱۹۴۸ء)

لال، کے ایس، Twilight of the Sultanate ایشیا پبلشنگ ہاؤس (بمبئی ۱۹۶۳ء)

Studies in Medieval Indian History رنجیت پرنٹرس اینڈ پبلشرس (دہلی ۱۹۶۶ء)

لین پول، ایس، ۱۔ The Muhammadan Dynasties (پیرس ۱۹۲۵ء)

۲۔ اورنگ زیب (آکسفورڈ ۱۹۰۸ء)

۳۔ Catalogue of Indian Coins in the British Museum (لندن ۱۸۸۴ء)

۴۔ Muhammadan States (فشر اَون (لندن ۱۹۰۶ء)

۵۔ Medieval India

لا، این، این (Law, N. N.) Promotion of Learning in India Under Muslim Rule (لندن ۱۹۱۶ء)

منو کی منوسمرتی یا دھرم شاستر، مع انگریزی ترجمہ از ہاپکنس (لندن ۱۸۸۴ء)

منوچی نکولاؤ (Manucci, Niccolao) Storia do Mogor ۴ جلدیں (جان مری لندن ۱۹۰۷ء)

منشی، کے ایم، گجرات اینڈ اِٹس لٹریچر

مرزا، ایم، ڈبلیو، لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو (کلکتہ ۱۹۳۵ء)

مورلینڈ، ڈبلیو، ایچ، The Agrarian System of Moslem India (کیمبرج ۱۹۲۹ء)

میلیٹ، سی، سی، ہسٹری آف سندھ، ترجمہ تاریخ معصومی (بمبئی ۱۸۵۵ء)

ناظم، ایم۔ دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمود آف غزنہ (کیمبرج ۱۹۳۱ء)

پیج، جی، اے، اے گائیڈ ٹو دی قطب، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا میموائر ۱۹۳۸ء

پیگوٹ، اسٹوارٹ (Piggot, Stuart) Some Ancient Cities of India (آکسفورڈ)

پراڈن، مائیکل (Prawdin, Michael) The Mongol Empire, Its Rise and Legacy جارج ایلن اینڈ اَون (لندن) ۱۹۴۰ء

پرشاد، ایشوری، ہسٹری آف دی قرانہ ٹرکس (دی انڈین پریس، الہ آباد ۱۹۳۶ء)

قریشی، آئی، ایچ، ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی، (لاہور ۱۹۴۲ء)

رینکنگ، جارج ایس اے منتخب التواریخ، بدایونی کی تاریخ کا ترجمہ (کلکتہ ۱۸۹۸ء)

رینل، جیمس (Rennel, James)
Memoir of a Map of Hindustan (لندن ۱۷۹۳ء)
ریورٹی، ایچ، طبقات ناصری، انگریزی ترجمہ (لندن ۱۸۸۱ء)
روجرس، سی، جے (Catalogue of Coins in the Indian
Museum) جزو اول (کلکتہ ۱۸۹۳ء)
رے، ایچ، سی (Dynastic History of North India)، ۲ جلدیں (کلکتہ ۱۹۳۱ء)
ساردا، ہربلاس ہمیر آف رنتھمبور (اجمیر ۱۹۲۱ء)
سرکار، جے، این، اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب، (کلکتہ ۱۹۳۰ء)
شیواجی (کلکتہ ۱۹۲۹ء)
سائکس، پی، ایم (Sykes, P. M.) اے ہسٹری آف پرشیا، ۲ جلدیں، میکملن اینڈ کو (لندن ۱۹۱۵ء)
Archaeology and Monumental
اسٹیفن کار، (Remains of Delhi) تھیکر اسپنک اینڈ کو (کلکتہ ۱۸۷۶ء)
سینڈرسن، گورڈن، آرکیالوجی آف دی قطب، دہلی، میموائر آف دی آرکیالوجکل سروے
سین، ڈی، سی، اے ہسٹری آف دی بنگالی لینگویج اینڈ لٹریچر (کلکتہ ۱۹۱۱ء)
اسپیز، اوٹو (Spies, Otto) An Arab Account of the 14th Century
القلقشندی کی صبح الاعشیٰ سے ترجمہ (علی گڑھ، بلا تاریخ)
سیول، آر (Sewell, R.) (Historical Inscriptions
of Southern India) (مدراس ۱۹۳۲ء)
اسٹینگاس (Steingass) پرشین انگلش ڈکشنری، کیگن پال (لندن ۱۹۳۰ء)
ٹاڈ، جیمس، Annals and Antiquities of Rajasthan، مرتبہ کروک (Crooke) ۳ جلدیں آکسفورڈ ۱۹۲۰ء
تھامس، ایڈورڈ، Chronicles of the Pathan Kings of Delhi (لندن ۱۸۷۱ء)
ٹیٹس، ایم، ٹی، انڈین اسلام (مدراس ۱۹۳۸ء)
ترپاٹھی، آر، پی، Some Aspects of Muslim Administration انڈین پریس (الہ آباد ۱۹۳۶ء)

ٹوپا، ایشور؛ پالیٹکس ان پری مغل ٹائمز (کتابستان الہ آباد سنہ ۱۹۳۸ء)
ٹوائے، سڈنی ( Toy, Sidney) 'Strongholds of India' بائن من (لندن سنہ ۱۹۵۷ء)
ویمبرے، آرمینس (Vambery, Arminius) ہسٹری آف بخارا (لندن سنہ ۱۸۷۳ء)
وینکٹ رمینا این، دی ارلی مسلم اکسپینشن ان ساؤتھ انڈیا (مدراس یونیورسٹی سنہ ۱۹۴۲ء)
ولاڈی مرتسوف (Vladimirtsov) لائف آف چنگیز خاں، راؤٹ لیج (لندن سنہ ۱۹۳۰ء)
رائٹ نیلسن (Wright, Nelson) The Sultans of Delhi. Their Coinage and Metrology سنہ ۱۹۳۶ء دہلی
یول، سرہنری، Sir Marco Yule ۲ جلدیں (لندن سنہ ۱۹۰۳ء)
The Way Thither لندن سنہ ۱۹۱۲-۱۶ء

# جرائد

آرکیالوجکل سروے آف انڈیا رپورٹس
ایپی گرافیا کرناٹیکا Epigraphia Carnatica
ایپی گرافیا انڈومسلمکا Epigraphia Indo-Moslemica
ایپی گرافیا انڈکا Epigraphia Indica
دی انڈین اینٹی کویری The Indian Antiquary
انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی
جرنل آف دی (رائل) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
جرنل آف انڈین ہسٹری
جرنل آف انڈین آرٹ
جرنل آف نیومسمیٹک سوسائٹی آف انڈیا Journal of Numismatic Society of India
جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین
جرنل آف دی یونائیٹڈ پروونسز ہسٹاریکل سوسائٹی Journal of the United provinces Historical Society
پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس Proceedings of the Indian History Congress

# ہماری مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| جدید سیاسی فکر | سید انوار الحق حقی / ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی | 14/25 |
| جدید ہندوستان کے معمار | آئی، سی، ایچ، آر / ڈاکٹر قیام الدین احمد | 14/- |
| جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد | ایس۔ ڈبلیو وولرج / انیس احمد صدیقی | 19/- |
| جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار | ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی | 47/- |
| اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء | محمد اطہر علی / امین الدین | 28/- |
| بادشاہ | میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین | 14/- |
| برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت | محمد محمود فیض آبادی | 36/- |
| تاریخ آصفی | مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی | 10/- |
| تاریخ اور سماجیات | عائشہ بیگم | 10/50 |
| اسلامی تہذیب و تمدن | عماد الحسن آزاد فاروقی | 14/- |
| اسلامی سماج | ریوبن لیوی / ڈاکٹر مشیر الحق | 60/- |
| اکبر سے اورنگ زیب تک | ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی | 21/50 |
| البیرونی کے جغرافیائی نظریات | ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی | 11/- |
| تاریخ فلسفہ سیاسیات | پروفیسر محمد مجیب | 18/- |
| تاریخ ہندی فلسفہ | ایس۔ این داس گپتا | 12/50 |
| تحریک آزادی ہند | ظہور محمد خاں | 2/25 |
| تحریک خلافت | قاضی محمد عدیل عباسی | 65/- |
| قدیم ہندوستان میں شودر | ڈاکٹر رام سرن شرما / جمال الدین محمد صدیقی | 14/50 |
| مہاتما گاندھی | بی۔ آر۔ نندا / علی جواد زیدی | 60/- |
| مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال | ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی | 37/- |
| مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست (دوسری طباعت) | ڈاکٹر ستیش چندر / ڈاکٹر قاسم صدیقی | 22/- |

| | | |
|---|---|---|
| فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ اوّل) | رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی | 67/50 |
| فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم) | رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی | 67/50 |
| فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ اوّل) | رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی | 50/- |
| فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ دوم) | رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی | 50/- |
| فکر و تحقیق (۱) جنوری تا جون 1989 | قومی اردو کونسل | 15/- |
| فکر و تحقیق (۲) جولائی تا دسمبر 1989 | قومی اردو کونسل | 15/- |
| فکر و تحقیق (۳) جنوری تا جون 1990 | قومی اردو کونسل | 15/- |
| فکر و تحقیق (۴) جولائی تا دسمبر 1990 | قومی اردو کونسل | 15/- |
| فکر و تحقیق (۵) جنوری تا جون 1992 | قومی اردو کونسل | 20/- |
| فکر و تحقیق (۶) جولائی تا دسمبر 1992 | قومی اردو کونسل | 20/- |
| فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون 1997 | قومی اردو کونسل | 30/- |
| فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر 1997 | قومی اردو کونسل | 30/- |
| آہنگ و عروض | ڈاکٹر کمال احمد صدیقی | 18/- |
| املانامہ | مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ | 9/- |
| اردو تصویری لغت | شیاملا کماری / ڈاکٹر علی وفاد فہمی | 30/- |
| اردو صرف و نحو | ڈاکٹر اقتدار حسین خاں | 16/- |
| اردو افعال | سونیا چرنیکوا | 24/- |
| اردو املا (دوسری طباعت) | رشید حسن خاں | زیر طبع |
| اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اوّل) | پروفیسر فضل الرحمٰن | 300/- |
| اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ دوم) | پروفیسر فضل الرحمٰن | 450/- |
| اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ سوم) | پروفیسر فضل الرحمٰن | 450/- |
| اسکول لائبریری | سید حسین رضا رضوی | 20/- |

| | | |
|---|---|---|
| ایلیس آئینہ گھر میں | لیولیس کیرل رڈاکٹر عبدالحیٔ | 12/- |
| بابر نامہ | ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی | 12/- |
| باتیں کرنے والا غار | دولت ڈونگاجی رائے کے لونگیا | 3/50 |
| باپو اور بچے | پی۔ڈی۔ٹنڈن ر تاجور سامری | 2/25 |
| بچوں کے حالی | صالحہ عابد حسین | 3/75 |
| بچوں کے ڈرامے | اظہر افسر | 10/50 |
| بچوں کی مسکان | سیّدہ فرحت | 3/75 |
| بچوں کی نظمیں | جگن ناتھ آزاد | 5/- |
| بچوں کے نہرو | ایم چیلاپتی راؤ ر پریم نارائن | 7/50 |
| بکری دو گاؤں کھا گئی | م۔ ندیم | 9/- |
| بگلا اور کیکڑا | الکا شنکر | 7/- |
| بوڑھیا اور کوا | شنکر | 7/50 |
| بے زبان ساتھی | وکیل نجیب | 10/- |
| بیربل کی شوخیاں | ثریا جبیں | 8/- |
| بے زبانوں کی دنیا | حیدر بیابانی | 18/- |
| پینک کی کہانی | غلام حیدر | 4/50 |
| چراغ کا سفر | سید محمد ٹونکی | 1/50 |
| چڑیا اور راجہ | مدھو ٹنڈن ر اتل ویاس | 7/- |
| چڑیاں | سلطان آصف | 3/- |
| چلو چاند پر چلیں | جے پرکاش بھارتی رڈاکٹر محمد یعقوب عامر | 5/- |
| چندا ماما کے گاؤں میں | قاضی مشتاق احمد | 5/- |

| | | |
|---|---|---|
| وفادار نیولا | شنکر | 7/- |
| ہری اور دوسرے ہاتھی | شنکر ر پریم نارائن | 6/- |
| ہمارا سنیما | پریم پال اشک | 10/- |
| ہمارا قومی گیت | سید محمد ابراہیم فکری | 10/- |
| ہماری لوک کہانیاں | پریم پال اشک | 18/- |
| ہمارے ٹیگور | صفدر حسین | 8/50 |
| ہمارے جانباز | پریم پال اشک | 13/- |
| ہمالیہ کے بجارے | شیام سنگھ ششی | 6/50 |
| ہندوستان کی آبادی | محمد ابوذر | 8/75 |
| ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ اوّل) | صفدر حسین | 15/- |
| جامع انگریزی اردو لغت (حصہ اوّل) | کلیم الدین احمد | 400/- |
| جامع انگریزی اردو لغت (حصہ دوم) | کلیم الدین احمد | 600/- |
| جامع انگریزی اردو لغت (حصہ سوم) | کلیم الدین احمد | 600/- |
| جامع انگریزی اردو لغت (حصہ چہارم) | کلیم الدین احمد | 600/- |
| جامع انگریزی اردو لغت (حصہ پنجم) | کلیم الدین احمد | 600/- |
| جامع انگریزی اردو لغت (حصہ ششم) | کلیم الدین احمد | 600/- |
| توضیحی لسانیات | ایچ، ایل، گلیسن ر عتیق احمد صدیقی | 23/- |
| چندر دیو | ایم نثار کشور سلطان | 3/- |
| حاتم طائی کا قصہ | مرتب: ڈاکٹر نورالحسن نقوی | 13/- |
| حالی | صالحہ عابد حسین | 4/- |
| حرف حرف نظم | وقار خلیل | 5/- |

Rs. 88/=

Printed at : Lahooti Print aids, 1397, Pahari Imli,
Jama Masjid, Delhi-110006.